شعرائے اردو کے تذکرے

نکات الشعراء سے گلشن بے خار تک

۱۱۶۵ھ تا ۱۲۵۰ھ
۱۷۵۲ء تا ۱۸۳۵ء

وکرم یونیورسٹی اجین کی ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)
کی ڈگری کے لئے منظور شدہ

تحقیقی مقالہ

ڈاکٹر حنیف نقوی

ایم اے (فارسی)، ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (اردو)

لیکچرر شعبۂ اردو و فارسی و عربی

بنارس ہندو یونیورسٹی

وارانسی

قیمت

چھبیس روپیہ

ناشر

نسیم انہونوی

نسیم بک ڈپو • لاٹوش روڈ لکھنؤ

۲۴۵۵۹
ٹیلیفون:- ۲۵۲۳۴

باہتمام عزیز الرحمٰن نظامی پریس لکھنؤ میں چھپکر شائع ہوا

(بار اول جون ۱۹۷۶ء)

میں اپنی تحقیقی کاوشوں کے اس ماحصل کو انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ

اپنے مرحوم نانا

منشی شاکر حسین صاحب نکہت

سہوانی کے نام

جنکے فیضانِ تربیت سے مجھے خدمت لوح و قلم کی توفیق حاصل ہوئی

استادِ محترم ڈاکٹر گیان چند جین کے نام

جنھوں نے میرے اندر تحقیق کا ذوق پیدا کیا

اور

شفیق رہنما ڈاکٹر ابو محمد سحر کے نام

جن کا علمی شغف اور تحقیقی بصیرت آج بھی میرے لئے چراغ راہ ہے

معنون کرتا ہوں

فہرست مضامین

دیباچہ

زبان و ادب کا مطالعہ تاریخ ادب کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور مطالعے کی اس تکمیل کے لئے آثارِ ادبیہ کا تحفظ اور فنکاروں کے صحائفِ حیات کی شیرازہ بندی ایک ناگزیر امر ہے۔ مشرق میں لوح و قلم کے خدمت گزاروں کو جب اس حقیقت کا احساس ہوا تو اس کے نتائج تذکرہ نویسی کے آغاز اور اس کے فروغ کی صورت میں رونما ہوئے۔ عربی و فارسی میں شعراء کے تذکروں کی کثرت تاریخی حس کی اسی بیداری کی رہینِ منت ہے۔ اردو میں یہ صنف دوسری متعدد اصنافِ ادب کی طرح فارسی کے واسطے سے داخل ہوئی۔ یہاں اس میدان میں اربابِ قلم کی کاوشوں کے ابتدائی نمونے ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) کے قریب منظرِ عام پر آئے۔ اس زمانے سے ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں اردو کی پہلی ادبی تاریخ 'آبِ حیات' کی اشاعت کے زمانے تک تذکروں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جس کی بنا پر یہ دور بلاشبہ تذکرہ نگاری کا عہدِ زریں کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس زمانے کے تذکروں میں اردو زبان و ادب اور اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی تہذیب کے بارے میں معلومات کا جو متنوع اور وافر سرمایہ محفوظ ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں ادبِ قدیم سے متعلق موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی زاویہ نظر سے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تذکروں کی اس اہمیت

کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے محتویات و مشتملات پر سیر حاصل بحث کے ذریعے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ ایک عام قاری کے ذہن میں بھی ان میں سے کسی تذکرے کے انفرادی معیار اور اسنادی حیثیت کے بارے میں کوئی خلطِ مبحث باقی نہ رہے

اُردو میں اس موضوع پر اب تک جو کچھ کام ہوا ہے وہ کسی طرح درخورِ اعتنا نہیں کیونکہ کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف وہ حضرات ہیں جو تذکروں کو ایک متاعِ کاسد سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تو دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کی رائیں مطالعے کی سطحیت غور و فکر کے فقدان اور دوسروں کے تاثرات سے اثر پذیری کی غماز ہیں۔ بعض ناقدین نے اپنی پسند یا رسائی کے مطابق صرف دو چار تذکروں کو سامنے رکھ کر پوری صنف کے بارے میں ایسے حتمی اور قطعی فیصلے صادر کر دیے ہیں جن سے متاثر ہو کر حقیقتِ حال سے بے خبر قارئین تذکروں کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پیشِ نظر مقالہ اسی افراط و تفریط کے درمیان اعتدال و توازن کی جستجو کو منتہائے مقصود بنا کر سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

چونکہ ایک متعین وقت اور محدود گنجائش کے اندر سارے تذکروں کے بارے میں کوئی کار آمد اور تسلی بخش کام نہیں کیا جا سکتا اس لئے ہم نے اپنا دائرۂ کار صرف ان تذکروں کے جائزے تک محدود رکھا ہے جو ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴-۳۵ء) کے درمیان مرتب ہوئے ہیں۔ اس زمانے کے تقریباً وہ تمام ہی تذکرے جو شائع ہو چکے ہیں یا جن کے مخطوطات ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اس دائرے میں آ گئے ہیں۔ البتہ چند تذکروں کو جن کا ذکر موقع کی مناسبت سے آئندہ سطور میں کر دیا جائے گا، بعض ناگزیر وجوہات کے تحت نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تذکرہ نویسی کے فن اور اس کے

متعلقات و مناسبات سے بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں مثالوں کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں حتی الامکان انھیں تذکروں کے حوالے دئے گئے ہیں جو ہمارے مطالعے میں شامل ہیں تاہم کہیں کہیں موضوع گفتگو کی وضاحت کے لئے ان تذکروں کو بھی شامل بحث کر لیا گیا ہے۔ جو بعد کے زمانے سے یا ہم شعرائے فارسی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ارباب ذوق عام طور پر ان سے نا واقف نہیں۔

اردو میں تذکرہ نویسی کا آغاز فارسی کے زیر اثر ہوا اور فارسی تذکرہ نویسوں نے براہ راست عربی تذکرہ نگاروں سے اثرات قبول کئے روایات کے اس مربوط سلسلے کی نشاندہی کے لئے دوسرے باب میں عربی و فارسی تذکرہ نویسی کے متعلق مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ بسلسلۂ کلام کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے یہاں عربی کے صرف انھیں تذکروں کے ذکر سے سروکار رکھا گیا ہے جو فارسی میں تذکرہ نویسی کی ترویج و ترقی کے لئے سامانِ ترغیب ثابت ہوتے اسی طرح چونکہ فارسی کا اولین تذکرہ ہندوستان میں لکھا گیا اور اس کے بعد بھی اس صنف نے ترقی کے بیشتر مراحل یہیں طے کئے۔ اس لئے یہاں بھی اختصار کی گنجائش نکال کر ہم نے اردو تذکرہ نویسی کے آغاز سے قبل ہندوستان میں ترتیب پائے ہوئے تذکروں کے تعارف پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اس اختصار بیانی کی وجہ سے یہ بحث کسی قدر تشنہ رہ گئی ہے لیکن اس سے ہمارے موضوع بیان کے تسلسل اور افادیت میں یقیناً کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔

تیسرے باب میں اولاً اجمال و اختصار کے ساتھ اردو شاعری کی عہد بعہد ترقی و مقبولیت کے "قصۂ پارینہ" کو دوہرایا گیا ہے تاکہ قارئین کے ذہن میں اس ماحول اور پس منظر کا ایک نقش تازہ ہو جائے جس سے اردو تذکرہ نویسی کے محرکات اور ترغیبی عوامل وابستہ ہیں۔ اس کے بعد اردو تذکرہ نگاری کی ابتدا اور اس میدان میں شرف اولیت کے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں کے دعووں اور

ناقدین کے بیانات کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں حقیقتاً اس صنف کا آغاز کب ہوا اور اس کی بنیاد گزاری میں شرفِ اولیت کا اصل مستحق کون ہے۔ یہ حصہ خالص تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں ملک کے مختلف ادبی مراکز میں وہاں کی تہذیبی سرگرمیوں اور علمی و ادبی ترقیوں کے دوش بدوش تذکرہ نگاری کے فروغ اور ترقی کی رفتار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں ہم نے ان تذکروں کے متعلق تمام دستیاب معلومات کا بھی احاطہ کر لیا ہے جو دستبردِ زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں یا جنھیں خاص وجوہات کے تحت زیرِ تنقید تذکروں میں شامل نہیں کیا جا سکا ہے۔

مقالے کے اگلے چار ابواب ہماری تمام تر تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا ماحصل ہیں۔ ان ابواب کے تحت فرداً فرداً تیئیس[۲۳] تذکروں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ تذکرے زیرِ تبصرہ دور کا کل سرمایہ تو نہیں لیکن اس سرمائے کا جزوِ اعظم ضرور ہیں۔ دوسرے ہم زمانہ تذکروں میں سے جو تذکرے دسترس سے بعید نہ ہونے کے باوجود ہماری بحث کے دائرے میں نہیں آ سکے ان میں "گلشنِ ہند" مؤلفہ حیدر بخش حیدری، مجمع الانتخاب مؤلفہ شاہ کمال مانکپوری، "دیوانِ جہاں" مولفہ رائے بینی نرائن اور تذکرۂ صدر الدین آزردہ شامل ہیں۔ حیدری کے "گلشنِ ہند" کو نظر انداز کر دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک فنی نقطۂ نظر سے یہ تذکرہ کے بجائے بیاضِ اشعار کہے جانے کا مستحق ہے کیونکہ اس میں مظفر علی خاں ولا کے علاوہ کسی شاعر کو بھی نہایت مختصر قسم کے ایک دو جملوں سے زیادہ میں متعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ بینی نرائن کے "دیوانِ جہاں" کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ "مجمع الانتخاب" کے دو مکمل نسخے سرسالار جنگ میوزیم کے کتب خانے میں محفوظ ہیں لیکن بعض مجبوریوں کے تحت حیدرآباد کے سفر سے قبل

اور وقت وابسی کی بنا پر ان سے استفادہ نہ کیا جا سکا اور انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانے میں اس تذکرے کا جو نسخہ ہے وہ ردیف میں پر ختم ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو سامنے رکھ کر کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ کارپس کرسٹی کالج کیمبرج کی لائبریری میں دریافت شدہ تذکرۂ آزردہ کا قلمی نسخہ بھی "مجمع الانتخاب" کے نسخۂ علی گڑھ ہی کی طرح ناقص ہے اور ردیف نون کے بعد میں ختم ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے اس نسخے کی تصویری نقل بھی جس کے دیکھنے کا ہمیں موقع ملا، زیادہ صاف اور واضح نہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے کے جن تذکروں کا ذکر تذکروں یا دوسری کتابوں میں ملتا ہے وہ یا تو ضائع ہو چکے ہیں یا اگر ان میں سے کسی تذکرے کا کوئی نسخہ موجود ہے تو وہ ہنوز اہلِ نظر کی رسائی سے دور گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔

یکتا لکھنوی کی "دستور الفصاحت" اور بہادر سنگھ دہلوی کی "یادگارِ بہادری" کے شعرا سے متعلق ابواب بھی چونکہ اصلاً ان کتابوں سے علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور یہ کتابیں تذکروں کی تعریف میں نہیں آتیں۔ اس لیے تذکرہ نویسی کے فروغ وارتقا کی بحث کے ضمن میں ان کا ذکر کر دینے کے باوجود انھیں تفصیلی بحث کے لیے منتخب نہیں کیا گیا ہے۔

مقالے کے مختلف ابواب میں تذکروں کے متعلق موجودہ معلومات سے پوری طرح کام لینے کے باوجود تنقیح مباحث اور استخراج نتائج میں ہم نے اپنے انداز نظر کی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اپنے پیش رو محققین و ناقدین سے استفادے کا ہمیں اعتراف ہے لیکن فیصلہ کن مقامات میں حتی الامکان نہ تو ہم نے ان کے خیالات و بیانات سے متاثر ہو کر کوئی رائے قائم کی ہے اور نہ ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ عربی سے بہم سری

تقیت اور فارسی کے تمام تذکروں کے براہ راست مطالعے کی دشواری کے باعث
بعض اوقات اس موضوع پر کام کرنے والے مشہور و معتبر مصنفین اور صاحب
نظر کرم فرماؤں کی اعانت کا سہارا لینا پڑا ہے۔

تحقیقی مقالات کے آخری باب میں بطور خلاصہ وہی تمام باتیں دہرائی
جاتی ہیں جو سابقہ ابواب میں بالتفصیل بیان کی جاتی ہیں لیکن اس مقالے کے
مباحث کی نوعیت کے پیش نظر یہ طریقۂ کار ہمیں نہ تو سودمند معلوم ہوا اور نہ
دلچسپ۔ چنانچہ ہم نے اس کے آخری باب کو گذشتہ ابواب کی معمولی تلخیص تک
محدود رکھنے کے بجائے ان ادبی و تہذیبی مقاصد کی نشاندہی کے لئے مخصوص کیا
ہے جن کے مطالعے میں تذکرے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ باب
پچھلے تمام ابواب کے اہم تحقیقی و تنقیدی نتائج کا ایک ایسا نچوڑ یا ماحصل ہے،
جس سے تذکروں کی حقیقی اور زیادہ نمایاں قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔

شعرائے اردو کے تذکروں میں سے جو تذکرے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، ان میں سے
ہم نے "گلزار ابراہیم" کو چھوڑ کر باقی تمام تذکروں کے سارے ہی دستیاب مخطوطات
کو سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے، تاکہ شعراء کی تعداد کے فرق، متن کے اختلاف
زمانہ ترتیب کے تعین اور اسی قسم کے کسی اور معاملے میں کوئی شک و شبہ باقی
نہ رہے جو تذکرے شائع ہو چکے ہیں، ان پر تبصرہ و تنقید کے لئے عام حالات میں
مطبوعہ نسخوں ہی کا انتخاب کیا گیا ہے اور کئی اشاعتوں کی صورت میں مستند ترین
ایڈیشن کو ترجیح دی گئی ہے لیکن اس تخصیص کو بھی جامعہ کلیہ نہ بنا کر ہم نے حسب
موقع ان تذکروں کے بعض اہم قلمی نسخوں اور دوسرے مطبوعہ ایڈیشنوں سے بھی
استفادہ کیا ہے۔ مختلف نسخوں کے اس تقابلی مطالعے کی بنیاد پر اگر کسی جگہ مطبوعہ
متن میں تصرف کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو مکمل جملوں کے اختلاف یا تین چار

لفظوں کے واضح فرق کی صورت میں اضافی یا اختلافی عبارات کو قوسین میں لکھ کر
حاشیے پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک یا دو الفاظ
کے معمولی فرق یا کتابت کی صریح غلطی تک محدود رہا ہے تو کسی توضیح کے بغیر قابل
ترجیح الفاظ شاملِ عبارت کر لئے گئے ہیں۔

علیسوی، ہجری سنین و تواریخ کی مطابقت کے موقعوں پر قارئین کو اس مقالے
میں بہ لحاظِ ترتیب ایک قسم کا عدم توافق نظر آئے گا۔ یہ فرق جو بظاہر معیوب
معلوم ہوتا ہے، اتفاقی نہیں ارادی ہے۔ ہم نے اپنی تحریر میں بالالتزام ان
تواریخ و سنین کو جو اصل ماخذ سے معلوم ہوئے ہیں یا جن کی دریافت کے ذرائع
زیادہ معتبر ہیں، اولیت دی ہے اور تقویمی حساب کے ذریعے حاصل شدہ مطابقات
کا اندراج ان کے بعد کیا ہے۔ اس ضمن میں صرف تقویم نگاروں کے حسابات
پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ہم نے ذاتی طور پر بھی تاریخوں کی صحت کا اطمینان کر لیا
ہے۔ بالخصوص جن مقامات پر ہجری تاریخ کے ساتھ دن بھی مذکور ہے وہاں مذکو
بنیاد بنا کر صحیح تاریخ علیسوی کے تعین کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتائج اکثر
تقویمات کے تخمینی حساب سے مختلف ثابت ہوئے ہیں۔

یہ مقالہ ڈاکٹر ابو محمد صاحب سحر پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو گورنمنٹ حمیدیہ
کالج بھوپال کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مواد کی فراہمی سے اس کی
ترتیب تک سارے ہی مراحل میں جس انہماک اور توجہ کے ساتھ میری رہنمائی
فرمائی ہے میں اس کے لئے ان کا بے حد ممنون ہوں۔ یہ موصوف کے علمی
شغف اور ناقدانہ و محققانہ بصیرت ہی کا فیضان تھا کہ خلافِ لوح و قلم کے
اس صبر طلب مرحلے میں تمنا کی بیتابی کسی مقام پر گریز پائی پر مجبور نہ کر سکی اور
راقم السطور کو ایک ایسے موضوع پر جس کی دقت طلبی کسی شرح و بیان کی محتاج

میں، ایک مبسوط تحقیقی و تنقیدی مقالہ اہلِ نظر کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

اس مقالے کی ابتدا ۱۹۶۳ء کے اوائل میں ہوئی اور تکمیل یکم مئی ۱۹۶۷ء کو ہوئی۔ چار سال کی اس مدت میں زیادہ تر وقت مواد کی فراہمی پر صرف ہوا۔ بالخصوص غیر مطبوعہ تذکروں کے ملک کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے مخطوطات اور یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ قلمی نسخوں کی مائیکرو فلمز اور فوٹو اسٹیٹس کے حصول میں کافی دشواریاں پیش آئیں۔ ان دشواریوں سے نمٹنے کے لیے راقم السطور نے مختلف اوقات میں علی گڑھ، رام پور، دہلی، لکھنؤ، شاہجہاں پور، گورکھپور، پٹنہ اور حیدرآباد کے سفر کیے اور مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، رضا لائبریری رام پور، دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری لکھنؤ۔ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، گاندھی فیضِ عام کالج لائبریری شاہجہاں پور، گورکھپور یونیورسٹی لائبریری گورکھپور، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری پٹنہ، کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری) حیدرآباد، سینٹرل ریکارڈ آفس لائبریری حیدرآباد اور دوسری متعدد لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ان سفروں کے دوران جن بزرگوں اور کرم فرماؤں کی عنایات میرے شاملِ حال رہیں ان میں سے ڈاکٹر مختار الدین صاحب آرزو (علی گڑھ) مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی (رامپور) پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی (لکھنؤ) قاضی عبدالودود صاحب (پٹنہ)، جناب مالک رام صاحب (دہلی)، ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب زخمی (گورکھپور)، چودھری نبی محمد صاحب (پرنسپل جی ایف کالج شاہجہاں پور) اور جناب مسعود عالم صاحب (لیکچرر شعبۂ اردو جی ایف کالج شاہجہاں پور) کا میں خاص طور پر ممنون ہوں۔ آرزو صاحب نے مجھے یورپ کے کتب خانوں کے کسی نادر مخطوطات کے اوٹوگرافس اور دستی

نقلوں سے استفادے کی سہولتیں مہیا فرمائیں۔ جناب مالک رام نے "تذکرۂ بے جگر" کے نسخہ انڈیا آفس لائبریری کا فوٹو اسٹیٹ تقریباً دو ہفتے کے لئے مستعار دیا اور محمود الہی صاحب کی وساطت سے تذکرۂ شورش کے نسخۂ جون رِیلینڈ کے مطالعہ کا موقع حاصل ہوا۔ آرزو صاحب، عرشی صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، قاضی عبدالودود صاحب اور ڈاکٹر محمود الہی صاحب نے وقتاً فوقتاً خطوط کے ذریعے بھی مجھے مطلوبہ معلومات مرحمت فرمائیں۔ ان حضرات کی یہ مخلصانہ اور مشفقانہ کرم گستریاں سپاس گزاری کے تمام رسمی الفاظ کی قید و بند سے بالاتر ہیں۔

بھوپال میں مجھے استاذِ محترم ڈاکٹر گیان چند صاحب جین، علامہ محوی صدیقی لکھنوی اور جناب کوثر چاند پوری کے ذاتی کتب خانوں اور مولانا آزاد سنٹرل لائبریری گورنمنٹ حمیدیہ کالج لائبریری اور کتب خانۂ شعبۂ اردو سیفیہ ڈگری کالج سے بھی بہت سی مفید کتابیں حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر جین صاحب کی محققانہ خصائل اور انتقادی ڈاکٹر سلیم حامد صاحب رضوی مرحوم کی مشفقانہ بازپرسوں نے سمندِ شوق کے لئے تازیانے کا کام دیا۔ مقامی اور غیر مقامی احباب میں ڈاکٹر یونس حسنی پروفیسر عبد القوی دسنوی، ڈاکٹر فدا عباس رضوی، ڈاکٹر نور الحسن نقوی، جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ، جناب نثار احمد فاروقی، جناب نسیم عباسی (دہلی یونیورسٹی لائبریری دہلی) ایم۔ حبیب خاں صاحب کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، اور محمد ہارون صدیقی صاحب (اسلامیہ کالج لائبریری، بریلی) کے دوستانہ تعاون اور مخلصانہ مشوروں سے بھی مجھے اس کام میں بہت مدد ملی۔ جناب شرقی عثمانی مالک مکتبۂ شرقیہ بھوپال مقالے کی تصنیف کے دوران بڑے خلوص اور لگن کے ساتھ میری مطلوبہ کتابوں کی فراہمی کا بندوبست کرتے

شکر گزار ہوں۔

میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا بھی احسان مند ہوں جس نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی غرض سے تین سال کے لئے تین سو روپے ماہوار کی جونیر فیلوشپ عطا کر کے ان مشکلات کا سد باب کر دیا جن کا بصورت دیگر اس کام میں حائل ہونا ایک لازمی امر تھا۔

عزیز دوست اور رفیق کار ڈاکٹر سید سلیمان حسین اور نسیم بک ڈپو کے مالک جناب نسیم انہونوی بھی دوسروں سے کسی طرح کم میرے شکریے کے مستحق نہیں۔ سلیمان صاحب کے پیہم اصرار نے مجھے ان اوراق پر نظر ثانی کے لئے آمادہ کیا اور نسیم صاحب کی علم دوستی کی بدولت اس کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔

بنارس ۱۵ دسمبر ۱۹۷۲ء

حنیف نقوی

تذکرہ نگاری بحیثیت فن

تذکرہ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

تذکرہ ایک عربی لفظ ہے جسے اہلِ زبان یادداشت (میمورنڈم) دستاویز یا سرٹیفکٹ ریل یا جہاز کے ٹکٹ اور پروانۂ راہداری یا پاسپورٹ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔[1] قرآنِ کریم میں اس سے بالعموم نصیحت اور تفہیم کے معنی مراد لئے گئے ہیں[2] لیکن فی زمانہ فارسی و اردو میں اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جس میں شعرا کے مختصر حالات اور ان کا منتخب کلام درج کیا گیا ہو۔ "تذکرہ" کو اس کی مجرد حیثیت میں یہ اصطلاحی مفہوم گیارھویں صدی ہجری کے عجمی ادیبوں نے عطا کیا ہے ورنہ اس سے قبل ان کے یہاں اس لفظ کا استعمال "یادداشت، یاد آوردن و پند دادن"[3] کے معانی میں محدود تھا۔ اور "یادداشت، یا یاد آوردن کی رعایت سے اسے کسی بھی

---

[1] المنجد فی اللغۃ طبع جدید ص ۲۳۶۔ علامہ شبلی نے اپنی مشہور اردو تصنیف "سفرنامہ مصر و روم و شام میں لفظ "تذکرہ" کو دو جگہ پاسپورٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے (صفحات ۱۴ و ۲۲) اور کتاب کے آخر میں زمانہ حال کے عربی الفاظ کی فرہنگ کے تحت اس کے معنی پروانہ ٹکٹ اور سند تحریر کئے ہیں (ص ۱۵۱)

[2] سورۂ "طٰہٰ" آیت نمبر ۳، سورۂ "الحاقہ" آیت نمبر ۴۸، سورۂ "المزمل" آیت نمبر ۱۹، سورۂ "المدثر" آیات نمبر ۴۹ و ۵۴، سورۂ "الدھر" آیت نمبر ۲۹ و سورۂ "عبس" آیت نمبر ۱۱

[3] فرہنگ آنندراج جلد اوّل ص ۶۶۷ و غیاث اللغات ص ۹۷

ایسی کتاب کے نام کا جز بنایا جاسکتا تھا جس میں مختلف اشخاص کے حالات بیان کیے گئے ہوں جیسا کہ لفظ تذکرہ سے شروع ہونے والی فارسی کی قدیم ترین تصنیف "تذکرۃ الاولیا" (مرتبہ اوائلِ قرنِ ہفتم) کے مولف شیخ فریدالدین عطار کی اس وضاحت سے ظاہر ہے۔

"چوں می بینیم کہ روزگارے پدید آمدہ است کہ ... ... اشرار الناس اخیار الناس را فراموش کردہ اند، تذکرہ ساختم اولیا را و این کتاب را تذکرۃ الاولیا" نام نہادم تا اہلِ خسرانِ روزگار اہلِ دولت را فراموش نکنند و گوشہ نشینان و خلوت گرفتگان را طلب کنند و بر ایشان رغبت نمایند"[1]

دولت شاہ سمرقندی کا "تذکرۃ الشعراء" (مرتبہ ۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۷ء) شعرائے فارسی کا وہ پہلا دستیاب تذکرہ ہے جس کے نام میں یہ لفظ اولین جز کی حیثیت سے شامل ہے لیکن جہاں تک اس کے مفہوم کا تعلق ہے سمرقندی کے بیانات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بھی اسے یادگار و یادآوری کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ:

"علمائے دین دار آثار و اخبار دادہ اند و ابوابِ قصصِ انبیاء بر رخ خلق کشادہ اند شیخ عطار ... ... در "تذکرۃ الاولیا" ید بیضا نمودہ و مورخانِ دانا در تواریخ و مقاماتِ سلاطین توانا حیلہ پرداختہ اند و کتاب ہا ساختہ و ہم چنیں در معرفت بلاد و مصلحت عباد آنچہ بایستنی است؛ فضلاء، دراں کار جہد نمودہ اند و یادگارے گزاشتہ اند۔ بیت

---

[1] تذکرۃ الاولیاء مطبوعہ لیڈن ص ۶

آنچہ مجہول ماندہ در عالم
ذکر تاریخ و قصۂ شعرا است

جہت آنکہ علماء باوجود فضل و کمال بدین افسانۂ مختصر قلم رنجہ نکردہ اند و
سر ہمت فرو نیاوردہ اند و دیگران را از قلت مساعدت تذکرۂ حالات
این طائفہ را ہیچ آفریدہ از فضلا ضبط ننمودہ، اگر رقمے بر وجہ
صلاح خواہد بود . . . . . (لہٰذا) از تواریخ معتبرہ و از دواوین
استادان اصنی و اشعار متقدمین و متاخرین و از رسائل متفرقہ و
کتب سیر و غیر ذٰلک تاریخ و مقامات و حالات شعرائے بزرگ
کہ ذکر دواوین و اشعار ایشان در اقالیم مشہور و مذکور است
جمع نمودم و از عہد اسلام الیٰ یومنا ہٰذا بہ تقریب شمہ از تواریخ
سلاطین بزرگ کہ شعرائے نامدار بروزگار آن طائفہ بودہ
اند، دلہٰذا این تذکرہ بقلم آوردم و از منشآت اکابر و لطائف اعاظم
بتحقیق معرفت بلد الیٰ آنچہ توانستم بقدر الوسع و الامکان درین
تذکرہ بایراد رسانیدم"[1]

اس اقتباس میں جس انداز سے بار بار "تذکرہ" کا ذکر آیا ہے، اس سے
یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سمرقندی اس کتاب کو اپنی زبان کے سخنوروں کی یاد
تازہ رکھنے کی غرض سے ایک یادگار تحفے کے طور پر ناظرین کے سامنے پیش
کر رہا ہے اور اس لفظ کا وہ اصطلاحی مفہوم جس نے عرفِ عام میں اسکے
استعمال کو محض شعرا کے حالات و اشعار پر مشتمل تصنیف کے لئے،

---

[1] تذکرۃ الشعرا مطبوعہ لیڈن صفحہ ۱۳

مخمس کو دیا، اس کے پیش نظر نہیں بمفہوم کی اس جدت آمیز تجدید کا سہرا اور اصل طاہر نصرآبادی کے سر ہے جس نے نہ صرف اپنے تذکرۂ شعرائے فارسی (مرتبہ مابین ۱۰۸۰ھ تا ۱۰۹۲ھ) کو کسی خاص نام سے موسوم کرنے کے بجائے مطلقاً تذکرہ کہا بلکہ دوسرے مقامات پر بھی اس روایت کو برقرار رکھ کر اپنے تصور کی پوری وضاحت کر دی. مقدمے کے تحت لکھتا ہے کہ:

"سخن سنجان مثل محمد عوفی مولف "جامع الحکایات" بہ تمہید تذکرہ موسوم بہ لب الالباب (لباب الالباب) پرداختہ مشتمل بر اشعار سلاطین و شعرائے متقدمین و مرحوم میر علی شیر "در مجالس النفائس" و نواب شاہزادگی سام مرزا در تذکرہ سامی و دولت شاہ سمرقندی در تذکرۃ الشعرا ملا صوفی در تذکرہ موسوم بہ "میخانہ" "بت خانہ" آنچہ لازم سنجیدگی و حقوق برگزیدگی است، در تحقیق حالات اہل نظم بہ ظہور رسانیدہ اند بعد از ایشان میر تقی کاشی بہ نگارش تذکرہ پرداختہ داد حق دادسی دادہ کہ بر ان مزید ے متصور نیست[1]"

تذکرہ نصرآبادی کی تدوین کے بعد سے ایران کے بیشتر مصنفین نے تذکرہ سے یہی اصطلاحی معنی مراد لئے ہیں حتی کہ اب اصولی طور پر فارسی میں اس لفظ کی معنویت کا دائرہ "کتابے کہ مقصود اصلی مولف آن ترجمۂ احوال شعرا باشد[2]" تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ ہندوستان اور بالخصوص اردو زبان میں صورت حال اس سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں یہ لفظ آج بھی مفرد و مرکب دونوں ہی صورتوں میں شرح حال رجال سے متعلق کسی بھی کتاب کے ساتھ بلا تامل

---

[1] تذکرہ نصیرآبادی مطبوعہ تہران ص ۵

[2] مقدمہ "لباب الالباب" جلد اول از علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی ص ۱۵

وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری کی تصانیف "تذکرہ سلاطین دکن اور "تذکرہ اولیائے دکن" پنڈت کشن پرشاد کول کا مجموعۂ مضامین "ادبی اور قومی تذکرے" اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت "تذکرہ" اس کی روشن مثال ہیں، البتہ اہلِ زبان کے نزدیک یہاں بھی "تذکرہ" کے ساتھ اس کے اصطلاحی مفہوم کا رشتہ اس قدر استوار ہو چکا ہے کہ جب بھی تحریر و تقریر میں کسی تخصیص کے بغیر اس کا استعمال ہوتا ہے تو ہم اس سے تذکرۂ شعرا ہی مراد لیتے ہیں اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عرب مصنفین نے اپنے شعراء، علماء، فقہا اور دیگر ماہرینِ فنون کے جس قدر تذکرے ترتیب دیتے ہیں ان میں سے اکثر کسی نام خاص سے موسوم نہ ہونے کی صورت میں "طبقات کے زیرِ عنوان منظرِ عام پر آئے ہیں۔ مثال کے طور ابن سلام، ابن قتیبہ اور ابن المعتز کی تالیفات "طبقات الشعراء" کے ناموں سے موسوم ہیں۔ "طبقات الادبا" مولفہ کمال الدین ابوالبرکات عبدالرحمٰن (متوفی ۵۷۷ھ)، "طبقات الاولیا" مرتبہ شیخ سراج الدین عمر (متوفی ۸۰۳ھ) اور علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن ابنِ کمال السیوطی (۸۴۹ھ ۱۴۴۶ء تا ۹۱۱ھ ۱۵۰۵ء) کے مرتب کیے ہوئے مختلف الموضوع تذکرے "طبقات الحفاظ"، طبقات المفسرین اور "طبقات النحویین واللغویین" بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر تین ہم نام تذکروں کے علاوہ باقی تمام کتابوں کے نام کسی جامع اصول کے بجائے متقدمین کی قائم کردہ روایت کے اتباع پر مبنی ہیں کیونکہ انکی ترتیب کے زمانے تک اس موضوع کی دستاویزوں کو "تذکرہ" کے دامن میں سمو دینے اختراع فارسی کی طرح عربی ادب کے وسیع دائرہ اثر میں بھی کسی تعریف و تشریح کی محتاج نہیں رہی تھی۔ عراق کے مشہور شیعہ فقیہ علام

جلال الدین ابو المنصور حسن بن یوسف (۱۲۵۰ء ۶۴۸ھ تا ۱۳۲۶ء م ۷۲۶ھ) کا تذکرۃ الفقہا لاہل الشیعہ" اور شمس الدین محمد بن احمد الذہبی دمشقی (۱۲۷۴ء م ۶۷۳ھ تا ۱۳۴۸ء م ۷۴۷ھ) کا "تذکرۃ الحفاظ" تذکرہ کے ابتدائی دور میں مستعمل مفہوم سے عربی ادیبوں کی واقفیت کا پتہ دیتا ہے۔ لغوی معنی سے اہلِ زبان کا یہ انحراف روز افزوں علمی و ثقافتی روابط کے نتیجے میں عجمیوں کے لسانی تصرفات سے اثر پذیری کا غماز ہے۔

دورِ جدید میں عربی زبان کے مشہور لغت "المنجد" کے مرتب لوئس معلوف نے محمد عوفی کے "لباب الالباب" کو "اول تذکرۂ فارسیہ"[1] کہہ کر یہ بات بھی صاف کر دی ہے کہ موجودہ عرب دنیا اس لفظ کے معروف اصلاحی مفہوم سے بھی بے خبر نہیں ہے۔

غرض یہ کہ مروجہ اصطلاحی معنی کی روشنی میں صرف وہی کتابیں "تذکرہ" کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دونوں عناصر (مختصر حالات اور منتخب کلام) اس صنفِ ادب کے لیے ناگزیر ہیں جن کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ حالات کے تحت تذکرہ نگار شعراء کے نام اور تخلص، وطن اور جائے قیام علمی و ذہنی استعداد، شاگردی و استادی کے روابط، مزاج و طبیعت کی افتاد تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے مذاق و معیار کے متعلق ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ نمونہ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفرق غزلوں کے منتخب اشعار اور کبھی کبھی دوسری اصنافِ سخن

---

[1] المنجد فی الادب والعلوم ص ۳۱۱

کے اقتباسات بھی پیش کیئے جاتے ہیں۔ ترتیب کے اس بنیادی اُصول کو برقرار رکھتے ہوئے اگر کسی کتاب میں محض ہر شاعر کے نام اور تخلص کے ساتھ مختلف شاعروں کا کلام یکجا کر دیا جائے تو اسے تذکرہ کے بجائے "بیاض" کہا جائے گا، جبکہ زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے اور کلام کے متعلق بحث کسی صورت میں، ایسی کتاب "تاریخ ادب" کی تعریف میں آئے گی۔

تذکرے اور بیاض کا فرق

بیاض اصطلاحاً اس کتاب یا دداشت کو کہتے ہیں جس میں اس کا مرتب وقتاً فوقتاً اپنی ضرورت اور ذوق کے مطابق معلومات و مطالب کا اندراج کرتا رہتا ہے اس کے لئے نہ وحدت موضوع درکار ہے اور نہ کسی خاص نظم و ترتیب کی پاسداری۔ مگر یہ ممکن ہے کہ کوئی بیاض موضوعی وحدت اور باقاعدہ ترتیب دونوں کی پابند ہو۔ اشعار کی بیاضیں اسی ضمن میں آتی ہیں، کیونکہ ان میں صرف پسندیدہ اور منتخب کلام ہی یکجا کیا جاتا ہے۔ ان بیاضوں میں علی العموم ہر شاعر کے نام و تخلص اور کبھی کبھی اس کے وطن اور سلسلۂ تلمذ کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ لیکن تذکرہ نگار کی طرح بیاض نویس پر تمام شاعروں کے مختصر مگر جامع تعارف کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو تذکرے اور بیاض میں حدِ فاصل قائم کرتا ہے — لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے اس فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا،

"فرق درمیان بیاض و تذکرہ این است کہ بیاض تنہا مشتمل بر اشعار بقید نام شاعر بلا قید می باشد و تذکرہ محتوی بر احوال

شاعر باشد و ہم بر اشعار او[1]"

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کا بھی یہی خیال ہے کہ

"فرق درمیانِ بیاض و تذکرہ ہمیں باشد کہ بیاض تنہا اشعار
شاعر دارد و تذکرہ احوال و اشعار ہر دو دارد (۲)"

مختصر یہ کہ تذکرے کے مقابلے میں بیاض کا دائرہ بہت محدود ہے لیکن اس کے باوجود بیاض اپنی ایک علیحدہ اور مستقل حیثیت رکھتی ہے چنانچہ بعض بیاضیں اپنے مرتبین کے حسنِ انتخاب کی بدولت غیر معمولی شہرت و اہمیت حاصل کر چکی ہیں اور بعض اس بنا پر اہم ہیں کہ ان کے ذریعے ایسے بے شمار شاعروں کے نتائج افکار ہم تک پہنچتے ہیں جن کی شہرت استدادِ زمانہ کی تاب نہ لا سکی اور رفتہ رفتہ ان کے نام اور کارنامے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئے۔ اس کے علاوہ اکثر تذکرہ نگاروں کو اس قسم کی بیاضوں سے اپنے تذکروں کے لئے خام مواد کی فراہمی میں کافی مدد ملی ہے۔ میر نے "نکات الشعرا" میں جا بجا میر عبدالولی عزلت سورتی کی بیاض سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" کا آغاز بھی ایک بیاضِ اشعار ہی کی شکل میں ہوا تھا۔ شعرائے فارسی کا ایک اور مشہور تذکرہ "خلاصۃ الشعرا" مؤلفہ عباس گجراتی بھی ملا محمد صوفی مازندرانی کے مرتب کئے ہوئے اس قسم کے ایک مجموعۂ اشعار پر حالات کے اضافے کے بعد سرِ نو وجود میں آیا ہے۔

تذکرے اور تاریخِ ادب کا فرق تذکروں کی طرح تاریخِ ادب میں بھی انشا نگاروں کے

[1] گل رعنا مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد ص ۵ [2] خزانۂ عامرہ ص ۱۰۸

پہلو بہ پہلو، شعرا کے احوال و آثار سے بحث کی جاتی ہے لیکن دونوں میں نمایاں
فرق یہ ہے کہ تذکرہ نگار شعرا کے تعارف میں تفصیل سے سروکار نہ رکھتے ہوئے محض
ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں اس کے برخلاف مورخ ہر
فنکار کے حالاتِ زندگی کو متوازن شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کرنے اور اس کی
سرگزشتِ حیات کے منتشر سلسلوں کو ایک تنظیم و ترتیب کے تحت لانے کا
فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ ادب صرف نمایندہ اور منتخب
اربابِ فن کے ذکر پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ تذکرے میں کسی شاعر کو اس کے
کلام کی پست معیاری کا سہارا لے کر نظر انداز کر دینا غیر مناسب خیال کیا
جاتا ہے۔ خوب چند ذکا کے بقول "در تذکرہ اشعار رطب و یابس ہر کس
نوشتن لازم آمدہ" و ایں خیال در گشتن شعارِ تذکرہ نویس نیست[1]

مورخ کا شعار یا طرزِ فکر اس سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے اس کے
نزدیک ان افراد کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جو اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے
متقدمین کے چھوڑے ہوئے سرمائے میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ کر پائے
ہوں یا جن کی فکری و ذہنی کاوشیں ادبی و لسانی ارتقا کی راہ میں ایک
سنگ میل یا مینارۂ نور کی حیثیت حاصل کرنے میں ناکام رہی ہوں۔ ان
انفرادی خصوصیات کے ساتھ ہی تذکرے اور تاریخ کے حدود میں
امتیاز کرتے وقت ان دونوں کے باہم مختلف اندازِ ترتیب کو بھی پیش نظر
رکھنا بھی ضروری ہے۔ تذکروں میں عام طور پر حروفِ تہجی کی رعایت سے
ایک متعین مقام پر جگہ ملتی ہے۔ چنانچہ وہاں غالب کو میر سے اور میر کو
ولی سے قبل متعارف کرانے میں کسی تامل یا اعتراض کی گنجائش نہیں۔

---

[1] عیار الشعرا مخطوطہ علی گڑھ ورق ۱۲۲ الف و ۱۶۶ الف

لیکن ترتیب کا یہ طرز تاریخ کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ مورخ کی نظر میں زمانے کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ وہ ہر صاحب فن کی شخصیت اور کارناموں کو اس کے عہد اور ماحول کے آئینے میں سجا کر ضروری نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس طرح اسکی دنیا بے پناہ وسعتوں سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور اس کے بیانات کی دھوپ چھاؤں میں ہر دور کے فن کار ایک مسلسل و مربوط کہانی کے مختلف کرداروں کی طرح متحرک اور سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

تاریخ ادب کے یہ امتیازات تذکروں کے مقابلے میں جو غیر معمولی برتری عطا کرتے ہیں اگر ایک طرف اس کا اعتراف اختلاف رائے سے بالاتر ہے تو دوسری طرف تذکروں کی نقائص فرمائی کے باوجود ان کی اہمیت ناقابل انکار نظر آتی ہے۔ تذکرے تاریخ ادب کا ایک جز بھی ہیں اور اس کی بنیاد بھی۔ انھوں نے بلا استثنا تمام مورخین کے لئے تحقیق و تلاش کی ظلمتوں میں چراغ راہ کا کام دیا ہے، ان کے متفق علیہ بیانات سے حقائق کے عرفان اور واقعات کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ اور اختلافی مباحث نے ارباب نظر کے ذوق تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو و نما کے موقع فراہم کئے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کوئی مورخ ان ماخذ کی جانب رجوع کئے بغیر اپنی تاریخ کے مکمل اور مستند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تذکروں کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جو ہر صاحب رائے شخص کو ان کی لازوال تاریخی اہمیت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

تذکرہ نگاری کے تقاضے

اوپر کی سطور میں تذکرہ نگار، بیاض نویس اور مورخ کے فرائض و مراتب کا فرق واضح کرنے کی غرض سے جو تفصیلی بحث کی گئی ہے، اس سے تذکرہ نگاری

کے فن کی نزاکتوں کا اظہار مقصود ہے۔

تذکرہ نگار کو بیاض نویس کی مختصر بیانی اور مورخ کی مفصل نگاری کے درمیان اعتدال و توازن کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس مرحلے میں وہ دقت نظر اور قوت فیصلہ کی پے بہ پے آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس کے لئے ہر شاعر کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کی عکاسی ناگزیر ہوتی ہے جن کا مطالعہ کئے بغیر اس کی شخصیت کا ادراک ناممکن ہو اور دوسری طرف ان تمام واقعات کو نظر انداز کر دینا ضروری ہو جاتا ہے جنھوں نے اُس کی شخصیت اور فن کی تعمیر میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا ہے۔ اخذ و ترک کے اس مرحلے سے عہدہ برآ ہونے اور تفصیل و اختصار کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رکھنے کا یہ کام تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ایک تذکرہ نگار کے لئے چند خاص اوصاف سے متصف ہونا اور اپنے بعض اہم فرائض کو پوری طرح دھیان میں رکھنا لازمی ہے ورنہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر سکے گا۔ مثال کے طور پر۔

(الف) ایک عام مصنف کی طرح ہر تذکرہ نگار کا فطرت کے عطا کیے ہوئے ادبی ذوق اور ریاض کے شعلوں میں تپتی ہوئی علمی استعداد سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے۔ مطالعے کی سطحیت، شعور کی بے مائگی، ذہن و فکر کے افلاس اور اظہار و ابلاغ کے اسالیب پر قدرت کامل سے محرومی کی صورت میں محض دوسروں کی نقالی اسے منزلِ مراد تک نہیں پہنچا سکتی

(ب) تذکرہ نگار کے روابط اپنے دور کی ادبی تحریکات علمی و ثقافتی مجلس اور شعر و ادب کی تخلیق میں سرگرم افراد سے پوری طرح استوار ہونا چاہئیں۔

کم آمیز، مردم بیزار اور خلوت پسند انسان چونکہ شخصیات کے قریبی مطالعے اور دروں بینی کی نعمت سے محروم رہتا ہے اس لئے وہ صحیح معنی میں تذکرہ نگاری کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

(ج) تذکرے کی ترتیب کسی جامع اُصول اور نظم و ضبط کی پابند ہونا چاہیئے۔ اس غرض سے شعرا کو ان کے عہد یا مراتب کے بموجب مختلف مقامات میں بھی تقسیم کیا جاسکتا ہے اور تخلص کے حرفِ اوّل کی رعایت سے حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق ہر حرف کے تحت آنے والے شاعروں کی علیحدہ علیحدہ ردیفیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔ اس قسم کے کسی التزام سے صرفِ نظر کی صورت میں کسی خاص شاعر کے حالات تلاش کرنے کے لئے قاری کو اِدھر اُدھر بھٹکنا پڑتا ہے۔

(د) متقدمین اور دور دراز شہروں سے تعلق رکھنے والے شعراء کے حالات مستند اور قابلِ اعتبار ذرائع سے نقل کئے جائیں جب کہ معاصرین کے معاملے میں بہتر صورت یہ ہے کہ تذکرہ نگار حتی المقدور ہر شخص سے براہِ راست اس کی زندگی کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرے اور اسے اپنے طور پر ترتیب دے۔ متعلقہ شعرا کے اعزہ، احباب اور تلامذہ سے بھی اس سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

(ہ) تذکرہ نگار کا وسیع النظر، غیر جانبدار اور انصاف پسند ہونا بھی بےحد ضروری ہے۔ شعراء کے اخلاق و عادات اور کلام کے متعلق اظہارِ رائے کے وقت اسے ذاتی تعلقات اور مروت و مخاصمت کے جذبات سے بے نیاز ہو کر محض حقائق کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ علی ابراہیم خلیل کے بقول اس کے لئے یہ لازم ہے کہ "از غائلۂ جانبداری و فرض اندیشی رشتہ را

بخوبی و خوب را از زشتی وا نماید[۱]"

(و) کسی شخص کو محض اس لئے تذکرے میں جگہ دینے سے احتراز نہ کرنا چاہیئے کہ اس کا کلام معیار یا مقدار کے لحاظ سے قابلِ اعتنا نہیں۔ البتہ ایسے شعرا کے تعارف میں اختصار کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(ز) تذکرہ نگار کا اسلوب تحریر واضح اور دل کش ہونا چاہیئے۔ سادگی و پرکاری کے اس امتزاج کا خیال رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ جس طرح انشا پردازی کا مظاہرہ اور غیر ضروری رنگین نگاری و عبارت آرائی اس موضوع کی سنجیدگی کو مجروح کر دیتی ہے اسی طرح وقائع نویسی کا خشک اور بے کیف انداز بھی قارئین کی دل چسپیاں برقرار رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔

(ح) تذکرہ نگار کو حتی الامکان تمام شاعروں کے کلام کا انتخاب ان کے دواوین کے معتبر و مستند نسخوں کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیئے۔ اس طریقۂ کار کی بدولت ہر شخص کے شاعرانہ کمالات کے متعلق اظہار خیال کی منزل بھی آسان ہو جاتی ہے اور اشعار کے متن میں لفظی تغیر و تبدل کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ جب کہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے پسند کئے ہوئے کلام پر انحصار و اعتماد کی صورت میں یہ مقاصد پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔

(ط) ہر شاعر کا کلام اس طرح انتخاب کیا جائے کہ اس کے مطالعے سے اس کے فن کی تمام خوبیاں اور خامیاں پوری طرح آشکار ہو جائیں۔ معائب کی پردہ پوشی کے لئے محض بہترین شعروں کا انتخاب یا محاسن کو نظر انداز کرنے کی غرض سے پست اور غیر معیاری اشعار کی تلاش کسی طرح تذکرہ نگار کے منصب کو زیب نہیں دیتی۔

---

[۱] دیباچہ خلاصۃ الکلام بحوالۂ تاریخ تذکرہ ہائے فارسی از احمد گلچین معانی جلد اوّل ص ۵۹۰

ان شرائط کے ساتھ ساتھ ایک تذکرہ نگار کی کامیابی بڑی حد تک بقدر ضرورت فرصت کی بہم رسی، سازگار ماحول کی موجودگی اور حالات کی مساعدت پر منحصر ہے۔ مولف کی ذہنی طمانیت جس کا تعلق کم و بیش ہر دور میں معاشی مسائل کے اطمینان بخش حل سے رہا ہے۔ ادبی علاحیتوں کے ارتکاز کے اس بصیرت آزما مرحلے میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔

تذکرہ نگاری کے محرکات

ہر تخلیق اپنے وجود کے لئے کسی جذبے یا تحریک کی رہین منت ہوتی ہے چنانچہ تذکرہ نویسی کی طرف اہلِ قلم کے رجحان اور اس فن کے عہد بعہد ارتقا کے بھی کچھ مخصوص محرکات تھے تذکروں کے مطالعے سے حاصل شدہ نتائج اور بعض تذکرہ نویس کے بیانات کی روشنی میں ان کی تفصیل یہ ہے:

(الف) بقائے نام کی آرزو۔ ہر ذی شعور انسان کی یہ خواہش ہوتی ہو کہ وہ اپنے پیچھے ایسا کوئی کارنامہ چھوڑ جائے جس سے اس کے نام کو حیات جاوید حاصل ہو اور اس کے بعد آنے والی نسلیں اس کا ذکر خیر کرتی رہیں۔ تذکرہ نگار بھی اس خواہش کے اثر و نفوذ سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اپنے باکمال اسلاف و احباب کی یاد محض اس لئے تازہ کی ہے کہ شاید اس طرح ان کا نام بھی زندہ رہے۔ مثال کے طور پر عبداللطیف عباسی، "خلاصۃ الشعراء" کے دیباچے میں اس توقع کا اظہار کرتے ہیں:

"بطفیل ایں بزرگان نام گم نام (ایں) کمترین نیز: ... ...
مذکورِ السنہ و افواہ ارباب فضل و کمال گردد۔"

نواب اعظم الدولہ امیر محمد خاں سرور نے اپنے تذکرے کے دیباچے

میں یہی بات اس انداز میں کہی ہے۔

"امید از جنابِ باری است کہ مقبولِ اربابِ ایں فن شریف گردد و مطالعہ کنندگان محفوظ شوند و مولف را بدعائے خیر یاد دارند۔"[1]

(ب) اربابِ کمال کی قدرشناسی۔ فن کاروں کی قدردانی کا حق ادا کرنے کی غرض سے ان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو محفوظ کرنے کا خیال بھی تذکرہ نگاری کا ایک محرک ہے۔ اس فن کا آغاز بالخصوص اس خیال کے زیرِ اثر ہوا ہے۔ شیخ علی حزیں "تذکرۃ المعاصرین" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"یادآوریِ دوستانِ یکدل او حقیقت فردہی (تجرو ہاں) کامل و پاسِ نیک صحبتِ یارانِ خلیل و اصدقائے جلیل (و) قدرشناس ہنرِ ہر وضیع و نبیل بر آں داشت کہ ..... بذکرِ بعضے از یارانِ معاصر و ابیاتِ برخے از صاحب کمالان صافی ...... پردازد تا بہ ادائے حق: داد وہم احیائے نام و اثباتِ کلام و ابدائے مقام ہر یک عودہ باشد۔"[2]

مولوی قدرت اللہ شوق نے بھی "طبقات الشعراء" کی تالیف میں اس قسم کے عوامل کی کارفرمائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"اشعارِ استادانِ ایں فن از دواوین مولفہ و بیاضِ متفرقہ تلاش و تجسس نمودہ ..... بطریقِ تذکرہ ...... در

۱؎ عمدۂ منتخبہ ص ۲

۲؎ بحوالہ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" ص ۳۶۷

سابق تحریر در آورده تا چند سے بموجب اشتہار دربا عث یادگاری چندیں بزرگوار بر صفحہ روزگار گردد"[1]

(ج) ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین ـــــ بعض اہل علم اپنے ذہن کی مخصوص ساخت پرداخت کے باعث تنقید و تحقیق کے مسائل سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ گذشتہ صدی کے نصف اوّل کے اختتام تک ایسے لوگوں کے ذوق کی تسکین اور ذہانت و فطانت کے اظہار کا تذکرہ نگاری سے بہتر کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ اس لئے بھی اس فن کو اردو اور فارسی کے ادبی حلقوں میں کافی فروغ حاصل ہوا۔

(د) تاریخی شعور۔ شعری و لسانی روایات کی عہد بعہد ترقیوں کو ایک تاریخی تسلسل کی صورت میں منضبط کرنے اور اس طرح ادب کے ماضی و حال کا رشتہ اس کے مستقبل سے مربوط رکھنے کا خیال بھی تذکرہ نگاری کی ترویج و اشاعت کے محرکات میں شامل رہا ہے۔ مولوی عبدالحی صفا بدایونی "شمیم سخن" کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"خیال آتا ہے کہ کوئی سامان ایسا کیا جائے کہ جس کی بدولت ہماری زبان ترقی پائے۔ ہماری زبان کے موجودہ شاعروں کا نام باقی رہے اور زمانۂ حال کے حالات دیکھ کر آئندہ نسلوں میں بھی شوق تصنیف و تالیف پیدا ہو"[2]

(ہ) رقابت اور معاصرانہ چشمکیں :- ارباب فن کے باہمی اختلافات بھی تذکروں کی ترتیب میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

---

[1] طبقات الشعرا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد: ورق ۳۔ الف

[2] شمیم سخن حصہ اوّل ص ۸

میر صاحب کا تذکرہ "نکات الشعرا" جب منظر عام پر آیا تو بہت سے ادیب و شاعر ان کی زہر گداز تنقید دل کی تاب نہ لا سکے۔ چنانچہ جوابی کارروائیوں کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں میر محمد یار خاکسار اور سید فتح علی گردیزی کے تذکرے معرض وجود میں آئے۔ اسی طرح قطب الدین باطن اکبرآبادی نے نظیر کی شاعری کے متعلق شیفتہ کی رائے سے برافروختہ ہو کر ان کے تذکرے "گلشن بے خار" کے جواب میں "گلستان بے خزاں" مرتب کیا اور ان کے بیانات کی تردید میں دل کھول کر قلم کے جوہر دکھائے۔

(ز) ادبی گروہ بندی۔ بعض تذکرے اپنے استاد بھائیوں اور شاگردوں کی کثرت تعداد کو نمایاں کرنے یا اپنے ہم خیال اور ہم پیالہ اور ہم نوالہ شاعروں کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی غرض سے بھی مرتب کئے گئے ہیں۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد موہن لال انیس نے "انیس الاحبا" کے نام سے مکین اور ان کے تلامذہ کے حالات و کلام کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اُردو تذکروں میں مصحفی کا "ریاض الفصحا" اگرچہ بظاہر اس تخصیص کا پابند نہیں لیکن درحقیقت اس کی تالیف کے پس پشت بھی یہی جذبہ کار فرما ہے کیونکہ شعراء کی فہرست میں مؤلف کے احباب اور تلامذہ کی بہ نسبت عام شاعروں کے نام بہت کم نظر آتے ہیں

(ل) احباب و اعزہ کی فرمائشیں۔ دوستوں اور ساتھیوں کی فرمائشیں بھی تذکروں کی ترتیب میں ایک باثر محرک کے طور پر کارفرما رہی ہیں۔ مصحفی "تذکرۂ ہندی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "ایں فقیر ... بتکلیف میر مستحسن خلیق ... قدم دریں بادیۂ پرخار گزاشت"[1] خوب چند ذکا

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲

مولف "عیار الشعرا" کا بیان ہے کہ میں یہ تذکرہ اپنے استاد شاہ نصیر دہلوی کے ایما پر مرتب کر رہا ہوں۔[1]

شیفتہ کا تذکرہ "گلشن بے خار" بھی ایک حسب دل خواہ اور "یار عزیز کے امتثال امر" کی یادگار ہے۔[2] مرزا علی لطف کا "گلشن ہند" بھی ڈاکٹر گلگرسٹ کی خواہش کے مطابق یورپین افسروں کے نصاب تعلیم میں شامل کرنے کی غرض سے مرتب ہوا تھا۔

(ح) سرپرستوں کی خوشنودی ــــ سلاطین و امراء سے وابستہ اہل قلم ان کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کی غرض سے بھی تذکرے ترتیب دیتے رہے ہیں۔ شعرائے فارسی کے کتنے ہی تذکرے اپنے وجود کے لئے اس جذبے کے منت پذیر ہیں۔ مصحفی نے "تذکرہ ہندی" اس امید کے ساتھ اپنے محسن اور مربی مرشد زادہ شاہزادہ سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ "بنظر قبول آن والاجناب در آمدہ مقبول دلہا گردد۔"[3] امیر مینائی کا تذکرہ "انتخاب یادگار" بھی جو انھوں نے نواب کلب علی خاں فرمانروائے رامپور کی ملازمت کے زمانے میں مرتب کیا ہے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

(ط) شاعروں کی گرم بازاری ــــ تذکرہ نگاری کے لئے سازگار ماحول تیار کرنے میں شاعروں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا بھی بڑا حصہ ہے۔ میر تقی میر، میر غلام حسین شورش، مولوی قدرت اللہ

---

[1] عیار الشعرا، مخطوطہ لندن ص ۲۸۵

[2] گلشن بے خار طبع اول ص ۵ و ۶

[3] تذکرہ ہندی ص ۲۸۲

شوق اور مصحفی شعرائے اُردو کے ان تذکرہ نگاروں میں ہیں جن کے یہاں باقاعدگی کے ساتھ مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان کے تذکروں میں ہم طرح اشعار کی فراوانی ان محفلوں کے اثرات کا پتہ دیتی ہے۔

(ی) پسندیدہ کلام کو باقاعدہ نظم و ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا شوق — فرصت کے لمحات میں لطف اندوزی کی خاطر یا محض حاصل مطالعہ کے طور پر منتخب اور بہترین اشعار یکجا کرنے کا شوق بھی تذکرہ نگاری کو فروغ دینے میں دوسرے عوامل سے کم اہمیت کا حامل نہیں۔ مرزا کاظم مبتلا لکھنوی، "گلشن سخن" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ:

"اکنوں چناں بخاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویانِ سابق و حال ...
کہ دریں زمانہ کمال اشتہار در قلمرو ہندوستان دارند صحیفۂ جمع نمایم
تا از مطالعۂ آن شیفتگانِ محبوبانِ معنی حظے وافر بردارند"[1]

مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی "شمیم سخن" کی تالیف کا پس منظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

"شوقِ تصنیف و تالیف میں میں نے سیکڑوں شعرائے ماضی و حال اردو فارسی کے دیوان، بیسیوں تذکرے، صدہا بیاضیں الٹ ڈالیں، کتب تواریخ و رسائل صنائع و بدائع شعری کی بھی اوراق گردانی کی، مختلف جلسے دیکھے، بڑے بڑے شعرائے باکمال کی صحبتوں سے مستفید ہوا۔ جس کا کلام دل کو بھلا معلوم ہوا اپنی بیاض میں درج کر لیا آخر کو اس انتخاب نے کچھ اور ہی رنگ پیدا کیا"[2]

---

[1] گلشن سخن مخطوطہ رام پور۔ ورق ۲۔ الف۔ [2] شمیم سخن حصہ اول ص ۸

ان محرکات کی روشنی میں یہ حقیقت بروئے کار آتی ہے کہ تذکرہ نگاری کا فن وقت اور حالات کے تقاضوں کا ردعمل ہے۔ انسان کے ارتقاپذیر اندازِ فکر کی کرشمہ سازیاں ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان تقاضوں کی نوعیت اور ان کے نتائج کو ہر لحظہ نئے آب و رنگ سے آشنا کرتی رہتی ہیں، لیکن ہر نسل کے فن کار اپنی راہ کے تعین اور کوششوں کی کامیابی کے لئے بہرحال اسلاف کے نقوشِ قدم سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اس لئے ان کے کارناموں کی اہمیت کبھی زائل نہیں ہوتی۔ تذکروں کا بھی یہی حال ہے۔ آج عملاً "تاریخ ادب ان کی جگہ لے چکی ہے" اور ان اغراض ومقاصد کی جلوہ نمائی کے لئے جن کی تکمیل سے ان کی افادیت و مقبولیت کا دامن وابستہ تھا، علم و تحقیق کی وسیع تر شاہراہیں کھل گیئں ہیں۔ اسکے باوجود کوئی باشعور اور دیدہ ور مورخ یہ جراءت نہیں کرسکتا کہ ماضی کے عظیم ورثے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر گزر جائے۔

تذکروں کی اہمیت

ایک عام قاری کے نقطۂ نظر سے تذکروں کو میرزا کاظم مبتلا اور لالہ خوب چند ذکا کے بیان کردہ اسبابِ تالیف کے مطابق لطف اندوزی اور تفریح طبع کا ایک ذریعہ کہا جاسکتا ہے لیکن کسی زبان اور اس کے ادب کے ارتقا اور تاریخ کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ان کی اہمیت اور افادیت کا دائرہ کس قدر وسیع ہے، اس کا اندازہ ذیل کی تفصیلات سے کیا جاسکتا ہے۔

(الف) تذکروں نے ایسے بے شمار فنکاروں کو بے نام و نشان ہونے سے بچا لیا ہے جن کے کارنامے یا تو کسی وجہ سے مدون نہ ہوسکے یا مدون

ہونے کے بعد ضائع ہو گئے۔ فن کاروں کے اس زمرے میں ان سخنوروں کے پہلو بہ پہلو جن کے کلام کی ذہنی سطح زیادہ بلند نہیں، بعض ایسے اساتذہ بھی شامل ہیں جنھوں نے انتہائی نازک مرحلوں میں کاروانِ شعر و سخن کی قیادت کی ہے اور اپنی کوششوں سے ایک نئے عہد کو جنم دیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ سے یہاں بطور مثال مصطفیٰ خاں یکرنگ، خان آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان اساتذہ کی تخلیقات کا جس قدر سرمایہ آج موجود ہے، وہ تذکروں ہی کے واسطے سے حاصل ہوا ہے

(ب) اس عام خامی کے باوجود کہ تذکرہ نویسوں نے شعرا کے تعارف میں اکثر حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے، وہ تذکرے عام شاعروں کے حالاتِ زندگی، سیرت و شخصیت اور تخلیقی کاوشوں کے متعلق حصول معلومات کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔

(ج) بعض تذکروں میں ان کے مولفین نے زمانی و مکانی قرب سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر ہم عصر شاعروں کے بارے میں ضروری اور کار آمد معلومات کا وہ بیش قیمت سرمایہ فراہم کر دیا ہے جو دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

(د) بعض تذکرہ نگار بذاتِ خود بڑے شاعر ہیں انھوں نے دوسرے شعرا کے کلام کی جن خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے یا بعض اوقات اشعار میں لفظی ترمیم و تغیر کے متعلق جو مشورے دئے ہیں ان کا مطالعہ خود ان کے رجحانِ طبع اور نظریۂ فن کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں ان کے کلام کو زیادہ بہتر طور پر پرکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

(ہ) کچھ تذکرہ نویسوں نے نہایت تندہی اور سلیقہ مندی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ شاعروں کے بہترین اور منتخب اشعار یکجا کر دئیے ہیں۔ اس قسم کے تذکروں کا مطالعہ عام حالات میں دواوین کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

(و) تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں جو یقینی طور پر فنا ہو چکی ہیں یا جن کی بازیابی کے امکانات تقریباً مفقود ہیں۔ بطور مثال میر حسن نے انعام اللہ خاں یقین کے ذکر میں "نکات الشعراء" کا ایک ایسا اقتباس نقل کیا ہے جو اس کے گم شدہ ایڈیشن سے تعلق رکھتا ہے، یا مولوی کریم الدین نے "طبقات الشعرائے ہند" میں فضلی کی "کربل کتھا" کی ایک طویل عبارت بطور نمونہ پیش کی ہے۔ یہ کتاب جو شمالی ہند کی اردو نثر کا بالکل ابتدائی نمونہ ہے، اب سے کچھ پہلے تک گم شدہ شاہکاروں میں شمار کی جاتی تھی اور حال ہی میں دستیاب ہوئی ہے۔ اس قسم کے حوالے بعض اوقات محققین کو ان غائب شدہ کتابوں کی تلاش و جستجو کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

(ز) کبھی کبھی تذکروں کے مطالعے سے کسی خاص شعر یا مکمل نظم کی تخلیق کا پس منظر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً دہلی میں انشا اور مرزا عظیم بیگ کے درمیان جو زبردست معرکہ ہوا اور اس کے نتیجے میں ان شاعروں نے ایک دوسرے کی ہجو میں جو نظمیں کہیں، حکیم قدرت اللہ قاسم اور اعظم الدولہ سرور نے تذکروں میں ان کی تمام تفصیلات محفوظ کر دی ہیں۔

(ح) مختلف العہد تذکروں کے تقابلی مطالعہ سے زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے ادبی رجحانات فن کی منزل بہ منزل ترقی اور زبان کے عہد بعہد ارتقا کی رفتار اور کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(ط) تذکروں میں نقل کئے گئے اشعار اور دواوین کی صورت میں مرتب شدہ کلام کے باہمی تقابلے سے متن کے ان اختلافات کی نشاندہی میں بھی مدد ملتی ہے جو بالعموم خوب سے خوب تر کی تلاش پر منحصر شعراء کے خود اصلاحی و خود تنقیدی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

(ی) تذکروں میں اکثر ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں، جنھیں شاعر پست از معیار قرار دے کر اپنے کلام سے خارج کر دیتا ہے، یا کسی اور وجہ سے مجموعے میں شامل نہیں ہو پاتے۔ غالب کے منسوخ کلام کا ایک اچھا خاصہ حصہ اسی طرح دستیاب ہوا ہے۔

(ک) تذکروں سے متنازع فیہ کلام کی ملکیت کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثلاً "قائم چاند پوری" کے بعض مشہور اشعار جو بالعموم سودا سے منسوب کئے جاتے ہیں خود ان کے تذکرے میں ان کے اپنے نام سے منقول ہیں اس طرح ان شعروں پر سودا کی بہ نسبت قائم کا دعویٰ زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے۔ یا میر نے "نکات الشعرا" میں حسن شاگرد سودا کے نام سے جو اشعار نقل کئے ہیں ان کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ میر حسن، مصنف "سحر البیان" کی تصنیف نہیں، محض اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں ابوالحسن وحشت کو ان کا مصنف قرار دیا ہے۔

(ل) تذکروں کے انتخابات کی بنیاد پر کسی حد تک ایک ہی شاعر کی

مختلف غزلوں یا نظموں کے درمیان تاریخی تقدیم و تاخیر کے حدود بھی متعین کیے جا سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کسی شاعر کے کلام کو تاریخی اعتبار سے مرتب کرنے میں بھی تذکروں سے خاص مدد ملتی ہے۔

(م) بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے حالات کافی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں اس کے علاوہ دوسرے شعرا کے ذکر میں ان کے قلم سے ضمناً ایسی باتیں نکل گئی ہیں جن سے ان کی اپنی زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اردو میں میر حسن اور مصحفی کے تذکرے اس لحاظ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

(ن) بعض تذکروں کے ذریعے شعراء کے بارے میں تذکرہ نگار کے علاوہ دوسرے اہل الرائے اور صاحب نظر اساتذہ کے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے قاسم کے تذکرے میں جرأت کے کلام کے متعلق میر کی رائے اور "گلشن بے خار" میں میر کی شاعری کی نسبت مفتی صدر الدین آزردہ کا مشہور قول اس کی مثال ہے۔

(س) بعض تذکرہ نگاروں نے مختلف شاعروں کے انتخاب کلام کے تحت ان کی مشہور یا اچھی غزلوں کی زمین میں اپنی اور دوسرے شعرا کی غزلیں یا ان کے منتخب اشعار بھی بطور نمونہ پیش کر دئے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک ہی طرح اور ایک قافیہ میں مختلف ارباب سخن کی طبع آزمائی کے نتائج کو سامنے رکھ کر ان کی پرواز خیال، رسائی ذہن، انداز نظر اور معیار فکر کے اختلاف سے بحث کی جا سکتی ہے۔

(ع) بعض تذکروں میں مختلف صاحب حال بزرگوں کے یہاں عرس اور سماع کی محفلوں کے انعقاد اور ارباب ذوق کی قیام گاہوں پر شاعرے

کے مستقل انہدام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اس طرح سیاسی خلفشار کے نتیجے میں شعرا کی آشفتہ حالی، نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں سرگردانی اور ترکِ وطن کے واقعات کا بھی جا بجا ذکر آیا ہے۔ یہ بیانات مختلف زمانوں کے سیاسی و اقتصادی مسائل، تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کے مطالعے سے شغف رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ گویا تذکروں کی ایک عمرانی اور تاریخی اہمیت بھی ہے۔

ترتیب کے مختلف انداز

ظاہری ترتیب کے لحاظ سے تذکروں کے درمیان خاصا فرق یا تنوع نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں جن اصولوں پر تذکرہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے عمل کیا ہے یا جو طریقے عام طور پر مروج رہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(الف) جغرافیائی طرزِ ترتیب ۔ عربی و فارسی کے بعض مشہور تذکروں مثلاً "یتیمۃ الدہر (ثعالبی)، دمیۃ القصر (باخرزی) لباب الالباب (عوفی) اور ہفت اقلیم (امین رازی) وغیرہ میں مختلف ممالک یا علاقوں کے شعراء کے لیے علیحدہ علیحدہ ابواب مخصوص کیے گئے ہیں۔ چوں کہ یہ تفریق یا تخصیص جغرافیائی بنیادوں پر عمل میں آئی ہے اس لیے ترتیب کے اس خاص طرز کو جغرافیائی طرزِ ترتیب سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں ایسا کوئی تذکرہ موجود نہیں جس میں اس طرز کو اپنایا گیا ہو۔

(ب) تاریخی طرزِ ترتیب ۔ بعض تذکرہ نگاروں نے تاریخی اعتبار سے شعرا کی تقدیم و تاخیر اشعری و لسانی روایات کے تدریجی ارتقا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کیے ہیں۔ اس قسم کے تذکروں میں تاریخی شعور کی جھلک کافی نمایاں

ہے۔ اُردو میں قائم چاندپوری اور مولوی قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکروں کے لئے یہی طرزِ ترتیب پسند کیا ہے۔

(ج) قاموسی طرزِ ترتیب۔ اس طرزِ ترتیب کی عملی شکل وہ تذکرے پیش کرتے ہیں جن میں لغت یا قاموس الاعلام (بیوگرفیکل ڈکشنری) کی ترتیب کے اصول پر شعرا کے حالات ان کے نام یا تخلص کے حرفِ اوّل کی رعایت سے حروفِ تہجی کی ابجثی یا ابجدی ترتیب کے مطابق مختلف ردیفوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اس قسم کے تذکروں کو اصطلاحاً معجم کہا جاتا ہے، لیکن یہ طرز عربی سے زیادہ فارسی اور اردو میں مقبول رہا ہے۔ شعرائے اُردو کے بیشتر مشہور اور اہم تذکرے مثلاً "تحفۂ گریاں" (گردیزی) "چمنستانِ شعراء" (شفیق اورنگ آبادی) "تذکرہ شعرائے اُردو" (میر حسن) گلزار ابراہیم (خلیل) "تذکرہ ہندی"..... "ریاض الفصحا" (مصحفی) "عیار الشعرا" (خوب چند ذکا) "گلشن بے خار" (شیفتہ) اور "خمخانۂ جاوید" (لالہ سری رام کی ترتیب اسی اصول پر ہوئی ہے۔

(د) غیر منظم طرزِ ترتیب۔ بعض تذکرے ایسے بھی ملتے ہیں جو ترتیب کے لحاظ سے کسی خاص نظم و ضبط کے پابند نہیں۔ ان تذکروں میں شعرا کے درمیان تقدیم و تاخیر کا فیصلہ مولف کی ذاتی پسند یا حالات و کلام کی دستیابی کے مواقع پر منحصر رہا ہے۔ اُردو میں میرؔ کے "نکات الشعرا" حمید اورنگ آبادی کے گلشن گفتار" اور سعادت خاں ناصر لکھنوی کے "خوش معرکۂ زیبا" کی یہی نوعیت ہے۔

تذکروں کی گروہی تقسیم مشرقی زبانوں بالخصوص فارسی و اُردو میں

...... عموماً تو تمام شعرا کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں معیار فن اور انداز کے لحاظ سے کوئی بہت بڑا فرق نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود ہم انھیں بھی ضمنی مگر مابہ الامتیاز خصوصیات کی بنیاد پر مختلف گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یہ اس وقت اردو کی مثال ہمارے پیش نظر ہے۔ یہاں میرؔ، گردیزی اور قائمؔ نے تذکرہ نویسی کے بالکل ابتدائی دور میں جن روایات کی بنیاد رکھی ہو ان میں ضرورت اور وقت کے تقاضوں کے مطابق برابر رد و بدل ہوتا رہا۔ کسی تذکرہ نگار نے اپنے دائرہ کار کو وسعت دے کر حسب مقدور تمام معلوم الاسم شاعروں کے حالات و اشعار جمع کرنے کی کوشش کی۔ کسی کی توجہ صرف بہترین اشعار کے فراہم کرنے پر مرکوز رہی۔ کسی کا زور قلم خصوصیت کے ساتھ نام ور اور مسلم الثبوت اساتذہ کے تذکرے پر صرف ہوا اور کسی کو معلومات کے ذرائع و وسائل کی کمی اور اسی قسم کے دوسرے عوامل یا خصوصی دل چسپی کی بنا پر اپنی کوششیں ایک خاص دبستان علاقہ یا عہد سے تعلق رکھنے والے شعرا کی ترجمانی تک محدود رکھنا پڑیں۔ اغراض و مقاصد کی ان تبدیلیوں کے ساتھ تذکروں میں تنوع کا عنصر داخل ہوا جس کی بدولت ایک جانب تو ایک ہی قسم کے مطالب کی تکرار سے پیدا ہونے والی بے کیفی کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے اور دوسری طرف قارئین کو ہر دور، ہر علاقے اور ہر درجے کے شعرا سے واقفیت کے مواقع حاصل ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو تذکروں کی انھیں مختلف النوع خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا ہے[1]۔

اول — وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۱۰

جمع کئے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

دوئم — وہ تذکرے جن میں تمام قابلِ ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت اور استیعاب ہے۔

سوئم — وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعرائے کلام کا عمدہ اور مفصل انتخاب پیش کرنا ہے اور حالات کے جمع کرنے کی طرف زیادہ اعتنا نہیں بیاض اور مجموعے اس صنف میں شامل ہیں۔

چہارم — وہ تذکرے جن میں اُردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقا دکھانا ہے۔

پنجم — وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں

ششم — وہ تذکرے جو کسی وقتی یا ادبی گروہ کے نمایندے ہیں۔

ہفتم — وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقیدِ سخن اور اصلاحِ سخن ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے مطالب کی نوعیت کے بجائے مولفین کی حیثیت کے لحاظ سے تذکروں کے تین درجات قائم کیے ہیں:[۱]

۱۔ وہ تذکرے جو کسی بڑے شاعر کے نتیجۂ قلم ہیں۔

۲۔ وہ تذکرے جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں لیکن کسی بڑے شاعر کے گردیدہ شاگرد تھے۔

۳۔ وہ تذکرے جن کے مصنفوں کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہا جاسکتا ہے

قسم اول کے مصنف چونکہ خود بڑے شاعر ہیں۔ اس لئے ان میں زیادہ تر مشہور شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے معمولی شاعر بالکل نظر انداز کردئے گئے ہیں۔ .. .. (اور) .... حالات کی طرف توجہ کرنے کی جگہ صرف ....

---

[۱] مقدمہ گلزار ابراہیم ص ۳۱ و ۳۲

تنقید کرنے کی کوشش کی گئی) ہے۔

دوسری قسم کے تذکرے چھوٹے بڑے سب شاعروں کو فراخ دلی سے پیش کرتے ہیں لیکن ...... ان کی تحریر کا سب سے اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے استاد اور اپنے دوستوں یا اپنے استاد بھائیوں یا دوست شاعروں کو روشنی میں لایا جائے ......

تیسری قسم کے تذکروں سے ...... شاعروں کے اعلیٰ مرتبے اور انکی شاعری کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے ...... کیونکہ ان کا مقصد تحریر ادبی تنقید کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔"

بعض ناقدین نے "خاص" اور "عام" یا "مرکزی" اور "جوابی" تالیفات کے زیرعنوان بھی تذکروں کے مختلف فیہ حدود عمل کا تعین کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں یہ ساری تقسیمیں بنیادی طور پر دو خاص گروہوں میں ضم ہو جاتی ہیں۔

۱۔ بیاضی تذکرے جن کا اصل مقصود انتخاب اشعار ہے۔

۲۔ سوانحی تذکرے جن میں شعرا کے حالات جمع کرلے اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے[۱]۔

اگر تذکروں کی داخلی خصوصیات کا بنظر غایر مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے کسی بھی معیار تقسیم کو مکمل اور جامع و مانع نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مجوزہ گروہ بندی اس لحاظ سے ترمیم طلب ہے کہ ان کے بیان کے برخلاف اُردو میں اور شاید فارسی میں بھی ایسا کوئی تذکرہ موجود نہیں

۱ے نگار پاکستان ۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر ص ۲۹

جس میں انتخاب کلام کو ضمنی حیثیت دی گئی ہو[1] اس کے علاوہ انھوں نے کسی مخصوص دور یا ادبی و وطنی گروہ سے تعلق رکھنے والے تذکروں کو علیحدہ علیحدہ جگہ دی ہے۔ لیکن ان تذکروں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جن کا بنیادی مقصد کسی خاص صنفِ سخن۔ مذہبی گروہ یا سماجی طبقے کی نمایندگی کرتا ہے اسی طرح تنقیدِ کلام اور اصلاحِ سخن کا عنصر اگرچہ بعض تذکروں میں کافی نمایاں ہے پھر بھی اسے کسی تذکرہ نگار کے یہاں اساسی حیثیت حاصل نہیں۔

ڈاکٹر زور کے مقررکردہ معیار بھی اپنی تشریحات کی روشنی میں حقائق کی تعبیر سے زیادہ مفروضات پر اعتماد کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر کے بالق میر، قائم، میر حسن، مصحفی اور شیفتہ کے تذکرے قسم اول کے تحت آئیں گے حالانکہ نہ تو ان میں غیر معروف اور کم پایہ شاعروں کے ذکر سے احتراز کیا گیا ہے اور نہ حالات کو کم تر اہمیت دے کر صرف شاعری پر تنقید کی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں دوسری اور تیسری قسم کے تذکروں کے درمیان حدِ فاصل کا تعین بھی عملاً دشوار ہے کیونکہ اکثر و بیشتر تذکرہ نگار نہ خود بڑے شاعر ہیں اور نہ کسی بڑے شاعر کے برگزیدہ شاگرد۔ لیکن ان کو محض سخن فہم قرار دینا اور ان کی سخن گوئی میں کلام کرنا کسی طرح ممکن یا مناسب نہیں۔ بحث کا ایک دل چسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر زور نے فرقِ مراتب کی اس وضاحت کے بعد اپنے اصل موضوع یعنی "گلزار ابراہیم" کے تعارف کی طرف آتے ہوئے اسے تیسری قسم کے تذکروں میں شمار کیا ہے جن کا مقصد

---

[1] آبِ حیات (محمد حسین آزاد) اور گلِ رعنا (عبدالحئی) وغیرہ میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو مگر ہمارے نزدیک ان کتابوں کو تذکروں کی فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں۔

ان کے بیان کے مطابق ادبی تنقید کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا جب کہ یہ تذکرہ صرف مولف کے ذوقی تحقیق یا بہ الفاظ دیگر اپنے سوانحی عنصر کی وجہ سے ممتاز ہے اور ادبی تنقید سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

دوسرے ناقدین کی تقسیموں کا نقص یہ ہے کہ انھوں نے اختصار یا جامعیت کی کوشش میں ابہام کی مطلق پروا نہیں کی ہے اور بعض ایسے پہلوؤں کو بالکل نہیں چھوا ہے جو مستقل حیثیت یا نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک تمام اُردو تذکروں کو ان کے اغراض و مقاصد یا معنوی امتیازات کے اعتبار سے مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تعارفی تذکرے — وہ تذکرے جن کے مولفین نے علمی یا ادبی ذوق یا جذبۂ قدر شناسی کے تحت شعراء کے حالات و اشعار کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور علی العموم بیجا تنقیص و تعریف سے دامن بچائے رکھا ہے اس قسم کے تذکروں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

۲۔ جوابی تذکرے۔ وہ تذکرے جن کے مولفین نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی ضد میں قلم اُٹھایا ہے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں حریف تذکرہ نگار کے بیانات کی تردید یا اپنے احباب کی تعریف و تحسین اور مخالفین کی تشہیر و تضحیک پر صرف کر دی ہیں۔ قطب الدین باطن اکبر آبادی کا تذکرہ "گلستان بے خزاں" اسی ضمن میں آتا ہے۔

۳۔ انتخابی تذکرے — وہ تذکرے جن میں انتخاب کلام اور تدوین اشعار کو حالات کی تلاش و ترتیب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس

قسم کے تذکروں کی مثال میں حیدر بخش حیدری کے "گلشن ہند" بینی نرائن کے "دیوانِ جہاں" اور شاہ کمال کے "مجمع الانتخاب" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

جوابی اور انتخابی تذکروں کو دوسرے ضمنی گروہوں میں منقسم کرنے کی گنجائش نہیں البتہ تعارفی تذکرے اپنے حدودِ عمل کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ عام تذکرے — جن تذکروں میں بلا تخصیص تمام قابلِ ذکر اور معلوم الاحوال شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان تذکروں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) مرکزی تذکرے — وہ تذکرے جن کے مرتبین نے شعرا کے تعارف میں حتی الامکان ذاتی واقفیت اور تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے۔ مثلاً نخزن نکات، مسرت افزا، گلزار ابراہیم، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا اور شمیم سخن وغیرہ۔

(ب) متوسط تذکرے — وہ تذکرے جن میں ذاتی علم و آگاہی اور پیشرو تذکرہ نویسوں کی فراہم کردہ معلومات سے استفادے کا تناسب کم و بیش برابر ہے اور بالارادہ دیانت کے اُصول پامال نہیں کیے گئے ہیں۔ مثلاً "چمنستانِ شعرا"، تذکرہ میر حسن، تذکرہ بے جگر اور گلشن بے خار وغیرہ۔

(ج) ذیلی تذکرے — وہ تذکرے جن کے مولفین نے صرف دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات کی تلخیص اور ان کے پسند کئے ہوئے کلام کے انتخاب پر قناعت کی ہے اور اکثر اپنے ماخذ کا حوالہ

دینے سے اغماض کیا ہے مثلاً تذکرہ ریختہ گویان اور ریاض حسنی وغیرہ۔

۲۔ خاص تذکرے — وہ تذکرے جن میں تمام شعرا کے درمیان کسی مخصوص وحدت کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کے تذکرے زیادہ تر درج ذیل اقسام کے تحت آتے ہیں۔

(الف) مخصوص بالعہد تذکرے — وہ تذکرے جن کا دائرہ کار کسی خاص عہد تک محدود رہا ہے۔ مثلاً غلام محی الدین مبتلا کا تذکرہ "طبقات سخن" محمد شاہ کے عہد کے آغاز (۱۱۳۱ھ) سے اکبر شاہ ثانی کے پہلے سال جلوس (۲۲-۱۲۲۱) تک کے شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

(ب) مخصوص بالمقام تذکرے — وہ تذکرے جن میں کسی خاص علاقے یا شہر کے شعرا کو متعارف کرایا گیا ہے مثلاً "مخزن شعرا (تذکرہ شعرائے گجرات) مرتبہ فائق گجراتی - انتخاب یادگار (تذکرۂ شعرائے رام پور) مؤلفہ امیر مینائی اور محبوب الزمن (تذکرۂ شعرائے دکن) از مولوی عبدالجبار ملکاپوری۔

(ج) مخصوص بالمذہب تذکرے — وہ تذکرے جو کسی خاص مذہبی گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً "آثار الشعرائے ہنود" از منشی دیبی پرشاد بشاش (تذکرہ ہندو شعرا موسوم بہ بہار سخن از خیام سندر لال برق سیتاپوری۔

(د) مخصوص بالحیثیت تذکرے — وہ تذکرے جن میں کسی خاص ادبی یا سماجی حیثیت کے حامل شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً دستور الفصاحت از یکتا لکھنوی صرف قابلِ استناد شعرا کا تذکرہ ہے۔

(۵) مخصوص بالجنس تذکرے، وہ تذکرے جن میں جنسی تفریق کی بنا پر کسی ایک ہی طبع کے سخنوروں کو جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً "بہارستانِ ناز" مؤلفہ رنج میرٹھی اور "چمن انداز" مرتبہ درگا پرشاد نادر دہلوی صرف خواتین کے حالات و کلام پر مشتمل ہیں۔

(۶) مخصوص بالصنف تذکرے --- وہ تذکرے جن میں بطور خاص کسی ایک صنف یا موضوعِ سخن پر طبع آزمائی کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً عبدالغفور نساخ کا تذکرہ "قطعۂ منتخب" صرف قطعہ گو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ "دو سراپا سخن" مؤلفہ محسن لکھنوی میں صرف ان شعرا کا ذکر ہے جنہوں نے اپنی بعض غزلوں یا اشعار میں اعضائے جسمانی کے نام بطور ردیف استعمال کئے ہیں۔

ان سطور میں ہم نے تذکروں کی گروہی تقسیم کے لئے جو بنیادیں قائم کی ہیں ان کے دائرہ اطلاق سے شاید ہی کوئی تذکرہ خارج رہے تاہم ایسے کچھ تذکرے ضرور ملیں گے جنھیں ان کی متنوع خصوصیات کے پیش نظر قطعی طور پر کسی ایک گروہ کے تحت لانا ممکن نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر گردیزی کے بلند بانگ دعوے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ "تذکرہ ریختہ گویان" ایک جوابی تذکرہ ہے لیکن درحقیقت اس تذکرے میں جواب نویسی کی کوئی خصوصیت موجود نہیں اور زیادہ تر معلومات میر کے نکات الشعراء سے ماخوذ ہے۔ اس طرح شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں "اشعارِ دلآرا" کی گردآوری کو اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے اور صرف غزلوں کے اشعار انتخاب کئے ہیں مگر ان کی دست جولانگاہ عمل میں یہ خود کی

التزام تعارف نگاری کی گم دراہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں صحیح طریقۂ کار یہی ہو سکتا ہے کہ مولفین کے بیان کردہ اغراض و مقاصد اور غیر نمایاں اسباب تالیف کی بجائے اصل موضوعات اور نمایاں خصوصیتوں کو معیار تفریق بنایا جائے۔ یہاں ہم نے اس اصول کے پیش نظر "تذکرہ ریختہ گویان" کو قسم سوم کے اور "گلشن بے خار" کو قسم دوم کے عام تعارفی تذکروں میں شمار کیا ہے

عربی و فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت

تذکرہ نگاری کا آغاز

مشرق کے ادبی قلمرو میں تذکرہ نگاری کا ارتقائی سفر سرزمین عرب سے شروع ہوتا ہے۔ طلوع اسلام سے قبل یہ خطہ اگرچہ تہذیب و شائستگی اور علم و یقین کی دولت سے محروم تھا لیکن اس کے فرزندوں کی بے پناہ قدرتِ کلام اور اس میدان میں ان کے لازوال کارنامے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ شاعری اور خطابت کے اس عہد شباب میں تحریری صورت میں فنی شاہکاروں کے تحفظ کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ عرب اپنی غیر معمولی قوتِ حافظہ پر ایمانِ کامل کے نتیجے میں نہ صرف فنِ تحریر سے نا آشنا تھے بلکہ تخلیق و تحریر کی پیوند کاری کو باعثِ ننگ اور اس خداداد صلاحیت کی توہین تصور کرتے تھے۔ دورِ اموی کے مشہور محدث محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (متوفی ۱۲۴ھ مطابق ۷۴۲ء) کا یہ قول کہ ہم لوگ علم کو تحریر میں لانا پسند نہیں کرتے مگر امراء نے ہم کو مجبور کیا"[1] اسی تصور کی ہمہ گیری پر دلالت کرتا ہے۔ شعراء کے سرمایۂ افکار کی حفاظت و اشاعت کے لئے اسوقت یہ طریقہ کار رائج تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک راوی ہمہ وقت موجود رہتا جو اسکے کلام کو ازبر رکھنے اور عوام نیز دوسرے راویوں تک منتقل کرنے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اسی عالم میں نبی کریم حضرت محمد صلعم کی بعثت اور نزول قرآن کے واقعات رونما

---

[1] ادب العرب ص ۲۴۳

ہوئے وحیِ مرسل کے دلنشین طرزِ خطاب اور پُر اثر اسلوبِ بیان نے عربوں کی فصاحت و بلاغت کے چراغ گل کر دئے۔ فَاْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کی بلند بانگ تحدی[1] زباندانی و قادر الکلامی کے تمام دعووں پر پانی پھیر گئی اور شعر و شاعری کے بازار سرد ہو گئے۔ بدلے ہوئے ماحول کے تقاضوں اور نئی نئی ضروریات کے پیشِ نظر حلقہ بگوشانِ اسلام نے تحریر سے اجتناب کے روایتی تصور کو خیرباد کہا اور آیات و احادیث، احکامِ شرعی، خطوط و فرامین اور جنگی معاہدوں اور صلحناموں کی کتابت کے ساتھ خطابت کی جہانگیری کے پہلو بہ پہلو قلم کی فرمانروائی کا دور شروع ہوا۔ البتہ خلافتِ عباسیہ کے زمانۂ قیام (تاریخ آغاز ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۲ھ مطابق ۶ اگست ۷۵۰ء) تک مسلمان تسخیری مہمات اور خانہ جنگیوں میں مصروفیت کے باعث اپنے سرمایہ علم و فن کی تدوین پر حسبِ ضرورت توجہ صرف نہ کر سکے۔ اس میدان میں ان کے باقاعدہ ورود کی تاریخ عباسیوں کے دورِ حکومت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ مورخین نے اس خاندان کے طویل دورِ اقتدار کی پہلی صدی کو عربی ادب کے عہدِ زریں سے تعبیر کیا ہے[2]۔ اس صدی میں جہاں مختلف موضوعات پر نثر کی بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں وہیں ماضی کی ادبی یادگاروں کے تحفظ اور روزمرہ تحریر و تقریر میں الفاظ کے محلِ استعمال، معنی و مفہوم اور فصاحت و غرابت پر استناد کی خاطر سلطنت کے مختلف گوشوں میں بکھرے ہوئے راویوں کی مدد سے اسلاف کے شعری سرمائے کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ اسی مقصد کے تحت شعرا کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی تفصیلات جاننے

---

[1] سورہ البقرہ آیت نمبر ۲۳

[2] ...

اور دوسروں تک پہنچانے کی اہمیت محسوس کی گئی۔ جس کی بدولت تذکرہ نگاری کے لئے فضا ہموار ہوئی چنانچہ شعرائے عرب کا پہلا تذکرہ نگار ابو عبداللہ بن سلامؒ الجمحی اسی صدی سے تعلق رکھتا ہے۔

عربی میں تذکرہ نگاری کی روایت

محققین کے اتفاق رائے کے مطابق ابن سلامؒ (متوفی ۲۳۲ھ مطابق ۸۴۵ء) وہ پہلا صاحب قلم ہے جس نے عربی میں تذکرہ نگاری کا سنگ بنیاد رکھا[1] وہ بصرے کا رہنے والا تھا اور نقد شعر پر بڑی دسترس رکھتا تھا اس نے شعرائے جاہلیت و اسلام کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کر کے "طبقات الشعرا" کے نام سے ان کے حالات اور کلام کے نمونے کتابی صورت میں مرتب کئے۔ یہ تذکرہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں "طبقات الشعراء الجاہلیین" کے عنوان سے دس طبقات میں عہد جاہلیت کے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ دسویں طبقے کے اختتام پر چند مرثیہ گویوں کا ذکر ہے اس کے بعد مدینے، مکے، طائف اور بحرین کے شاعروں اور پھر مدینے کے یہودی شعراء کو علیحدہ متعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ "طبقات الشعراء الاسلامیین" بھی دس طبقات پر مشتمل ہے۔ ان میں اسلامی دور کے شاعروں کے حالات و اشعار منقول ہیں[2]۔

ابن سلام کے بعد تیسری صدی ہجری کے تذکرہ نگاروں میں محمد بن حبیب النحوی (متوفی ۲۴۵ھ مطابق ۸۵۹ء) ابو زید عمر بن شبہ البصری (متوفی ۲۶۲ھ مطابق ۸۷۶ء) ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ

---

[1] کشف الظنون جلد چہارم ص ۱۴۴ و فرہنگ نامہ پارسی جلد اول ص ۶۱۹

[2] بحوالہ "طبقات الشعراء" مرتبہ جوزف ہیل۔

مطابق ۸۸۹ء) ابو عبداللہ ہارون بن علی بن یحییٰ بن ابی منصور المنجم البغدادی (متوفی ۲۸۸ھ مطابق ۹۰۱ء) اور ابوالعباس عبداللہ ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ مطابق ۹۰۸ء) کے نام آتے ہیں۔ محمد بن حبیب النحوی اور ابوزید عمر بن شبہ البصری کے تذکروں کا ذکر کشف الظنون میں "طبقات الشراء" کے نام سے لکھی جانے والی کتابوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق مزید معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ ابن قتیبہ ابن سلام کے بعد اس دور کا سب سے مشہور اور ممتاز تذکرہ نگار ہے۔ اس کا خاندان مرو (ایران) کا رہنے والا تھا لیکن وہ ۲۱۳ ہجری (۸۲۸ء) میں کوفے میں پیدا ہوا اور غالباً وہیں وفات پائی۔ کچھ عرصے تک وہ دینور میں عہدہ قضا پر بھی مامور رہا تھا، جس کی نسبت سے اسے بالعموم "دینوری" کہا جاتا ہے۔ مورخین ابن قتیبہ کو ادبی تنقید، لغت اور نحو کا بلند پایہ عالم اور مفکر قرار دیتے ہیں۔ تنقید ادب سے متعلق اس کی تصانیف میں "ادب الکاتب" اور "الشعر والشراء" کو غیر معمولی شہرت و اہمیت حاصل ہے۔ ادب الکاتب میں نثر نگاری اور اس کے اصول و آداب سے بحث کی گئی ہے اور "الشعر والشرا" میں شعرا کے حالات و اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ ابتدائے تیسری صدی ہجری کے اوائل تک کے شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اسے "الشعر والشرا" کے علاوہ "طبقات الشعراء" "کتاب الشرا" "دیوان الشعر والشعراء" اور "اخبار الشرا" کے ناموں سے بھی موسوم کیا ہے۔[۲] دیباچے کے ذیل میں ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ

---

[۱] کشف الظنون جلد چہارم ص ۱۴۲

[۲] اورنٹیل کالج میگزین لاہور شمارہ فروری ۱۹۳۲ء مضمون بعنوان "ابن قتیبہ"

"شاید تمھارا یہ خیال ہو کہ ہماری اس کتاب میں تمام شعرائے عرب کا تذکرہ درج ہوگا اور یہ کہ شعرا کا گروہ" بھی "شل راویان حدیث وناقلان اخبار و آثار یا علماء و امراء و ملوک و سلاطین کی طرح محدود و متناہی ہوگا اور ان کے حالات تمام و کمال قلمبند ہو سکتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ خیال محال ہے۔ شعرائے عرب کا احاطہ بشر کی قدرت سے خارج ہے۔ اگر کوئی طویل العمر شخص اپنی تمام عمر اس کوشش میں صرف کر دے تو بھی صرف ایک قبیلے کے شعرا کا استقصا نہیں کر سکتا نہ ان کا کلام جمع کر سکتا ہے[۱]۔

انھیں مجبوریوں کے پیش نظر اس نے یہ وضاحت کی ہے کہ

"میرا مقصد زیادہ تر ان شعرا کے تذکرے سے ہے جنھیں بڑے بڑے ادیب جانتے اور مانتے ہیں اور جن کے اشعار سے نوادر و غرائب، نحو، قرآن مجید حدیث نبوی وغیرہ کے حل کرنے کے لئے استشہاد کیا جاتا ہے۔ ایسے شخصوں کا ذکر بہت کم کیا ہے جن کے اسماء حالات وغیرہ کچھ بھی معلوم نہ ہوں۔ ساتھ ہی ان کے اشعار کم پایہ بھی ہوں اور سوائے خاص خاص آدمیوں کے انھیں کوئی نہ جانتا ہو۔ میں نے اس کتاب میں ایسے لوگوں کا ذکر نہیں کیا جن پر شعر کے مادر اکوئی اور شئے غالب تھی کیونکہ ہم نے اس فن کے بعض مولفین کو دیکھا ہے کہ وہ شعرا کے تذکروں میں ایسے لوگوں کا ذکر کر دیتے ہیں جن کو اشعار کی بنا پر کوئی جانتا بھی نہیں، اور جنھوں نے شاذ و نادر ہی کوئی شعر کہا ہوتا ہے۔"

میں نے متقدمین کو ان کے پہلے ہونے کی وجہ سے بزرگی کی نگاہ

---

[۱] شعر العرب (قلمی) کے حوالے سے

سے نہیں دیکھا اور نہ ہی متاخرین کو ان کے بعد میں ہونے کے سبب بنظر استحقار دیکھا ہے۔ بلکہ فریقین پر عدل و انصاف کی نگاہ ڈالی ہے اور ہر ایک کو اس کا حق دیا اور اس کا پورا پورا اعتراف کیا ہے[۱]"

یہ بیانات تذکرہ نگاری کے راستے کی دشواریوں اور اس فن کے متعلق ابن قتیبہ کے تصورات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ استناد و استشہاد کی ضرورت عربی تذکروں کی ترتیب کے بنیادی محرکات میں شامل ہے۔

ابن المنجم کو فن تذکرہ سے متعلق ایک ضخیم کتاب کا مؤلف کہا جاتا ہے۔ اس نے "کتاب البارع فی اخبار الشعراء المولدین" کے نام سے اس کتاب کی ایک تلخیص بھی مرتب کی تھی۔ یہ دونوں کتابیں اب نایاب ہیں۔ ابن خلکان نے اپنی تصنیف "وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان" میں "کتاب البارع سے استفادے کا اعتراف کیا ہے[۲] ابن الندیم مرتب "الفہرست" کی نظر سے بھی یہ کتاب گزری تھی[۳]۔ تذکرہ نگاروں میں ابو المنصور الثعلبی اس کتاب سے اثر پذیری اور اس کے نتیجے میں تذکرہ نویسی کی طرف میلان کا اقرار کرتا ہے[۴]۔ ابن خلکان نے اسے "کتب نفیسہ میں شمار کرتے ہوئے بعد کے کتنے ہی تذکروں کو اس کی فرعات

---

[۱] بحوالہ اورینٹل کالج میگزین لاہور شمارہ فروری ۱۹۳۲ء

[۲] وفیات الاعیان جلد دوم ص ۱۹۴

[۳] الفہرست ص ۲۰۶

[۴] یتیمۃ الدہر جلد اول ص ۶ و ۱۷

قرار دیا ہے[1] اس طرح اس تذکرے کے بارے میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے دور کی تالیفات میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔

ابن المعتز خاندانِ عباسیہ کا چشم و چراغ تھا وہ ۲۴۹ ہجری میں پیدا ہوا اور ۲۹۶ھ (۹۰۸ء) میں خلیفۃ المقتدر کے خلاف ایک سازش کے تحت مسند خلافت پر متمکن ہونے کے چوبیس گھنٹے کے بعد ہی قتل کر دیا گیا۔ مورخین نے اسے شعر و ادب اور موسیقی و سپہگری کے فنون میں یگانۂ روزگار قرار دیا ہے۔ اس کے اشعار حسن کی عظمت کے اشاروں سے معمور اور رومانی طرزِ فکر کے آئینہ دار ہیں۔ شاعری کے موضوع پر اس کی نثری تصانیف میں "البدیع"، "اشعار الملوک" "الزہر الریاض" اور طبقات الشعراء المحدثین کا پایہ کافی بلند ہے طبقات الشعراء میں ایک سو ستائیس شعرائے متاخرین کے حالات و اشعار شامل ہیں ابن سلام اور ابن قتیبہ کی طرح ابن المعتز نے بھی اس کتاب میں معیارِ کلام اور زمانے کے اعتبار سے شاعروں کی درجہ بندی کی ہے۔ بعد کے اکثر تذکرہ نگار اس کتاب سے مستفید ہوئے ہیں۔

تذکرہ نگاری کے میدان میں اگلا قابلِ رشک قدم ابوالفرج الاصفہانی (متوفی ۳۵۶ھ مطابق ۹۶۷ء) نے اٹھایا۔ وہ ۲۸۴ھ (۸۹۷ء) کے قریب اصفہان میں پیدا ہوا اور بغداد میں تعلیم و تربیت پائی۔ "کتاب الاغانی" اس کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس میں صدہا شاعروں، نغمہ نگاروں، ادیبوں، راویوں اور ان کے سرپرست خلفاء و اعیان سلطنت کے تذکرے شامل ہیں۔ موضوع کی اس وسعت کی بنا پر ہم اسے خالصتہً تذکرۂ شعرا نہیں کہہ سکتے لیکن چونکہ اس کا بڑا حصہ شاعروں کے حالاتِ زندگی اور ان کی تخلیقات کی

---

[1] وفیات الاعیان جلد دوم ص ۱۹۳

تحقیق و ترتیب سے متعلق ہے اس لئے اسے شعرا کے تذکروں کی فہرست سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب اکیس جلدوں پر مشتمل ہے اور پچاس سال کی مسلسل محنت و کوشش کے بعد تیار ہوئی ہے۔ ابوالفرج نے اس ادبی انسائیکلوپیڈیا میں ان نغموں کی تدوین پر خاص توجہ صرف کی ہے جو مغنیوں نے خلفاء اور بالخصوص ہارون الرشید (متوفی ۱۹۳ھ) کی تفریح طبع کے لئے انتخاب کئے تھے۔ ساتھ ہی وہ قدیم و جدید غنائیے بھی یکجا کر دئے ہیں جن کی تدوین اس کے امکان سے باہر نہ تھی۔ ہر نغمے کو اس نے بیک وقت اس کے تخلیق کار اور لحن ساز دونوں سے منسوب کیا ہے اس کے بعد ان کے سوانح حیات سپرد قلم کئے ہیں اور عہد جاہلیت و اسلام کی ان حربیہ اور نشاطیہ مجلسوں کی بھی منظر کشی کی ہے۔ جن کے زیر اثر ان نغمات کی تخلیق و تکمیل عمل میں آئی تھی۔[1] مشہور مورخ ابن خلدون نے اس کتاب کو "عربوں کے رجسٹر" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے نزدیک "کتاب الاغانی طلباء ادب کے لئے عربوں کے فنون لطیفہ اور علم تاریخ کے متعلق معلومات کا آخری منبع ہے۔ اس کے بعد انھیں کسی دوسرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔"[2]

صاحب بن عباد (متوفی ۳۸۵ھ) کا یہ قول بھی اس کتاب کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے کہ "مجھے سفر کے دوران بیسیوں اونٹوں پر کتابیں لدوا کر ساتھ رکھنا پڑتی تھیں۔ "کتاب الاغانی" کے بعد میں ان سب سے بے نیاز ہو گیا۔"[3] ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے بقول اصفہانی اپنے اس کارنامے کی بدولت ان لوگوں کی صف میں

---

[1] النجد فی الادب والعلوم ص ۲۶ و کتاب الاغانی جلد اول (مقدمہ مرتب) ص ۲

[2] بحوالہ "عربی ادب" ص ۲۶

[3] بحوالہ تاریخ ادبیات عرب، ص ۷۰ و کتاب الاغانی جلد اول (ترجمہ مولف) ص ۱

شامل ہو گیا ہے۔ جو اسلامی تمدن کی تاریخ میں لازوال اہمیت رکھتے ہیں۔[1]

اصفہانی کے انتقال سے چند سال قبل چوتھی صدی ہجری کے عین وسط میں ایک اور مشہور تذکرہ نگار ابو المنصور عبد الملک بن محمد اسماعیل الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ مطابق ۱۰۳۷ء) پیدا ہوا۔ وہ نیشاپور سے وطنی تعلق رکھتا تھا۔ اور لومڑیوں (ثعالب) کی کھال کی تجارت کرنے کی وجہ سے ثعالبی کے لقب سے مشہور ہے۔ تنقید، تاریخ ادب، انتخابِ اشعار اور موازنہ کلام پر غیر معمولی دسترس کے باعث اسے اپنے دور کے عظیم اور بہترین ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے کئی درجن تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت "یتیمۃ الدہر فی محاسن اہل العصر" کے حصے میں آئی ہے۔ یہ کتاب جس میں ثعالبی نے اپنے عہد کے تقریباً چار سو شاعروں کے حالات و اشعار قلمبند کیے ہیں۔ چار جلدوں میں منقسم ہے اور ابن المنجم کی کتاب البارع اور ابن المعتز کے طبقات الشعراء المحدثین سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔[2] اس کا نقشِ اول ۳۸۴ھ میں تیار ہوا تھا جو نسبتاً بہت مختصر تھا۔ اس کے بعد متواتر تلاش و جستجو کے نتیجے میں جب ثعالبی کو مختلف راویوں کے ذریعے اس سلسلے کا کافی مواد دستیاب ہو گیا تو اس نے از سرِ نو مرتب کیا۔[3] ثعالبی کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کی طرح اس کی سعیِ جمیل کو بھی تواریخ شعرا، تدوینِ کلام اور نقد شعر کی تاریخ میں ایک نمایاں اور بلند مقام حاصل ہے۔ عربی ادب کے علاوہ فارسی ادب کی تاریخ میں بھی اسے کافی اہم

---

[1] تاریخ ادبیات در ایران جلد دوم ص ۶۴۲

[2] یتیمۃ الدہر جلد اول ص ۱۶ و ۱۷

[3] یتیمۃ الدہر جلد اول ص ۱۷

خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے اوراق چوتھی صدی ہجری میں ایران کی ادبی فضا کے بارے میں مکمل معلومات کے حامل ہیں[1]۔ کتاب کی ترتیب جدید کے بعد ثعالبی نے "تتمۃ الیتیمۃ" کے نام سے اس کا ایک تتمہ بھی مرتب کیا تھا۔
"یتیمۃ الدہر" سے اگلے زمانے کے تقریباً تمام ہی تذکرہ نگار متاثر ہوئے چنانچہ اس کے طرز پر کتنی ہی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں زمانہ ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے علی ابن الحسن الباخرزی (متوفی ۴۶۷ھ مطابق ۱۰۷۴) کی "دمیۃ القصر و عصرۃ اہل العصر" سرفہرست ہے۔ اس کتاب کے مطبوعہ نسخے میں جو راغب الطباخ کے ۱۹۳۰ء میں حلب سے شائع کیا ہے، ۲۹۲ شاعروں کے حالات و اشعار درج ہیں۔ لیکن اس کے بعد جو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ۵۳۷ شعرا کے تراجم ملتے ہیں[2]۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں مختلف علاقوں کے شعرا کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ آخری باب ان ارباب سخن سے متعلق ہے جو بنیادی طور پر شاعر نہ تھے۔ "دمیۃ القصر" کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ "یتیمۃ الدہر" کا تکملہ ہے یعنی اس میں خصوصیت کے ساتھ ان شاعروں کے حالات و کلام سے بحث کی گئی ہے جو "یتیمۃ الدہر" میں شمولیت سے محروم رہ گئے تھے۔
چھٹی صدی ہجری میں "جنان الجنان و ریاض الاذہان" کے نام سے "دمیۃ القصر" کا ایک تتمہ منظر عام پر آیا جو قاضی رشید احمد بن علی بن الزبیر الاسوانی المصری (مقتول ۵۶۲ھ مطابق ۱۱۶۷ء) کی تالیف تھا لیکن اب تک اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کتاب

---

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد چہارم ص ۴۴۶

[2] بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین آرزو

ابوالحسن علی بن زید البیہقی (متوفی ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۷۰ء) کی "وشاح الدمیہ" ہے۔ اس کتاب کا ایک تتمہ "درۃ الوشاح" خود اسی کے مولف نے مرتب کیا تھا۔ یہ دونوں کتابیں بھی نایاب ہیں۔ البتہ "وشاح" کا ایک ٹکڑا جو ساتویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، ترکیہ میں دستیاب ہوا ہے۔ یاقوت الحموی الرومی، (متوفی ۶۲۶ھ مطابق ۱۲۲۹ء) نے اپنی کتاب "ارشاد الادیب الی معرفۃ الادیب" معروف بہ "معجم الادبا" میں اس کی عبارتیں جابجا نقل کی ہیں[1]۔

قاضی رشید اور البیہقی کے علاوہ ثعالبی سے براہِ راست یا باخرزی کے واسطے سے اثر قبول کرنے والوں میں شمس الدین محمود اندخودی (متوفی ۵۷۷ مطابق ۱۱۸۲ء) ابوالمعالی سعد بن علی الحظیری (متوفی ۵۶۸ھ مطابق ۱۱۷۳ء) اور مشہور مورخ عماد الدین کاتب الاصفہانی (متوفی ۵۹۷ھ مطابق ۱۲۰۱ء) کے نام لئے جاتے ہیں۔ محمود اندخودی کا تذکرہ "زینۃ الزماں" کے نام سے موسوم تھا۔ عوفی نے لباب الالباب کے دیباچے میں اس کا حوالہ دیا ہے[2]۔ پروفیسر براؤن "یتیمۃ الدہر" کے تتموں کے ذیل میں اس کا ذکر کرتے ہیں[3] لیکن اس کے کسی نسخے کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔

ابی المعالی سعد بن علی الحظیری جو کتب فروشی کا پیشہ اختیار کرنے کے باعث تاریخ ادب میں بالعموم "دلال الکتب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ "زینۃ الدہر فی لطائف شعراء العصر" کا مؤلف ہے۔ حاجی خلیفہ اور ابن خلکان نے اس کتاب کو "دمیۃ القصر" کا تتمہ قرار دیا ہے[4]۔ یہ کتاب بھی کتب نایاب میں سے ہے۔

---

[1] بحوالہ مکتوب ڈاکٹر مختار الدین آرزو [2] لباب الالباب، مرتبہ سعید نفیسی ص ۱۰۹

[3] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد چہارم ص ۴۴۴

[4] کشف الظنون جلد چہارم ص ۱۴۵ "وفیات الاعیان" جلد دوئم ص ۷۰

اور دوسرے ذرائع سے بھی اس کے متعلق مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

عماد الدین الکاتب ۱۱۲۵ء (۵۱۹ھ) میں اصفہان میں پیدا ہوا لیکن اس نے تعلیم و تربیت بغداد میں حاصل کی اور عمر کا بیشتر حصہ دمشق میں گزارا۔ وہیں ۱۲۰۱ء (۵۹۷ھ) میں اس کی وفات ہوئی۔[1] "یتیمۃ الدہر" کے مرتب محی الدین عبد الحمید نے اس کی تالیف "خریدۃ القصر و جریدۃ اہل العصر" کو "یتیمۃ الدہر" کے تکملوں میں "دمیۃ القصر" کے بعد دوسرا نمبر دیا ہے۔[2] ابن خلکان کے بیان کے مطابق یہ کتاب دس جلدوں میں منقسم ہے اور ۵۹۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے نیز اس میں ان شاعروں کا ذکر ہے، جو سنہ ہجری کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔[3] عماد نے خود ہی "کتاب السیل" کے نام سے تین جلدوں میں اس کا تتمہ بھی لکھا تھا جو ضائع ہو چکا ہے۔[4] اصل کتاب کی دو جلدیں جو شعرائے مصر سے متعلق ہیں، قاہرہ سے استاد احمد امین نے شائع کر دی ہیں۔[5] تین جلدیں جن میں شعرائے شام کا ذکر ہے دمشق سے اور دو جلدیں جو شعرائے عراق کے تعارف پر مشتمل ہیں بغداد سے شائع ہوئی ہیں باقی جلدوں کی طباعت کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔[6]

یہاں ہم نے جن تذکرہ نگاروں کا ذکر کیا ہے وہ ان لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت کے حامل ہیں جن کی بدولت عربی میں

---

1. المنجد فی الادب والعلوم ص ۳۵۷
2. یتیمۃ الدہر جلد اول مقدمہ مرتب ص ۱۲
3. بحوالہ وفیات الاعیان جلد دوم ص ۵۷
4. یتیمۃ الدہر جلد اول مقدمہ مرتب حاشیہ ص ۱۳
5. بحوالہ مکتوب ڈاکٹر محی الدین آزاد۔

تذکرہ نگاری کے فن کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں سے باستثنائے چند تقریباً تمام ہی تذکرہ نگار عجمی النسل ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایران کے ادب شناسوں نے اپنے ملک کی ادبی تاریخ اور علمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے تذکروں میں بھی فارسی نژاد شاعروں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے[1]۔ یہ صورت حال اس حقیقت کا پتہ دیتی ہے کہ اہل ایران مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد نہایت سرگرمی کے ساتھ زبان و ادب اور علوم و فنون کے میدان میں عربوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے اور ایران و عرب کی ادبیات میں ایک ناقابلِ تنسیخ رشتہ و ربط قائم ہوگیا تھا۔ ابتدائی چند صدیوں کے یہی ادبی و ثقافتی روابط فارسی میں تذکرہ نگاری کے آغاز کا سبب بنے اور ایران کے تذکرہ نویسوں نے سب سے زیادہ انھیں تذکرہ نگاروں کا اثر قبول کیا۔ اس بحث کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے ہم فارسی میں تذکروں کی ترتیب و تدوین کے جائزے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

فارسی میں تذکرہ نگاری کی ابتدا

ارباب تحقیق نے سدید الدین محمد بن عوفی کے "لباب الالباب" کو بالاتفاق شعرائے فارسی کا پہلا موجودہ تذکرہ تسلیم کیا ہے اس تذکرے کی ترتیب ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) کے قریب عمل میں آئی ہے۔ اس سے قبل اگرچہ عجمی ادیب ایسی کئی کتابیں تصنیف کر چکے تھے جن سے قدیم شاعروں کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران جلد اول ص ۱۴۱، ۶۴۲ و جلد دوم میں ۱۰۲۸ و تاریخ ادبیات ایران برائے دبیرستانہا ص ۲۲، ۴۴ و ۱۰۱

کے متعلق حصولِ معلومات میں مدد ملتی ہے لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی تذکرے کی تعریف میں نہیں آتی۔ ابوبکر نجم الدین محمد بن علی الراوندی مولف "راحت الصدور و آیۃ السرور" (مرتبہ قریب ۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء) کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں طغرل بن ارسلان کی خواہش پر ایک مصور مجموعہ اشعار کی ترتیب کا کام شروع ہوا تھا جس کے لئے پہلے ہر شاعر کی تصویر تیار کی جاتی تھی اس کے بعد اس کی پشت پر اس کے منتخب اشعار اور کچھ لطیفے درج کئے جاتے تھے[1] اس مجموعے میں بھی اگر شعرا کے حالات کے سلسلے میں کچھ لکھ دیا گیا ہوگا تو وہ ایک ایک دو دو جملوں سے زیادہ نہ ہوگا۔ راوندی نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق اس کی حیثیت ایک مصور بیاض سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے علاوہ اس کی تکمیل اور وجود کے بارے میں بھی اہل تحقیق بالکل لاعلم ہیں۔ خود "راحت الصدور" میں بھی شاعرانِ مداح آل سلجوق اور ان کے حوالے بکثرت موجود ہیں لیکن یہ کتاب در اصل سلجوقی خاندان کی تاریخ ہے اور اس کے صفحات میں شعرا سے متعلق معلومات کی موجودگی محض ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کو بھی تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ان موجود و غیر موجود تصانیف کے ساتھ اس ضمن میں ابوطاہر خاتونی (متوفی اوائل قرن ششم) کی تصنیف "مناقب الشعراء" کا نام بھی لیا جاتا ہے[2] جس کا ذکر دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے اور جس پر بظاہر تذکرہ شعرا کا گمان ہوتا ہے لیکن یہ کتاب بھی

---

[1] راحۃ الصدور مطبوعہ تہران ص ۵۷

[2] مقدمہ "لباب الالباب" جلد دوم (مرتبہ براؤن) مطبوعہ لیڈن ص د

بالیقیں اس موضوع سے متعلق نہ تھی کیونکہ سمرقندی بذاتِ خود تذکرہ نگاری میں اولیت کا مدعی ہے اور اس صنفِ ادب سے فارسی کے ادیبوں کی بے اعتنائی کا شکوہ کرتا ہے۔[1] اگر یہ کتاب واقعی تذکرہ ہوتی تو وہ اس قسم کا دعوی ہرگز نہ کرتا۔ اس کے علاوہ خاتونی کے تمام ہم عصر و رخ جنھوں نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کتاب کے وجود سے قطعاً بے خبر ہیں۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے نزدیک یہ بے خبری اس امر کی دلیل ہے کہ دولت شاہ سے اس کتاب کو خاتونی سے منسوب کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔[2] غرض کہ ان حقائق کی روشنی میں تذکرہ نگار کی حیثیت سے عوفی کی اولیت میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔

تذکرہ نگاری سے عربی کے ادیبوں کے شغف اور فارسی ادب کی تہی دامنی کا ذکر کرتے ہوئے عوفی لکھتا ہے کہ:

"شک نیست کہ دریں شیوہ در طبقاتِ شعرائے عرب چند تالیف ساختہ اند و چند تصنیف پرداختہ چوں طبقات ابن سلام و طبقات ابن قتیبہ و طبقات ابن المعتز و "دمیتۃ القصر" کہ ابو منصور ثعالبی ساختہ و "دمیتۃ القصر" کہ تاج الرؤسا علی بن الحسین الباخرزی پرداخت و "زینت الزمان" کہ شمس الدین محمود اندخودی تالیف کردہ و لیکن در طبقات شعرائے عجم ہیچ تالیف شاہدہ نیفتادہ است و ہیچ مجموعہ در نظر نیامدہ"[3]

اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عوفی کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور

---

[1] تذکرۃ الشعراء مطبوعہ لیڈن ص ۱۲

[2] مقدمہ "لباب الالباب" جلد اول (مطبوعہ لیڈن)

[3] لباب الالباب نسخہ نفیسی ص ۱۰۹

شعرائے عربی کے جس قدر تذکرے اس وقت تک لکھے جاچکے تھے ان میں سے اکثر اس کی نظر سے گزر چکے تھے لہذا فارسی میں اس صنف کے کسی نمونے کی غیر موجودگی کے متعلق اس کی معلومات پر عدم اعتماد کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

عوفی کے حالات زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں حتیٰ کہ ابھی تک اس کی ولادت و وفات کے سنین اور مولد و مدفن کا بھی تعین نہیں کیا جاسکا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ چھٹی صدی ہجری کے ربع آخر میں اپنے آبائی وطن بخارا میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل طے کئے۔ بعد ازاں علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادے اور تکمیل علم کی خاطر ایران اور اطراف و جوانب کے علمی مراکز کی سیر کرتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ سوءِ اتفاق سے اس ورود کا سنہ بھی متعین نہیں۔ لیکن اس کے بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰-۱۱ء) کے بعد تک وہ بلاد خراسان میں مقیم تھا اور ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں چنگیز خاں کے ہاتھوں ماوراء النہر اور خراسان کی تباہی سے قبل اسے سندھ کے گورنر ناصر الدین قباچہ (مقتول ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء) کے دربار میں رسائی حاصل ہو چکی تھی۔ اس طرح ہندوستان میں اس کی آمد ۶۰۷ اور ۶۱۷ھ کے درمیانی عرصہ کا واقعہ قرار پاتی ہے۔

۶۲۵ھ (اپریل ۱۲۲۸ء) میں جب سلطان شمس الدین نے سندھ پر لشکر کشی کی تو وہ اپنے مربی قباچہ کے ساتھ صوبے کے دار السلطنت اچھ (مضافات بھاولپور) سے دور قلعہ بھکر میں حصار بند تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں قباچہ کو حکومت اور زندگی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے اور اس کے وزیر عین الملک اشعری اور مشہور مورخ منہاج سراج کے ساتھ عوفی نے

بھی التمش کی ملازمت قبول کر لی۔ اس کے بعد ۶۲۸ھ ۱۲۳۱ء تک دہلی میں اس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے اور ایک شعر سے جس میں اس نے عباسی خلیفہ المستنصر باللہ کی وفات اور عبداللہ المستعصم کی جانشینی کا ذکر کیا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ۶۴۰ھ ۱۲۴۲ء میں ان واقعات کے رونما ہونے تک وہ بقید حیات تھا۔[1]

لباب الالباب میں عوفی نے کسی جگہ اس کے زمانہ ترتیب کی صراحت نہیں کی ہے لیکن بہاء الدولہ والدین علی بن احمد جاجی کے حالات میں دو جگہ ۶۱۷ھ کے حوالے دئیے ہیں[2] اور امیر ناصر الدین عثمانی کے ذکر میں اس کے بھائی ملک یمین الدین بہرام شاہ کو جس نے ۶۱۲ھ ۱۲۱۵ء سے ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء تک حکومت کی ہے[3] سجستان کے تخت سلطنت پر متمکن ظاہر کیا ہے۔[4] اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ۶۱۷ھ ۱۲۲۰ء کے بعد اور ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں بہرام شاہ کی وفات سے قبل مکمل ہوا ہے۔ تکمیل کے بعد عوفی نے تذکرے کو عین الملک اشعری کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا اس وقت عین الملک اور عوفی دونوں اچھ میں مقیم تھے۔ بہ الفاظ دیگر یہ تذکرہ مولف کی قباچہ کے دربار سے وابستگی اور سندھ میں قیام کے زمانے کی یادگار ہے۔

"لباب الالباب" تین سو شاعروں کے ذکر پر مشتمل اور دو جلدوں میں

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ "لباب الالباب" از علامہ قزوینی۔ مقدمہ "جوامع الحکایات" از اختر شیرانی۔ "سبک شناسی" جلد سویم ص ۳۶ تا ۳۸ و تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۵۹ تا ۶۹

[2] لباب الالباب مرتبہ سعید نفیسی ص ۱۰۴

[3] لباب الالباب (تعلیقات علامہ قزوینی) مرتبہ سعید نفیسی ص ۵۶۲

[4] لباب الالباب مرتبہ سعید نفیسی ص ۵۰

منقسم ہے دونوں جلدوں میں بارہ ابواب ہیں جن میں سے شروع کے چار ابواب فن شعر کے بارے میں علمی و تاریخی مباحث سے متعلق ہیں۔ بعد کے ابواب میں شعرا کو ان کی سماجی حیثیت شعر و شاعری سے شغف کی نوعیت اور زمانی و مکانی اختلاف کی بنیادوں پر مختلف عنوانات اور فصلوں کے تحت علیحدہ علیحدہ جگہ دی گئی ہے۔

عوفی کے آثار ادبیہ میں قاضی ابوالحسن بن علی التنوخی (متوفی ۳۸۴ھ) کی تصنیف "الفرج بعد الشدہ" کے فارسی ترجمے اور "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" کو بھی ان کی قدامت اور لسانی و بیانی لطافتوں کی وجہ سے کافی اہم خیال کیا جاتا ہے لیکن فارسی ادب کی تاریخ میں اس کا وقار دراصل "لباب الالباب" ہی کی بدولت قائم ہے۔ یہ تذکرہ بہت سی خامیوں کے باوجود فارسی میں تذکرہ نویسی کی روایت کا سنگِ بنیاد ہے اور اس راہ کے اکثر جادہ نوردوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس سے استفادہ کیا ہے۔ آقائے مظاہر مصفا کے بقول

"ایں کتاب (لباب الالباب) ترجمہ تمام شاعران پس از اسلام تا زمان مولف در بر دارد و از دیرباز مآخذ و سندِ معتبر تذکرہ نویسان و سخن سنجان و نویسندگانِ تاریخ ادبی ایران بودہ است۔ من توان گفت کہ تمام تذکرہ نویسانِ مستقیم و غیرہ مستقیم ازیں کتاب استفادہ کردہ اند و مورد توجہ محققان سدۂ اخیر نیز قرار گرفتہ"[1]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی عوفی کا ذکر کرتے ہوئے یہی بات لکھی ہے کہ "جمیع تذکرہ نویسان متاخر در تحریر احوال شعرائے اقدم القدما عیال اویند"[2]

---

[1] مقدمہ۔ مجمع الفصحا (رضا قلی ہدایت) ص۔ ج۔ح۔ [2] خزانۂ عامرہ۔ ص ۶

"لباب الالباب" کی ترتیب کے تقریباً پونے تین سو سال بعد تک فارسی کے وسیع دائرہ اثر میں تذکرہ نگاری کے افق پر کوئی نیا ستارہ طلوع نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو اس کی روشنی تاریخ کے ظلمت کدے سے باہر نہ آسکی اس لئے مؤرخین دولت شاہ سمرقندی کے "تذکرۃ الشعرا" کو جو ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) کے قریب مکمل ہوا ہے اس سلسلے کی دوسری کڑی قرار دیتے ہیں۔ دولت شاہ "لباب الالباب" کے وجود سے باخبر نہ تھا۔[۱] چنانچہ عوفی کی طرح اس نے بھی شعرائے فارسی کے احوال و آثار کی ترتیب سے علمائے ادب کی بے اعتنائی کا شکوہ کرتے ہوئے اس میدان میں اپنی اولیت کا دعویٰ کیا ہے۔[۲] یہ تذکرہ دیباچے اور خاتمے کے علاوہ سات طبقات پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں تذکرے کے اسباب تالیف اور فن شاعری سے متعلق کچھ مسائل پر گفتگو کے بعد بطور مقدمہ عربی کے دس شاعروں کے حالات دیے گئے ہیں اس کے بعد ہر طبقے کے ذیل میں کم و بیش بیس بیس شاعروں اور ان کے سرپرست امرا و سلاطین کا ذکر ہے۔ خاتمے کے تحت مولف نے اپنے زمانے کے چھ "اکابر و افاضل" کو متعارف کرایا ہے۔ اس طرح شرکائے تذکرہ کی مجموعی تعداد ایک سو اکیاون (۱۵۱) ہو جاتی ہے۔ تذکرے کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

"دولت شاہ — شاعر کی شخصیت اور اس کے فن کا جائزہ کچھ اس طرح پر لیتا ہے گویا اس کے نزدیک فن اور سیرت کے درمیان ایک قسم

---

[۱] اس بے خبری کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہو کہ شاید اس وقت تک لباب الالباب کی شہرت ہندوستان سے باہر نہ پہنچی ہو کیونکہ اب تک اس تذکرے کے جتنے بھی نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب کسی نہ کسی طرح ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

[۲] تذکرۃ الشعرا، مطبع بریل لیڈن ص ۱۲

کا... گہرا رابطہ ہے۔ شعرا کے حالات بیان کرتے وقت وہ زندگی
کے واقعات اور سنین اور تاریخوں کا ذکر زیادہ نہیں کرتا۔ اس
تفصیل کی بجائے وہ ہر شخص کی سیرت کے داخلی پہلوؤں کو نمایاں
کرتا ہے ...... اس کی عام وضع زندگی، اس کی ذہنیت، علمی
استعداد اور دوسرے نمایاں رجحانات کا تذکرہ کرتا ہے۔ چنانچہ
اس کے بیانات کو پڑھ کر تمام بڑے بڑے شعرا کی شخصیت اور زندگی
کا رنگ الگ الگ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ہم ہر شخص
کے ذہن اور زندگی اس کی انفرادی خصوصیات کے ساتھ جاننے
کے قابل ہو جاتے ہیں۔"[1]

پروفیسر براؤن کی رائے اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ انکے نزدیک
"یہ (تذکرہ) ایک دلچسپ مگر ساقط الصحت تالیف ہے جس
میں اشعار کے بہترین انتخاب کے ساتھ ایسی بے شمار تاریخی غلطیاں
یکجا ہو گئی ہیں جنھوں نے بعض معاملات میں ریو (RIEU) جیسے
لائق اور محتاط مصنفین کو بھی گمراہی کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔"[2]

عوفی کی موجودگی میں دولت شاہ کو تذکرہ نگاری کا میر کارواں تو نہیں کہا
جا سکتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت کو
"تذکرۃ الشعراء" کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی استحکام حاصل ہوا۔ چنانچہ
۱۱۶۵ھ میں شعرائے اردو کے پہلے تذکرے کی ترتیب سے قبل تک تقریباً
پونے تین سو سال کی درمیانی مدت میں شعرائے فارسی کے تقریباً چالیس

---

[1] مباحث۔ ص ۲۶۴

[2] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوئم ص ۴۳۰

تذکرے معرضِ وجود میں آچکے تھے۔ ان میں غالب تعداد ان تذکروں کی ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے۔ اس لئے جہاں برصغیر ہندوپاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ فارسی زبان کے شاعروں کا پہلا تذکرہ اس سرزمین پر مرتب ہوا وہیں یہ امتیاز بھی اس کے حصے میں آیا ہے کہ تذکرہ نویسی کی ترقی میں یہاں کے اہلِ قلم کی کوششیں ہر دور میں ایرانی ادیبوں کی کاوشوں سے افضل رہی ہیں۔ ایران کے باشعور اور وسیع النظر دانشوروں نے خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ لغت نویسی کی طرح اس فن میں بھی ان کی زبان اور اہلِ وطن ہندوستانیوں کے احسانات سے گرانبار ہیں۔ دانش کدۂ ادبیات تہران کے اُستاد اور ایران کے سابق وزیر برائے ثقافتی امور ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"نویسندگان فارسی زبان ہند و پاکستان در دو زمینہ بر ادبیان ایران برتری یافتہ اند، یکے در تدوینِ فرہنگ نامہ و لغت و قواعد زبان فارسی و دیگر ے در ثبت احوال و اخبار شاعران فارسی زبان۔ ایرانیان خود باین دو امر توجہ خیابانی نداشتہ و در بارۂ آن کار چندانی نکردہ اند و حتی می توان گفت کہ تا این اواخر از کوششہائے برادران ہندی و پاکستانی خود درین دو رشتہ آگاہی کافی نداشتہ اند"[1]

اہلِ ہند کے اس مسلمہ تفوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہاں مختصراً انہیں فارسی تذکروں کا ذکر کریں گے جو ہندوستان میں مرتب ہوئے اور جن سے اردو تذکرہ نویسی کے آغاز و ارتقا کی داستان براہِ راست وابستہ ہے

[1] نوائے نظ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" ص ۱۵-۱۶

تاکہ وہ پس منظر پوری طرح سامنے آجائے جس میں ہمارے اہلِ قلم اپنے اسلاف اور معاصرین کے حالاتِ زندگی اور کلام کے نمونوں کی تلاش و ترتیب کی طرف مائل ہوئے۔ اس سے یہ مطلب نہ لینا چاہیئے کہ شعرائے فارسی کے جن تذکروں نے ہندوستان سے باہر ترتیب و تکمیل کے مراحل طے کئے ہیں اردو کے تذکرہ نگار ان اثرات سے آزاد ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نقل و حمل اور کتابت و اشاعت کی دقتوں کے باعث ان تذکروں کا دائرۂ اثر نسبتاً محدود رہا ہے۔

ہندوستان کے فارسی تذکرے

ہندوستان میں عمومیت اور تسلسل کے ساتھ تذکرہ نگاری کی ابتدا اکبر کے عہد تاریخ جلوس ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء) سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کا صرف ایک تذکرہ "روضۃ السلاطین" دستیاب ہوا ہے جو مولانا سلطان محمد فخری ہروی کی تالیف ہے۔ فخری شاہ طہماسپ صفوی کے عہد (۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ) میں زیارتِ حرمین شریفین کے ارادے سے اپنے وطن کو خیرباد کہکر کچھ عرصے تک ابوالفتح شاہ حسین ارغون حاکم سندھ و ٹھٹھہ کے دربار سے متوسل رہے تھے۔ اس تذکرے کو انھوں نے اسی کے نام سے معنون کیا ہے۔ "روضۃ السلاطین کا سنہ ترتیب معلوم نہیں لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کی تکمیل شاہ حسین کے دورِ حکومت یعنی ۹۲۵ھ / ۱۵۲۹ء اور ۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء کے درمیان ہوئی ہے۔ یہ تذکرہ ان سلاطین کے ذکر پر مشتمل ہے جنھوں نے شاعری کے میدان میں اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔

"روضۃ السلاطین کی آخری حدِ تالیف (۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء) کے تھوڑے دن

بعد ہی تاریخ اکبر اعظم کے بیتر اقبال کی تابانیوں سے ہم کنار ہو گئی۔ اکبر کا ایوان سلطنت ایک عظیم المرتبت شہنشاہ کے رعب و جلال کا مظہر بھی تھا اور تہذیب و ثقافت، شعر و ادب اور علم و فن کے ایک پرتار کا معبد بھی۔ حسن اتفاق سے علم دوستی و معارف پروری کی یہی صفات اس کے اولوالعزم اور فراخ حوصلہ سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں میں بھی جمع ہو گئی تھیں۔ قدردانی اور قدر شناسی کی اس فضا نے ملک اور بیرون ملک کے ارباب کمال کے دلوں میں اکبر کی ذات کو اپنا مرکز نگاہ اور کعبۂ مقصود بنا لیے اور اسکے درباری امراء اور اعیان سلطنت کا تقرب حاصل کرنے کی امنگ پیدا کی نتیجۃً مغل دربار جلد ہی علم و فن کی دنیا میں ایک گوہر شب چراغ کی طرح جگمگا اٹھا۔ نصف صدی ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے اس طویل عہد حکمرانی کو ہم یکجا طور پر ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی مقبولیت و محبوبیت کا سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔

اکبر کے جلوس کے وقت مولانا فخری ہروی جن کا ذکر اوپر کی سطور میں آچکا ہے سندھ میں مقیم تھے۔ تخت نشینی کی خبر سن کر ان کی یہ خواہش ہوئی کہ کوئی مناسب تحفہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس اثنا میں ایک رات کو جب کہ وہ اپنے مرتب کیے ہوئے مجموعہ غزلیات "تحفۃ الحبیب" کا مطالعہ کر رہے تھے، ایک شاعرہ کی غزل نظر سے گزرنے پر معاً یہ تجویز ان کے ذہن میں آئی کہ سخن گو خواتین کا ایک تذکرہ ترتیب دے کر کم سن بادشاہ کی دایہ ماہم کے لیے "انبساط خاطر" کا سامان فراہم کیا جائے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے غالباً اکبر کے پہلے سال جلوس کے دوران "جواہر العجائب" کے

۱۔ ایک محقق تذکرۃ الدو... کے حالات و کلام ...

مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ متذکرہ شاعرات کے... حالاتِ زندگی کے سلسلے میں کوئی
قابلِ اعتنا معلومات فراہم نہیں کرتا۔ ساتھ ہی اشعار کا انتخاب بھی زیادہ
اچھا نہیں۔

اکبر کے عہد کا دوسرا تذکرہ "نفایس المآثر" ہے اس کے مولف میر
علاؤالدولہ قزوینی اکبر کے اتالیق میر عبداللطیف قزوینی کے حقیقی بھائی
تھے اور ۹۶۳ھ میں آذربائیجان سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔
یہ تذکرہ اس دور کے شاعروں کے بارے میں بہترین ماخذ کی حیثیت رکھتا
ہے "نفایس المآثر" اس کا تاریخی نام ہے جس سے آغازِ ترتیب کا سنہ
۹۷۳ھ (۶۶-۱۵۶۵ء) برآمد ہوتا ہے۔ سالِ اختتام ۹۷۹ھ (۷۲-۱۵۷۱ء) ہے۔

"نفایس المآثر" کے بعد محمد عارف بقائی نے "مجمع الفضلا" مرتب کیا۔
عارف بھی اکبر ہی کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ عرصے تک
عبدالرحیم خانخاناں سے متوسل رہے تھے۔ یہ تذکرہ جس کی ترتیب کا کام انھوں
نے ۹۹۶ھ، ۸۸-۱۵۸۷ء میں اندجان (نواحِ سمرقند) میں شروع کیا تھا... ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء
میں بمقام وزیرپور (مضافاتِ آگرہ) پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں چار سو سے زاید
شاعروں کا ذکر ہے۔ مولف نے ان شعرا کو بہ اعتبارِ زمانہ تین "فرقوں" میں تقسیم
کیا ہے۔ آخر میں بعنوان "خاتمہ" ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جو شاعری کے
مدعی ضرور تھے لیکن درحقیقت انھیں اس فن سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا

خانخاناں کے متوسلین میں دوسرا تذکرہ نگار سید علی بن محمود الحسینی ہے
جس نے... ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء میں "بزم آرائی" کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کر کے اپنے
مربی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس تذکرے میں حسینی نے فارسی شاعری کی ابتدا
سے اپنے زمانے تک کے شعرا کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے بیشتر مطالب حتیٰ دیباچہ

وہ مقدمہ بھی بے کم و کاست "لباب الالباب" سے منقول ہیں مگر ماخذ کی فہرست میں صرف تذکرہ دولت شاہ اور تذکرہ سامی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

عہد اکبری کا آخری تذکرہ امین احمد رازی کا "ہفت اقلیم" ہے۔ رازی اکبر کے دورِ حکومت میں اپنے وطن رے سے ہندوستان آیا۔ وہ نور جہاں کے والد جہانگیر کے وزیر اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا قریبی عزیز تھا۔ "ہفت اقلیم" کی ترتیب پر اس نے چھ سال صرف کیے اور ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۴ء) میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ مولف نے اس تذکرے میں ربعِ مسکون کو ہفت اقلیم میں تقسیم کر کے اولاً ہر اقلیم کے تاریخی و جغرافیائی حالات بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد وہاں کے شعرا کا ذکر کیا ہے۔

۱۳ جمادی الاول ۱۰۱۴ھ (مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کو اکبر کا انتقال ہو گیا اس کے بعد زمام سلطنت نور الدین محمد جہانگیر کے ہاتھ میں آئی (تاریخ جلوس ۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء یوم پنجشنبہ) اس کے عہد میں ہندوستان کی سرزمین کوئی فیضی یا ابوالفضل تو پیدا نہ کر سکی لیکن ہمسایہ ملکوں سے فنکاروں اور دانشوروں کی آمد کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ ایران میں یہ دور شعر و ادب کی ناقدری کا دور تھا۔ جبکہ اس کے برخلاف ہندوستان میں اہلِ علم و فن کو سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی ایسا ل[1] فارسی زبان و ادب کے لحاظ سے شاہکار معرضِ وجود میں آئے۔ اسی سلسلے میں تذکرہ نویسی کی روایت بھی کسی قدر آگے بڑھی اور کئی تذکرے مرتب ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے

---

[1] اس دور (عہد صفوی) کے مشہور ایرانی شاعر علی قلی سلیم نے درج ذیل شعر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس صورتِ حال کی تصویر کشی کی ہے ؎

نیست در ایراں زمیں سامانِ تحصیل کمال ۔۔۔ تا نیامد سوئے ہندوستاں حنا رنگیں نشد

خلاصۃ الشعرا

ملا محمد صوفی مازندرانی (متوفی ۱۰۳۵ھ) نے جو اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ ۱۰۱۰ھ/ ۲-۱۶۰۱ء میں احمد آباد گجرات میں قیام کے دوران "بتخانہ" کے نام سے ساٹھ ہزار متفرق اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء میں عبداللطیف عباسی گجراتی نے جو مرتب کا ہم جلیس اور ارادت مند تھا اس انتخاب میں بعض شاعروں کے کلام کا اضافہ کیا ہے اور تاریخی تقدم و تاخر کے لحاظ سے تمام شعرا کے حالات قلمبند کر کے اسے ایک تذکرے کی شکل دے دی۔ ہیئت کی اس تبدیلی کے بعد "بت خانہ" "خلاصۃ الشعرا" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ جہانگیر کے عہد کا پہلا تذکرہ ہے۔ عباسی کے اس کی ترتیب دولت شاہ کے "تذکرۃ الشعرا" میر علاؤ الدولہ قزوینی کے "نفائس المآثر" اور دوسری معتبر تاریخی کتابوں اور تذکروں سے مدد لی ہے۔ اور اپنی دانست میں لوازم تحقیق و تفتیش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے[1]۔

عرفات العاشقین

یہ تذکرہ تقی الدین محمد تقی اوحدی اصفہانی کی تالیف ہے۔ تقی رجب ۱۰۱۵ھ (نومبر ۱۶۰۶ء) میں دوستوں کی ایک جمعیت کے ساتھ عازم ہندوستان ہوئے۔ یہاں پہنچکر اولاً انھوں نے ڈیڑھ سال تک لاہور میں قیام کیا۔ اس کے بعد جہانگیر کے ساتھ آگرہ گئے اور ایک سال سے کچھ زیادہ وہاں مقیم رہ کر سفر حج کے ارادے سے گجرات کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء کے قریب وہ پھر آگرہ چلے آئے۔ اصفہان سے ہندوستان آتے ہوئے اثنائے راہ میں اوحدی سے ان کے ایک دوست

---

[1] مقدمہ خلاصۃ الشعرا بحوالہ میخانہ حاشیہ صفحہ ۷۹م

اور رفیق صفر حیدر ہمدانی نے اپنے لئے بطور یادگار شعرائے متقدمین و متاخرین کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ ترتیب دینے کی فرمائش کی تھی جسے انھوں نے شیراز سے گجرات تک کی مسافرت کے دوران میں "فردوس خیال" اوحدی کے تاریخی نام سے ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ۱۰۲۲ھ / ۱۶۱۳ء میں جبکہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں قیام پذیر تھے۔ ایک دوسرے دوست کے ایما سے اس مجموعۂ انتخاب پر شعرا کے حالات کے اضافہ کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء تک جتنے شعرا کے حالات و اشعار دستیاب ہو سکے انھیں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق یکجا کر کے فردوس خیال کو "عرفات العاشقین" کا نام دے دیا گیا یہ تذکرہ تین ہزار ایک سو چھیانوے شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۱۰۳۰ھ میں مولف نے خود ہی "کعبۂ عرفان" کے نام سے اس کا ایک خلاصہ مرتب کیا اور اس کے کچھ دن بعد جہانگیر کی فرمائش پر "انتخاب کعبۂ عرفان" کے نام سے اس خلاصے کا انتخاب کیا۔ اس طرح اشعار کی وہ بیاض جو ۱۰۲۰ھ میں مکمل ہوئی تھی، وقتاً فوقتاً مختلف شکلیں اختیار کرتی رہی۔

خرابات

پروفیسر محمد شفیع اڈیٹر اورینٹل کالج میگزین لاہور ایک مضمون میں برٹش میوزیم کے نسخہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تذکرہ حسن بن لطف اللہ طہرانی نے حسن بیگ خاملو کی تحریک پر مرتب کیا ہے اور بظاہر اس کی تکمیل ۱۰۴۰ھ میں ہوئی ہے لیکن کتاب خانۂ ملی تہران کا نامکمل نسخہ جس سے تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" کے مصنف ڈاکٹر سید علی رضا

۱- [illegible] ۱۹۲۷ء ص ۷۳

نقوی نے استفادہ کیا ہے، تذکرہ نگار کے نام، اسباب تالیف اور زمانہ ترتیب کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کرتا۔ البتہ بعض بیانات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ مولف ۱۰۱۰ھ ۱۶۰۱-۲ء سے ۱۰۲۵ھ ۱۶۱۶ء تک ہندوستان میں مقیم اور تذکرے کی ترتیب میں مصروف رہا ہے[۱]۔ اس لئے اسے عہد جہانگیر کے ہندوستانی تذکروں میں شامل کرنا غلط نہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں برٹش میوزیم اور کتاب خانہ ملی تہران کے مذکورہ نسخے خرابات کی دو علیحدہ علیحدہ جلدیں یا ایک ہی جلد کے منتشر اجزا ہیں۔ کیونکہ اول الذکر نسخہ رودکی سے شروع ہو کر خواجہ یوسف جامی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے[۲]۔ جبکہ دوسرے نسخے کی ابتدا انتخاب غزلیات جامی سے ہوئی ہے[۳]۔

میخانہ

فارسی تذکروں کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے جس میں نوے شاعروں کے ساقی نامے اور حالات درج کئے گئے ہیں اس کے مولف عبدالنبی خاں، فخر الزماں عزتی ۱۰۱۷ھ، ۱۶۰۸ء کے اواخر میں قزوین سے لاہور پہنچے اور چار مہینے وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۰۱۸ھ، ۱۶۰۹ء میں دارالخلافہ آگرہ میں وارد ہوئے۔ ۱۰۲۲ھ، ۱۶۱۳ء میں انھوں نے جہانگیر کے ساتھ اجمیر کا سفر کیا اور وہیں اس تذکرے کی ترتیب و تدوین کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۰۲۸ھ، ۱۶۱۹ء میں جبکہ وہ بہار کے دیوان میرزا نظامی کے ساتھ پٹنہ میں مقیم تھے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا اور ۱۰۲۹ھ، ۱۶۲۰ء میں نظر ثانی کے بعد کتاب کو طلائی جلدوں

۱۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص۔ ۱۶۳

۲۔ اورینٹل کالج میگزین۔ شمارہ فروری ۱۹۲۷ء۔ ص ۴۳

۳۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان۔ ص ۱۶۳

سے آراستہ کر کے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا گیا[1]۔ حالات کی تلاش و ترتیب کے سلسلے میں مولف کے تحقیقی انداز نظر نے اس تذکرے کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔

تاریخ جہانگیری

مولف کا نام معلوم نہیں لیکن اس کا تخلص مطربی اور وطن سمرقند ہے۔ اس تذکرے کی ابتدا اس نے رجب ۱۰۲۵ھ جولائی ۱۶۱۶ء میں کی جمادی الثانی ۱۰۳۶ھ فروری ۱۶۲۷ء میں خاتمہ کا آغاز کیا اور ۱۰۳۷ھ میں بلخ جانے سے قبل پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ تذکرہ ان شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ان کے دربار سے یا سلاطینِ ازبک اور چنگیز خاں کے اسلاف سے وابستہ رہے اور جن سے مطربی ۱۰۳۴ھ ۱۶۲۵ء تک شرفِ ملاقات حاصل کر چکا تھا۔

مجمع الشعرائے جہانگیری

یہ تذکرہ ایک مجہول الاحوال صاحبِ قلم قاطعی کی تالیف اور کسی بڑی کتاب یا ضخیم تر تذکرے کا دفتر ثالث معلوم ہوتا ہے۔ شعراء کی مجموعی تعداد ایک سو اکیاون ہے اور یہ تمام تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے جہانگیر کی مدح سرائی کی ہے۔ تذکرے کے مندرجات زمانۂ ترتیب کے سلسلے میں کوئی رہبری نہیں کرتے اس لئے محض موضوع کی مناسبت اور ظاہری اندازے کی بنا پر اسے جہانگیر کے عہد کی تالیفات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

جہانگیر نے ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء) کو وفات پائی۔ اس کے چند دن بعد ۲۲ جمادی الاولیٰ (۱۸ جنوری ۱۶۲۸ء) کو شاہجہاں اورنگ جہانبانی

---

[1] رضا لائبریری رام پور کے مخطوطے کے سرورق پر جہانگیر کی خدمت میں تذکرے کی پیشکش کا سنہ ۱۰۳۹ھ درج ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جہانگیر کا انتقال ۱۰۳۷ھ میں ہوا ہے۔

پروان چڑھا افزوں ہوا۔ اس جمال پرست شہنشاہ کا دور مغل فن تعمیر کی ترقی یا نشاۃ ثانیہ کا دور سمجھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول تعلیمی ترقی اور علمی احیاء و ترویج میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں تھا۔[1] اس کے زمانے میں ہندوستان کے باشعور ذی علم افراد میں اہل زبان سے مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ فیضی اور ابوالفضل کی وراثت عام ہونے لگی البتہ تذکرہ نگاری کے فن میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہ ہوئی اور تیس سال (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸ء تا ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۸ء) کے عرصے میں صرف دو تذکرے "طبقات شاہجہانی" اور "خزینۂ گنج الٰہی" منظر عام پر آئے۔

طبقات شاہجہانی۔

یہ تذکرہ محمد صادق نے ترتیب دیا ہے جو علوم متداولہ میں فیضی کا شاگرد تھا اور ہندوستان میں پیدائش کے لحاظ سے عبداللطیف عباسی کے بعد دوسرا ملکی تذکرہ نگار ہے۔ مولف نے تیمور سے شاہجہاں تک ہر بادشاہ کے متوسل اور ہم زمانہ ارباب کمال کو علیحدہ علیحدہ روشناس کرانے کی غرض سے دس طبقات قائم کئے ہیں اور ہر طبقے کو ذکر سادات و عرفا" "ذکر علماء و حکماء و فضلا" اور "ذکر شعرا" کے زیر عنوان تین ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ تذکرے میں کسی جگہ زمانۂ تالیف کے متعلق کوئی صراحت موجود نہیں البتہ طبقہ ثانی کے تحت ایک جگہ ۱۰۴۶ھ کو سال رواں قرار دیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب شاہجہانی کے نویں یا دسویں سال جلوس میں ہوئی ہے۔

خزینہ گنج الٰہی۔

اس تذکرے کا مولف میر عماد الدین محمود حسینی متخلص بہ الٰہی جہانگیر کے عہد

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ ص ۷۴

میں ولایت ہمدان سے ہندوستان آیا۔ ۱۰۴۲ھ میں بزمانۂ قیام کشمیر اس نے تذکرے کی تالیف کی ابتدا کی اور زندگی کے آخری ایام (مابین ۱۰۵۲ھ و ۱۰۶۴ھ) تک ترتیب کا سلسلہ جاری رکھنے کے باوجود اسے ناتمام چھوڑ کر ہی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ چنانچہ یہ تذکرہ ہمایوں (متوفی ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور بعد کے شاعروں کے بارے میں اس سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

۱۰۶۸ھ کے اواخر میں اورنگ زیب نے شاہجہاں کو عزلت نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا اور ملک کی تقدیر براہ راست اس کی ذات سے وابستہ ہو گئی (غرہ ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ مطابق ۲ جولائی ۱۶۵۸ء) اورنگ زیب کی ساری زندگی حرب وضرب اور جدال و قتال میں بسر ہوئی اس کے علاوہ افتاد طبع کے اعتبار سے بھی وہ ایک سادگی پسند، نام و نمود سے محترز اور مدح و ستائش سے بے نیاز قسم کا انسان تھا۔ اس لئے اس کے دور اقتدار (۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۹ھم ۱۷۰۷ء) میں شعر و ادب کو دربار شاہی سے کوئی سہارا نہ مل سکا۔ ماحول کی اس تبدیلی سے جہاں ملک کے ارباب فن متاثر ہوئے وہیں باہر سے اہل کمال کی آمد کا سلسلہ بھی تقریباً منقطع ہو گیا لیکن اس زمانے تک فارسی زبان عوام و خواص کے دلوں پر اس طرح اپنا تسلط قائم کر چکی تھی کہ وہ ادبی روایات جنھیں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی سرپرستی نے استحکام عطا کیا تھا زوال و انحطاط سے بڑی حد تک محفوظ رہیں اور تصنیف و تخلیق کے شیدائی حسب مقدور لوح و قلم کی تربیت کرتے رہے۔ مگر شاہجہاں کے دور کی طرح اس دور میں بھی تذکرہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی کیونکہ اس زمانے کے جو تذکرے ہمارے علم میں آسکے ہیں ان کی تعداد صرف چار ہے۔ ان تذکروں کی تفصیلات

حسب ذیل ہیں۔

لطائف الخیال

یہ تذکرہ شیخ مفید معروف بہ شاہ محمد شیرازی کی تالیف ہے جو شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور چند سال دولت آباد، احمد آباد اور سورت میں قیام کر کے ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء میں ایران واپس چلے گئے۔ لیکن اس سرزمین کی کشش انھیں زیادہ عرصہ تک اپنے دامن سے دور نہ رکھ سکی، اور تھوڑے ہی دن میں وہ دوبارہ ہندوستان چلے آئے۔ مراجعت کے بعد ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۵ء میں انھوں نے "لطائف الخیال" کا آغاز کیا اور بظاہر ۱۰۷۸ھ تک اس کی تالیف میں منہمک رہے لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر کتاب کی تکمیل نہ ہو سکی پھر بھی اسے مولف کے ہم عصر شاعروں کے حالات کا ایک معتبر ماخذ خیال کیا جاتا ہے۔

کلمات الشعرا۔

یہ تذکرہ محمد افضل سرخوش کشمیری کی تالیف ہے جسے خان آرزو نے غنی کشمیری اور ناصر علی کے ساتھ ہندوستان کے تین بڑے فارسی گو شعرا میں شمار کیا ہے تذکرے کے نام سے اس کا سالِ ترتیب ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ سرخوش نے اس میں اپنے زمانے کے ۱۶۹ (ایک سو انہتر) شاعروں کا ذکر کیا ہے مرتب تذکرہ علامہ محوی صدیقی کے بقول "یہ تذکرہ نہایت دلچسپ مفید اور تاریخی معلومات کا ذخیرۂ بے بہا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان شعرا کا ذکر ہے جو خود مولف کے ہم عصر تھے ـــــ یا جن کے حالات سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے[1]" اس لئے عالمگیری عہد کے ادب کا مطالعہ کرتے وقت

---

[1] کلمات الشعرا مقدمہ مرتبہ ص ۲۵

ہم اس تذکرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

تذکرہ بقا

ریو (Rieu) کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء سے قبل محمد بقا سہارنپوری نے بھی شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا لیکن کسی دوسری جگہ اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

مرآۃ الخیال

یہ تذکرہ شیر خاں لودی نے اپنے باپ علی امجد خاں لودی (متوسل شہزادہ شجاع حاکم بنگال) کی وفات (۱۰۸۴ھ) اور اپنے بھائی عبداللہ خاں کی شہادت (۱۰۸۷ھ) کا غم غلط کرنے کی غرض سے کئی سال کی محنت و مصروفیت کے بعد ۱۱۰۲ھ/۹۱-۱۶۹۰ء مکمل کر لیا ہے۔ شعراء کی مجموعی تعداد ۱۳۰ ہے جن میں دو خواتین بھی شامل ہیں۔ مولف نے تمام شاعروں کے حالات عصری تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے سپرد قلم کئے ہیں۔

مرآۃ الخیال اورنگزیب کے ۳۴ ویں سال جلوس کی تالیف ہے اس کی تکمیل کے بعد سے محمد شاہ کے چوتھے سال جلوس وتاریخ جلوس ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ستمبر/اکتوبر ۱۷۱۹ء کے اختتام تک تذکرہ نگاری کی روایت ایک طویل خلا میں بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جمود و تعطل کی یہ کیفیت اس سیاسی و سماجی انتشار اور ذہنی و فکری ناآسودگی کا نتیجہ بھی جا سکتی ہے۔ جس کا دائرہ عملی دکن کی مہوں اور اورنگزیب کے مسلسل انہماک اور اس کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کی نااہلی و نابکاری کے باعث روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد محمد شاہ پہلا فرمانروا تھا جسے تقریباً ۳۰ سال (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تک تخت سلطنت پر اپنا تسلط

برقرار رکھنے کا موقع ملا لیکن اس کے عہد میں بھی نظام حکومت کی ابتری برابر بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۱۵۱ھ (مارچ ۱۷۳۹ء) میں دارالحکومت پر نادر شاہ کے حملے کے بعد ملک کی اقتصادی حالت بے حد سقیم ہو گئی۔ ابھی اس ہزیمت کے زخم مندمل بھی نہ ہونے پائے تھے کہ محرم ۱۱۶۱ھ (جنوری ۱۷۴۸ء) میں احمد شاہ ابدالی کی فوجیں سلطنتِ مغلیہ کے حدود میں داخل ہوئیں اور دو ماہ تک پنجاب کی سرزمین قتل و غارت اور تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر پیش کرتی رہی لیکن آخر کار قسمت کی یاوری یا "فتح خدا ساز کی بدولت یہ معرکہ مغلوں ہی کے ہاتھ رہا۔ چند دن کے بعد ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۲۶ اپریل ۱۷۴۸ء) کو محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور احمد شاہ تخت کا وارث قرار پایا۔ اس کے زمانے میں ایک طرف خراج کی وصولی کے لئے ابدالی کی پیہم یورشوں اور دھمکیوں نے ملک کے سیاسی و اقتصادی نظام پر ضرب کاری لگائی اور دوسری طرف اعیانِ سلطنت کی تخریب کاریاں اس حد تک پہنچ گئیں کہ ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۲۱ مئی ۱۷۵۴ء) کو بادشاہ کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا۔ یہ واقعہ مغلوں کی رہی سہی سطوت و شوکت پر آخری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد انھیں پھر کبھی اپنی عظمت رفتہ کی شیرازہ بندی کا موقع نصیب نہ ہوا۔ ہر آن ایک تازہ قیامت اور ہر لحظہ ایک نئے انقلاب کے اس دور سے گزرتے ہوئے متوسط طبقے کے ذی شعور افراد زندگی کے اس موڑ تک آ گئے تھے جہاں انسان ہر تیرہ بختی کو اپنا مقدر اور ہر افتاد کو اپنی میراث سمجھ کر ناگزیر ناساعد حالات سے مفاہمت میں امن و عافیت کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ اربابِ علم کو ایسے ماحول میں شعر و ادب اور تصنیف و

تالیف کی دنیا سے بہتر کوئی پناہ گاہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ انتشار و ابتلا کے اس زمانے میں ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں نے جس تعجب خیز اور حیرتناک انہماک کے ساتھ فارسی زبان اور ادب کی خدمت کی ہے اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ محمد شاہ کے پانچویں سال جلوس (۱۱۳۶ھ) سے احمد شاہ کی معزولی (۱۱۶۷) تک ۳۰ سال کی مدت میں شعرائے فارسی کے ۱۶۔۱۷ تذکرے مرتب ہوئے جن میں سے بیشتر ہندی الاصل مولفین کے نتائج قلم ہیں اور ان میں ہندوستانی شاعروں کی تعداد نہ صرف نمایاں بلکہ بعض اوقات غالب رہی ہے۔ ہم یہاں اپنے موضوع کی مناسبت سے ان میں سے صرف انھیں تذکروں کا ذکر کریں گے جو ۱۱۶۵ھ میں شعرائے اردو کے پہلے تذکرہ کی تالیف سے قبل مکمل ہو چکے تھے۔

"ہمیشہ بہار" مؤلفہ کشن چند اخلاص

یہ تذکرہ جس میں مولف کی توجہات خصوصیت کے ساتھ جہانگیر کے عہد سے محمد شاہ کی تخت نشینی سے قبل تک کے شاعروں پر مرکوز رہی ہیں۔ ۱۱۳۶ھ/ ۲۴-۱۷۲۳ء میں مرتب ہوا ہے۔ سال ترتیب "ہمیشہ بہار" کے اعداد کو دو سے ضرب کرنے پر حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ۲۰۷ شعرا کا ذکر ہے جن کے بارے میں مولف نے خاص مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

سفینہ بے خبر۔ مؤلفہ عظمت اللہ بے خبر بلگرامی

مؤلف نے یہ تذکرہ بعض احباب کے اصرار پر ۱۱۴۱ھ/ ۲۹-۱۷۲۸ء میں بزمانہ قیام دہلی ترتیب دیا ہے اور طوالت سے بچنے کی خاطر صرف جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے عہد سے محمد شاہ اور محمود شاہ کے زمانے تک

کے ہندی و ایرانی شاعروں کے حالات و اشعار قلمبند کئے ہیں۔ تعارف میں غیر معمولی اختصار اس تذکرے کا نمایاں نقص ہے۔

سفینۂ خوش گو۔ از بندرابن داس خوش گو متھراوی۔

خوش گو "کلمات الشعرا" کے مولف سرخوش کشمیری کا شاگرد تھا ساتھ ہی اس نے خان آرزو سے بھی اپنے فارسی کلام پر اصلاح لی تھی اور زندگی کے ۲۵ سال ان کے "مصاحب دائمی کی حیثیت سے گزارے تھے "سفینۂ خوش گو" اس تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے سال آغاز ۱۱۳۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ اتمام کی تاریخ (۱۱۴۷ھ) "سفینۂ خوش گوئی سے نکلتی ہے لیکن اسے تاریخ تکمیل نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ کتاب کو آخری شکل ۱۱۵۵ھ، ۴۲-۱۷۴۱ء میں خان آرزو کے قلم سے چند شعرا کے حالات اور ایک مقدمے کے اضافے نیز ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد حاصل ہوئی۔ یہ تذکرہ تین دفتروں پر مشتمل ہے جن میں علی الترتیب ۳۲۶ شعرائے متقدمین ۱۱۸ متوسطین و متاخرین اور ۲۴۵ معاصرین کے حالات درج ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں "یہ تذکرہ بہت مشرح و مفصل ہے۔۔۔۔ مصنف کی تنقیدی حیثیت بہت اچھی ہے اور ترتیب سنین کے لحاظ سے ہے۔ معاصرین کا جو حال لکھا ہے وہ بہت مستند ہے اس لئے کہ مصنف۔۔۔۔ ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا وہاں اس نے اکثر شعرا سے ملاقاتیں کیں چنانچہ وہ بار بار ان ملاقاتوں کا ذکر کرتا ہے[1]۔

ید بیضا۔ مولفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی

مولف کا بیان ہے کہ مجھے ۱۱۴۸ھ ۳۶-۱۷۳۵ء میں اپنے وطن بلگرام سے

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۱۱۵

صوبۂ سندھ کی طرف جانے اور کئی سال سیوستان میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا وہاں فرصت کے لمحات کو غنیمت جان کر ۱۱۴۵ھ کے وسط (اواخر ۱۷۳۲ء) میں اس تذکرے کا آغاز کیا اور تقریباً ایک سال کے بعد اس کی ترتیب سے فراغت پائی۔ "ید بیضا" کے عام نسخوں میں پانچسو پینتیس شاعروں کا ذکر ملتا ہے لیکن جناب محمد ابراہیم ساکن گڑھی یاسین (مغربی پاکستان) کے ذاتی کتب خانہ کا نسخہ نسبتاً بہت ضخیم اور ۱۲۵۹ شعراء کے حالات پر مشتمل ہے۔[1] آزاد کی تصانیف میں اس تذکرے کے علاوہ شعرائے فارسی کے دو اور تذکرے "سرو آزاد" مرتبہ ۱۱۶۶ھ اور "خزانۂ عامرہ" (مرتبہ ۱۱۷۶) بھی شامل ہیں۔

تذکرہ ندرت

یہ تذکرہ ایک گم نام اور مجہول الاحوال صاحب قلم علی فطرت عطاء اللہ ملقب بہ دانشور خاں و تخلص بہ ندرت کی تالیف ہے اور ۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء میں لکھا گیا ہے۔ مولف نے ہر صدی کے شاعروں کے حالات علیحدہ علیحدہ تحریر کئے گئے ہیں۔

گلدستہ۔ مرتبہ عبدالوہاب خاں عالمگیری۔

یہ تذکرہ تقی اوحدی کے "انتخاب کعبہ عرفان" کا خلاصہ ہے اور ۱۱۵۵ھ ۱۷۴۲ء میں مرتب ہوا ہے۔ آخر میں مولف نے عمر خیام کے مختصر حالات اور چند رباعیات اپنی طرف سے اضافہ کی ہیں۔ اس کے بعد مختلف موضوعات و عنوانات کے تحت اشعار نقل کر دئے ہیں۔

---

[1] بحوالہ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان۔ ص ۲۷۱

ریاض الشعراء۔ از علی قلی خاں، واکہ داغستانی

واکہ ۱۱۴۴ھ میں نادر شاہ کے تخت ایران پر قابض ہونے کے کچھ دن بعد ایران آیا، اور لاہور میں مقیم ہوا۔ ۱۱۴۷ھ میں وہ لاہور سے دہلی پہنچا جہاں اسے دربار شاہی میں کافی عزت حاصل ہوئی۔ احمد شاہ نے اپنے دور حکومت (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) میں اسے شش ہزاری منصب اور خان زماں بہادر ظفر جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ نواب غازی الدین خان عماد الملک کی بیوی اور اردو کی مشہور شاعرہ گنا بیگم منت اس کی بیٹی تھی۔

"ریاض الشعراء" اس نے دہلی کے زمانہ قیام میں ۱۱۶۰ھ ۱۷۴۷ء اور ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء کے درمیان مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ عربی حروف تہجی کی تعداد کے مطابق ۲۸ روضوں پر منقسم ہے اور تقریباً ۲۷ سو شاعروں کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ مؤلف نے شعرا کے حالات زندگی کی دریافت و تحقیق پر بالعموم زیادہ توجہ نہیں دی ہے لیکن اچھے اشعار کو بہت کم نظر انداز کیا ہے۔ فنون شاعری مثلاً عروض، قافیہ اور صنائع بدائع سے متعلق مباحث اس تذکرے کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے حالات کے ضمن میں واکہ نے اپنے زمانہ کے تاریخی واقعات پر بھی کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

منتخب الاشعار۔ از مرزا کاظم مبتلا لکھنوی

اس تذکرے کا سال ترتیب ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) "نظم معانی"[1] سے برآمد ہوتا ہے۔ مؤلف نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب کے متعلق سات سو گیارہ شاعروں کے

---

[1] پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں اس تذکرہ کا جو قلمی نسخہ محفوظ ہے وہ اسی نام سے موسوم ہے (بحوالہ گلشن سخن مرتبہ مسعود حسن رضوی ص ۳۸) لیکن گلشن سخن کے دیباچہ (نسخہ مطبوعہ ص ۵۰) میں مبتلا نے اس کا نام "گلدستۂ معانی" تحریر کیا ہے۔

حالات و اشعار نقل کئے ہیں۔ ریاض الشعراء کی طرح یہ تذکرہ بھی حالات کے بیان میں اختصار کی بناء پر ایک اوسط درجے کی تالیف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن حسنِ انتخاب کے لحاظ سے شعرائے فارسی کے بہترین تذکروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ شعرائے اردو کا مشہور تذکرہ گلشنِ سخن بھی انھیں مبتلا کی تالیف ہے۔

منتخب حاکم۔ از عبدالحکیم حاکم لاہوری۔

یہ شعرائے فارسی کا مختصر ترین تذکرہ ہے جس میں صرف چھ شاعروں کا ذکر ہے ان شعراء سے ۱۱۶۱ھ، ۴۸-۱۷۴۷ء میں تذکرے کی ترتیب سے قبل مولف کی ملاقات ہو چکی تھی۔ دراصل اس تذکرے کو حاکم کے دوسرے تذکرے "مردم دیدہ" کا مقدمہ یا حرفِ آغاز سمجھنا چاہیئے۔ "مردم دیدہ" انھوں نے ۱۱۷۵ھ، ۶۲-۱۷۶۱ء میں قیام اورنگ آباد کے دوران خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" کو دیکھنے کے بعد "تحفۃ المجالس" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ چونکہ اس تذکرے میں بھی مؤلف نے صرف دیدہ و شنیدہ شعرا کے تعارف کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا تھا اس لئے بعد میں علامہ آزاد بلگرامی کی تجویز کے مطابق انھوں نے اپنے پسند کئے ہوئے نام "تحفۃ المجالس" کو "مردم دیدہ" سے بدل دیا۔

تذکرہ حسینی مولفہ میر حسین دوست سنبھلی۔

مولف کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "خجستہ انجام" کے بموجب اس تذکرے کی ترتیب ۱۱۶۳ھ میں عمل میں آئی ہے۔ شعراء کی مجموعی تعداد ۲۴۵ ہے جس میں وہ صلحا و عرفا اور ملوک و سلاطین بھی شامل ہیں جنھیں شاعری سے محض برائے نام واسطہ رہا ہے۔ شعراء کے حالات بالعموم بہت مختصر اور ناکافی ہیں البتہ بعض جگہ قارئین کی دلچسپیاں برقرار رکھنے کے لئے لطائف و ظرائف کا بھی

اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مجمع النفائس از سراج الدین علی خاں آرزو

آرزو نے اپنے ایک دوست کی فرمائش پر مختلف شعرا کے کلام سے انکے بہترین اشعار انتخاب کر کے ایک بیاض کی صورت میں جمع کرنا شروع کئے تھے لیکن متوسط اور متاخر شعرا کے تیس دیوانوں کا انتخاب مکمل کر لینے کے بعد ان کی توجہ حالات کے اضافے کی طرف منعطف ہوئی، اور اشعار کے اس مجموعے نے بڑھتے بڑھتے ایک ضخیم تذکرے کی صورت اختیار کر لی۔ بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تشکیلِ جدید کی ابتدا ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء سے قبل ہو چکی تھی۔[1] اختتام مولف کے ایک شاگرد بیدار کے مصرعۂ تاریخ "گلزار خیال اہلِ معنی جہاں" کی رو سے ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۱ء میں ہوا۔ خدا بخش لائبریری بانکی پور پٹنہ کی فہرست کے مطابق "مجمع النفائس" میں ایک ہزار سات سو پچیس شاعروں کے حالات و اشعار شامل ہیں۔ حالاتِ زندگی کے بیان کی حد تک یہ تذکرہ عام تذکروں سے بہت زیادہ مختلف یا ممتاز نہیں البتہ شعراء کی ادبی حیثیت کے تعین، ان کے کلام کے بارے میں اظہار خیال، اشعار کے نقائص کی استادانہ گرفت اور ان کی اصلاح اور اس قسم کے دوسرے علمی و فنی مسائل پر بحث نیز انتخابِ کلام کے لحاظ سے اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے الفاظ میں اس تصنیف میں خان آرزو کے علم کی وسعت اور ہمہ گیری پوری طرح ابھر کے سامنے آ رہی ہے اور

---

[1] لطف اللہ خاں نثار کے متعلق لکھتے ہیں کہ "دریں سنہ کہ ہزار و یکصد و پنجاہ و نہ ہجری (۱۱۵۹ھ) است دو ماہ پیش ازیں برحمت ایزدی پیوست" مخطوطہ رام پور ورق

انھوں نے اس کے ذریعہ اپنے لئے ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔[1]

یہ تھے شعرائے فارسی کے وہ تذکرے جو اردو تذکرہ نویسی کے آغاز سے قبل معرضِ وجود میں آ چکے تھے۔ شعرائے اُردو کے تذکرہ نگاروں نے انھیں کو اپنے لئے چراغِ راہ بنایا۔ انھوں نے انھیں تذکروں سے ترتیب کے اصول وآداب اور نقد و نظر کے معیار مستعار لئے اور بعض حالات میں ان کے صفحات پر بکھری ہوئی معلومات سے بھی استفادہ کیا چنانچہ وہ تمام خوبیاں اور خامیاں جو فارسی تذکرہ نگاروں کے یہاں موجود تھیں اردو تذکروں میں بھی داخل ہو گئیں۔ فارسی تذکرہ نویسوں نے انتخاب کلام کی نفاست و جامعیت پر خاص نظر رکھی ہے، حالاتِ زندگی کے انضباط کو وہ ثانوی حیثیت دیتے ہیں لیکن نہ تو ان کے یہاں عام طور پر کسی محققانہ انہماک کا تصور ملتا ہے اور نہ تو تاریخ وسنین کا التزام ان کے معمولات میں شامل ہے۔ اُردو تذکرہ نویس بھی انھیں رجحانات و میلانات کے مقلد یا ان سے متاثر ہیں۔ اس لئے شعرائے اُردو کے تذکروں کا مطالعہ کرنے سے قبل ان تمام باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے

---

[1] دلی کالج میگزین۔ میر نمبر... ص ۱۷

اُردو تذکرہ نگاری

(آغاز سے شیفتہ تک)

پس منظر اور محرکات

تذکرہ نگاری کا آغاز اور اس کے فروغ کے امکانات شاعری کی ترقی سے اس طرح وابستہ ہیں کہ انھیں کسی نہج پر بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری عالمِ طفولیت میں ہو تو تذکرہ نگاری کا تصور بھی محال ہے۔ شعری سرمائے کی وافر مقدار میں موجودگی کے بغیر تذکرہ نگار ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ اس کی تگ و تاز اس جہانِ معنی کے گرد طواف سے عبارت ہے، وہ اس سمندر کا غواص ہوتا ہے، اس کے فن کے شاہکار اس سرمایہ سے سامانِ وجود حاصل کرتے ہیں اور اس کی دنیا اس آب و گل سے تعمیر ہوتی ہے۔ عربی و فارسی تذکرہ نگاری کی تاریخ اس کلیے کی صداقت پر شاہد ہے۔ عربی شعرا کا پہلا تذکرہ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عربی شاعری دورِ شباب سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کا خزانہ امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمیٰ، لبید بن ربیعہ، عمرو بن کلثوم، نابغہ ذبیانی، کعب بن زہیر، حسان بن ثابت، اخطل، جریر، فرزدق جیسے شہرۂ آفاق فن کاروں کی تخلیقات اور دوسرے بے شمار معروف و غیر معروف شاعروں

کے جواہر افکار سے معمور تھا۔ زبان نے استناد کے تمام مرحلے طے کر لئے تھے اور فن بڑی حد تک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں شعرائے فارسی کے پہلے تذکرے کی ترتیب کے زمانے تک فارسی زبان نے بھی مشرق کی ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ غزنویوں اور سلجوقیوں کی فتوحات کے نتیجہ میں خراسان، عراق اور آذربائیجان اس کے اہم مراکز بن گئے تھے اور دجلہ کے ساحل سے دریائے سندھ کی وادی تک اس کا سکہ چل رہا تھا۔ شاعری کے میدان میں رودکی دقیقی، عنصری، فردوسی، فرخی، منوچہری، قطران، ازرقی، محمود سعد، معزی فیاپوری، سنائی غزنوی، انوری ادحدی، ظہیر فاریابی، خاقانی شروانی نظامی گنجوی اور شیخ فریدالدین عطار وغیرہ کے گراں قدر کارنامے جوہر شناس نگاہوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ اردو تذکرہ نویس کا آغاز بھی ایسے ہی حالات میں ہوا۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک جبکہ زمانے کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہمارے کئی اہل علم اس صنعت کی طرف راغب ہو گئے۔ اردو شاعری کی بنیادیں کافی مستحکم ہو چکی تھیں۔ فارسی کی بزم سخن کے چراغ صبح کے سیماب یا ستاروں کی طرح ٹمٹما رہے تھے اور شعر و ادب کی فضائے بسیط ایک آفتاب تازہ کی روشنی سے جگمگاتی جا رہی تھی۔ ستاروں کی شکست سے تخلیق آفتاب تک کی یہ منزل کس طرح طے ہوئی، یہ داستان ناشنیدہ نہیں لیکن یہاں اس کا دوہرانا ضروری معلوم ہوتا ہے

اردو شمالی یا شمالی مغربی ہندوستان میں پیدا ہوئی لیکن خود نگوئی اور خود شناسی کے مواقع اسے سب سے پہلے سرزمین دکن میں حاصل ہوئے۔ یہی سرزمین اس کی التفات انگیز شاعری اور قابل اعتنا ادب کا اولین گہوارہ

بنی اور اس افق سے اس کے عروج و اقبال کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس علاقے میں وسیع پیمانے پر اُردو کے اثر و نفوذ کی داستان ۲۷ء ھ مطابق ۱۳۲۷ء میں ہندوستان کا دارالخلافہ دہلی سے دیوگیریا دولت آباد منتقل کرنے کے متعلق محمد تغلق کے تاریخی فیصلے کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ جزیرہ نما اس سے قبل ہی شمالی ہند سے پہنچنے والے صوفیا و صلحا اور مبلغین اسلام کے ذریعہ اس دربار کے رہنے والوں سے روشناس ہو چکی تھی لیکن سیاسی سطح پر اس اہم تبدیلی کے بعد دولت آباد میں دہلی اور اس کے قرب و جوار سے ہجرت کر کے آنے والے عام شہریوں، عمائدین سلطنت، علماء و فضلا، سرکاری ملازمین، تاجروں اور صناعوں کی آبادکاری کے نتیجے میں اس کے دائرۂ اثر کو جو وسعت حاصل ہوئی اس نے اس کے ارتقا کی رفتار حیرت انگیز طور پر تیز کر دیا۔ اس زمانے میں دکن کے مختلف حصوں میں تلگو، کنڑی، مرہٹی اور ان کی ذیلی بولیاں عوام کے ذریعہ اظہار کے طور پر رائج تھیں لیکن یہ زبانیں نو وارد حاکموں اور مقامی باشندوں کے درمیان ربط و ضبط بڑھانے اور مودت و مواسات کے رشتے استوار کرنے کے لئے کافی نہ تھیں تاریخ کے اس نازک موڑ پر اُردو کی تسخیری توتیں بیدار ہوئیں اور اس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تمام لسانی اختلافات کو مٹا کر دلوں کو جوڑنے اور اظہار و ابلاغ کی صلاحیتوں کو ایک مرکز پر لے آنے کا فریضہ انجام دیا۔

اُردو کا یہ سیل رواں جو شمالی ہند کے مہاجر عوام اور فوجوں کے ساتھ دکن کے حدود میں داخل ہوا تھا، ملک کی سرکاری زبان یعنی فارسی کے خلاف ایک منظم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تغلق کی رعایا اور فوج نے نئے دارالسلطنت کے قیام اور ترکِ وطن کا فیصلہ خوشی کے ساتھ قبول

نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے آقا کی اس حکمتِ عملی سے مطمئن نہ تھے چنانچہ اس کو جلد ہی اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا پڑی (۱۳۳۵ء) اس کے باوجود اس بددلی کا جو حالات کی ان تبدیلیوں سے پیدا ہو گئی تھی، سدباب نہ ہو سکا۔ جانباز اور تجربہ کار سردار جنھوں نے اپنا لہو بہا کر فتح دکن کی مہم سر کی تھی۔ سلطان کی سخت گیری اور خود دماغی سے تنگ آ چکے تھے اور اس کی طرف سے طرح طرح کے خدشات میں مبتلا تھے۔ چنانچہ جب بعض افسروں کو سلطان کے اس ارادے کا علم ہوا کہ وہ ان کو قتل کرا کے ان سے نجات حاصل کر لینا چاہتا ہے تو وہ اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی یہ تحریک کامیاب ہوئی۔ کافی جدال و قتال کے بعد شاہی فوجیں دولت آباد سے پسپا ہو گئیں اور باغی گروہ کے ایک سردار حسن خاں مخاطب ظفر خاں نے جو خود کو اسفندیار کے بیٹے بہمن شاہ کی اولاد کہا کرتا تھا ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ (۳ اگست ۱۳۴۷ء) کو ابوالمظفر علاء الدین بہمن شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔[1] اس طرح بہمنی سلطنت وجود میں آ گئی جس کا ستارۂ اقبال ۱۴۹۰ء تک جگمگاتا رہا۔[2] اس خاندان کے فرمانرواؤں نے مرکز سے مکمل قطع تعلق کی پالیسی اور دوسری سیاسی مصلحتوں کے تحت دفتری کاروبار کے لئے فارسی کے بجائے اردو کا انتخاب کر کے اسے شاہی سرپرستی کا شرف عطا کیا۔[3] یہ اردو کے جمہوری کردار کی دوسری عظیم الشان کامیابی تھی جس کی بدولت وہ عوام اور خواص دونوں کیلئے قابلِ احترام ہو گئی

---

[1] تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۴۲۱ تا ۴۲۵

[2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم ص ۱۷۰ تا ۱۷۰

[3] دکن میں اردو ص ۳۵ و اردوئے قدیم ص ۷۰

سرکاری دفاتر میں اردو کی باریابی کے بعد اہل علم زیادہ تندہی کے ساتھ اس کی تہذیب و ترقی کی جانب متوجہ ہوئے اور وہ احساس کمتری جو اسے تصنیف و تالیف کی زبان بنانے سے روک رہا تھا ختم ہو گیا۔ صوفیائے کرام نے مسائل تصوف اور رموز معرفت کی تفہیم و تشریح کے لئے تقریر کے ساتھ تحریر میں بھی اس زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا کر تخلیق ادب کے دروازے کھول دئیے۔ اردو کے اس قدیم ترین سرمایہ کی کچھ یادگاریں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور بعض دوسرے بزرگوں کے رسائل کی صورت میں اب بھی محفوظ ہیں۔ شاعری کے میدان میں نظامی بیدری کی مثنوی "کدم راؤ پدم" بہمنی عہد کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کی جاتی ہے۔ یہ مثنوی اردو کی سب سے پہلی مستقل منظوم تصنیف ہے۔ بعض اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظامی سلطان احمد شاہ ثالث عرف نظام شاہ (۱۴۶۱ء ۸۶۵ تا ۱۴۶۳ء - ۸۶۷ھ) کا درباری شاعر تھا اور یہ مثنوی اسی کے عہد حکومت میں لکھی گئی ہے[1]۔

۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں سلطنت بہمنیہ زبردست انتشار و اختلال سے دوچار ہوئی۔ سلطان محمود شاہ (۸۸۷ھ - ۱۴۸۲ء تا ۹۲۴ھ - ۱۵۱۸ء) کی کم عمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر ایک سازش کے تحت بیک وقت اس کے تین صوبے داروں نے اطاعت کا طوق اتار پھینکا۔ ملک نظام الملک نے احمد نگر میں آزاد حکومتیں قایم کر لیں[2]۔ یہ حکومتیں بعد میں اپنے بانیوں سے منسوب ہو کر نظام شاہی، عادل شاہی اور عماد

---

[1] دکن میں اردو - ص ۳۰ و دکنی ادب کی تاریخ ص ۱۴

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۵۷۰

شاہی سلطنتوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں تلنگانہ یا گولکنڈہ کے صوبے دار قطب الملک سلطان قلی نے خودمختاری کا اعلان کر کے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی[1] اور ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) میں محمود شاہ کے وزیر برید الملک قاسم کے بیٹے اور جانشین امیر علی برید کے آخری بہمنی تاجدار سلطان کلیم اللہ کو بیدر سے فرار پر مجبور کر کے ان علاقوں کے ساتھ جن پر وہ عملاً پہلے ہی سے قابض تھا دارالسلطنت پر بھی تسلط حاصل کر لیا اور یہ تمام علاقے برید شاہی سلطنت میں تبدیل ہو گئے[2] اس طرح بہمنی خاندان کا چراغ گل ہوتے تک اس کی خاکستر سے پانچ آزاد ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں برار پر احمد نگر کے سلطان نظام شاہ کا قبضہ ہو گیا[3] اور ۱۰۲۸ھ (۱۹-۱۶۱۸ء) بیدر کی برید شاہی سلطنت بیجاپور کی عادل شاہی مملکت میں ضم ہو گئی[4]۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں تاریخی نقطۂ نظر سے ان سلطنتوں میں سے احمد نگر کی خدمات زیادہ نمایاں اور اہم تھیں لیکن عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین اور ان کے علاقوں کے عوام نے اس سلسلے میں جو عہد ساز کارنامے انجام دئے ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں۔

عادل شاہی خاندان کے پہلے دو فرمانروا یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ - ۹۱۶ھ) اور اسمٰعیل عادل شاہ (۹۱۶ - ۹۴۱ھ) فارسی زبان اور اس کی شاعری

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم۔ ص ۲۴۷

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۵۰۲ و ۵۰۴

[3] تاریخ فرشتہ جلد دوئم، ص ۳۶۱

[4] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوئم ص ۴۰۹

کے دلدادہ اور ایرانی تہذیب و تمدن کے پرستار تھے۔ اس لئے ان کے عہد اقتدار میں فارسی نے دوبارہ اپنا کھویا ہوا منصب پالیا اور اردو عوام کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔ تقریباً پچاس سال کے بعد لسانی تغیر کا یہ دور ختم ہوا اور ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ھ-۹۶۵ھ) کے عہد میں اس کے حکم سے تمام دفاتر از سر نو اردو میں منتقل کردئے گئے۔[1] ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ یوسف عادل شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ کی طرح اس کے عہد حکومت (۹۶۵-۹۸۸ھ) میں بھی عجمی اثرات کا دور دورہ رہا اور اردو اپنی سلطنت میں اپنی برتری قائم نہ رکھ سکی۔ لیکن ابھی پورے پچیس برس بھی نہ گذرے تھے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸-۱۰۳۷) نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سابقہ احکام منسوخ کردئے۔ اس خوش آیند اقدام کے بعد سے گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں انتزاع سلطنت کے زمانے تک شاہی دفتر دل میں بدستور اردو کا سکہ چلتا رہا۔ لسانی کشمکش اور برتری کے اس دو سو سالہ دور میں اردو نے ہر لحاظ پر نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اس نے خود کو رموز مملکت اور مسائل حیات دونوں کی ترجمانی کا اہل ثابت کردکھایا۔ عوام میں اس کی مقبولیت بڑھ گئی اور اس کے ادبی سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے شعرا میں شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، عبدل، اشرفی، ملک خوشنود، رستمی، حسن شوقی، شاہی، ملک الشعرا نصرتی، اور شاہ میراں ہاشمی کے نام کافی نمایاں ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں قدم جمانے کے مواقع حاصل ہوئے اور اس کے فروغ و ارتقا کی راہیں ہموار ہوئیں

---

[1] منتخب الالباب جلد سوئم ص ۳۰۷

شاہ میران جی شمس العشاق سے جنھیں بعض محققین کے خیال کے مطابق گجرات سے وطنی نسبت تھی[1]۔ تین مختصر منظوم تصانیف "خوش نامہ" "خوش نغز" اور "شہادت الحقیقت" منسوب ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم شاہ شمس العشاق کے فرزند تھے۔ اپنے والد کی طرح انھوں نے بھی اردو نثر و نظم سے اخلاقی تصورات اور رموز معرفت کی تبلیغ و اشاعت کا کام لیا۔ ارشاد نامہ، حجت البقا، وصیت الہادی، سکھ سہیلا، منفعت الایمان اور نکتہ واحد ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ عبدل کی مثنوی "ابراہیم نامہ" جس میں اس نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مجلسی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، ڈاکٹر نذیر احمد کے الفاظ میں ایک وسیع کارنامہ ہے[2]۔ یہ مثنوی ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۴ء) میں مکمل ہوئی ہے۔ صنعتی "قصہ بے نظیر" یا "قصۂ تمیم انصاری" کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) یعنی محمد عادل شاہ کے عہد کی تصنیف ہے۔ ملک خوشنود محمد عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اپنے ولی نعمت کی فرمائش پر اس نے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس مثنوی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خوشنود نے حضرت یوسف اور زلیخا کے قصے کو بھی اردو میں نظم کیا تھا۔ ۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲-۳۳ء) بیجاپور آنے سے قبل اس نے گولکنڈہ کے زمانۂ قیام میں بھی ایک مثنوی جسے ڈاکٹر زور بازار حسن سے موسوم کرتے ہیں لکھنا شروع کی تھی جو کسی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی[3]۔ اس کے علاوہ بعض مورخین اس کی قصیدہ گوئی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ رستمی اپنی تصنیف "خاور نامہ" کی بدولت دکنی اردو کی تاریخ

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۰۹

[2] " " " " ص ۲۵۸

[3] " " " " ص ۲۸۴

میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے یہ مثنوی جس کے اشعار کی تعداد ۲۲ ہزار سات سو بتیس بتائی جاتی ہے محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان کے حسب فرمائش (۱۶۴۹-۵۹ء) میں محمد بن حسام الدین الخوائی کے خاور نامہ سے ترجمہ کی گئی ہے۔ شوقی دو مثنویوں "میزبانی نامہ" اور "فتح نامہ" کا مصنف ہے اول الذکر مثنوی میں وزیر سلطنت مصطفےٰ خاں کی لڑکی سے محمد عادل شاہ کی شادی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ دوسری مثنوی بیجاپور کے خلاف نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی اور برید شاہی فوجوں کی متحدہ یلغار جنوری ۱۵۶۵، جمادی الثانی ۹۷۱ھ) کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے علاوہ شوقی نے غزل میں بھی اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کی جو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں وہ بڑی بلند پایہ ہیں۔ شاہی خاندان عادل شاہیہ کے آٹھویں فرمانروا علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء تا ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء) کا تخلص ہے۔ اس نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں بڑی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ تخیل کی بلند پروازی اور طرز ادا کی ندرت اس کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ نصرتی (متوفی ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۵ء) عادل شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر ہے علی عادل شاہ ثانی نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا تھا۔ مثنوی "گلشن عشق" (منظومہ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) میں جو کم و بیش چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس نے مناظر قدرت کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ دوسری مثنوی "علی نامہ" (۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء) سے بھی جو علی عادل شاہ کی سوانح عمری اور اس کے عہد کی سیاسی و مجلسی تاریخ ہے، اس کی مہارت فن اور قدرت کلام کا پتہ چلتا ہے۔ نصرتی کی تیسری مثنوی "تاریخ اسکندری" (۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) ہے

جس میں اس نے ایک موقع پر عادل شاہی افواج کی معرکہ آرائی کا حال نظم کیا ہو مثنوی نگار کے پہلو بہ پہلو نصرتی کو قصیدہ گوئی میں بھی زبردست ملکہ حاصل تھا اس صنف میں دکن کے دور قدیم کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہاشمی (متوفی ۱۱۰۹ھ ۔ ۱۶۹۷ء) اردو غزل میں صنف نازک کی جانب سے اظہار عشق کا موجب کہا جاتا ہے۔ اس کا کلام بہ لحاظ معنویت ریختی سے مماثل ہو لیکن اس میں وہ ابتذال اور چھچھورا پن نہیں جو بعد کے ریختی گو شعرا کے یہاں نظر آتا ہے۔ ہاشمی کی زندگی ہی میں عادل شاہی سلطنت پر زوال آیا اور وہ عالمگیر کی وسیع مملکت کا ایک جزبن گئی۔ (۱۰۹۷ھ، ۱۶۸۶ء)[1] سقوط بیجاپور کے بعد وہ ارکاٹ کی طرف چلا گیا جہاں ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۸ء میں اس نے "مثنوی یوسف زلیخا" نظم کی۔ اس مثنوی کا قصہ براہ راست قرآن مجید اور اس کی تفاسیر سے ماخوذ ہے۔

عادل شاہیوں کی طرح قطب شاہی سلاطین نے بھی اردو زبان اور شاعری کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے عہد کی ۱۷۵ سالہ (۱۵۱۲ء تا ۱۶۸۷ء) تاریخ میں دفتری سطح پر لسانی تبدیلیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد بھی اس علاقے میں اردو کو ابتدا ہی سے حکومت کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا اور لسانی ارتقا کی راہ پر اپنی پیش قدمی جاری رکھنے کے لئے زیادہ بہتر مواقع اور سازگار ماحول نصیب ہوا لیکن اس خاندان کے پہلے دو فرمانروا اول یعنی سلطان قلی قطب شاہ (۹۱۸ھ، ۱۵۱۲ء تا ۹۵۰ھ، ۱۵۴۳ء) اور جمشید قلی قطب شاہ (۹۵۰ھ، ۱۵۴۳ء تا ۹۵۷ھ، ۱۵۵۰ء) کے زمانہ حکومت میں اردو شاعری کی کیا کیفیت

---

[1] دی سلطنت آف دہلی۔ ص ۲۷۷

رہی، یہ جانا محال ہے۔ تیسرے فرمانروا ابراہیم قطب شاہ کے عہد (۹۵۷ھ
۱۵۵۰ء تا ۹۸۹ھ، ۱۵۸۱ء) میں بھی وثوق کے ساتھ حضرت قطب الدین فیروز
بیدری کا نام لیا جا سکتا ہے جس کی ایک مثنوی "پرت نامہ" اردو میں اس کی
طبع آزمائی کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ یہ مثنوی ایک سو اکیس اشعار پر مشتمل ہے
اور نو سو بہتر ہجری ۹۷۲ء (۱۵۶۵ء) سے قبل لکھی گئی ہے۔ موضوع سخن
حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی مدح ہے۔ ڈاکٹر زور نے فیروز کو گولکنڈہ
کے مسلم الثبوت شعرا میں شمار کیا ہے۔ ان کے قول کے مطابق "اس کے کلام
کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور ادب اس وقت تک ارتقا کی
جملہ ابتدائی منزلوں سے گزر چکے تھے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی
ہے کہ فیروز سے پہلے بھی اچھے اچھے اور بلند پایہ شاعر گزرے ہوں گے۔"[1]
ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا نامور فرزند محمد قلی قطب شاہ
تخت نشین ہوا[2]، اور ۱۰۲۰ھ تک سریر سلطنت پر رونق افروز رہا۔ محمد قلی ایک
نئی تہذیب کا بانی اور ایک نئے دور کا معمار کہا جاتا ہے۔ اس کی زندۂ جاوید
یادگار شہر حیدرآباد ہے جس کی تعمیر کا سلسلہ اس نے اپنے جلوس کے سولھویں سال
میں شروع کیا تھا۔[3] وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ تقریباً پچاس

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول ص ۳۵۷
[2] ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے تاریخ جلوس ۱۲ ربیع الثانی ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) بتائی ہے۔
(علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۶۲) لیکن تاریخ فرشتہ (جلد دوم ص ۱۵۲) میں مذکور ہے کہ ۹۸۹ھ
میں ابراہیم قطب شاہ نے وفات پائی اس کے بعد محمد قلی تخت نشین ہوا۔ فرشتہ ہم عصر مورخ ہے
اس لیے ہمارے نزدیک اس کا بیان قابل ترجیح ہے۔

---

[3] علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۳۶۲ (۴) اردو کی ادبی تاریخ ص ۱۰۲۔

ہزار پر مشتمل اس کے ضخیم مجموعہ کلام میں اردو غزلوں، قصیدوں، مرثیوں اور رباعیوں کے علاوہ عوامی موضوعات پر مسلسل نظمیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے بقول "اردو غزل محمد قلی کے یہاں سب سے پہلے اپنے خط و خال کے ساتھ ابھری" چنانچہ اس کی غزلوں میں پہلی بار اس صنف کی فنی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی دوسری نظمیں بھی فن کے رچاؤ اور زبان کی سنجیدگی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

مختلف اصنافِ سخن اور بالخصوص غزل کی صنف میں محمد قلی کی باقاعدہ طبع آزمائی سے جہاں اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے وہیں اس کی سخن شناسی اور شعروادب کی قدر افزائی نے بھی علم و فن کے سرپرست سلاطین کی صفِ اول میں اس کے لئے ایک ممتاز حیثیت مخصوص کر دی ہے۔ اس کے دربار کا مشہور شاعر ملا وجہی جسے اس نے ملک الشعرا کے اعزاز سے نوازا اردو کا ایک بلند پایہ اور ممتاز ادیب ہے۔ وجہی کی شاعرانہ صلاحیتیں مثنوی "قطب مشتری" (مصنفہ ۱۰۱۸ھ، ۱۶۰۹ء) سے آشکار ہیں۔ اس مثنوی میں اس نے مشتری کے فرضی نام کے تحت بھاگمتی سے بادشاہ کے عاشقی کی واردات و کیفیات نظم کی ہیں ابتدا میں "در شرح شعر" کے عنوان سے اس نے شاعری کے بارے میں کچھ اپنے تصورات پیش کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں اردو شاعری کا ایک معیار متعین ہو چکا تھا۔ مثنوی کے علاوہ وجہی نے غزلیں، رباعیاں، مرثیے اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔ "قطب مشتری" کی طرح ان تمام تخلیقات سے بھی استادانہ رنگ جھلکتا ہے۔ وجہی قلی قطب شاہ کے بعد محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ، ۱۶۱۱ء ۱۰۳۵ھ، ۲۶-۱۶۲۵ء) اور عبداللہ قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۳ھ، ۱۶۷۲ء

کے عہد میں بھی سرگرم عمل رہا لیکن اس زمانے میں غواصی کے سامنے اس کا چراغ نہ جل سکا۔ غواصی نے قطب شاہ کے دورِ حکومت میں مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال تصنیف کر کے خاص شہرت حاصل کی۔ یہ مثنوی ایک روایت کے بموجب ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں[1] اور دوسری روایت کے مطابق ۱۰۲۷ھ/۱۶۱۸ء میں لکھی گئی ہے[2]۔ غواصی کی اس مثنوی کے علاوہ محمد قطب شاہ کے عہد میں کوئی اور قابلِ ذکر شاہکار نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے شاعروں کی سرپرستی میں کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی توجہات شعر و ادب سے زیادہ فلسفے اور مذہبی علوم کی جانب مبذول رہیں تاہم ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں اس نے اپنے چچا اور خسر قلی قطب شاہ کا دیوان مرتب کر کے ایک اہم علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس دیوان پر اس نے ایک منظوم دیباچہ بھی لکھا ہے جو نثر سے اس کے طبعی تعلق کا شاہد ہے محمد قطب شاہ کے برخلاف عبداللہ قطب شاہ کا طویل دورِ حکومت شعرا کے لئے کافی سازگار رہا۔ قائم چاندپوری نے لکھا ہے کہ سلطان ارباب سخن کے ساتھ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتا تھا[3]۔ اس حسن سلوک نے وجہی، غواصی اور دوسرے بہت سے شاعروں کو جو کسمپرسی اور استغنا کی زندگی بسر کر رہے تھے، دوبارہ گوشۂ عزلت سے باہر آنے کے مواقع فراہم کئے۔ غواصی نے اس کے پہلے ہی سال جلوس میں "سیف الملوک اور بدیع الجمال" پر نظر ثانی کی اور ان اشعار کو جن میں محض رسمی طور پر محمد قطب شاہ کی تعریف کی تھی۔ عبداللہ

---

[1] برس ایک ہزار ہور پنچ بیس میں — کیا ختم یو نظم دن تیس میں (نسخۂ برٹش میوزیم)

[2] برس ایک ہزار ہور ستائیس میں — کیا ختم یو نظم دن تیس میں (نسخۂ مطبوعہ)

[3] مخزن نکات۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ ص ۳

کی مدح سے بدل دیا۔ ان مدحیہ اشعار میں اس نے سلطان کی ادب پروری اور
جوہر شناسی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ڈاکٹر زور کے الفاظ میں ان
کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شاعر کنج عزلت کے گوشہ نشین ہو کر نیم مردہ ہو گئے تھے
وہ تیسرے دور میں پھر زندہ ہو گئے اور پھر گمنامی میں ڈوبے ہوئے صاحبان
فضل و کمال تیر کر پھر ساحلِ شہرت پر نکل آئے۔ سب لوگ سمجھنے لگے کہ گویا
شاعروں کا قدردان اور دلدادہ محمد قلی پھر دنیا میں آگیا۔[1] غالباً اس پہلی
ادبی نوازی کی بدولت غواصی کو عبداللہ کی خدمت میں تقرب اور رسوخ حاصل ہوا اور
وجہی کے بالمقابل دربار کی ملک الشعرائی کا منصب اس کے حصے میں آیا۔ سلطان
کی فرمائش پر اسی دور میں ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں وجہی کے "سب رس" تصنیف
کی جو اردو نثر کا پہلا مثالی شاہکار اور لازوال اہمیت کا کارنامہ ہے۔ ۱۰۴۹ھ
(۱۶۳۹ء) میں غواصی نے ملا ضیاء الدین نخشبی کے فارسی "طوطی نامہ" کا اردو
نظم میں ترجمہ کیا۔ یہ مثنوی تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ "سیف الملوک او
بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" کے علاوہ غواصی کے کلیات کا ایک نامکمل نسخہ
اور ایک اور مثنوی "چندا اور لورک" بھی دستیاب ہوئی ہے۔ کلیات میں ردیف وار
مسلسل اور غیر مسلسل غزلیں، قطعات، قصیدے اور متعدد دوسری نظمیں شامل
ہیں۔ قصائد میں غواصی نے بڑی کامیابی کے ساتھ فارسی قصیدہ نگاروں کا
اتباع کیا ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کو خود بھی شعر گوئی سے خاصی دلچسپی تھی
چنانچہ اس کا دیوان بھی جو مختلف اصناف سخن کے نمونوں سے مملو ہے، منظر
عام پر آچکا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے دوسرے قابل ذکر شعرا میں قطبی، ابن نشاطی

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۳۰۶

جنیدی، افضل، قادری اور طبعی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ قطبی نے ۱۰۴۵ھ ۳۶-۱۶۳۵ء میں شیخ یوسف دہلوی کی قصیدہ نما نظم "تحفۃ النصائح" کو جس کے اشعار کی تعداد ۷۸۶ ہے شعر بہ شعر ترجمے کی صورت میں اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ابن نشاطی غواصی کے بعد اس دور کا ممتاز ترین فنکار ہے۔ وجہی کی طرح وہ ایک اچھا نثر نگار اور انشا پرداز بھی تھا۔ ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۶ء میں اس نے ایک عشقیہ مثنوی "پھول بن" فارسی قصے کی بنیاد پر اردو میں نظم کی ہے۔ اس مثنوی کے بعض اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ دربار کی بہ نسبت عوام میں زیادہ مقبول رہا۔ جنیدی مثنوی "ماہ پیکر" کا مصنف ہے جو ۱۰۶۴ھ ۱۶۵۴ء میں لکھی گئی ہے۔ افضل قادری قصیدہ گوئی میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ طبعی نے ۱۰۸۱ھ ۷۱-۱۶۷۰ء میں مثنوی "بہرام و گل اندام" تصنیف کی جو اردو کی بہترین عشقیہ مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے اس کی وفات کے بعد اس کا داماد ابوالحسن تاناشاہ جو ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھتا تھا تخت نشین ہوا۔ تاناشاہ کے ایام حکمرانی میں اگرچہ مغل فوجوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور تاناشاہ کے عزائم کے باعث عام طور پر بے چینی اور بے اطمینانی کا دور دورہ رہا، پھر بھی شاعری اور فنون لطیفہ سے اس کے تعلق خاطر کی بنا پر تخلیق ادب کی رفتار متاثر نہ ہوئی۔ سلطان کے کلام کا کوئی مجموعہ تو محفوظ نہیں لیکن مختلف تذکروں میں اس کے جو اشعار منقول ہیں وہ اس کی خوش گوئی اور قادر الکلامی کا پتہ دیتے ہیں۔ طبعی جو گذشتہ دور میں بہرام و گل اندام لکھ کر نام پیدا کر چکا تھا اس عہد کا سب سے ممتاز سخنور ہے وہ تاناشاہ کے مرشد شاہ راجو کا مرید تھا۔ تاناشاہ کی تخت نشینی کے بعد طبعی نے اس کی شان میں کچھ تازہ اشعار

بعد کو اس مثنوی میں شامل کئے۔ تاناشاہ کے مقربین میں ایک اور قابلِ ذکر شاعر غلام علی تھا اس نے ۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰ء) میں ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک طبع زاد تخلیق کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ قایم چاندپوری جنھوں نے اپنے تذکرے میں دکنی شاعروں کے تعارف کا خاص اہتمام کیا ہے۔ مرزا ابو القاسم، سید شجاع الدین نوری اور شاہ قلی خاں شاہی کو بھی تاناشاہ کے مخصوص درباریوں کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں[1]۔ نوری کا کلام بہت کم دستیاب ہوا ہے لیکن مرزا اور شاہی کے متعدد مرثیے محفوظ ہیں۔ شاہی کے بارے میں قایم نے لکھا ہے کہ "تا الحال بیش پنجاہ سال ابیات مرثیہ اش در بلاد ہندوستان دست بدست گردیدہ اند[2]" دربار کے ان معزز شعرا کے ساتھ ہی انھوں نے افضل الدین خاں فضلی، محمد غوث غوثی نے پیرزادہ روحی اور محمد عبد القادر کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً اسی دور سے متعلق ہیں۔ "مخزن نکات" میں ان شاعروں کا تذکرہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کی شہرت نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی کا شہرہ عام ہونے سے بہت پہلے شمالی ہند تک پہونچ چکی تھی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مطابق تاناشاہ کے عہد کی آخری بڑی تصنیف فائز کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" ہے[3]۔ یہ مثنوی ۱۰۹۴ھ ۱۶۸۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اس کی تصنیف کے پانچ سال بعد ایک طویل معرکہ آرائی کے نتیجہ میں ۲۳ ذی قعد ۱۰۹۹ھ (۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء) کو عالمگیر کی فوجیں

---

[1] مخزن نکات۔ ص ۷ و ۶

[2] مخزن نکات۔ ص ۶

[3] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۵۰۴

ضلع گولکنڈہ کی مہم میں کامیاب ہوگئیں[1] اور عادل شاہیوں کی طرح قطب شاہی سلاطین کی سطوت و حشمت کا چراغ بھی ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔ دکن کے اس آخری اور پر آشوب دور سے تعلق رکھنے والے جن شاعروں کے متعلق ابھی تحقیق مکمل نہیں ہوئی ہیں یا جن کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ان میں مشہور مثنوی نگار مقیمی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس نے ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء "چندر بدن و مہیار" کا قصہ نظم کیا ہے۔

گیارھویں صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے اگرچہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقے اپنی آزادی اور انفرادیت کھو چکے تھے لیکن ان سلطنتوں کے زیر سایہ تحصیل کمال اور تخلیق فن کی منزلیں سر کرنے والے فنکاروں کا تابناک سلسلہ درحقیقت بحری اور دوسروں پر ختم ہوا، جو زوال دکن کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہے۔ قاضی محمود بحری ضلع گلبرگہ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ بیجاپور کا آخری فرمانروا اسکندر عادل شاہ ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ اس کی حکومت کے آخری ایام میں وہ کچھ دن تک بیجاپور میں مقیم رہے پھر وہاں سے حیدرآباد چلے گئے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد انھوں نے اپنے وطن قصبہ گوگی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں انکا انتقال ہوا۔[2] بحری کا بیشتر فارسی و اردو کلام جو تقریباً پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا ایک سفر کے دوران رہزنوں کی دست برد کے نتیجے میں تلف ہو گیا۔ پھر بھی ایک کلیات اور دو مثنویاں "من لگن" اور "بھنگ نامہ" ان سے یادگار ہیں۔ من لگن ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی ان کی تصانیف میں خاص اہمیت

---

[1] اردو قدیم۔ ص ۹۳ و اردو کی ادبی تاریخ ص ۱۱۴

[2] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۳۰۹

رکھتی ہے۔ کلیات میں جو غزلیں شامل ہیں ان میں فن کا نکھار کافی نمایاں ہے۔ مرثیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس صنف میں بھی کمال حاصل تھا۔ ولی کا کلام دکنی شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔ وہ اپنے دور کا ایک پیغمبر سخن تھا جس کی تخئیل کی اعجاز نمائی اردو شاعری کو معراج کمال تک لے گئی۔ اس کے وطن کے بارے میں آج تک محققین کے درمیان اختلاف رائے ہے لیکن سرزمین دکن سے اس کے تعلق میں کوئی شبہ نہیں اورنگ آباد کو اس کی وطنیت کا فخر نہ دینے والے بھی یہ بات بہرحال مانتے ہیں کہ اس کی شاعری کا ارتقا بیجاپور اور اورنگ آباد میں ہوا اور اس نے بیجاپوری اور قطب شاہی شعرا کے اثرات بھی قبول کیے۔[1]

ولی نے ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں وفات پائی۔[2] دکن اس وقت تک پوری طرح مغلوں کے زیر اقتدار آچکا تھا اور سیاسی و معاشی نظام کی وحدت نے شمال و جنوب کے درمیان تہذیبی لین دین اور ثقافتی ربط و ضبط کے راستے کافی حد تک ہموار کردئیے تھے۔ قائم چاندپوری کا بیان ہے کہ "ولی عالمگیر کے چوالیسویں سال جلوس یعنی ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں سید ابوالمعالی کے ساتھ دلی آئے یہاں انھوں نے شیخ سعد اللہ گلشن سے شرف نیاز حاصل کیا۔ جنھوں نے ان کو ریختہ میں فکر شعر کی ترغیب دلائی اور ایک مطلع بھی نظم کرکے دیا جس کی برکت سے ان کے کلام کو حسن قبول حاصل ہوا۔[3] میر صاحب نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ گلشن نے ولی کا کلام سن کر انھیں یہ رائے دی کہ ایں ہمہ مضامین فارسی

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول مقالہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ۴۳۲

[2] تاریخ وفات "بادپیاده دکنی، ساقی کوثر علی" کے اعداد (۱۱۱۸) میں ایک کے اضافے سے نکلتی ہے۔ [3] مخزن نکات ص ۱۰

کہ بیکار افتادہ اند' در ریختہ خود بکار بر اند تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"[1] روایت

کے اس جزوی اختلاف سے قطع نظر، دلی میں ولی کا ورود اردو شاعری کے لئے فال نیک ثابت ہوا۔ ایک طرف تو خود انھوں نے اپنے کلام کو دہلی کے روزمرہ کے معیار پر لانے کی کوشش کی اور دوسری طرف اُردو میں ان کی کامیاب طبع آزمائی سے ان لوگوں کو حوصلہ ملا جو فارسی کی سرد لاش کو زیادہ عرصے تک اپنے سینے سے لگائے رکھنے کے لئے تیار نہ تھے اور اپنی بات اپنی زبان میں دوسروں تک پہنچانے کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ زمانے کے بعد محمد شاہ کے دوسرے سال جلوس (۳۳-۱۱۳۲ھ) میں ولی کا دیوان دہلی آیا۔[2] اور شاہ حاتم کے بیان کے مطابق آتے آتے اس کے اشعار ہر خورد و بزرگ کی زبان پر جاری ہو گئے۔ ولی کے کلام کی اس مقبولیت نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے ارتقا کی رفتار بڑے خوش آیند اثرات مرتب کیے۔ فارسی کا اعتبار اٹھنا شروع ہوا اور اردو ایک طاقتور حریف کی حیثیت سے اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ حال کے آئینہ میں مستقبل کو بے نقاب دیکھ لینے والوں کے لئے افق پر آفتاب تازہ کی اس نمود کے بجھتے ہوئے چراغوں کی پرستش ممکن نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون، مصطفےٰ خاں یک رنگ، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ حاتم، صدر الدین فائز اور دوسرے کئی شعرا جن میں سے بعض لوگ یقینی طور پر اس سے پہلے ہی نکو دخیال کی اس نئی جولان گاہ میں قدم رکھ چکے تھے قدر شناس نگاہوں کا مرکز قرار پائے۔ فارسی کی جگہ اُردو کو مسند اقتدار تک لے آنے کا یہ رجحان جس تیزی کے ساتھ عوام و

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۹۰

[2] دستہ تذکرہ ہندی ص ۸۰

خواص میں مقبول ہوا تاریخ ادب میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں[1]۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے بقول دار السلطنت میں پچھلے چار سو برس میں فارسی نے جس شعری ذوق کو ابھارا تھا اس کی تربیت کی تھی وہ سب اردو شاعری کے اٹھان کے کام آ گیا[2]۔ ادبی و لسانی انداز کے اس تغیر کی بدولت دہلی کو جس کی خاک سے ولی کی آمد سے قبل کوئی وجہی، کوئی نصرتی یا کوئی غواصی پیدا نہ ہوا تھا۔ جلد ہی اردو شاعری کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی بنیادیں مستحکم ہونے کے ساتھ دکن کی مرکزیت کا زوال شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ولی کے بعد اس علاقے سے سراج اورنگ آبادی (۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء — ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۴ء)[3] کے علاوہ کوئی ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جسے اپنے اسلاف کا صحیح جانشین کہا جا سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ولی نے غزل کی صنعت کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا کر جس رمز شناسی اور دیدہ وری کا ثبوت دیا تھا اس کا اندازہ دکن والوں کی بہ نسبت شمالی ہند کے لوگوں نے زیادہ بہتر طور پر کیا۔ شمال کی اردو شاعری کی تاریخ دراصل غزل کے ارتقا کی تاریخ ہے اور تذکرہ نگاری کے فن نے جو ہمارا اصل موضوعِ بحث ہے تاریخ کے اس وسیع سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے ترقی کی ہے۔

شمالی ہند کے قدیم اردو شاعروں میں استادانہ اہمیت کے لحاظ سے خان

---

[1] محمد شاکر ناجی ایک غزل کے مقطعے میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بلندی سخن کے ناجی ریختہ کی ۔ ہوا ہے پست شہرہ فارسی کا

[2] اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۱۲۹

[3] بحوالہ کلیات سراج مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۳۶ و ۵۵

آرزو اور مرزا مظہر جانجاناں دوسرے تمام شعراء پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آرزو اور مظہر دونوں ہی بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے ان کا اردو کلام بھی زیادہ مقدار میں دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ریختہ گوئی کے میلان کو عام کرنے لسانی خودمختاری کی تحریک کو مقبول و کامیاب بنانے اور ابھرتے ہوئے اردو شاعروں کی تربیت و حوصلہ افزائی میں ان اساتذہ کا جو حصہ رہا ہے وہ ان کے تفوق کا ضامن ہے۔ اس دور کے اکثر بڑے بڑے شاعر یا تو براہ راست انھیں دونوں اساتذہ کے شاگرد ہیں یا پھر انھوں نے بالواسطہ ان کی تربیت کے اثرات قبول کیے ہیں۔ جہاں تک خان آرزو کا تعلق ہے ڈاکٹر محمد حسن کے بقول "انکی حیثیت اس دور میں گویا ہندوستانیوں کی خوش مذاقی اور ادبی استعداد کے نمایندے کی ہو گئی تھی ... ... ان کے سایۂ عاطفت میں اردو زبان کے جتنے مشاہیر ملتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ کسی غیر ملکی زبان میں صاحب طرز ہونا اور اس کی ادبیات میں ممتاز مقام پالنے سے کہیں بہتر ہوگا کہ اپنی زبان میں دوسری اعلیٰ زبانوں کی سی شیرینی اور لطافت حسن پیدا کیا جائے ... ... (چنانچہ) ... ان کی تربیت ریختہ گوئی کی طرف میلان پیدا کرنے میں خاص طور پر معاون ہوئی۔ آرزو کا اردو کلام تقریباً نایاب ہے۔ صرف تذکروں میں چند متفرق اشعار مل جاتے ہیں۔ اس کمی کی وجہ ان کی کم گوئی معلوم ہوتی ہے جس کی جانب تقریباً سبھی تذکرہ نگاروں نے اشارہ کیا ہے..."[1]

مرزا مظہر کا کلام کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے خان آرزو کے کلام پر بھاری ہے۔ انھوں نے اردو میں غالباً باقاعدہ دیوان بھی مرتب

---

[1] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر ص ۲۵۰ : ۲۵۱

کیا تھا۔[1] لیکن ابھی تک اس کے کسی مکمل نسخے کا سراغ نہیں ملا ہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے مرزا صاحب کے کلام کی اہمیت یہ ہے کہ اسے فارسی شاعری کے معیار طرز فکر اور میلانات کے ایک تقلیدی نمونے کے طور پر کار آزمودہ اور جوان سال فن کاروں کی اس ملی جلی نسل کے سامنے پیش کیا گیا تھا جس کی کوششوں سے شمالی ہند میں اُردو شاعری کے اس ابتدائی دور میں اس کی ترقی کے امکانات وابستہ تھے، اور جو بڑی تیزی سے ایہام گوئی کے دھارے میں بہی جا رہی تھی۔ مظہر کے اس اجتہاد سے فن کاروں اور بالخصوص نوجوان شاعروں کی ایک پوری نسل متاثر ہوئی۔ الفاظ کے اُلٹ پھیر اور صنعتوں کی طلسم بندی میں اُلجھے رہنے کے بجائے خیالات کی ندرت و جدت، اسلوب کی لطافت و تازگی اور زبان کی سادگی و صفائی کی اہمیت محسوس کی گئی اور بحیثیت مجموعی ان تمام روایات کو جو نیم اسلامی و نیم عجمی تہذیب اور ہندوستانی تمدن کے اختلاط و ارتباط سے معرضِ وجود میں آئی تھیں، اردو زبان اور اس کی شاعری کے دامن میں سمو دیا گیا۔ زبان و ادب کی یہی تہذیب اُردو کو میرزا مظہر کی سب سے بڑی دین ہے۔

خانِ آرزو اور مرزا مظہر کی رہنمائی میں کامیابی کی منزلیں طے کرنے والی اس ادبی و لسانی تحریک کے ابتدائی دور میں جن شعرا نے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیا اور حالات کی نبض پہچانی، ان میں شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، مصطفےٰ خاں یکرنگ اور محمد شاکر ناجی، صدرالدین فائز اور شاہ حاتم کی خدمات خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ آبرو (متوفی ۱۱۴۶ھ ۱۷۳۳ء) گوالیار کے رہنے والے تھے

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۰۲

لیکن ابتدائے جوانی ہی سے انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی[1]۔ وہ عمر میں آرزو سے بڑے تھے لیکن جب دہلی میں اردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی اور وہ بھی اس کی جانب متوجہ ہوئے تو سن و سال کے تفاوت کا خیال لئے بغیر انھوں نے اپنا کلام خان آرزو کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کیا۔ ایہام گو شعراء میں ان کا نام سرفہرست ہے اور اب تک ان کے دیوان کے چار مکمل نسخے دستیاب ہو چکے ہیں۔ میاں شرف الدین مضمون کو قصبہ جاجمو (مضافات آگرہ) سے وطنی نسبت تھی لیکن آغاز جوانی ہی میں دہلی چلے آئے تھے۔ وہیں ۱۱۴۷ھ میں وفات پائی۔ میر اور میر حسن نے انھیں خان آرزو کے تلامذہ میں شمار کیا ہے[2]۔ لیکن گردیزی آرزو اور مظہر دونوں سے استفادے کا ذکر کرتے ہیں[3]۔ میر کے بیان کے مطابق ان کا اردو دیوان تقریباً دو سو اشعار پر مشتمل تھا[4]۔ میر صاحب کے اس اعتراف کے علاوہ کہ مضمون اگرچہ کم گو تھے لیکن بڑے خوش فکر شاعر تھے، ان کی عظمت سودا کے اس شعر سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے ان کی وفات کے صدمے سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

ہوا ہیں اُٹھ گئیں یاروں غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

مصطفیٰ خاں یکرنگ بھی شاہ آبرو کے معاصر اور خان آرزو کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے ایک قول کے مطابق آبرو سے مشورۂ سخن کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان کی ذاتی

---

[1] نکات الشعراء طبع ثانی ص ۹

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۵ و تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۴۶

[3] تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۳۵ و ۷

[4] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۵

رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کے بقول "از مجوائے کلامش می تراود کہ شاگرد مرزا مظہر خواہد بود"[1] قائم، یک رنگ کے اردو دیوان کی ترتیب اور اس کے براہِ راست مطالعے کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے اشعار کی تعداد پانچسو کے قریب بتاتے ہیں[2]۔

محمد شاکر ناجی کو بھی تذکرہ نگاروں نے آبرو کے معاصرین ہی میں شمار کیا ہے میر صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان زیادہ تر ظریفانہ شاعری کی طرف تھا[3]۔ تاہم ایہام گوئی کی بندشوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے یہاں اچھے اشعار کی بھی کمی نہیں۔ مصحفی ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۹ھ کے درمیان لکھتے ہیں کہ "دیوان او ہنوز در دہلی بر صفحہ روزگار یادگار است"[4] مرزا کاظم مبتلا لکھنوی نے ان کے اشعار کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب بتائی ہے[5]۔ ان کا ایک مخمس کافی مشہور ہے جس میں انھوں نے نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۱ھ ۱۷۳۹ء) کے وقت دہلی کے شاہی دربار اور لشکر کا حالِ زار نظم کیا ہے[6]۔

ناثر دہلوی (متوفی ۱۱۵۱ھ ۱۷۳۰ء) نام و نمود سے اجتناب یا شعر و سخن کی عام محفلوں سے بے تعلقی کے باعث اپنے زمانے میں شہرت و مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ ان کا نام اور کلام ان کے دیوان کی اشاعت کے بعد روشنی میں آیا ہے۔ اس دیوان میں دو تین کی زمینوں میں متعدد غزلیں ملتی ہیں جن سے

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۰۸ [3] مخزن نکات ص ۱۷

[2] نکات الشعرا ص ۲۳ [4] تذکرہ ہندی ۲۵۸

[5] گلشن سخن، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ص ۲۳۲

[6] ڈاکٹر نفضل حق استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی کوشش سے حال ہی میں دیوان ناجی کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

دہلی میں اُردو کے اس عظیم اور عہد ساز شاعر کی مقبولیت اور اس کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ مرتب دیوان پروفیسر مسعود حسن رضوی کا خیال ہے کہ فائز شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں جنھوں نے ولی کے دیوان کی آمد سے قبل ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء میں اپنا کلام مدون کر لیا تھا۔[۱] لیکن قاضی عبدالودود اس رائے سے متفق نہیں۔ ان کے خیال میں اُردو کلام ۱۱۴۲ھ/۳۰-۱۷۲۹ء میں کلیات پر نظرثانی کے وقت شامل کیا گیا ہے۔[۲] حقیقتِ حال کچھ بھی ہو فائز کے کلام کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ وہ ان گنے چنے شعراء میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں جنھوں نے اپنی کوششوں سے ارتقا کے ابتدائی مراحل ہی میں شمالی ہند کی اُردو شاعری کو ارباب نظر کے لئے درخورِ اعتنا بنا دیا تھا۔

شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۰، ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۲ء تک زندہ رہے۔ عمر کے اس طویل دور میں انھوں نے ایہام گوئی کی تحریک کی قیادت بھی کی اور مرزا مظہر کے اصلاحی اقدام کے اثرات بھی قبول کیئے۔ ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۰ء کے قریب انھوں نے اپنا پہلا اردو دیوان مرتب کیا۔ اس کے بعد عزیزالدین عالمگیر ثانی کے پہلے سال جلوس (۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۵ء) میں جبکہ انھیں ایہام گوئی کی روش اور فارسی کے حروف جار (در، براور از وغیرہ) اور دوسرے اغلاق زدہ الفاظ کے استعمال سے کنارہ کش ہوئے تقریباً بارہ برس گزر چکے تھے "دیوان زادہ" کے نام سے ایک اور مجموعہ ترتیب دیا۔ اس مجموعے میں انھوں نے اپنے پرانے

---

[۱] فائز دہلوی اور دیوانِ فائز ص ۷۵، ۷۷

[۲] عیار ستان ص ۶۵ و ۷۵ — [۳] معاصر ۳ ص ۳۲ و ۴۴

کلام سے وہ اشعار انتخاب کر کے شامل کئے جن پر رنگ قدیم کے اثرات غالباً نہ تھے یا جن میں پچھلے دس بارہ سال کے دوران شعوری طور پر نئے اندازِ سخن کی تقلید کی گئی تھی۔ ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل اور زبان کی اصلاح کا یہ رجحان جس نے انھیں اُردو زبان اور شاعری کے محسنوں میں شامل کر دیا ہے، ان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ غزلوں کے علاوہ حاتم نے کچھ قصیدے اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔

آبرو، مضمون، یکرنگ اور ان کے ہم نواؤں کی فکری کاوشوں سے مالامال ہو کر بارہویں صدی ہجری کے وسط میں اردو شاعری کی روایت حاتم اور مرزا مظہر کے جن جواں سال اور جوان فکر معاصرین تک پہنچی ان میں مرزا رفیع سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ، ۱۷۸۱ء) خواجہ میر درد (متوفی ۱۱۹۹ھ، ۱۷۸۴ء) میر تقی میر (متوفی ۱۲۲۵ھ، ۱۸۱۰ء) اور میر سوز (متوفی ۱۲۱۳ھ، ۹۹-۱۷۹۸ء) سرِ فہرست ہیں۔ سودا کو شاہ حاتم نے "دیوان زادہ" میں اپنے شاگردوں کے زمرے میں شمار کیا ہے وہ اپنی اس خوش قسمتی پر نازاں بھی تھے کہ انھیں ایسا استادِ زمانہ شاگرد ملا۔[1] سیکن خیراتی لال بے جگر نے "نشترِ عشق" مولفہ حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سودا خان آرزو کے مشورے سے جو انھیں ان کے فارسی کلام پر اصلاح دیتے تھے ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوئے۔[2] قاسم نے بھی انھیں آرزو کے خرمنِ فیض کا خوشہ چیں قرار دیا ہے۔[3] بہر صورت سودا کی کوششوں سے اُردو

---

[1] مجموعہ نغز جلد اوّل ص ۱۰۰ [2] تذکرہ بے جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۸۵ [3] مجموعہ نغز جلد اوّل ص ۲۲

شاعری کو فکر و فن کی جو دولت ملی وہ اپنی انفرادیت، تنوع اور ہمہ گیری کے لحاظ سے اُردو کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی غرض کہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر میدان میں اپنی قادر الکلامی اور ندرتِ فکر کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ بالخصوص قصیدہ نگاری اور ہجو گوئی میں انھوں نے جس کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بقول ان کی غزلیں بھی کسی طرح قصائد سے کم پایہ نہیں[1]۔ میر نے تمام اصنافِ سخن میں ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ "سرآمدِ شعرائے ہندی اوست ... ... ملک الشعرائے ریختہ او را شاید[2]۔"

درد نے اگرچہ بہت مختصر مجموعۂ کلام یادگار چھوڑا ہے لیکن میر حسن کے بقول ان کا کلام حافظ کے کلام کی طرح سراپا انتخاب[3] ہے۔ اُردو شاعری کو مقبولِ عام بنانے میں ان کی غزلوں کی سادگی، سوز و گداز اور کیف و مستی کا بڑا حصہ ہے۔ اُردو شاعری سے ان کا شغف اس اعتبار سے بھی سود مند ثابت ہوا کہ وہ ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو عرصے سے رشد و ہدایت اور دینی و دنیوی علوم کا مرکز تھا۔ ان جیسے ثقہ اور صاحبِ طریقت بزرگ کو ریختہ گوئی کی جانب ملتفت پا کر ان لوگوں کے لئے اعتراض کا کوئی موقع نہ رہا جو اُردو میں طبع آزمائی کو علمی مرتبے اور وقار کے منافی سمجھتے تھے۔

میر ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنھیں اپنے زمانے میں بھی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اور آج بھی اس صنف میں غالب اور

---

[1] گلستانِ بے خار طبع اوّل ص ۱۲۲
[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۲۱
[3] تذکرۂ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۶۶

اقبال کے علاوہ کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ ان کی یہ مقبولیت ان کی طبیعت اور غزل کے مزاج کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ ان کی طبیعت کے سوز و گداز اور زبان کے رموز و نکات سے واقفیت نے اردو غزل کو اور اردو غزل نے ان کی شخصیت کو حیاتِ دوام عطا کی ہے۔ ان کی مثنویاں بھی سودا کی مثنویوں سے بلند پایہ ہیں لیکن قصیدے کے میدان میں سودا کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ انھوں نے تقریباً نوے سال کی عمر پاکر ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ اس اعتبار سے وہ اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک نسل کے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی میں اپنی منزل کا تعین کیا، دوسری نسل کے درمیان ایک استاد فن کی حیثیت حاصل کی اور تیسری نسل کی رہنمائی کے فرائض انجام دئے۔ میر سوز کا پایہ ادبی حیثیت سے سودا، درد اور میر سے کم تر ہے لیکن اپنے مخصوص "طرز ادائیہ" کی بدولت جو انھیں کی ایجاد تھا، وہ اس زمانے میں کافی مقبول ہوئے اور انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کو بھی کسی حد تک متاثر کیا۔ اس لئے اردو کے صاحب طرز شعرا اور عہد ساز شخصیتوں کی فہرست میں ان کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ اس دور کے دوسرے خوش فکر اور خوش سلیقہ شعرا میں اشرف علی خاں فغاں، عبدالحئی تاباں، انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، محمد فقیہہ دردمند، احسن الدین خاں بیان، میر محمد حسن کلیم، میر ضیا، میر محمدی بیدار اور قائم چاند پوری کے نام آتے ہیں۔ فغاں ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء کے قریب پیدا ہوئے۔ انھوں نے شاعری کی ابتدائی منزلیں دہلی میں طے کیں اور اپنی طباعی کی بدولت جلد ہی ہم عصر شعرا میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ احمد شاہ درانی کے حملوں میں دہلی کی تباہی کے بعد سے ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء (سالِ وفات) تک انھوں نے اپنی

زندگی کے بیش قیمت ایام مرشد آباد اور پٹنہ میں گزارے جہاں ان کے دم
سے اُردو شاعری کا چراغ روشن ہوا۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے
علاوہ کچھ ہجویہ اور بیانیہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ تاباں حاتم کے شاگرد تھے
انھوں نے ۱۱۶۱ھ، ۱۷۴۸ء اور ۱۱۶۵ھ، ۱۷۵۲ء کے درمیان عین عالم شباب
میں وفات پائی۔ اپنی فکر سخن کے مختصر دور میں انھوں نے جس خوش
اسلوبی کے ساتھ عروس غزل کے گیسو سنوارے وہ اس سے ظاہر ہے کہ خود
ان کے استاد شاہ حاتم نے ان کی زمینوں میں غزلیں کہیں۔ بعض تذکرہ نگار
راوی ہیں کہ ان کے مکان پر ہمیشہ شعرا کا مجمع رہا کرتا تھا[1]۔

یقین، حزیں، دردمند اور بیان مرزا مظہر کے تلامذہ ہیں۔ تذکرہ
نگاروں کا بیان ہے کہ مظہر اپنے شاگردوں کی اصلاح و تربیت ہی کے
لئے اُردو میں فکر سخن کیا کرتے تھے[2]۔ یقین ۱۱۶۹ھ، ۱۷۵۶ء میں تیس سال
کی عمر میں اپنے باپ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ زندگی کے اس مختصر عرصے میں
وہ اُردو کلام کا اچھا خاصا سرمایہ جمع کر چکے تھے۔ مصحفی نے ان کے بارے
میں لکھا ہے کہ "در دورہ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ راشستہ و رفتہ
گفتہ، ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگران رسیدہ"[3]۔ بعض روایتوں سے
پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے سخن شناسوں کے ایک خاص طبقے میں یقین
کو کافی مقبولیت حاصل تھی۔ حتیٰ کہ بعض لوگ انھیں سودا سے بھی افضل و بہتر
خیال کرتے تھے[4]۔ جبکہ بعض لوگ معاصرانہ رقابت پر ان کی موزونیٔ طبع سے

۱؎ تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۳۵

۲؎ مخزن نکات نسخہ لندن ذکر مظہر و تذکرہ ہندی ص ۲۰۳

۳؎ تذکرہ ہندی ص ۱۷۵ — ۴؎ چمنستان شعرا ص ۱۶ و ۱۶۳

ہی بخیر منکر تھے۔ حزیںؔ، تذکرۂ گردیزی کی تکمیل (۱۵ محرم ۱۱۶۶ھ/ ۱۳ نومبر ۱۷۵۲ء) سے قبل وفات پا چکے تھے[1]۔ ان کا اصلی وطن عظیم آباد تھا۔ لیکن ان کی شاعری دہلی کی ادبی فضا میں پروان چڑھی اور وہیں انھوں نے اردو کے دو دیوان مرتب کیے۔ دوسرا دیوان جو نسبتاً مختصر تھا، دیوان یقین کے جواب میں نظم کیا تھا[2]۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد سے انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام مرشد آباد اور عظیم آباد میں گزارے[3]۔ فغاںؔ کی طرح ان کا کارنامہ بھی یہی ہے کہ ان کی کوششیں ان دونوں مقامات پر اردو شاعری کی ترقی کے امکانات کو وسیع تر کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔

دردمند کی ولادت اودگیر (علاقہ بیدر) میں ہوئی تھی۔ وہاں سے ۱۱۳۶ھ/ ۲۴-۱۷۲۳ء میں وہ اپنے والد کی معیت میں دہلی آئے[4]۔ دہلی میں ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء میں یا اس سے کچھ قبل انھوں نے اپنی مشہور مثنوی "ساقی نامہ" نظم کی۔ اس کے بعد ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء کے قریب وہ مرشد آباد چلے گئے[5]۔ جہاں (۱۱۷۶ھ/ ۶۳-۱۷۶۲ء) ان کا انتقال ہو گیا[6]۔ تذکروں میں ان کی غزلوں کے کچھ اشعار بھی ملتے ہیں لیکن شعر و ادب کی انجمن میں ان کا وقار دراصل "ساقی نامہ" کی وجہ سے قائم ہے جس کے بے شمار اشعار محمد شاہ کے دور (۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء - ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) میں اور اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک زبان زد خاص و عام رہے[7]۔ اس مثنوی میں انھوں نے زبان اور

---

[1] تذکرۂ ریختہ گویان۔ ص ۴۷ [2] تذکرۂ شورش۔ دو تذکرے جلد اول ص ۲۲۱

[3] دو تذکرے ص۔ ۲۲۱، ۲۲۲

[4] دیکھیے ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، شمارہ ماہ جولائی ۱۹۶۲ء ص ۲۲

[5] گلشن ہند طبع ثانی ص ۱۳۰ [6] گلشن سخن مطبوعہ ص ۱۳۰

فن کو جس سلیقے کے ساتھ برتا ہے اس کے پیش نظر ہم انھیں اس دور کے نمائندہ شاعروں کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتے۔

خواجہ احسن الدین خاں بیاںؔ کے بارے میں بعض لوگوں کا بیان ہے کہ وہ آگرے میں پیدا ہوئے[۱]۔ جبکہ بعض تذکرہ نگار دہلی کو ان کا مولد قرار دیتے ہیں[۲]۔ لیکن یہ بات بہرحال مسلم ہے کہ ان کی شاعری کی نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کا کلام نہایت مقبول تھا[۳]۔ تمام ہم عصر ریختہ گو ان کی غزل سرائی کے معترف تھے[۴]۔ اور انھیں "مربوط گو" اور "صاحب زبان" شعرا میں شمار کرتے تھے[۵]۔ عمر کا آخری حصہ الغول نے حیدرآباد دکن میں بسر کیا۔ ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء میں انکی وفات ہوئی محمد حسین کلیم، خان آرزو اور میر تقی میر سے "قرابت قریبہ" رکھتے تھے[۶]۔ میر حسن نے انھیں "شاعر زبردست و مشاق قدیم" اور "فن شعر و شاعری" میں استاد سخن" کہا ہے[۷]۔ قائم کا بیان ہے کہ انھوں نے علم عروض و قوافی میں کئی رسالے تصنیف کئے تھے[۸]۔ "فصوص الحکم" کے ترجمے اور "دہ مجلس ہندی" کے علاوہ "نثر ہندی" کی ایک نامعلوم الاسم کتاب بھی ان سے منسوب ہے۔

میر ضیا دہلوی میر کے شاگرد اور میر حسن کے استاد تھے۔ میر صاحب کے علاوہ

---

[۱] تذکرہ ریختہ گویان ص ۲۷، تذکرہ شورش۔ دو تذکرے جلد اول ص ۸۳ و گلشن سخن ص ۶۸

[۲] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۲۷ [۳] دستور الفصاحت، مرتبہ عرشی ص ۸۲

[۴] دو تذکرے (تذکرہ عشقی) جلد اول ص ۸۴ [۵] تذکرہ ہندی ص ۳۶

[۶] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۲۸

[۷] تذکرہ شعرائے اردو۔ طبع ثانی ص ۱۲۸

[۸] مخزن نکات۔ ص ۴۳

انھوں نے مرزا محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد کی صحبت اٹھائی تھی اور انکی ہم مجلسی کے فیض سے فن شاعری میں کمال حاصل کیا تھا[1]۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی میں انھیں خاص مہارت تھی۔ دہلی کی مسلسل تباہیوں کے نتیجے میں انھوں نے جوان العمری ہی میں وہاں سے ترک وطن کر کے عظیم آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی[2]۔ عظیم آباد میں انھوں نے ۴۰ سال سے زیادہ عرصے تک شعر و ادب کی خدمت کی[3]۔ اور بہت سے شاعروں کو اپنی اصلاح و تربیت سے فیض پہنچایا[4]۔

میر محمدی بیدار (متوفی ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء) بڑے خوش فکر غزل گو ہیں ان کی عمر کا بڑا حصہ دہلی میں اور آخری ایام آگرے میں بسر ہوئے۔ انھوں نے خواجہ میر درد سے استفادۂ سخن کیا تھا[5]۔ اردو میں ایک مکمل دیوان ان سے یادگار ہے۔ آگرے کے قیام کے زمانے میں ان کے گرد معتقدین اور تلامذہ کا ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ اس طرح ان کی ادبی و لسانی خدمات اور فیضانِ سخن کا دائرہ دہلی سے آگرے تک پھیلا ہوا ہے۔

قائم چاندپوری میر درد اور میرزا سودا کے شاگرد ہیں۔ وہ "بدو شعور" سے دہلی میں مقیم اور توپ خانۂ شاہی سے متوسل تھے اپنے اس دعوے کے عین مطابق کہ۔

---

[1] تذکرہ عشقی۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۱۴۱

[2] تذکرہ شورش۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۴۰

[3] تذکرہ عشقی۔ دو تذکرے جلد دوم۔ ص ۱۴۱

[4] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۰۰

[5] مجموعۂ نغز جلد اول ص ۱۱۰

قائم ہیں غزل طرازیکساں ریختہ ور نہ اک بات لچرسی بزبان دکنی تھی

زبان کی شستگی اور صفائی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے تقریباً تمام ہی اہم اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن کمال فن کے شاہکار در اصل ان کی غزلوں اور مثنویوں میں ملتے ہیں۔ ہجویہ شاعری میں بھی سودا کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ احمد شاہ کی معزولی (۷۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء) کے غالباً تین چار سال کے اندر قائم نے دہلی سے ترک سکونت کر کے چاند پور چلے گئے۔ اس کے بعد وہ ٹانڈہ اور رام پور کے درباروں سے وابستہ رہے۔ ۱۲۰۸ھ ۹۴-۱۷۹۳ء میں رام پور ہی میں انکا انتقال ہوا

یہاں ہم نے شعرا کی جس نئی نسل کا ذکر کیا ہے وہ بنیادی طور پر محمد شاہ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نسل کا دور شباب گویا اردو شاعری کا عہد شباب ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اس دور کی مثال مجنوں صاحب کے بقول انگریزی ادبیات میں دور الزبتھ کی سی ہے جو شعر و موسیقی کا دور تھا۔ دہلی میں اس زمانے میں جتنے خوش گو اور باکمال شاعر یکجا ہو گئے تھے آئندہ کسی زمانے میں بیک وقت کسی ایک جگہ جمع نہ ہو سکے اور نہ کسی دور میں اردو زبان اور شاعری کو اس حیرت انگیز رفتار سے ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ سودا، درد اور میر جن میں سے ہر شخص بجائے خود ایک عہد کی حیثیت رکھتا ہے، اس دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے شعرا زیادہ سرگرم اور نمایاں نظر آتے ہیں وہ بھی آئندہ اردو کے اساتذہ سے کسی طرح کم پایہ نہیں۔ اس دور کے شعرا کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آنے والے چند برسوں میں ان میں سے اکثر نے مغل سلطنت کی زوال آمادگی

ا۔ نقوش و افکار۔ ص ۱۹۶

اور بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کے نتیجے میں غریب الوطنی کو گلے لگانے اور نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کی یہ مجبوری اُردو کے نئے مراکز کے لئے سامانِ وجود بن گئی۔ چنانچہ فرخ آباد، ٹانڈہ، رام پور، اکبر آباد، فیض آباد، لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشد آباد میں انھیں لوگوں کے طفیل اہلِ نظر کی تازہ بستیاں آباد ہوئیں۔ مختصر یہ کہ اس دور کے شعرا کی مسلسل جد و جہد اور روایت شکنی اور روایت سازی کے عزم ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ محمد شاہ کے عہد کے ختم ہوتے ہوئے اردو دہلی کی ادبی فضا میں نہ صرف اجنبی نہ رہی تھی بلکہ اس کی رونق اور زیب و زینت کا سامان بن چکی تھی۔ شعر و ادب کی محفلوں میں فارسی کے ساتھ اُردو کے اشعار بھی اعتماد کے ساتھ پڑھے اور دلچسپی سے سُنے جانے لگے تھے۔ "یارانِ ریختہ گو" "مراختہ" کے نام سے اپنی علیحدہ مجلسیں بھی منعقد کرتے تھے۔ میرؔ نے اپنے اور خواجہ میر دردؔ کے علاوہ سجّاد اکبر آبادی، جعفر علی خاں ذکی، میر علی کافر اور حافظ حلیم کے یہاں مختلف اوقات میں اس قسم کی محفلوں کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ قائم چاندپوری کے بعض بیانات بھی ان محفلوں میں شعرا اور عوام کی عمومی دلچسپی اور پابندی کے ساتھ شرکت کا پتہ دیتے ہیں۔ شاعروں سے اس عام دلچسپی کے پہلو بہ پہلو کلام کی باقاعدہ ترتیب و تدوین اور بیاضوں کی صورت میں دوسرے شعرا کے منتخب اشعار یکجا کرنے کا شوق بھی عام ہو چلا تھا۔ اس ذوق و شوق کے سلسلے دراز تر ہو کر تذکرہ نویسی کے محرک ہوئے اور فارسی تذکروں کے نمونوں پر شعرائے اُردو کے حالات و اشعار کتابی صورت میں مدوّن کئے جانے لگے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اُردو شاعری کی اس عام مقبولیت اور ترقی کے باوجود اس زمانے تک ارباب علم کے ذہنوں کو فارسی کی عظمت و برتری کے نقوش پوری طرح محو نہ ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اُردو کا دائرہ عمل صرف روزمرہ گفتگو اور شاعری تک محدود تھا اور زندگی کے دوسرے تمام شعبے بدستور فارسی کے زیر اثر تھے دفتری اور کاروباری امور میں گزری ہوئی کئی صدیوں کی طرح وہ اب بھی اختیارات کلی کی حامل تھی، خطوط، دستاویزات، معاہدے، سرکاری احکام، شرعی فتوے اور عدالتی فیصلے سب فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اردو کی تحریک کے علمبردار اور نئی شعری روایت کے نقیب تھے۔ جب نثر میں کسی موضوع پر اظہار خیال کے لئے قلم اٹھاتے تو فارسی کا سہارا لیتے تھے۔ گویا فارسی ابھی تک لوگوں کی ایک متبرک میراث، علمی استعداد کے ایک پیمانے، ثقاہت کی ایک دلیل، درباری تہذیب کے ایک نشان اور شاہی سرپرستی کے ایک مجرب کے طور پر زندہ تھی اور اُردو اپنے اندر اتنی توانائی پیدا نہ کر پائی تھی کہ ہر میدان میں اسے شکست دے سکے وہ ابھی صرف متوسط طبقے اور عوام النّاس کے درمیان تہذیبی و ثقافتی ربط کا ایک ذریعہ تھی، عوام اور طبقہ اعلیٰ کے نمائندے اس کے واسطے سے ایک رشتے میں منسلک نہ ہو سکے تھے یہی وجہ ہے کہ ایک ایک مختصر دیوان کے علاوہ درد دہلوی اور خواجہ میر درد کی تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔ میر نے اپنی سرگذشت "ذکر میر" فارسی ہی میں لکھی ہے اور ان سب سے بڑھ کر شاہ حاتم نے "دیوان زادہ" پر فارسی ہی میں دیباچہ تحریر کیا ہے۔ شمالی ہند کی طرح دکن میں

بھی مغلوں کے تسلط کے بعد سے برابر فارسی ہی کا سکہ چل رہا تھا۔ انھیں حالات میں جب اس زمانے کے کچھ اہلِ قلم اپنے شعرا کے تذکروں کی ترتیب کی طرف راغب ہوئے تو انھیں ذریعہ اظہار کے طور پر فارسی کو اپنانے کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا۔ چنانچہ اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں اکثریت ایسے ہی تذکروں کی ہے جو فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

شعرائے اُردو کا اوّلین تذکرہ۔

شعرائے اردو کے جس قدر تذکرے اب تک دستیاب ہو چکے ہیں ان میں بہ اعتبارِ قدامت میر تقی میر کے "نکات الشعرا"، سید فتح علی گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویان"، حمید اورنگ آبادی کے "گلشن گفتار"، قایم چاندپوری کے "مخزنِ نکات" اور عنایت اللہ فتوت کے "ریاضِ حسنی کو سرِ فہرست رکھا جاتا ہے۔ "تذکرہ ریختہ گویان کے علاوہ ان تمام تذکروں کے مولفین نے کسی نہ کسی صورت میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اُردو میں اس فن کے موسس ہیں اور ان کا تذکرہ ریختہ گویوں کا پہلا تذکرہ ہے۔ چنانچہ میر صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلٰی شاہجہاں آباد دہلی، کتابے تاحال تصنیف نہ شدہ کہ احوالِ شاعرانِ ایں فن بصفحہ روزگار بماند بنا بر علیہ ایں تذکرہ کہ مسمّی بہ نکات الشعرا است نگاشتہ می شود[1]"

قایم چاندپوری نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے

"بر ضمیر مہر تنویر سخن طرازانِ ہندوستان ... مخفی و محتجب

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۔

مانند کہ الی الآن در ذکر و بیانِ اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف
نہ گردیدہ و تا ایں زماں ہیچ احدے از ماجرائے شوق افزائے
سخنورانِ ایں فن سطرے بتالیف نرسانیدہ بنا بریں فقیر مولف
بعد کوشش تمام وسعی مالاکلام دواوین ایں اعزہ فراہم آوردہ
پارہ ابیات از ہر کلام بر سبیلِ یادگار در ذیل ایں بیاض کہ بہ "مخزن
نکات" موسوم است بہ قیدِ قلم در آوردہ۔"[1]

حمید نے واضح طور پر اولیت کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے اپنے تذکرہ کو "مضامین
تازہ" کی پیش کش سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"خواستم کہ شغلے پیش بگیرم و تذکرۃ الشعرا نویسم لیکن چوں عبارت آرایان
معنی طراز اکثر تذکرۃ الشعرائے فارسیہ بحیطہ تحریر آوردہ اند تالیف
آں تحصیلِ حاصل می انجامد بنا بریں تذکرۃ الشعرائے ہندیہ ترتیب دادم
و بہ مضامین تازہ و لہارا گلشن گلشن ساختم و نامش "گلشنِ گفتار"
نہادم۔"[2]

نصرت کو ان کے بقول مجمع النفائس (مولفہ خان آرزو) کے مطالعے سے یہ
تحریک ملی ہے کہ۔

"ایجادِ تذکرہ ہندی خالی از ندرت نیست۔"[3]

سرسری اندازوں کے مطابق یہ بیانات ۱۱۶۵ھ، ۱۱۶۸ھ اور ۱۱۷۲ھ میں
سپردِ قلم کئے گئے ہیں، اس لئے بیک وقت ان سب کا درست ہونا بظاہر

۱؎ مخزن نکات مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق اب

۲؎ گلشن گفتار مرتبہ سید محمد ایم اے ص ۴

۳؎ ریاض حسنی مخطوطہ سینٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد ص ۲۲

ممکن نہیں اس کے باوجود ناقابل انکار حقائق و واقعات کی روشنی میں فتوت کے علاوہ باقی تذکرہ نگاروں کی صداقت اور نیک نیتی پر شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے کے زمانۂ تالیف کی صراحت نہیں کی ہے لیکن ان کے یہاں ایسی شہادتیں بکثرت موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ کے ربع ثالث (۱۷۵۲ء) میں اس کی ترتیب سے فراغت پا چکے تھے[1]۔ "گلشن گفتار" بھی مؤلف کے قطعۂ تاریخ کے بموجب اسی سال کی تالیف ہے۔

قائم کے تذکرے کا سال ترتیب بالعموم اس کے نام کے اعداد کی بنا پر ۱۱۶۸ھ (۱۷۵۵ء) قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ مؤلف کی بعض تصریحات سے بالواسطہ طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کا کام ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء کے قریب شروع ہو چکا تھا اور یہ نام اختتام کار کے مرحلے میں خواجہ اکرم کے قطعۂ تاریخ سے اخذ کیا گیا ہے۔ "ریاض حسنی" اس تذکرے کے بھی کئی برس بعد ۱۱۷۳ھ/۶۰-۱۷۵۹ء میں مرتب ہوا ہے۔ ایسی صورت میں بصرف نظر اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں کہ:

(الف) شمالی ہند میں میر صاحب کو اور دکن میں حمید اورنگ آبادی کو پہلی بار شعرائے اردو کے تذکرے کی ترتیب کا فخر حاصل ہے۔

(ب) "ایجاد تذکرۂ ہندی" سے متعلق فتوت کا دعویٰ ایک بے بنیاد

---

[1] اس قسم کے موضوعات پر مفصل بحث آئندہ ابواب میں متعلقہ تذکروں کے تفصیلی جائزے کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اور گراہ کن تعلّی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

(ج) "قائم کا یہ قول ہے کہ اب تک سخنورانِ ریختہ کے احوال و اشعار کے بارے میں کوئی کتاب مرتب نہیں ہوئی ہے، اس لحاظ سے اپنی جگہ درست ہے کہ ۱۱۶۵ھ تا ۱۱۶۸ھ تک جب کہ مخزنِ نکات کا آغاز ہوا تھا۔ شعرائے اُردو کے کسی تذکرے کی تالیف کا سراغ نہیں ملتا۔

ان حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور بعض دوسرے اہلِ قلم نے میر کو تذکرہ نگاری میں شرفِ اولیت کا واحد حقدار ٹھہرایا ہے۔ ان کی نظر میں حمید اورنگ آبادی اس لئے کسی اہمیت کے مستحق نہیں کہ ان کا تذکرہ دکن سے تعلق رکھتا ہے اور میر ان کے وجود سے باخبر نہیں تھے[1]۔ اسی طرح بعض مصنفین "نکات الشعراء" اور "مخزنِ نکات" کی تقدیم و تاخیر پر بحث کے سلسلے میں بھی افراط تفریط کے شکار ہوئے ہیں۔ گارساں دتاسی قائم کے دعوے کی صداقت پر شک کے اظہار کا اپنا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال میں انھوں نے سرقے کے الزام سے بچنے کے لئے سخن سازی کی راہ اختیار کی ہے[2]۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی انھیں میر کا نقال یا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں[3]۔ ڈاکٹر کے نزدیک انھوں نے تذکرہ نویسی میں صرف میر کے اسلوب ہی کا تتبع

---

[1] مقدمہ "نکات الشعرا" از مولوی عبدالحق ص الف؛ ج، شعرائے اردو کے تذکرے از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۵؛ اردو تنقید کی تاریخ از مسیح الزماں ص ۱۸

[2] گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے ص ۵۶-۶۸

[3] " " " " حاشیہ مرتب ص ۵۸

نہیں کیا ہے، ان کی ترکیبیں اور عبارتیں تک اڑا لی ہیں[1]۔ نیاز فتحپوری کے الفاظ میں قائم کا تذکرہ بالکل "نکات الشعرا" کا چربہ ہے[2]۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کے بموجب "مخزن" کے اوراق سے صاف طور پر میر کے تذکرے کے اثرات مترشح ہوتے ہیں[3]، اس کے برعکس نثار احمد فاروقی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "میر دہلی میں قائم کے ہمسایہ تھے اس لئے انھیں "مخزنِ نکات" کی تالیف کا علم ہوگا لیکن انھوں نے عمداً اس سے چشم پوشی کی ہے اور تقدم کا شرف خود حاصل کرنا چاہا ہے[4]۔ اس قسم کی تمام رائیں یا تو ناواقفیت کا نتیجہ ہیں یا محض مفروضہ دلائل پر مبنی ہیں۔ قائم چونکہ "نکات الشعرا" کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے اپنے تذکرے کا آغاز کر چکے تھے اس لئے ان کے معاملے میں دروغ بیانی یا میر صاحب کے تذکرے سے ناروا طور پر استفادے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس اصول کے پیش نظر کہ مختلف کتابوں کے درمیان تاریخی ترتیب ان کے سنین اختتام کا لحاظ رکھ کر ہی قائم کی جا سکتی ہے، "نکات الشعرا" اور "گلشنِ گفتار" کو مخزنِ نکات اور دوسرے تمام تذکروں پر تقدم حاصل ہے۔

بعض ناقدین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ "نکات الشعرا اور "گلشن گفتار" کی تالیف کے زمانے میں یا اس سے قبل شعرائے اردو کے کچھ اور تذکرے

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۳۴ - ۴۱ - ۴۲ - ۴۳ -

[2] ماہنامہ "نگار" لکھنؤ شمارہ ماہ جون ۱۹۵۶ء ص ۱۴

[3] اردو تنقید کی تاریخ ص ۹۶

[4] دلی کالج میگزین میر نمبر - ص ۱۹۶

بھی مرتب ہوئے تھے جو امتداد زمانہ کی نذر ہو گئے۔ اس خیال کا اولین محرک گردیزی کا یہ بیان ہے کہ

"از ملاحظۂ تذکرہ ہائے اخوانِ زماں کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویانِ ہند محور ساختہ اند و علتِ غائی تالیف شان خوردہ گیری ہمسران دستم ظریفی یا معاصرانست بخاطر فاطر ریخیت کہ تذکرۂ مرقوم سازم بے ردوبدل کی از روئے انصاف خالیاً عن الاعتساف..."[1]

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تحریر کس حد تک صداقت پر مبنی ہے کیونکہ تذکرے کا لب و لہجہ اور اکثر اندراجات یہ باور کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ مولف کی نظر صرف "نکات الشعرا" کے مطالعہ تک محدود رہی ہے اور اخوانِ زماں کی تنقیص کے پردے میں انھوں نے بالواسطہ میر صاحب ہی کو ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس وقت تک خاکسار کا تذکرہ جو "نکات الشعرا" کے "علی الرغم" لکھا گیا تھا مرتب ہو چکا ہو اور گردیزی نے اخفائے حال کی خاطر تذکروں کے لئے صیغہ جمع کے استعمال میں کوئی قباحت محسوس نہ کی ہو۔ بہر نوع اس بیان سے گارساں دتاسی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "تذکرہ ریختہ گویان" کے زمانۂ ترتیب یعنی ۱۷۵۱ء (۱۱۶۵ھ) میں شعرائے اردو کے متعدد تذکرے موجود تھے جن میں سے کچھ میر کے تذکرے سے بھی پہلے مدون ہو چکے تھے۔[2] دتاسی کے بعد جن مصنفین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے بعض کی تحقیق یا قیاسات کے نتائج حسب ذیل ہیں:

(الف) "جہاں تک تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے (تذکرہ) گردیزی کے

---

[1] تذکرہ ریختہ گویان ص ۳

[2] گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے ص ۵۵، ۵۶

زمانے میں یا اس سے کچھ قبل یہ چند تذکرے لکھے گئے تھے

۱۔ تذکرہ سید امام الدین خاں بعہد محمد شاہ
۲۔ تذکرہ خان آرزو
۳۔ تذکرہ میر' نکات الشعرا۔ ۱۱۶۵ھ
۴۔ تذکرہ سودا۔
۵۔ معشوق چہل سالہ خود نوشتہ خاکسار ۱۱۶۵ھ
۶۔ تحفۃ الشعراء مولفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی ۱۱۶۵ھ
۷۔ گلشن گفتار مولفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی۔ ۱۱۶۵ھ

ممکن ہے دو ایک اور بھی تذکرے ہوں جن کا پتہ اب تک نہیں لگا۔ سید امام الدین خاں' خان آرزو' سودا اور خاکسار کے تذکرے ابتک دستیاب نہیں ہوئے' البتہ بعض کتابوں اور تذکروں میں ان کا حوالہ ملتا ہے

(مولوی عبدالحق مقدمہ تذکرہ ریختہ گویان مطبوعہ ۱۹۳۳ء ص ۱۰ و ۱۱)

(ب) "نگارستان الشعرا اور "گلشن گفتار" کے علاوہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی کا تحفۃ الشعرا بھی ۱۱۶۵ھ ہی کی تالیف ہے۔ چند تذکرے میر صاحب سے پہلے بھی لکھے گئے مثلاً تذکرہ سید امام الدین خاں بعہد محمد شاہ جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں دیا ہے۔ تذکرہ خان آرزو مگر یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے۔ تذکرہ سودا' اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعہ نغز میں دیا ہے لیکن اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

غالباً وہ قایم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے۔ بہرحال میر صاحب کے سامنے ان میں سے کوئی تذکرہ نہ تھا اور نہ ابتک یہ دستیاب ہوئے ہیں۔"

(مولوی عبدالحق مقدمہ نکات الشعرا مطبوعہ ۱۹۳۵ء ص ۳ و ۴)

(ج) "کچھ تذکرے میر اور قایم کے تذکروں سے بھی پہلے لکھے جاچکے تھے۔ وہ تذکرے جو ۱۱۶۵ھ میں یا اس سے پہلے تصنیف ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ تذکرہ سید امام الدین (عہد محمد شاہ)
۲۔ تذکرہ خان آرزو۔
۳۔ تذکرہ سودا
۴۔ معشوق چہل سالہ خود نوشتہ خاکسار
۵۔ تحفۃ الشعراء مولفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی (۱۱۶۵ھ)
۶۔ گلشن گفتار مولفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی (۱۱۶۵ھ)

مذکورہ بالا تذکروں میں سے پہلے چار تذکرے ناپید ہیں اور موخرالذکر دو تذکرے دکن سے متعلق ہیں۔ ...... ان حالات میں تذکرۂ میر کو اردو شاعروں کا پہلا "موجود" تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔"

(ڈاکٹر سید عبداللہ۔ شعرائے اردو کے تذکرے ص ۱۵ : ۱۶)

(د) "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ میں یا اس سے قبل (نکات الشعرا کے علاوہ اردو شاعروں کے کچھ تذکرے ضرور لکھے گئے۔ (۱) تذکرہ امام الدین (۲) تذکرہ خان آرزو (۳) تذکرہ

سودا ۱۱۶۴ھ) معشوق چہل سالہ خود نوشتہ خاکسار۔ ۱۱۶۵ھ۔
(۵) تحفۃ الشعراء افضل بیگ ۱۱۶۵ھ (۶) گلشن گفتار حمید۔ ۱۱۶۵ھ۔ ان میں سے پہلے چار نایاب ہیں۔ پانچواں اور چھٹا دکن کے متعلق ہے، اس لئے نکات الشعراء کو پہلا موجودہ تذکرہ قرار دینا صحت اور واقعے کے مطابق ہے"
(ڈاکٹر مسیح الزماں۔ اردو تنقید کی تاریخ حاشیہ ص ۸۱)
(د) "یہ خیال درست نہیں کہ میر تذکرہ نگاری کے موجد ہیں حقیقت یہ ہے کہ انیسویں[1] صدی میں تذکرہ نویسی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہو گیا تھا ___ تذکرہ امام الدین، تذکرہ خان آرزو، تذکرہ سودا، معشوق چہل سالہ خاکسار وغیرہ تو بالیقین میر کے تذکرے سے پہلے لکھے گئے۔ یہ تذکرے موجود نہیں ہیں اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں ان میں تذکرۂ نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے"۔
(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ میر تقی میر ص ۵۲۰ و ۵۲۱)
(ر) "میر کے تذکرے سے پہلے کئی تذکرے موجود تھے۔ محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد کے چند تذکروں کا ذکر کتابوں میں پایا جاتا ہے مثلاً تذکرہ امام الدین جو عہد محمد شاہ میں لکھا گیا۔ دوسرا تذکرہ خان آرزو کا اور

---

[1] انیسویں صدی غالباً مصنف کا سہو قلم ہے۔ میر کا تذکرہ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں مرتب ہوا ہے۔

تیرا سودا کا — لیکن — یہ تذکرے ناپید ہیں۔"

(نیاز فتحپوری۔ ماہنامہ نگار۔ لکھنؤ شمارہ جون ۱۹۵۶ء ص۱۳)

(ز) "اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج میر و درد کے عہد ہی سے ہو گیا تھا اور بعض معاصرین مثلاً محمد یار خان خاکسار، رفیع الدین سودا، سراج الدین علی خان آرزو اور سید امام الدین وغیرہ نے اردو شعرا کے تذکرے بھی مرتب کیے تھے لیکن وہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے"

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ نگار پاکستان "تذکروں کا تذکرہ نمبر" ص۱۲)

ان تمام بیانات کی نوعیت تقریباً یکساں ہے اس لئے ان پر فرداً فرداً تبصرہ کرنے کی بجائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث تذکروں کے متعلق ضروری تفصیلات پیش کر دی جائیں جن کی روشنی میں اصل صورتِ حال کا اندازہ لگایا جا سکے اور اس سلسلے میں جو شکوک و شبہات ہیں ان کا ازالہ ہو جائے۔

(الف) تذکرہ امام الدین۔

اس تذکرے کا ذکر سب سے پہلے میر حسن نے کیا ہے ان کا بیان ہے کہ "سید امام الدین خاں ولد سید معین خاں سرچی کی رسالہ والا شاہی بود در وقت محمد شاہ غفر اللہ لہ۔ او ہم تذکرہ مختصر معاصرین خود نوشتہ است احوالش معلوم نیست"[1]۔

میر حسن کے بعد غالباً انھیں کے تذکرے کے واسطے سے یہی تمام باتیں عشقی عظیم آبادی نے ان الفاظ میں دہرائی ہیں۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی۔ ص ۱۲۹

"سید امام الدین خاں خلف سید معین الدین خاں در عہد سلطنت
محمد شاہ بادشاہ غازی سرچوکی رسالہ والا شاہی بود۔ می
گویند کہ تذکرہ مختصر مشتمل بر احوال و اشعار ریختہ گویان
معاصر خود مرتب ساختہ بود"[1]

ان بیانات سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ امام الدین محمد شاہ کے
عہد (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) میں فوت ہو چکے تھے یا ان کا
تذکرہ اس زمانے میں مرتب ہو گیا تھا عین ممکن ہے کہ وہ محمد شاہ کی
وفات کے بعد "رسالہ والا شاہی" سے وابستہ نہ رہے ہوں اور فراغت
کے انھیں ایام میں تذکرہ ترتیب دیا ہو، یا میر حسن کو جیسا کہ ان کے
آخری جملے سے مترشح ہوتا ہے۔ اس زمانے کے حالات معلوم نہ ہوں
اس قیاس سے قطع نظر "گلزار ابراہیم" کی روایت کے بموجب
امام الدین خاں ملازم سرکار نہ تھے بلکہ پدرش سید معین الدین سرچوکی
رسالہ والا شاہی بود[2]۔ واقعات کا یہ اختلاف تذکرہ میر حسن کی عبارت میں
"معین الدین خاں" اور "سرچوکی" کے درمیان سے کاف بیانیہ (کہ) کے
سقوط کی نشان دہی کرتا ہے اور کاتب یا خود مولف کے قلم سے اس قسم کا سہو
ہونا بعید از امکان نہیں۔ اس لئے دعوے کی صحت کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا
کہ امام الدین میر سے پہلے محمد شاہ کے عہد میں اپنا تذکرہ ترتیب دے چکے تھے

(ب) تذکرہ خان آرزو۔

اس تذکرے کے متعلق ضروری معلومات گذشتہ اوراق میں ہندوستان کے

---

[1] تذکرہ عشقی۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۲۶۴

[2] گلزار ابراہیم مطبوعہ ص ۲۲۷

فارسی تذکروں میں بحث کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے نہ معلوم کیوں اسے شعرائے اردو کے تذکروں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور دوسرے مصنفین نے اس سلسلے میں بلاپس و پیش مولوی صاحب ہی کے ارشاد پر صاد کیا ہے، حتیٰ کہ اس قول کی تائید میں بھی کسی نے تامل نہیں کیا کہ یہ تذکرہ اب نایاب ہے، جب کہ انڈیا آفس لائبریری لندن اور دوسرے غیر ملکی کتب خانوں کے علاوہ اس کے نسخے رضا لائبریری رامپور، خدا بخش لائبریری پٹنہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں بھی موجود ہیں۔

(ج) تذکرۂ سودا۔

اس تذکرے کے نکات الشعرا سے قبل مرتب ہونے کے بارے میں عام غلط فہمی کی بنیاد غالباً شیخ چاند کا یہ استدلال ہے کہ سودا نے قاسم کے بیان کے مطابق اپنے تذکرے میں سعدی دکنی کے اشعار سعدی شیرازی سے منسوب کئے تھے اور میر نے "نکات الشعرا" میں یہ لکھ کر کہ "آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند، خطا ست"، گویا سودا کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ اس لئے سودا کا تذکرہ یقیناً میر کے تذکرے سے پہلے مرتب ہوا ہوگا[1]۔ اس استدلال کی حیثیت اس سے ظاہر ہے کہ میر نے "نکات الشعرا" کے دیباچے میں واضح طور پر شعرائے اردو کے کسی تذکرے کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اگر تذکرۂ سودا ان کے پیش نظر ہوتا تو وہ ہرگز اس قسم کی بات نہ لکھتے۔ قاسم کا تذکرہ بھی جو ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں لکھا گیا ہے اور اس تذکرے کے متعلق ہماری معلومات کا اصل ماخذ ہے

---

[1] سودا، ص ۹۲-۹۳

زمانۂ تالیف کے تعین کا کوئی قرینہ فراہم نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ قاسم سے پہلے کے تذکرہ نگار اس کے وجود سے قطعاً ناآشنا ہیں یہاں تک کہ میر حسن بھی جنھوں نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۲ھ ۱۷۷۸ء میں مکمل کیا ہے، سودا کے حالات زندگی اور مشاغل علمی سے قریبی واقفیت کے باوجود کسی جگہ اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سودا نے یہ تذکرہ میر حسن کے تذکرے کی تکمیل اور اپنی وفات (۱۱۹۵ھ ۱۷۸۱ء) کے درمیانی حصہ میں مرتب کیا ہوگا۔ مولوی عبدالحق کا یہ قیاس بھی کہ قاسم نے بربنائے سہو قائم کے تذکرے کو سودا کی تالیف سمجھ لیا ہے، اس بنا پر محل نظر ہے کہ انھوں نے جن اشعار کے انتساب یا تصحیح متن کے سلسلے میں تذکرہ سودا کے حوالے دیئے ہیں ان میں سے قائم کے یہاں صرف ایک شعر ملتا ہے اور وہ بھی لفظی اعتبار سے قاسم کے نقل کیے ہوئے شعر سے کافی مختلف ہے۔

(ی) تذکرۂ خاکسار۔

خاکسار کے ذکر میں میر نے لکھا ہے کہ:

"علی الرغم این تذکرہ نوشتہ است بنام مشوقِ جہل سالہ خود۔ احوال خود را .... اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا بلکہ خود قرار دادہ"[1]

بظاہر کسی کتاب کی اشاعت سے قبل اس کے خلاف خامہ فرسائی ناممکن ہے، اس لئے خاکسار کا یہ تذکرہ لازماً "نکات الشعرا" کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی مرتب ہوا ہوگا اور چونکہ میر صاحب کے انداز بیان سے صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ عبارت نظر ثانی کے وقت اضافہ

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۱۰

کی ہے جس کا زمانہ متعین نہیں، لہذا اس تذکرے کو ۱۱۶۵ھ کی تالیفات میں شامل کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اس نقطۂ نظر کی تائید میں یہ دلیل بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ گردیزی جو میر کے بعد خاکسار کے قریب ترین معاصر ہیں، اپنی خودسری اور پندار کے بارے میں میر کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں[1]، لیکن تذکرے کے متعلق ہمارے نقل کیے ہوئے اقوال کی تائید یا تردید نہیں کرتے۔ گویا انھوں نے نکات الشعرا کے جس نسخے سے ۵ محرم ۱۱۶۶ھ ۱۳ نومبر ۱۷۵۲ء سے قبل استفادہ کیا ہے اس میں یہ جملے موجود نہ تھے۔

مولوی عبدالحق اور ان کے مقلدین سے اس تذکرے کے سلسلے میں دوسری غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے اس کا نام "معشوقِ چہل سال خود" قرار دیا ہے۔ یہ دراصل میر کی عبارت کے سخن گسترانہ پہلو کو نظرانداز کردینے کا نتیجہ ہے۔ کسی تذکرے کا نام "معشوقِ چہل سال" تو ہوسکتا ہے لیکن معشوقِ چہل سالہ خود نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں اور بھی کہ یہ نام تاریخی بھی نہیں ہے۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاکسار نے میر کے تذکرے کے جواب میں کسی ایسے شخص کے نام سے یہ تذکرہ مرتب کیا تھا جس پر کبھی ان کی نگاہ توجہ رہی ہوگی اور جو اس وقت عنفوانِ شباب کی منزل سے آگے بڑھ چکا تھا۔ میر نے اسی پر "معشوقِ چہل سالہ خود" کی پھبتی کہی ہے[2]۔ تذکرے میں خاکسار کا ذکر سب سے پہلے تھا۔ اور ان کے نام کے ساتھ سیدالشعرا لکھا گیا تھا۔ چونکہ میر

---

[1] تذکرہ ریختہ گویان ص ۸۲

[2] فارسی میں چہل سال سے واقعی چالیس سال کے بجائے عموماً مدت مدید مراد لی جاتی ہے۔ مثلاً سعدی کے اس شعر میں ؎

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت   مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

اس حقیقت سے واقف تھے کہ تذکرہ در اصل خاکسار ہی کی تالیف ہے اس لئے وہ اس پر مزید چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "احوالِ خود اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود۔ سید الشعرا پیش خود قرار دادہ" اپنے نام سے یہ تذکرہ لکھنے کی صورت میں خاکسار کے لئے نہ تو عام اصول تذکرہ نگاری کے برخلاف سب سے پہلے اپنا ذکر کرنا ممکن تھا اور نہ وہ اپنے قلم سے خود کو سید الشعراء لکھنے کی جسارت ہی کر سکتے تھے۔

(۵) تحفۃ الشعرا۔

یہ تذکرہ آزاد بلگرامی اور عارف الدین خاں عاجز کے قطعاتِ تاریخ کی رو سے ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا ہے اور باسٹھ شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے جنھیں شعرائے فارسی کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ان میں سے دس شاعروں کے ذکر میں مولف نے ضمناً ان کے اردو اشعار بھی شامل کر لئے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مولوی عبدالحق اور ان کے ہم نوا اسے بھی شعرائے اُردو کے تذکروں میں شمار کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ فیصلہ درست نہیں کیونکہ تحفۃ الشعرا کی اصلی حیثیت فارسی تذکرے کی ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا مناسب ہوگا۔ قاقشال نے خود بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ خصوصیت کے ساتھ بعض اردو شعرا کا بھی ذکر کر رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ امام الدین اور سودا کے تذکروں کے "نکات الشعرا" سے قدیم تر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ خان آرزو اور افضل بیگ قاقشال کے تذکرے شعرائے فارسی سے تعلق رکھتے ہیں اور خاکسار کا تذکرہ میر کے تذکرے کے بعد مرتب ہوا ہے۔ لہٰذا اُن کو بہ اعتبار زمانہ میر

صاحب یا حمید اورنگ آبادی پر کسی تذکرہ نگار کی فوقیت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ اس دعوے کے لئے کوئی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے شرف اولیت میں شمالی ہندیا دکن کے کچھ اور تذکرہ نگار بھی شریک ہیں۔

ماحول اور ترقی کی منزلیں

ابتدائی تذکرہ۔

اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ جیسا کہ گزشتہ بحث سے واضح ہے ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) سے شروع ہوتی ہے اس سال اور اس کے بعد اگلے سات آٹھ برسوں میں اس موضوع پر جو تالیفات معرض وجود میں آئیں ان میں سے میر تقی میر، حمید اورنگ آبادی، فتح علی گردیزی، قائم چاندپوری اور عنایت اللہ فتوت کے تذکرے دستیاب ہو چکے ہیں۔ صرف خاکسار کا تذکرہ اب تک نایاب ہے۔ میر نے اپنے تذکرے میں شعرا کی ترتیب بالعموم انکے مرتبے اور منزلت پر منحصر رکھی ہے۔ حمید کے یہاں ایک غیر واضح زمانی احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ گردیزی اور فتوت کے تذکرے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب ہوئے ہیں۔ قائم کے تذکرے کا انداز ان تمام تذکروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کئے ہیں۔ یہ طبقات تین مختلف ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں جن کی حدود لسانی ارتقا کی بنیادوں پر بعض سلاطین کے عہد کو مدنظر رکھ کر متعین کئے گئے ہیں۔

ان تذکروں کی حیثیت اگرچہ اردو میں اس فن کے ابتدائی نمونوں کی ہے

لیکن چونکہ یہ فن ہمارے اہل قلم کو فارسی سے وراثت میں ملا تھا اور وہاں اس قسم کی تالیفات کی کوئی کمی نہ تھی جنھیں وہ اپنے لئے چراغ راہ بنا سکیں، اس لئے فنی لحاظ سے ان میں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آتی۔ جو بہت نمایاں ہو۔ ان تذکروں کا معیار نقد و نظر وہی ہے جو فارسی کے عام تذکروں کا ہے۔ البتہ چونکہ اس زمانے میں معلومات کے ذرائع محدود اور وسیع پیمانے پر کلام کی اشاعت کے امکانات تقریباً مفقود تھے۔ ایک جگہ کے شاعروں سے دوسری جگہ کے ارباب ذوق کم ہی واقف ہو پاتے تھے صرف مشاہیر شعرا کا کلام مسافروں اور تجارت پیشہ لوگوں کے ذریعہ ارمغانِ سفر کے بطور ادھر سے ادھر پہنچتا رہتا تھا اس بنا پر ان تذکروں میں کسی حد تک سوانحی عنصر کی کمی محسوس ہوتی ہے یہ کمی اکثر فارسی تذکروں میں بھی موجود ہے اور حالات کی ناساعدت کے پیش نظر ہم اسے چنداں اہمیت بھی نہیں دے سکتے جانے پہچانے شعرا کے تعارف میں تعین و تواریخ کے التزام سے پہلو تہی بھی ایسے ہی اسباب و علل کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں نہ تو ولادت و وفات اور دوسرے واقعات کی تاریخیں مخلوط رکھنے کی روایت موجود تھی اور نہ ہر شخص کے بارے میں اس قسم کی معلومات فراہم کرنا عملاً ممکن تھا اس لئے تذکرہ نگار ایک زمانے تک اس طرح کے حوالوں کو غیر ضروری خیال کرتے رہے۔ انتہا یہ ہے کہ میر نے اپنی سوانح عمری ذکر میر میں کسی جگہ سنہ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہم ان کی ولادت آگرے سے ترک وطن کے بعد دہلی میں ورود اور دہلی لکھنؤ کی طرف مہاجرت جیسے اہم واقعات کے بارے میں تواریخ اور سنین کے تعین کے ساتھ کوئی قطعی معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ جس مرحلے پر خود نوشت کا فن ارتقاء کی

اس ابتدائی منزل میں، جو وہاں تذکرہ نویسی کا تصور، اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بہ حدِ امکان ہر شاعر کے بارے میں یہ بتا دیا جائے کہ اس کا نام اور تخلص کیا ہے وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ گذرِ اوقات کے کیا ذرائع ہیں کلام پر کس سے اصلاح لی ہے اور طبیعت کا میلان کس صنفِ سخن کی جانب ہے۔ دورِ اول کے ان تذکروں میں مولفین کی توجہات بالعموم انھیں امور تک محدود رہی ہیں۔

تذکرہ نگاری کے مختلف مراکز

(۱۱۷۵ھ — ۱۲۰۰ھ)

دہلی

اوپر کی سطور میں ہم نے خصوصیت کے ساتھ جن پانچ تذکروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ریاض حسنی (۱۱۷۳ھ) اور مخزن نکات (۱۱۷۶ھ) کے علاوہ باقی تین تذکرے احمد شاہ کے عہد (۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ تا ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں مرتب و مکمل ہوئے ہیں ..... اپنے باپ محمد شاہ کے انتقال پر ایک ایسی سلطنت کا وارث قرار پایا تھا جس میں ہر طرف رنگ رلیاں تھیں۔ تعیش تھا اور عیش امروز کی خاطر فکرِ فردا کو اندیشہ غلط کی طرح ذہن سے محو کر دیا گیا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی یورشوں اور مرہٹوں کی لگاتار لوٹ مار کے نتیجے میں ملک کا اقتصادی نظام معطل ہو چکا تھا۔ بنگال اور بہار کے صوبے مہابت جنگ کے تصرف میں تھے۔ دکن میں نظام الملک نے ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اودھ صفدر جنگ کے زیر اقتدار تھا۔ روہیلکھنڈ پر روہیلہ سردار قابض تھے اور فرخ آباد میں بنگش خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ احمد شاہ کے عہد میں زوال کا یہ سیلِ رواں کچھ اور تیزی سے آگے بڑھا۔ بادشاہ نے فارغ البالی اور بے فکری کے ساتھ عیش و عشرت کی داد دینے کے لئے کاروبارِ سلطنت کی تمام تر ذمہ داریاں اپنی کم ذات مائی اودھم بائی

اور جاوید خاں خواجہ سرا کو سونپ دیں جنھوں نے دل کھول کر اپنے نااہل اعزّہ
اور لواحقین کی قدر افزائی کی۔ احمد شاہ ابدالی ایک بار پھر حملہ آور ہوا
(۱۱۶۵ھ ۱۷۵۱ء) نواب بہادر جاوید خاں نے اپنی عافیت خواہی کے
خیال سے لاہور اور ملتان کے صوبے مصالحت کی قیمت کے طور پر اس کی نذر
کر دیے[1] کچھ دن کے بعد شوال ۱۱۶۵ھ (اگست ۱۷۵۲ء) میں صفدر جنگ
کی سازش سے جاوید خاں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد زمامِ اختیار وزیر سلطنت
انتظام الدولہ اور میر بخشی عماد الملک کے ہاتھ میں آئی (رجب ۱۱۶۶ھ مئی
۱۷۵۲ء) عماد الملک نے اپنے خلاف جاٹوں سے سازباز کی پاداش میں
۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ (۲ جون ۱۷۵۴ء) کو بادشاہ کو معزول اور نابینا کر کے مسندِ
حکومت جہاندار شاہ کے عمر رسیدہ فرزند عزیز الدین عالم گیر ثانی کے حوالے کر دی
سلطنتِ مغلیہ کا یہ نیا وارث بھی پیرانہ سالی کے باوجود عشرت پرستی میں کھویا رہا
اور امراء و اعیانِ سلطنت کی باہمی سازشیں درانی کی یورش (۱۱۷۰ھ /
۱۷۵۷ء) اور مرہٹوں کی تاخت و تاراج (۱۱۷۰ھ ۱۷۵۷ء) کے روپ
میں دلی کا سہاگ لوٹتی رہیں بالآخر ۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (۲۹ نومبر
۱۷۵۹ء) کو عماد الملک ہی کے ہاتھوں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا

عالمگیر کے قتل کی اطلاع پا کر اس کے بیٹے عالی گوہر نے جو اس وقت والی
عظیم آباد میں تسخیر بنگال کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ شاہ عالم ثانی کے لقب
سے اپنی فرمانروائی کا اعلان کر دیا۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں انھیں
ایام میں عماد الملک اور مشہور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی باہمی چپقلش کی
بنا پر اس خونریز معرکہ آرائی کا آغاز ہوا جو تاریخ میں اپنی جائے اختتام کی

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم۔ ص ۲۰۸ تا ۲۰۹

مناسبت سے پانی پت کی تیسری جنگ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس جنگ میں مرہٹے عماد الملک کے حلیف تھے اور احمد شاہ ابدالی نجیب الدولہ کی حمایت کے لئے افغانستان سے اپنی فوج لے کر آیا تھا۔ عماد الملک اور مرہٹوں کے خلاف ابدالی اور روہیلہ سرداروں کی اس مشترک فوجی مہم کے نتیجہ میں وقتی طور پر مرہٹوں کی طاقت منتشر ہو گئی اور مارچ ۱۷۶۱ (شعبان ۱۱۷۴ھ) میں احمد شاہ نے اپنی فوج کے اصرار پر افغانستان کی طرف واپس جاتے ہوئے شاہ عالم کو فرماں روا، شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد اور نجیب الدولہ کو مدار المہام مقرر کر دیا۔[1] لیکن تاریخی اعتبار سے شاہ عالم کے عہد کا سب سے اہم واقعہ بکسر کی فیصلہ کن جنگ (۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ ۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء) ہے، جس نے ملک کی آیندہ تاریخ کا رخ متعین کیا۔ اس جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں شاہی فوج پر غالب آئیں اور ایک عہد نامہ کے تحت ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن کے عوض بنگال بہار اور اڑیسہ کے صوبوں پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔[2] (۲ر اگست ۱۷۶۵ء ۲۴ر صفر ۱۱۷۹ھ) اس طرح انگریز جنھوں نے بغرض تجارت ہندوستان میں بود و باش اختیار کی تھی، شریک سلطنت کی حیثیت سے ملک کی سیاست اور نظم و نسق میں داخل ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنی حکمت عملی اور سیاسی بصیرت کی بنا پر اقتدارِ اعلیٰ کے مالک بن گئے۔

مغل سلطنت کے زوال کی یہ داستان جو شاہ عالم کے بعد ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ م ۱۸۰۶ء تا ۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء) اور

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "میر کی آپ بیتی" ص ۱۲۴ تا ۱۴۰ اور بہادر شاہ ظفر ص ۱۲
[2] نادرات شاہی ۔ دیباچہ مرتب ص ۱۶ و ۱۷

ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ (۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء تا ۱۲۷۲ھ م ۱۸۵۷ء)
کی مجبور تمناؤں اور خاموش ولولوں کے خون سے رنگین ہو کر ۱۸۵۷ء
کی ناکام جنگ آزادی کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج تک پہونچی۔
درحقیقت پورے ملک کی سیاست و معیشت کے زوال کی داستان ہے
لیکن علوم و فنون اور تہذیب و معاشرت کے دائرے میں اسے صرف دہلی
کی تباہی کا المیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس المیہ کا آغاز اگرچہ اورنگ زیب کی وفات
(۱۱۱۸ھ م ۱۷۰۷ء) کے فوراً بعد ہو چکا تھا لیکن محمد شاہ کے عہد تک اس نے
ارباب کمال کے لئے زیادہ پریشان کن صورت اختیار نہیں کی تھی۔ دس
سال کے فرق سے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے تباہ کن حملوں کے
باوجود تاریکیوں میں روشنی کی ایک جھلک باقی تھی۔ ملک کے خزانے خالی
ہوتے ہوئے بھی اتنے خالی نہ تھے کہ اہلِ کمال نانِ شبینہ کے محتاج ہو جائیں
اور کوئی ان کی بات پوچھنے والا نہ ہو۔ محمد شاہ واقعی رنگیلا، رنگین مزاج
اور آزاد طبیعت انسان تھا۔ اس نے اپنے جیتے جی فنونِ لطیفہ کی سرپرستی
میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ شہر اُجڑ اُجڑ کر بستا رہا، دربار کی رونق کچھ دنوں
کے لئے کم ہوتی پھر بڑھ جاتی لیکن اس کے بعد یہ کیفیت قائم نہ رہ سکی۔
احمد شاہ کے دور میں ایک طرف تو ادھم بائی اور جاوید خاں خواجہ سرا
کا عروج شریف اور معزز شہریوں کے لئے حد درجہ صبر آزما اور مایوس
کن ثابت ہوا اور دوسری طرف اقتدار سے محروم امراء کے باہمی اختلافات
نے رفتہ رفتہ ایک مستقل دردِ سر کی صورت اختیار کر لی۔ بادشاہ کی دنیا و
مافیہا سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ وہ دنوں حرم سرا سے جو تقریباً ایک
میل تک پھیلی ہوئی تھی، باہر نہ نکلتا اور ہفتوں کسی مرد کی شکل اسکے سامنے

رہ پاتی تھی۔ حالات کی اس خرابی سے برداشتہ خاطر ہو کر بہت سے باکمال دہلی کو خیرباد کہہ گئے۔ اس کے بعد عالمگیر ثانی کے مختصر دور حکومت اور شاہ عالم کی فرمانروائی کے ابتدائی زمانہ میں عماد الملک اور اس کے حلیفوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی مکرر فوج کشی اہالیانِ شہر کی تباہی اور اہلِ ہنر کے نقلِ وطن کا سبب بنی۔

شاہ عالم نے اپنی بادشاہت کے ابتدائی چھ برس تسخیر بنگال کی فکر میں مشرقی ہندوستان میں گزارے اور اس مہم میں ناکامی کے بعد تقریباً اتنے ہی عرصے شجاع الدولہ اور انگریزوں کی صوابدید کے بموجب الہ آباد میں مقیم رہا۔ اس عرصے میں دہلی میں نجیب الدولہ نے بڑی جوانمردی اور بیدار مغزی کے ساتھ مدارالمہامی کے فرائض انجام دیے۔ رجب ۱۱۸۴ھ (اکتوبر ۱۷۷۰ء) میں نجیب الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سوا سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۱۸۵ھ (۲ جنوری ۱۷۷۲ء) کو شاہ عالم پہلی مرتبہ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا[1]۔ لیکن یہاں آتے ہی وہ طرح طرح کے مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ امراء کی جنگ زرگری کے نتیجے میں نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خاں جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد کاروبار سلطنت سنبھال لیا تھا۔ پہلی فرصت میں برطرف کر دیا گیا۔ اس طرح وہ ہیلوں میں جو سلطنتِ مغلیہ کے بہترین اور جانباز محافظ ثابت ہوئے تھے۔ بددلی پھیل گئی اور وہ بادشاہ کے دشمن ہو گئے۔ یہ دشمن سکرتال، بریلی و پیلی بھیت اور غوث گڑھ (ضلع سہارنپور) کے علاقوں میں یکے بعد دیگرے ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲ء) ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) اور ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں قتل

---

[1] تاریخ عالم شاہی ص ۷

بھیانک اور خون آشام جنگوں کی صورت میں رونما ہوئی، جن میں میدان کا زیادہ
دراصل مرہٹوں اور شجاع الدولہ کے ہاتھ رہا اور شاہ عالم کو اپنی مفروضہ
فتح یابی کی موہوم مسرت کے سوا اور کچھ نہ ملا۔[1] بلکہ بیرونی حملہ آوروں کی
دست برد اور الہ آباد سے ترکِ قیام کی پاداش میں ۱۷۷۲ء (۱۱۸۶ھ)
میں کمپنی کی طرف سے سالانہ پنشن کی منسوخی کے بعد اس داخلی خلفشار کے باعث
اقتصادی نظام کا شیرازہ کچھ اور بھی برہم ہو گیا اور ہر طرف قحط و افلاس
کے مہیب سائے منڈلانے لگے جنگی اخراجات کے مسلسل بوجھ، امراء کی
بے دریغ لوٹ کھسوٹ اور زراعت و تجارت کے لئے حالات کی عدم
مساعدت کی وجہ سے شاہی خزانے کی رفتہ رفتہ یہ کیفیت ہو گئی کہ ۱۷۷۹ء
(۱۱۹۳ھ) میں جب بادشاہ کی ماں لال کنور کا انتقال ہوا تو اس کے
پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس کے لئے ایک نیا مقبرہ تعمیر کرا سکے[2] دہلی میں
متعین مرہٹہ سفیر جولائی ۱۷۸۲ء (رجب شعبان ۱۱۹۶ھ) میں اس
مفلوک الحالی کی روداد قلم بند کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مرکزی حکومت میں بڑی ابتری ہے خزانۂ عامرہ خالی ہے اور
سپاہیوں کے پاس اشیائے خوردونوش کی خریداری کے لئے
روپیہ نہیں ہے۔ وزیر اعظم نجیب خاں کا ذاتی محافظ دستہ فوج
بھی بھوکوں مر رہا ہے اور گھوڑے ہاتھی چارہ نہ ملنے کی وجہ سے
دم توڑ رہے ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے بہادر شاہ ظفر ص ۲۶۹ تا ۲۰۲ [2] بہادر شاہ ظفر ص ۲۵

[3] سید الطاف علی بریلوی کے مضمون "غلام قادر روہیلہ شہید" شمولہ "بہادر شاہ ظفر" از امیر احمد علوی (ص ۲۰۲) کے حوالے سے

ظاہر ہے کہ یہ حالات علم و فن اور شعر و ادب کی سرپرستی کے لیے ساز گار نہ تھے چنانچہ دہلی سے شرفا اور اہلِ علم کی مہاجرت کا جو سلسلہ محمد شاہ کی وفات کے بعد شروع ہوا تھا وہ شاہ عالم کے دور میں بھی جاری رہا اور آہستہ آہستہ مرزا مظہر، شاہ حاتم اور خواجہ میر درد جیسے چند قناعت پسند اور توکل شعار بزرگوں کے علاوہ جنھیں نہ دربار کے اعزاز و اکرام سے سروکار تھا اور نہ دلی کی مفارقت ہی گوارہ تھی، تقریباً تمام ہی بڑے ادیب اور شاعر دلی کے اُجڑے ہوئے بام و در پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اس زمانے تک سلطنت کے روز افزوں انحطاط، امرا کی شکستہ حالی اور اربابِ اختیار کی نااہلی و ناعاقبت اندیشی کے باعث دانشوروں اور فن کاروں کے ایک طبقے میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ کسمپرسی اور ناقدری کے اس دور میں زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے دربار و ں اور ڈیوڑھیوں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی قوتِ بازو پر اعتماد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ پڑھے لکھے عوام بھی اپنا غم غلط کرنے اور ان حادثات کے نقوش کو جو ان کی زندگی کا معمول بن گئے تھے۔ ذہن سے محو کرتے رہنے کے لیے ایک قسم کی ہنگامہ آرائی اور اس کے نتیجے میں ایک گونہ بیخودی کے متلاشی تھے۔ اس لیے شعر و سخن کی محفلیں زیادہ عرصے تک سونی اور نہ رہ سکیں۔ جنگِ سکوتال میں ضابطہ خاں کی شکست (۱۸ شوال ۱۱۸۵ھ) کے تقریباً ایک سال کے بعد مصحفی دہلی آئے تو انھوں نے تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا[1] اور اپنے مکان پر ایک مشاعرے کی طرح ڈالی جس کے انتظام و اہتمام میں وہ بقولِ خود اکثر لوگوں سے سبقت لے گئے۔[2] اس

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۹۲ [2] عقد ثریا ص ۲

شاعرے میں فارسی و اردو کے سب ہی شاعر نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کرتے تھے لیکن فارسی کی قدر کم ہو چلی تھی اس لئے مصحفی اپنے الفاظ میں "باوجود مہارت کلی در زبان فارسی بہ مقتضائے رواج زمانہ خود را در سلک ریختہ گویاں کشیدہ صرف اوقات عزیز در ریختہ گوئی می کرد"[1] اس طرح بارہ تیرہ سال تک وہ بڑی سرگرمی اور فارغ البالی کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے ۱۱۹۴ھ ۱۷۸۰ء میں انشاء بھی اپنے والد کے ہمراہ دہلی آ گئے تھے[2] ان کا اصل ذریعہ معاش طبابت تھا۔ اس لئے انھیں بھی وہاں گذر اوقات کے لئے کسی صاحب دولت کا منھ نہ دیکھنا پڑا انشاء کی آمد سے دہلی کی ادبی محفلوں میں جان پڑ گئی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ہنگامہ بندی اور معرکہ آرائی اُن کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ چنانچہ اسی زمانے میں امین الدولہ معین الدولہ مرزا مینڈھو دلاہیر کے شاعرے میں وہ مشہور معرکہ پیش آیا جس میں انھوں نے تن تنہا مرزا عظیم بیگ عظیم، ثناء اللہ خاں فراق اور قدرت اللہ قاسم کے اعتراضات و ہجویات کے جواب دئے اور اپنی قادر الکلامی اور ہمہ دانی کا لوہا منوا لیا۔ غرضیکہ بارھویں صدی ہجری کے آخری چند برسوں میں عام سیاسی اور معاشی ابتری کے باوجود دلی کے ادبی و شعری ماحول میں ایک بار پھر زندگی کے آثار پیدا ہو چلے تھے لیکن احساس کی پژمردگی کے آغوش میں نیم بیداری کی یہ کیفیت نہ تو عام ہوئی تھی اور نہ کسی سنجیدہ کام کی متحمل ہو سکتی تھی۔ اس لئے ۱۱۷۶ھ ۶۳-۱۷۶۲ء میں مخزن نکات کی تکمیل کے بعد سے آیندہ صدی کے چند ابتدائی

---

[1] عقد ثریا۔ ص ۲ [2] مسرت افزا ص ۱۱۲

برسوں تک دہلی میں شعرائے اردو کے تذکروں کی ترتیب کی طرف کوئی توجہ نہ دی جا سکی اور اگر سید امام الدین خاں مظلوم کے "تذکرۂ مختصر معاصرین" کی طرح کا کوئی تذکرہ معرض وجود میں آیا بھی تو وہ عام اہلِ علم کی نگاہوں سے پوشیدہ یا ان کے التفات سے محروم رہا۔ تیس بتیس سال کی اس طویل خاموشی کے بعد تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں پھر کچھ لوگ اس صنف کی طرف مائل ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ ہم تذکرہ نگاروں کی اس نئی رَو کے کارناموں پر نظر ڈالیں ان تذکرہ نگاروں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس درمیانی عرصے میں دہلی سے دور دوسرے ادبی مراکز کی سرگرمیوں کے نتیجے میں منظرِ عام پر آچکے تھے۔

نئے مراکز

دلی کا سنگھاسن لٹنے کے بعد جو نئے سیاسی و تہذیبی مراکز قائم ہوئے ان میں تذکرہ نگاری کے فروغ کے نقطۂ نظر سے دکن میں اورنگ آباد اور حیدر آباد، اودھ میں فیض آباد اور لکھنؤ اور مشرقی ہندوستان میں عظیم آباد کا خاص مقام ہے۔ اورنگ آباد فتح اورنگ زیب کے بعد سے دکن کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں جب نظام الملک آصف جاہ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں دوبارہ دکن کے صوبے دار مقرر ہوئے تو وہ دہلی سے بہت سے اربابِ کمال کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کے بعد بھی مہاجرت کا ایک سلسلہ عرصے تک قایم رہا[1]۔ رفتہ رفتہ نظام الملک نے ایک خود مختار حکمران کی حیثیت حاصل کر لی اور اورنگ آباد کی سیاسی و تہذیبی مرکزیت مستحکم ہو گئی۔ ۱۱۷۲ھ/۶۰-۱۷۵۹ء میں آصف جاہ

---

[1] دکن میں اردو۔ ص ۲۴۳

تانی برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے اورنگ آباد... کے بجائے حیدرآباد کو پایۂ تخت بنا لیا۔ اس تبدیلی کے زیرِ اثر اورنگ آباد، برہان پور اور سلطنت کے دوسرے حصوں سے بہت سے ادیب اور شاعر ترکِ وطن کر کے حیدرآباد چلے آئے۔ دکن کی تہذیب اور ریاست کے اس نئے مرکز کے بعد کے زمانے میں ادبی و لسانی خدمات کی جو شاندار مثال قایم کی، اس کے اعتراف کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے دورِ اقبال میں دہلی و لکھنؤ کے بعد اردو کا اگر کوئی گھر تھا تو وہ حیدرآباد تھا۔

سلطنتِ اودھ کے بانی اگرچہ سعادت خاں برہان الملک کہے جاتے ہیں جو ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء) میں محمد شاہ کی طرف سے صوبہ دار مقرر ہوئے تھے لیکن اس ریاست میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے قیام کی تاریخ درحقیقت نواب وزیر شجاع الدولہ کے عہد (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء) سے شروع ہوتی ہے جبکہ ملکی سیاست میں انگریزوں کے عمل دخل اور مغل اقتدار کے روز افزوں انحطاط کی وجہ سے مرکز سے ریاست کا تعلق محض برائے نام رہ گیا تھا۔ شجاع الدولہ علم و فن کے قدر شناس اور حد درجہ فیاض دل تھے۔ ریاست میں روپے کی بھی کمی نہ تھی۔ اس لیے فیض آباد میں ان کا دربار فنونِ لطیفہ کے ماہرین اور ادیبوں اور شاعروں کا ملجا و ماوا بنا رہا۔ ان کے دور میں تباہ حال دہلی سے اربابِ فضل و کمال جوق در جوق فیض آباد اور لکھنؤ پہنچے اور عمر بھر کے لیے وہیں کے ہو رہے۔ خان آرزو، میر غلام حسین ضاحک، میر حسن، میرزا رفیع سودا اور میر سوز کے اودھ میں ورود کا بھی یہی زمانہ ہے۔ قلندر بخش جرأت غالباً اسی زمانے میں اپنے والدین کے ہمراہ یہاں نقلِ سکونت کر آئے تھے۔

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ مسند آرائے وزارت ہوئے۔ انکے عہد میں لکھنؤ مستقر حکومت بن گیا (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۶ء) آصف الدولہ نے فنون لطیفہ اور علم و ادب سے دلچسپی کی سابقہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان کے دور میں انھیں اور زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ وہ صرف ادب و شعر کے قدر دان ہی نہ تھے، سخن گو اور سخن شناس بھی تھے۔ سودا کی وفات کے بعد ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے اوائل میں انھوں نے میر کو دہلی سے طلب کیا[1]۔ اور جب وہ لکھنؤ پہنچے تو ان کی قدر و منزلت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ میر کی آمد کے چند دن بعد ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں مصحفی بھی مستقلاً لکھنؤ چلے آئے[2]۔ اس زمانے تک اگرچہ خان آرزو، مرزا سودا اور میر غلام حسین ضاحک دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اور ان کے ساتھ وہ ہنگامے بھی سرد ہو گئے تھے جن کے روح رواں سودا اور میر ضاحک کی شخصیات تھیں، لیکن سوز اور جرأت کی موجودگی اور اس کے بعد دیکھیے میر اور مصحفی کی آمد نے اس بزم کو سونا نہ ہونے دیا۔ ان شعرا کی بدولت لکھنؤ میں اردو شاعری کا ذوق اتنا عام ہوا کہ پروفیسر عبدالغفار سرور کے الفاظ میں دہلی اور اودھی بولی کی اس سرزمین سے کتنے ہی اچھے اچھے سخنور اٹھے اور رفتہ رفتہ اردو شاعری اور ادب کے مرکز دل میں لکھنؤ کا مقام متعین ہو گیا[3]۔

آصف الدولہ کے دربار دولت کے علاوہ اس دور کے لکھنؤ میں ارباب کمال کی کچھ اور پناہ گاہیں بھی تھیں جہاں انھیں کمال فن کی داد بھی ملتی اور ان کے سرمایۂ فکر پر زر و جواہر بھی نثار کئے جاتے۔ میر حسن نے

---

[1] دلی کالج میگزین میر نمبر ص ۳۹ [2] عقد ثریا ص ۱۴۔

[3] اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۱۹۹

نواب سالار جنگ کے بیٹے میرزا نوازش علی خاں سے اپنی وابستگی اور اسکے نتیجے میں فکرِ معاش سے بے نیازی کا ذکر کیا ہے[1]۔ ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں صاحب عالم میرزا جہاندار شاہ جواں بخت امیر الامراء افراسیاب خاں کی سخت گیریوں سے تنگ آکر وارن ہسٹنگز سے ملاقات کے لیئے چھپتے چھپاتے لکھنؤ پہنچے۔ (۸ جمادی الثانی ۱۱۹۸ھ[2]) اور عشرہ دوم ماہ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ اکتوبر ۱۷۸۶ء) تک وہاں مقیم رہے[3]۔ تو ان کی بارگاہ میں بھی شاعروں کو عزّ قبول اور قدر و منزلت کا شرف حاصل رہا۔ میرزا علی لطف کے بیان کے مطابق "اس شہزادہ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی کہ پہلے میں دو مرتبہ بنا شاعرے کی اپنے دولت خانے میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے بادہ تار کو اپنے چوبدار بھیجکر شاعرے کے دن بلوائے اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے تھے۔[4]"

عظیم آباد پایۂ تخت سے دوری کی بنا پر اس دور ابتلا میں آفات ارضی و سماوی سے نسبتاً محفوظ رہا۔ دکن اور اودھ کی طرح یہاں بھی خرد سخن کے کئی قدر شناس موجود تھے۔ اس لئے دہلی سے اُجڑنے والے ارباب کمال معاشی آسودگی اور ذہنی سکون کی تلاش میں برابر ادھر کا رُخ کرتے اور اس سرزمین پر آرزوؤں اور تمناؤں کی نئی بستیاں بساتے رہے۔ میر محمد باقر حزیں، محمد نقیہ دردمند، میرزا گھسیٹا عشق، محمد علی عرت

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۵۲
[2] وقائع عالم شاہی ص ۷۵
[3] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد سوم ص ۲۶۵
[4] گلشن ہند طبع ثانی ص ۸۹

میرزا ابجو ندوی، اشرف علی خاں فغاں اور میر ضیاء الدین ضیا نے دہلی کی تباہی کے بعد یکے بعد دیگرے اسی گوشۂ عافیت میں پناہ لی اور ساری عمر یہیں گذار دی۔ خود عظیم آباد کی خاک سے اس زمانے میں میر محمد رضا جراءت، میر غلام حسین شورش، علی ابراہیم خلیل، ہیبت قلی خاں حسرت، خواجہ امین الدین امین، محمد عابد دل، محمد روشن جوشش اور شیخ غلام علی راسخ جیسے باصلاحیت فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے دہلی سے آئے ہوئے اساتذہ کے فیضانِ صحبت و تربیت سے نام پیدا کیا اور ناقابل فراموش کارنامے اپنی یادگار چھوڑے۔ میر غلام حسین شورش اپنے تذکرے میں اس دور کے عظیم آباد کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۱]۔

"بعد نادر شاہی میر باقر (حزیں) از شاہجہاں آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردہ۔ گفتگو و شعر و شاعری بطور میرزا موصوف رواج یافتہ ــــ (بعد ازاں) ..... خمسہ میرزا محمد رفیع سلمہ اللہ تعالیٰ کہ ایں مصرع بقیں غزلہ "کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے" مصرع پنجم او بودہ شہرت دریں شہر یافتہ بعدہٗ غزل میرزا و اشعار حضرت خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیدہ و شہرت یافتہ و طرزِ سخن بطور دیگر گردیدہ"

حسب اتفاق در صوبہ داری محمد کاظم خان بہادر احترام الدولہ محفل مشاعرہ بروز جمعہ قرار یافت ــــ میر غلام علی اظہر گفت کہ شاہ رکن الدین عرف حضرت میرزا گھسیٹا صاحب رحمۃ اللہ .....

[۱] گلشن ہند طبع ثانی ص ۸۶

بہ عظیم آباد تشریف آوردہ اند اگر دریں محفلِ مشاعرہ آیند، احسن است، احقر ہمراہ میر مذکور رفتہ ملازمت نمود۔ از راہِ نوازش قبول فرمودند۔ تا محفلِ مشاعرہ کم از کم ایک سال ماندہ تشریف مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غفرا رزاں می فرمودند[1]۔

جنگ بکسر کے بعد شاہ عالم اور انگریزوں کے درمیان ۱۶ر اگست ۱۷۶۵ء (۲۸ر صفر ۱۱۷۹ھ) کے معاہدے کی رو سے عظیم آباد سلطنتِ مغلیہ کے حدودِ اختیار سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔ اس سیاسی و انتظامی تبدیلی کے روبہ عمل آتے ہی امن و عافیت کے امکانات کچھ اور مستحکم ہو گئے۔ صاحبانِ علم کو ان کی لیاقت اور استعداد کے بموجب عدالتی اور دفتری ملازمتیں ملنے لگیں اور تصنیف و تالیف کے کام سے دلچسپی رکھنے والوں کو خدمتِ لوح و قلم کے لئے زیادہ سازگار فضا میسر آگئی۔ عظیم آباد کی ادبی مرکزیت دراصل بعد کے اس دور کے اکتسابات ہی کی رہینِ منت ہے۔

یہاں ہم نے دکن، اودھ اور عظیم آباد کے جس ادبی ماحول کی تصویر پیش کی ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے ربع آخر میں تذکرہ نگاری کا فروغ کلیتاً اسی سے وابستہ ہے۔ ابتدائی دور کے تذکروں کے بعد جو تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً ایک ہی زمانے میں لکھے گئے، جس پہلے تذکرے تک ہماری رسائی ہوئی ہے وہ لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا "چمنستانِ شعرا" ہے یہ تذکرہ ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۲ء) میں اورنگ آباد میں مرتب ہوا ہے۔ اس زمانے میں میر اور گردیزی کے تذکرے اورنگ آباد تک پہنچ چکے تھے اور قصائے

---

[1] تذکرہ شورش مخطوطہ جونپور

دکن میں ان کی شہرت عام ہوتی جا رہی تھی۔ شفیق نے انھیں تذکروں کی مقبولیت سے متاثر ہوکر تذکرہ نگاری کے لئے قلم اٹھایا۔ ان کے نزدیک ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے فرائض کو زیادہ تندہی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی اور وہ اس میں بقدرِ استطاعت کامیاب بھی ہوئے۔ انھوں نے میر اور گردیزی کے نقل کئے ہوئے حالات اور اشعار کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی مختلف شاعروں کا کلام اور بہت سے ایسے شعرا کے حالات جمع کئے جن کا ان تذکروں میں ذکر نہیں یا جن کے بارے میں انتہائی مختصر معلومات فراہم کی گئی ہو۔ شفیق کو فنِ تاریخ گوئی سے بھی کافی دلچسپی تھی اس لئے انھیں جن شاعروں کے سنینِ وفات کا علم ہو سکا ان کے انتقال پر اپنی اور دوسرے شعراء کی کہی ہوئی تاریخیں بھی تذکرے میں درج کرتے رہے اس کے علاوہ بھی حسبِ معلومات دوسرے اہم واقعات کے سنین اور تاریخوں کا تعین کر کے انھوں نے اردو تذکرہ نویسی کے فن کو ایک ایسے عنصر سے روشناس کرایا جسکی طرف ماضی میں کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔

"چمنستانِ شعرا" کے بعد اس دور کے دکنی تذکروں میں "بہار و خزاں" اور "گلِ عجائب" کے نام آتے ہیں۔ "بہار و خزاں" کے مولف بہاء الدین حسین خاں عروج بھی اورنگ آباد ہی کے رہنے والے تھے۔ یہ تذکرہ "گلِ عجائب" سے قبل مرتب ہو چکا تھا۔ چند سال پہلے تک اس کا ایک ناقص اور بوسیدہ و کرم خوردہ نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ تھا لیکن اب اسکا سراغ نہیں ملتا۔ یوسف سرمست صاحب کی مرتب کی ہوئی فہرست سے ظاہر

ا؎ "چمنستانِ شعراء" ص ۳

ہوتا ہے کہ مولف نے اس تذکرے میں کم از کم ۱۸۱ شاعروں کے حالات اور اشعار درج کیے تھے[1]۔ "گلِ عجائب" اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی کی تالیف ہو۔ یہ تذکرہ ۱۱۸۳ھ ۱۷۶۹ء اور ۱۲۰۰ھ ۱۷۸۶ء کے درمیان مرتب ہوا ہو لیکن مؤلف کے ایک قطعۂ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نقشِ اول ۱۱۹۲ھ ۱۷۷۸ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ شفیق کی طرح تمنا نے بھی جا بجا سنین کے حوالے دئے ہیں اور زیادہ سے زیادہ واقعاتِ زندگی کے انضباط کی کوشش کی ہو اس طرح اس معیار کو قائم رکھنے میں ان کا نمایاں حصہ ہے جو "چمنستانِ شعرا" کی ترتیب کے بعد پہلی مرتبہ سامنے آیا تھا۔

جس زمانے میں لچھمی نرائن شفیق اورنگ آباد میں "چمنستانِ شعرا" کی تالیف میں مصروف تھے اس زمانے میں میر غلام حسین، شورش، میرزا گھسیٹا عشق کے ایما پر عظیم آباد میں شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ ترتیب دے رہے تھے۔ عشق میر کا تذکرہ دیکھ چکے تھے اور شفیق کی طرح انھیں بھی اس میں بہت سی کوتاہیاں اور فروگذاشتیں نظر آئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے ایک زیادہ جامع اور بہتر تذکرے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے شورش کو اس کام کے لئے آمادہ کیا تھا۔ شورش نے اس تذکرے کی ترتیب پر تقریباً ۱۵-۱۶ سال صرف کئے۔ امر اللہ الہ آبادی کے بیان کے مطابق انھیں ۱۱۹۱ھ میں اس کام سے فراغت ہو گئی تھی[2]۔ لیکن تذکرے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۹۵ھ، ۱۷۸۱ء میں اپنی وفات کے وقت تک اس میں برابر اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ معیار اور ندرتِ قیمت کے لحاظ سے یہ تذکرہ "چمنستانِ شعرا"

---

[1] نگار پاکستان "تذکروں کا تذکرہ نمبر"۔ ص ۲۲۹

[2] مسرت افزا ص ۱۱۲

کے پائے تک نہیں پہنچا لیکن "نکات الشعرا" اور "تذکرہ گردیزی" سے جو اسکی تالیف کے دوران مؤلف کے پیش نظر رہے ہیں بہر حال بہتر ہے۔ جو خصوصیت اسے ان دونوں تذکروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کے انتخاب کی جامعیت ہے۔ شورش نے بیشتر معروف اور ممتاز شعرا کے زیادہ سے زیادہ منتخب اور بہترین اشعار تذکرے کے صفحات میں محفوظ کر دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض اوقات حالاتِ زندگی کے بیان میں بھی انھوں نے کافی تفصیل سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں عام واقعات کے سلسلے میں سنین کے حوالے اور وفات کی تاریخیں بھی مل جاتی ہیں اور یہ سب تذکرہ نگاری کے فنی ارتقا کی علامات ہیں۔

تذکرہ شورش کی تالیف کے بعد ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں ابوالحسن امراللہ الہ آبادی نے اپنے وطن سے کلکتے کی طرف سفر کرتے ہوئے عظیم آباد کے مختصر قیام میں وہاں کی فضائے شعری سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں "مسرت افزا" کا خاکہ تیار کیا اور منزلِ مقصود (کلکتہ) تک پہنچنے کا انتظار کئے بغیر دوران سفر ہی میں اس کی ترتیب شروع کر دی۔ اس طرح یہ تذکرہ اگرچہ مؤلف کے عظیم آباد کے چلے جانے کے بعد مرتب ہوا لیکن اس کی ترتیب میں وہاں کی ادبی فضا کا جو دخل ہے اس کی بنا پر ہم اسے شعر و ادب کے اس مرکز سے متعلق تالیفات کے زمرے سے علٰحدہ نہیں کر سکتے۔ اس تذکرے میں مؤلف کا انداز تعارف بڑی حد تک مورخانہ رہا ہے۔ انھوں نے نہایت کثرت سے اہم واقعات کے سنین اور تاریخوں کے حوالے دئے ہیں چنانچہ ان کے بیانات سے خاص خاص شعرا کے حالات زندگی کی تحقیق و دریافت میں جس قدر مدد ملتی ہے اتنی اس دور کے کسی دوسرے تذکرے سے نہیں ملتی۔

عظیم آباد سے متعلق اس زمانے کا تیسرا اور آخری تذکرہ علی ابراہیم خاں خلیل کا "گلزار ابراہیم" ہے۔ یہ تذکرہ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) اور ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) کے درمیانی عرصے کی تالیف ہے۔ خلیل موضوع شیخوپورہ نواح عظیم آباد میں پیدا ہوئے[1] لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ وطن سے دور مرشد آباد اور بنارس میں بسر ہوا تذکرے کے آغاز کے وقت وہ مرشد آباد میں مقیم تھے اور بیروزگاری کے سبب خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اختتام سے چار برس قبل ۱۱۹۵ھ۔ ۱۷۸۱ء میں انھیں گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی عنایت سے بنارس کی مجسٹریٹی مل گئی تھی[2] طبعاً انکا رجحان تاریخ نویسی کی طرف تھا۔ اس موضوع سے متعلق انھوں نے راجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس کی بغاوت کے حالات اور "وقائع جنگ مرہٹہ" پر مشتمل دو مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں "گلزار ابراہیم" میں بھی تاریخی رجحان اکثر شعرا کے حالات کی تحریر کے زمانے اور اس زمانے میں انکی جائے قیام، طرز بود و باش اور سلسلہ ملازمت کے بیان کی صورت میں نمایاں ہوا ہے ایک خاص مختصر دائرے میں محدود ہونے کے باوجود تاریخ ادب میں اس قسم کے اندراجات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ غرض کہ اس پچیس سالہ دور میں دکن کی طرح عظیم آباد کے ادبی ماحول اور اسکے دائرۂ اثر میں بھی تذکرہ نگاری کا فن تاریخی شعور سے آشنا ہوا اور اس کی ترقی کے راستے ہموار ہوتے رہے۔

حدود اودھ میں سب سے پہلا تذکرہ میر حسن نے لکھا ہے جس کے نقش اول کا سال تکمیل ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء ہے اس تذکرے کی ترتیب میں انھوں نے میر اور قائم کے تذکروں سے مدد لی ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے

---

[1] مسرت افزا۔ ص ۲۔ [2] مسرت افزا ص ۳۔

میں تمام شعرا کو بہ اعتبارِ زمانہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علیحدہ علیحدہ
طبقات میں تقسیم کر کے جس تاریخی طرزِ ترتیب کی بنیاد رکھی تھی میر حسن نے
اس پر یہ اضافہ کیا کہ تمام شاعروں کو ان کے تخلص کے حروفِ اول کی
رعایت سے متعلقہ ردیف کے تحت جگہ دے کر ہر ردیف کے ذیل میں تین
طبقات قائم کر دئے تاکہ قارئین کو کسی شخص کے حالات و کلام کی تلاش
میں دقت پیش نہ آئے۔ لیکن جہاں تک شفیق، اور اللہ یا خلیل کے طرز پر
مورخانہ زاویہ نگاہ سے حالات نویسی کا تعلق ہے وہ تذکرہ نگاری کے
فن کو کوئی خاص ترقی نہ دے پائے۔ البتہ شاعر کے ماحول اور سیرت و
شخصیت کی تصویر کشی میں میر کے بعد ان کا پایہ سب سے بلند ہے۔ کلام
کے محاسن و معائب اور زبان و بیان کے رموز و نکات پر بعض تبصرے
بھی ان کی سخن شناسی اور ناقدانہ بصیرت کے اعتراف پر مجبور کرتے
ہیں۔ اس میدان میں کوئی ہم عصر تذکرہ نگار ان کا حریف نہیں۔ اس کے
علاوہ غیر جانبداری، صاف گوئی، خلوص رائے اور اعتراف کمال
کے معاملے میں وہ میر پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔

اودھ کا دوسرا تذکرہ میرزا کاظم مبتلا لکھنوی کا "گلشنِ سخن" ہے۔
مؤلف کے کہے ہوئے قطعۂ تاریخ کی رو سے جو دیباچے میں شامل ہے،
اس کا سالِ ترتیب ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) قرار پاتا ہے متن کے درمیان میں
بھی جا بجا سالِ رواں کے طور پر اسی سنہ کے حوالے ... دئے گئے
ہیں لیکن چونکہ اس تذکرے کے بیشتر بیانات "گلزار ابراہیم" (مرتبہ
۱۱۹۸ھ م ۱۷۸۴ء) پر مبنی یا اس سے مستفاد معلوم ہوتے ہیں اس لئے بہ گمان
غالب یہ ۱۱۹۸ھ م ۱۷۸۴ء میں گلزار کے منظرِ عام پر آنے کے بعد مرتب

ہوا ہوگا۔ بیانِ واقعات کے سلسلے میں بجز ۱۱۹۴ھ کے حوالے بظاہر اصل حقیقت کو چھپانے اور "گلزارِ ابراہیم" پر اپنے تذکرے کا تقدم ثابت کرنے کے لئے دئیے گئے ہیں۔ بحیثیت شاعر علی ابراہیم کے وجود سے مولف کی بے خبری بھی اسی شعوری کوشش کے سلسلے میں ایک کڑی ہے۔ اس صورتِ حال سے قطع نظر کرکے مبتلا کی کوششیں اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ انھوں نے عام طور پر انتخاب کلام کے لئے اصل دواوین کے مطالعہ پر کافی توجہ دی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مجملاً شعرا کے نتائج افکار کی مجموعی کیفیت پر رائے زنی کے پہلو بہ پہلو تعداد اشعار کی صورت میں اُنکی کمیت کا بھی تعین کردیا ہے۔

میرزا رفیع سودا نے بھی ہمارے اندازے کے مطابق اپنا تذکرہ غالباً اسی زمانے میں مرتب کیا تھا لیکن اس کی تفصیلات ہمارے علم سے باہر ہیں۔ ان تذکروں کے علاوہ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء اور ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے درمیان لکھنؤ یا فیض آباد میں کسی اور تذکرے کی ترتیب کا پتہ نہیں چلتا البتہ امراللہ الہ آبادی نے اپنے یہاں مضافاتِ اودھ میں قصبہ زمانیہ ضلع غازی پور کے ایک شاعر شیخ احمد وارث احمدی کے "تذکرہ شعرائے ہندی ریختہ" کا ذکر کیا ہے[1] یہ تذکرہ بھی نایاب ہے۔ اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کس سنہ میں مرتب ہوا اور اس کی نوعیت کیا تھی۔

رام پور — بارھویں صدی ہجری کے اس ربع آخر میں شمالی ہند میں ایک اور تذکرہ بھی لکھا گیا۔ یہ تذکرہ جس کا نام "طبقات الشعرا" ہے مولوی قدرت اللہ شوق ساکن موضع موری من توابع سنبھل ضلع مراد آباد

---

[1] مسرت افزا س ۲۷، ۱۱۵۔

کی تالیف ہے اور ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں مرتب ہوا ہے۔ شوق نے نواب فیض اللہ خاں کے دورِ حکومت (۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء تا ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء) سے ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں انتقال کے وقت تک اپنی زندگی کا بڑا حصہ رامپور میں گذارا لیکن اس تذکرے کی ترتیب کے وقت وہ کس جگہ قیام پذیر تھے۔ یہ بات واضح طور پر ہمارے علم میں نہیں۔ مصحفی نے جنگ سکرتال (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۲ء) سے کچھ قبل ٹانڈہ ضلع رامپور میں قائم چاندپوری کے یہاں ایک مرتبہ ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے[1]۔ ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں امیر خلف نواب علی محمد خاں کی سرکار سے اس زمانے میں مصحفی، قائم چاندپوری، ندوی لاہوری اور دوسرے کئی شاعر وابستہ تھے۔ خود شوق بھی ایک بار ان کی خدمت میں باریاب ہو کر ان کی شفقت و عنایت سے بہرہ ور اور کلام سے محظوظ ہو چکے تھے[2]۔

مصحفی کے بیان کے مطابق جنگ سکرتال کے بعد جب یہ مجلس درہم ہوئی اور رامپور میں امیر کے برادرِ اکبر نواب فیض اللہ خاں کا ستارہ عروج پر آیا تو قائم رامپور چلے گئے[3]۔ خیال ہے کہ شوق نے بھی ٹانڈہ میں مختصر قیام کے بعد اسی زمانے میں رامپور میں سکونت اختیار کر لی ہوگی۔ ہمارے اس قیاس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے زیرِ بحث تذکرے کے طبقہ چہارم میں رامپور کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حالات "ذکر امرائے افغانانِ دیار" کے عنوان سے تحریر

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۷۵

[2] طبقات الشعرا، مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد۔ ورق ۸۰ ب

[3] تذکرہ ہندی ص ۱۴۳: ۱۰۹

کیے ہیں۔ اولین ترتیب کے بعد تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ اوّل میں شوق نے "طبقات الشعرا" پر نظر ثانی کی۔ اس زمانے میں وہ بہرحال ریاست رام پور سے توسل پیدا کر چکے تھے۔ رام پور جس نے نواب کلب علی خاں کے عہد (۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء تا ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء) میں ہندوستان کے سب سے زیادہ مستحکم اور توانا ادبی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی تھی اس زمانے میں اپنی تعمیر و تشکیل کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ اس لحاظ سے یہ تذکرہ رام پور کے دبستانِ شعر و ادب کا پہلا وقیع اور قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔

شوق نے اس تذکرے میں شعرا کو ان کی تاریخی اہمیت، اندازِ کلام اور معیارِ فن کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ایک نئے طرزِ ترتیب کی بنیاد رکھی ہے، جس کی روشنی میں اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا، مختلف ادوار کے فنی و لسانی تصورات اور پست و بلند کے رائج الوقت معیاروں کا مطالعہ دوسرے تذکروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔ حالات نویسی کے ضمن میں اگرچہ انھوں نے دو ایک مقامات کے علاوہ کسی جگہ واقعات کے سنین متعین نہیں کیے ہیں پھر بھی تعارف کا انداز معلومات افزا ہے۔ بعض جگہ شوق نے میر کی طرح اشعار کے فنی معائب کی بھی گرفت کی ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں تنوع اور رنگا رنگی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے دائرۂ کار کو صرف غزل کی نمایندگی تک محدود نہ رکھ کر پہلی مرتبہ افراط کے ساتھ دوسری اصنافِ سخن کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

اس دور کے بعض تذکرہ نگار میاں فخر الدین ماہر شاگرد سودا کے والد (علاء الدولہ)، ایک مجہول الاحوال شخص میر محمد علی کو بھی تذکرہ نویس کی حیثیت

سے یاد کرتے ہیں[1]۔ اشرف کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ یہ شعرائے فارسی کا تذکرہ ہے جو ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء کے قریب مرتب ہوا ہے[2]۔ میر محمد علی ہمارے خیال میں میر فتح علی گردیزی، کی تصحیف ہو جس نے تذکرۂ ریختہ گویاں کے دیباچے اور خاتمے میں اپنے نام کو اس کی معروف شکل میں نہ لکھتے ہوئے "فتح المدعو بہ علی" لکھا ہے، گلزار ابراہیم میں جس مقام پر محمد علی مذکور کا حوالہ ملتا ہے۔ گردیزی کے قول سے اس کی مطابقت بھی اسی قیاس کی تائید کرتی ہے۔

---

[1] گلزار ابراہیم مطبوعہ ص ۱۳۲، ۱۹۰؛ گلشن سخن مطبوعہ ص ۹
[2] دستور الفصاحت۔ مقدمہ مرتب ص ۶۳

ذکا اور مصحفی کا دور

۱۲۰۱ھ	۱۲۵۰ھ
۱۷۸۷ء	۱۸۳۵ء

تیرھویں صدی ہجری کا نصف اول جسے خوب چند ذکا اور مصحفی کا دور کہا جا سکتا ہے تذکرہ نگاری کا عہدِ شباب ہے۔ پچاس سال کے اس دور میں ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء سے ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء تک مصحفی اور ۱۲۰۸ھ/.... ۱۷۹۳ء سے ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک ذکا اپنی تصنیفی سرگرمیوں کے لحاظ سے اس طرح ایک دوسرے کے ہم دوش و ہم عنان رہے ہیں کہ گذشتہ صدی کے ۲۵ برسوں کی طرح اس نسبتاً طویل مدت کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ تذکرے دہلی اور اس کے آس پاس میرٹھ اور بلند شہر کے علاقوں میں تالیف ہوئے یہ تذکرے جس ماحول میں لکھے گئے وہ ان سیاسی اور اقتصادی حالات کی دین تھا جن کے سلسلے گذشتہ صدی کے آخری دو برسوں سے ملتے ہیں۔ شاہ عالم نے ۲۱ محرم ۱۱۹۹ھ (۵ دسمبر ۱۷۸۴ء) کو مرہٹوں کی آئے دن کی تاخت و تاراج سے مجبور و مرعوب ہو کر مادھو راؤ سندھیا کو "مختار الملک"، وکیلِ مطلق، عمدۃ الامراء، فرزندِ عالی جاہ، مہاراجہ دھراج۔ سری مادھو راؤ سندھیا بہادر منصور زماں کے خطابات اور دوسرے خدو ج

غیر معمولی اعزازات سے سرفراز کر کے امور شاہی کا مختار اور سلطنت کا عامر مطلق بنا دیا تھا[1]۔ مرہٹوں کا یہ عروج جہاں دوسرے امرائے سلطنت کو ناگوار تھا وہیں انگریز بھی اس کی وجہ سے حد درجہ متفکر اور پریشان تھے چنانچہ تھوڑے ہی دن بعد سب سے پہلے نجیب الدولہ کے پوتے اور ضابطہ خاں کے بیٹے غلام قادر نے جس کے باپ دادا اور خاندان کی عورتوں اور دوسرے افراد کے ساتھ جنگ سکرتال (شعبان ۱۱۸۵ھ۔ فروری ۱۷۷۲ء) اور جنگ غوث گڑھ (محرم ۱۱۹۱ھ، اپریل ۱۷۷۷ء) میں شاہ عالم کے ایما سے مرہٹہ اور مغل فوجوں نے حد درجہ ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا تھا، مادھو راؤ سندھیا کو جے پور کے قریب راجپوتوں سے جنگ میں مصروف پاکر اپنے ساتھیوں کو منظم کیا اور کچھ دن بعد اس معرکے میں اس کی ہزیمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی پر چڑھائی کر دی (۵ دسمبر ۱۷۸۷ء، ۲۴ صفر ۱۲۰۲ھ)[2] یہ دہلی کو مرہٹوں کے اثر سے آزاد کرانے کی آخری کوشش تھی جو مغلوں کی شومئی قسمت سے کامیاب نہ ہو سکی۔ شاہ عالم نے بدرجۂ مجبوری اس وقت غلام قادر کا ساتھ دیا لیکن اس کے دہلی سے چلے جانے کے بعد پھر مرہٹوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بادشاہ کی اس احسان فراموشی سے برافروختہ ہو کر غلام قادر دوبارہ دہلی پر حملہ آور ہوا (۱۴ جولائی ۱۷۸۸ء، ۹ شوال ۱۲۰۲ھ)[2] اور جوش انتقام میں اس نے ان تمام زیادتیوں کا بدلہ لے ڈالا جو ماضی میں اس کے خاندان کے ساتھ روا رکھی گئی تھیں۔ بادشاہ کو معزول

---

[1] غلام قادر روہیلہ شہید از الطاف علی بریلوی مشمولہ بہادر شاہ ظفر ۲۷۷
[2] " " " " ص ۲۷۹-۲۸۰

کرکے (۳۰ جولائی مطابق ۲۷ شوال[1]) اس پر طرح طرح کے ظلم توڑے زمین
پر گراکر اس کی ایک آنکھ اپنے خنجر سے نکال لی اور دوسری اپنے ایک
ساتھی سے نکلوا دی۔ (۱۰ اگست مطابق ذی قعدہ[2]) مغتول اہالیان قلعہ
پر خورد و نوش کو بند رکھا۔ شہزادوں کو زدوکوب کیا۔ شہزادیوں کی توہین
کی، نوکروں کو مرتے دم تک کوڑے لگوائے محل کو تاراج کیا اور
خزانے جو قلعے سے باہر دبے ہوئے تھے کھدوا ڈالے۔ اس طرح
۲۵ کروڑ روپیے نقد اور دوسری قیمتی چیزیں اس کے ہاتھ آئیں[3]
...... لیکن چند دن کے اندر ہی ۴ مارچ ۱۷۸۹ء (۶ جمادی الثانی
۱۲۰۳ھ) کو مرہٹوں نے بڑی بیدردی کے ساتھ اس روہیلہ سردار کا خاتمہ
کردیا[4]۔ اور حالیہ سابق بادشاہ کے برائے نام حقوق سلطنت بحال کرکے
دوبارہ دہلی پر قابض ہو گئے۔

۱۲ فروری ۱۷۹۴ء (۱۱ رجب ۱۲۰۸ھ) کو مادھوراؤ سندھیا چل
بسا[5]۔ اس کے بعد زمام وکالت و مختاری اس کے بھائی کے پوتے دولت راؤ
کے ہاتھ میں آئی۔ دولت راؤ عیش پرست تھا اور اس میں مادھوراؤ
جیسی فوجی و انتظامی صلاحیت بھی نہ تھی۔ ادھر روہیلوں کی طاقت کا
شیرازہ منتشر ہو جانے کے بعد شمالی ہند میں ایسا کوئی منظم اور سرفروش گروہ

---

[1] غلام قادر روہیلہ شہید از الطاف علی بریلوی مشمولہ بہادر شاہ ظفر۔ ص ۲۷۹ و ۲۸۰

[2] بہادر شاہ ظفر ص ۳۱ و نادرات شاہی۔ دیباچہ مرتب ص ۲۹

[3] غلام قادر روہیلہ بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۸۳

[4] " " " " ص ۲۸۶

[5] مادھوجی سندھیا۔ ص ۱۵۱

باقی نہ رہا تھا جو سلطنتِ مغلیہ کا تحفظ کر سکے، اس لئے انگریزوں کو مرہٹوں اور مغلوں کے خلاف اپنی قسمت آزمالینے اور ایک تیر سے بیک وقت دو شکار کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آگیا۔ اگست ۱۸۰۳ء (جمادی الاول ۱۲۱۸ھ) میں جنرل لیک کی سرکردگی میں ان کی فوجیں مغربی یو، پی کے اہم فوجی مراکز کی طرف بڑھنا شروع ہوئیں، اور ڈیڑھ دو مہینے کی مدت میں یکے بعد دیگرے انھوں نے علی گڑھ[1]، دہلی اور آگرے کی چھاؤنیوں پر اپنی فتح کے پرچم لہرادئے[2]۔

دہلی ۱۱ ستمبر کو فتح ہوئی[3]۔ ۱۵ ستمبر (۲۹ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ) کو جنرل لیک قلعہ معلی کے اندر بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا[4]، تو اس نے دیکھا کہ

"وہ قدیم عزت و شان کا مصیبت زدہ مجسمہ ضعف پیری اور بے بصارتی، ناداری و زوالِ مرتبت کی مصیبتوں سے شکستہ حال اور شکستہ دل ایک چھوٹے سے بوسیدہ شامیانے کے نیچے جو اس کی شان و شوکت کی تنہا یادگار اس کے پاس باقی رہ گیا تھا، بیٹھا ہوا تھا اور اندرونی و بیرونی مصائب کا ایک عبرتناک نظارہ پیش کر رہا تھا[5]۔"

مجبوری و لاچاری کے اس عالم میں شاہ عالم کے لئے حالات کے سامنے

---

[1] علی گڑھ کا قلعہ ۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو فتح ہوا۔ بحوالہ کتبہ قلعہ بزبان انگریزی

[2] بھارت کا اتہاس (ہندی) جلد دوم ص ۲۳۲

[3] دی ٹوائیلائٹ آف دی مغلز (انگریزی) ص ۲۵

[4] یہ تاریخ جی بسی اوشین مولف تاریخ ہند۔ عہد برطانیہ کی بیان کردہ ہے۔ اسپیر نے ٹوائیلائٹ آف دی مغلز (ص ۳۵) میں ۱۶ ستمبر کو ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

[5] تاریخ ہند۔ عہد برطانیہ (اردو ترجمہ) ص ۲۴۰ و ۲۴۱

سپر ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا چنانچہ اس نے اپنے آپ کو کلیتہً انگریزوں کے سپرد کر دیا اور "بادشاہ کے ملک میں خلق خدا" پر کمپنی بہادر کا حکم چلنے لگا۔ اس خود سپردگی کے صلے میں کمپنی کی جانب سے ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار بادشاہ کے صرف خاص کے لئے ساڑھے اٹھائیس ہزار ماہانہ بصورت نقد و جاگیر ولی عہد، خاندان کے دوسرے افراد اور ملازمین شاہی کے لئے اور دس ہزار سالانہ محرم، عیدین، نوروز اور دوسری تقریبات کے لئے مقرر ہو گئے۔[1] ساتھ ہی ادب اور احترام کے سارے طور طریقے اور شاہی القابات و خطابات بھی برقرار رکھے گئے۔[2]

۷ رمضان ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو شاہ عالم کی وفات ہو گئی اور ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی جانشین نامزد ہوئے ان کی درخواست اور مسٹر آرچیولڈ اسٹین ریزیڈنٹ متعلقہ دہلی کی سفارش پر ۱۸۰۹ء میں شاہی وظیفے کی مجموعی رقم ساڑھے ۹۸ ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ روپیہ ماہوار کر دی گئی۔[3] لیکن اکبر شاہ کو مسٹر اسٹین کی حمایت اور اس کے واسطے سے کمپنی کی ہمدردیاں زیادہ عرصے تک حاصل نہ رہ سکیں۔ فروری ۱۸۱۱ء میں ریزیڈنٹ کے عہدے پر سر چارلس مٹکاف کا تقرر عمل میں آیا۔ مسٹر اسٹین کے برخلاف مٹکاف کی نظر میں خاندان سلطنت کسی تعظیم و تکریم کا مستحق نہ تھا۔ وہ اس کے احساس برتری اور شعور ذات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ چند سال کے عارضی سکون کے

---

[1] بہادر شاہ ظفر ص ۲۷، ۴۶
[2] نادرات شاہی۔ دیباچہ مرتب۔ ص ۴۲
[3] بہادر شاہ ظفر۔ ص ۵۵

بعد شاہی خاندان کے گرد ایک بار پھر آفات و مصائب کے سائے منڈلانا شروع ہوئے۔ بادشاہ اور اس کی اولاد کے ساتھ ہر طرح کے ناروا اور توہین آمیز سلوک جائز قرار دے دئیے گئے۔ شاہی متوسلین جو ریزیڈنٹ کے دفتر میں جاگیرات کے حسابات کی جانچ پڑتال پر مامور تھے، برطرف ہوئے۔ قصاص اور طویل قید کے احکامات پر بادشاہ کی منظوری بے معنی قرار دے دی گئی۔ یورپین افسروں اور عام انگریزوں کو اثنائے راہ میں شاہی سواری کے آگے ضروری اور رواجی آداب کی بجا آوری سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۸۳۲ء میں دہلی کو صوبہ مغربی و شمالی میں شامل کر کے اس کی انفرادی و مرکزی حیثیت ختم کر دی گئی اور ۱۸۳۵ء سے تمام سکے "بادشاہ غازی" کی بجائے کمپنی بہادر کے نام سے منسوب ہونے لگے[1] اس طرح نام نہاد مسند نشینی و سلطانی کی سالگرہوں کے روپ میں اپنی تباہی و بربادی کے ۳۲ جشن منا کر جب یہ مجبور و محکوم حکمران دنیا سے رخصت ہوا (۲۷ جمادی الثانی ۱۲۵۳ ہجری مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) تو مغلوں کی قبائے تفاخر اور دہلی کے پیراہن یوسفی کا کوئی تار سلامت نہ رہا تھا۔

آفات و مصائب اور زوال و انحطاط کی ان ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق سے فرار کا جو رجحان پیدا ہوا اس نے شعر و ادب کو برگ و بار لاکے اور تذکرہ نویسی کے فن کو ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۴ء میں شاہ عالم مالی و ملکی انتظامات کی تمام ذمہ داریاں مادھو راؤ سندھیا کو سونپ کر اپنے فرائض

---

[1] بہادر شاہ ظفر ص ۵۸ - ۶۲

منصبی کی انجام دہی سے آزاد ہو گیا تھا اس کے بعد ۱۲۰۲ھ/۸۸-۱۷۸۷ء میں غلام قادر کے مظالم نے اس ذوقِ تن آسانی کی تکمیل کر دی اور بادشاہ کے لئے خانہ نشینی و مجلس آرائی کے سوا کوئی کام باقی نہ رہ گیا۔ غالباً اسی زمانے میں شعر و شاعری سے اس کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوا، قدرت اللہ قاسم نے اس کے دربار سے توسل رکھنے والے شعراء میں حسن علی آگاہ، عبدالرحمن آگاہ، عبدالرحمن احسان، حافظ بقاء اللہ حیرؔاکبرآبادی، راجہ رام نرائن زرہ، نواب سیف الدولہ سید رضی الدین خاں بہادر رضیؔ، برہان الدین خاں زارؔ، مرزا جان بیگ سامیؔ، لالہ دیوالی سنگھ سخنور، سید الشعراء میر غالب علی خاں سید، میرزا ابوالحسن مخاطب بہ مظہر علی خاں شفیقؔ، میر صادق علی خاں صادق، اسد الدولہ بہادر بیگ خاں ثاقب، کنور گوپال ناتھ غلام، لالہ سکھ سنگھ نازغ، میر نقیر اللہ نقیر، عبداللہ خاں مخاطب بہ مشتاق علی خاں مشتاق اور میر نظام الدین خاں ممنون کا ذکر کیا ہے۔ حسن علی آگاہ داستان سرائی کی خدمت پر مامور[1] اور بقاء اللہ حیرؔاں مرشد زادوں کی تعلیم کے لئے متعین تھے[2]۔ راجہ رام ناتھ زرہ قربِ پیشگاہِ سلطنت و پیشکاری نظارت سے سرفراز تھے[3]۔ زارؔ، شفیقؔ اور مشتاقؔ کو "سلکِ خواصانِ حضور" میں منسلک ہونے کا فخر حاصل تھا[4]۔ سامیؔ کو شاہنامہ فردوسی کے انداز میں عہدِ عالم شاہی کے واقعات نظم کرنے کی خدمت سونپی گئی تھی[5]۔ لالہ دیوالی سنگھ

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۴۱ [2] مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۴۱

[3] ؍ ؍ ؍ ص ۲۵۹

[4] ؍ زارؔ، جلد اول ص ۲۸۳۔ شفیقؔ جلد اول ص ۳۴۵۔ مشتاق جلد دوم ص ۱۸۷

[5] ؍ جلد اول ص ۲۸۷-۲۸۶

سخنور منشی . . . . اور سید الشعراء غالب علی خاں سید میر منشی تھے[1] صادق علی خاں صادق "دواخانہ" سے متعلق تھے[2] گوپال ناتھ غلام "حضور پُرنور" سے "تقرب بہ تمام" رکھتے تھے اور انھیں کے "یمن صحبت" سے ریختہ گوئی کی طرف مائل ہوئے تھے[3] فارغ توشک خانہ شاہی میں مقصدی گری کے عہدے پر فائز تھے[4] احسان، رنگین، غالب، نقیر اور ممنون بھی اسی طرح "شعراء پائے تخت سلطانی" اور "سخن سنجان بار یافتگان حضور پُرنور خاقانی" میں شامل تھے[5] ممنون کو ۱۲۱۸ھ میں فخر الشعراء کا خطاب بھی عنایت ہوا تھا[6] ان شعراء کے علاوہ شیفتہ نے[7] میر غلام حسین شگفتا کو اور عشقی[8] نے میر فرزند علی موزوں کو بھی انھیں مقربین شاہی کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ایک اور ہزل گو شاہ شہوت کے بارے میں قاسم اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس نے "بہ آرزوئے تمام" بیشگاہ سلطنت سے مسخر الدولہ قرمساق خاں بہادر پھکڑ جنگ کا خطاب عطا کیا تھا[10]۔ اندازہ

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۲۹۱
[2] " " " ص ۳۵۸
[3] " " جلد دوم ص ۲۸
[4] " " جلد اول ص ۳۶۸
[5] " " جلد دوم ص ۲۹
[5] " " احسان جلد اول ص ۵۸، رنگین جلد اول ص ۲۷۹، غالب جلد دوم ص ۲۳۔ نقیر جلد دوم ص ۸۰، ممنون جلد دوم ۲۱۲
[6] بحوالہ تحریر سرورق کلیات ممنون مخطوطہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال
[7] گلشن بے خار طبع اول ص ۱۷
[8] تذکرہ عشقی ۔ دو تذکرے جلد دوم ص ۳۵۸
[10] مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۵۷، معیار الشعراء، مخطوطہ علی گڑھ ورق ۱۴۴۔ الف

ہے کہ ان میں سے بیشتر شاعر بے بصارتی کے اس دور ہی میں بادشاہ کی ہم مجلسی کے اعزاز اور خدمت خاص کے شرف سے ممتاز ہوئے ہوں گے۔

کمپنی کے اقتدار سے قبل شاہ عالم کو اکثر مالی مشکلات کا سامنا رہا کرتا تھا۔ غلام قادر کی سرکوبی کے بعد مرہٹوں نے اس کے ذاتی مصارف کے لئے نو لاکھ سالانہ مقرر کردئے تھے[1] لیکن اس رقم کی ادائیگی محصول اور ذاتی لگان کی وصولی پر منحصر تھی۔ روپیہ بروقت وصول نہ ہوتا تو بادشاہ کے وظیفہ کی ادائیگی بھی تعویق میں پڑجاتی۔ میر کے بیان کے مطابق بینائی سے محرومی کے بعد اکبرو جہانگیر کے اس بدنصیب وارث پر ایک ایسا وقت بھی گذر چکا تھا جبکہ اس کی آمدنی صرف سو روپیہ یومیہ رہ گئی تھی[2]۔ ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں کمپنی کے زیر سایہ آجانے پر یہ اقتصادی کشمکش ختم ہوگئی۔ وظیفہ کی مقررہ رقم پابندی وقت کے ساتھ ماہ بماہ ملنے لگی، اسکے ساتھ ہی کاروبار سلطنت کا رہا سہا بوجھ بھی سر سے اتر گیا۔ نشاط و الم کے اس دوراہے پر گریز پا رنگینیوں کے تعاقب میں بادشاہ کے رخش عمل کی رفتار نسبتاً تیز ہوگئی، اعیان سلطنت کی بجائے شاعر خلوت و جلوت میں ہم ساز و ہم راز رہنے لگے، کچھ وقت عبادت و ریاضت میں گذرتا اور کچھ شاعروں کے ساتھ ان کے کلام سے اہتزاز و انبساط کے حصول میں صرف ہوتا۔ قاسم نے ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں آخری دور کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"زبدۂ اعیانِ ہمایونش برضا جوئی حضرت احدیت موصوف

---

[1] نادرات شاہی۔ دیباچہ مرتب۔ ص ۳۰

[2] میر کی آپ بیتی (ترجمہ "ذکر میر") ص ۱۹۱

خلاصہ اوقاتِ مبارکش بہ پرستاریِ جنابِ صمدیت مصروف
برخے از آوانِ شبانہ روزیِ آں حضرت تفریحاً للطبیع اللطیف
بدین شغلِ شریف کہ عبارت از ابتکارِ شعر و شاعری است..
صرف می شود۔ دریں ہنگامِ عشرت آغاز فرحت انجام شطرے
از نکتہ سنجانِ شیریں زبان و برخے از سخن آرایانِ سحر بیان
بشرفِ حضورِ فیض گنجور مشرف می گردند و بحکم ارفع اعلیٰ اقدس
بعضے از ان جادو طرازانِ ذوالاختصاص در دیوانِ خاصہ
بوقتِ معینہ سعادت اندوز گشتہ بہ دو رِ غراہر گونہ اشعار
آبدار سامعہ افروزِ آں خدیو ہفت کشور می شوند[1]"

شاہ عالم کو تمام ازل نے قدر شعر کی توفیق کے ساتھ ہی شعر گوئی کا
ملکہ بھی ودیعت کیا تھا۔ وہ آفتاب تخلص کرتے تھے اور اردو کے علاوہ
فارسی، ہندی اور پنجابی میں بھی شعر کہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا
بیان ہے کہ ان کے چار اردو دیوان تھے[2] ایک دیوان کا ذکر اشپرنگر
نے بھی اپنی فہرست میں کیا ہے[3]۔ ان دواوین کے علاوہ شاہ عالم کی
جو منظوم تصانیف ہمارے علم میں ہیں ان میں ایک طویل مثنوی "منظوم
اقدس"، فارسی کا ایک دیوان اور اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کے
متفرق کلام کا ایک مجموعہ "نادراتِ شاہی" شامل ہے۔ "نادرات
شاہی" کی نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عالم صرف برائے
نام شاعر نہ تھے۔ انھیں شاعری کی تمام اصناف اور کئی زبانوں پر عبور

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۸ [2] آبِ حیات حاشیہ ص ۷۰

[3] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ ص ۵۹۷

حاصل تھا۔ اور وہ ان میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی اہلیت رکھتے تھے۔

شاہ عالم کے جانشین اکبر شاہ ثانی بھی موزونیِ طبع سے بہرہ یاب تھے۔ انھوں نے اپنے والد کے تخلص (آفتاب) کی مناسبت سے شعاع تخلص اختیار کیا تھا لیکن ان کے زمانے میں قلعہ معلی کی ادبی سرگرمیاں ان سے زیادہ ان کے فرزند اکبر میرزا ابو ظفر کی ذات سے وابستہ رہیں۔ یہی میرزا ابو ظفر بعد میں "ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی" کے لقب سے مشہور ہوئے اور ہندوستان کے آخری مغل تاجدار کہلائے۔ اکبر شاہ ثانی تخت نشینی کے بعد اپنی چہیتی بیگم نواب ممتاز محل کے حسب خواہش ان کے فرزند میرزا جہانگیر کو جو عمر میں میرزا ابو ظفر سے چھوٹے تھے، ولی عہد نامزد کرنا چاہتے تھے[۱] اس خواہش کی تکمیل کے لئے انھیں ایک بار یہ جھوٹ بھی بولنا پڑا کہ "ابو ظفر میرا بیٹا ہی نہیں ہے"[۲] ادھر میرزا ابو ظفر، سر آرچبولڈ اسٹین ریذیڈنٹ کی وساطت سے اپنا حق منوانے کی فکر میں مصروف تھے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان حق و ناحق کی یہ کشمکش عرصے تک جاری رہی حتیٰ کہ میرزا جہانگیر ریزیڈنٹ پر طپنچہ سے وار کرنے کے جرم میں ماخوذ ہو کر الہ آباد میں نظر بند ہوئے اور وقت کی ایک کروٹ سے خوابوں کی قرعہ فال میرزا ابو ظفر کے نام نکل آیا۔ ظفر کو چونکہ ابتدا میں اپنی جانشینی کے امکانات تاریک نظر آتے تھے اور اس حق تلفی کے احساس نے ان کے اندر ایک قسم کی شکستہ دلی اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس لیے وہ اپنا وقت عبادت اور ریاضت حال و قال کی مجلسوں اور شعر و سخن کی محفلوں میں گزارتے۔ یہی وہ پناہ گاہیں تھیں جہاں اس دور میں ان کی خون گشتہ آرزوں کو اپنی آسودگی کا سامان ملتا۔

---

[۱] ٹوائیلائٹ آف دی مغل (انگریزی) ص ۴۱ [۲] تلامذہ غالب (ذکر ظفر) ص ۲۰۸

ادبی تفکرات سے گرانبار دل و دماغ یک گونہ طمانیت محسوس کرتے تھے لیکن شاعری سے ان کی دلچسپی صرف ان مادیوں کی دین نہ تھی ولی عہدی کے قضیہ سے قبل شاہ عالم کی زندگی میں بھی ان کا ذوقِ سخن گستری ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا جس کا ثبوت قائم کے اس بیان سے ملتا ہے

"شوق این فن شریف بسیار در سر دارند و اکثرے از اوقات ہمایوں بر سخن سازی و نکتہ پردازی ہمت می گمارند[1]"

فکر شعر سے تعلق کے اس ابتدائی دور میں ظفر نے اصلاح کلام کی باقاعدہ خدمت شاہ نصیر کے سپرد کر رکھی تھی لیکن خوب چند ذکا اور قاسم کی روایت کے مطابق ان کے علاوہ دوسرے "استادانِ وقت" اور "جوہریانِ جوہر شناس" سے بھی کبھی کبھی رسمی طور پر مشورہ سخن اور تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے[2]۔ قاسم نے اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ اپنے صاحبزادے میر عزت عشق کا نام لیا ہے۔ انگریزی عملداری کے قیام (۱۸۰۳ء - ۱۲۱۸ھ) کے بعد شاہ نصیر نے دکن کی راہ لی تو ان کے شاگرد میر کاظم حسین بیقرار شاہزادہ ولی عہد کی غزل بنانے لگے[3]۔ ۱۲۲۲ھ / (۱۸۰۷ء) کے قریب شیخ ابراہیم ذوق کو قلعہ معلی تک رسائی اور دربار ولی عہدی میں باریابی حاصل ہوئی اور تھوڑے ہی دن بعد ۱۸۰۸ء (۱۲۲۲ھ) میں بیقرار کے دہلی سے باہر چلے جانے کے باعث استادِ سخن کا

---

[1] مجموعہ نغز جلد اول ص ۲۷۳

[2] عیار الشعرا مخطوطہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ورق ۱۵۲ اب و مجموعہ نغز جلد اول ص ۲۷۳

[3] آب حیات ص ۴۲۹ [4] ذوق سوانح اور انتقاد ص ۹۴

منصب ان کے لئے خالی ہو گیا۔[۱] اس طرح ایام شاہزادگی سے ولی عہدی کے لئے جدو جہد کے زمانے تک دہلی کے کئی مشہور اساتذہ ظفر کے دامن فیض سے وابستہ رہے۔ زمانہ ولی عہدی میں اور اس کے بعد بھی ذوق کی زندگی تک اگرچہ قلعہ معلیٰ میں ذوق کے سامنے شہر کے کسی دوسرے استاد کا چراغ نہ جل سکا پھر بھی وہاں جو مشاعرے اور جشن منعقد ہوتے تھے ان میں تمام ممتاز شاعر شرکت کرتے اور اپنا کلام سناتے تھے غرض کہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ظفر کی ادب نوازی و شعر دوستی کی بدولت قلعہ معلیٰ ادبی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔

قلعہ سے نکل کر جب ہم شہر کی طرف آتے ہیں تو وہاں بھی ہر طرف اردو کا جادو چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گزشتہ عہدی کے اواخر میں مغلوں کے نظام سیاست و حشمت سے مایوسی کے زیر اثر شہر میں شعر و ادب سے دلچسپیوں کی جو فضا پیدا ہوئی تھی، زیر تبصرہ دور کی ادبی تاریخ میں اس کے اثرات قلعہ معلیٰ کی ادبی سرگرمیوں کے نتائج سے زیادہ ہمہ گیر دیرپا اور دوررس نظر آتے ہیں۔ قلعہ کے جلسوں میں درباری رسوم و آداب کے پیش نظر آزادانہ اظہار خیال اور نقد و بصیرت کے مظاہرے کی گنجائش نہ تھی جبکہ شہر کے اکثر مشاعرے معرکوں میں تبدیل ہو جاتے، الفاظ کے محل استعمال پر اختلاف رائے ہوتا، فصاحت و بلاغت کے رموز و نکات کی بات چلتی، اوزان و بحور کے اسقام زیر بحث آتے اور ہر دعوے کی تائید میں اساتذہ کے کلام سے سند طلب کی جاتی تھی۔ یہ مشاعرے ادبی ذوق کی تربیت کا وسیلہ بھی تھے اور تفریح طبع کا ذریعہ بھی۔ یہاں

---

[۱] تلامذہ غالب ص ۲۱۳

طبیعتوں کے جوہر بھی کھلتے، ذہنوں کو جلا بھی حاصل ہوتی نکر ی ذہنی مہارت کا امتحان بھی ہوتا اور اس کے ساتھ ہی تھوڑی دیر کے لئے بے مہری ایام کی زخم خوردگی کا احساس بھی مٹ جاتا۔ قاسم کے بیان کے مطابق حمید الرحمن انیس کے مشاعرے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص ایک مصرع بھی موزوں کر سکتا تھا تو وہ اس محفل میں ضرور شریک ہوتا[۱] مہدی علی خاں عاشق جن کا انتقال "مجموعہ نغز" کی ترتیب (۱۲۲۱ھ) سے چار سال قبل ہوا تھا، بارہ سال تک ہر جمعہ کو اپنے یہاں اس پابندی کے ساتھ مجلس مشاعرہ کا اہتمام کرتے رہے تھے کہ کوئی بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتی حتی کہ ایک بار انھوں نے مرحوم بیٹے کے سوئم کے دن بھی فاتحہ وغیرہ سے فراغت پا کر حسب معمول دوپہر کے بعد اس مجلس کا انتظام کیا تھا[۲] بہادر بیگ خاں غالب اپنے مشاعرے میں انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات سے حاضرین کی تواضع کرتے تھے شعر خوانی سے فراغت کے بعد رقص و سرود کی محفل جمتی اور اکثر اس عالم میں صبح ہو جایا کرتی تھی[۳] فرخ نژاد شاعر مظفر الدولہ مختار الدولہ نواب ظفریاب خاں بہادر صاحب کو بھی شاعروں کے انعقاد سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ دہلی کے زمانہ قیام میں وہ بھی اکثر مصرع طرح تجویز کر کے شعراء کو طبع آزمائی کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ فخر الشعراء میر نظام الدین ممنون کے زیر اہتمام شا

---

[۱] مجموعہ نغز جلد اول ص ۸۰ [۲] مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۷۹

[۳] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۲، عمدۂ منتخب ص ۶۴۶

[۴] ضیاء نثر المخطوط کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ورق ۹ الف

صاحب کے پرانے مدرسے میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا، جس میں شہر کے تمام سربرآوردہ شاعر شریک ہوتے تھے[1]۔ شاہ نصیر اپنے یہاں ہر مہینے کی پندرھویں اور انتیسویں تاریخ کو طرحی مشاعرے ترتیب دیتے اور ان کے لئے خصوصیت کے ساتھ سنگلاخ زمینیں اختراع کرتے تھے[2]۔

اجمیری گیٹ کے باہر دلی کالج میں منشی فیاض پارسا کی طرف سے جو وہاں ریاضی کی تعلیم پر مامور تھے بڑے اہتمام کے ساتھ بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ قادر بخش صابر دہلوی کی روایت کے مطابق اس بزم میں مشاہیر شعرائے شیریں سخن شاہ نصیر غفر اللہ لہ، اور مومن خاں مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق مغفور اور ان کملائے قادر سخن کے تلامیذ اور موزوں طبعان شہر جمع ہو کر سامعان سخن فہم کے پردہ گوش کو رشک گلستان کرتے تھے[3]۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا تھا کہ پھر کوئی (ایسا) مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا[4]"۔ اسی مشاعرے میں ایک مرتبہ شاہ نصیر نے شعرائے لکھنؤ کی فرمائش پر کہی ہوئی دو غزلیں، "قفس کی تیلیاں، مگس کی تیلیاں" اور "ذہن پتھر کے، کفن پتھر کے" سنائی تھیں، جن کی بے پناہ مقبولیت ان کے حریفوں کے لئے باعث رشک ثابت ہوئی اور اس کے نتیجے میں عرصے تک جوابی غزلوں کا سلسلہ قائم رہا بالخصوص اول الذکر ردیف و قوافی میں اہل مجلس کے اس فیصلے کے تحت کہ ہر مشاعرے میں طرحی غزل کے ساتھ ایک غزل اس زمین میں بھی پڑھی جائے، ہفتوں طبع آزمائی ہوتی رہی۔ آخر میں ذوق نے اس زمین میں ولی عہد سلطنت مرزا

---

[1] یادگار غالب ص ۷۰
[2] گلشن بیخار طبع اول ۳۲۲
[3] گلستان سخن ص ۱۶۲
[4] آب حیات ۴۵۴

ابو ظفر کی مدح میں ایک مرصع قصیدہ تصنیف کیا۔ اس کے چند روز کے بعد یہ مجلس برہم ہو گئی۔[1]

اس قسم کی دلچسپ اور ہنگامہ خیز محفلوں کے پہلو بہ پہلو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء - ۱۲۳۹ھ ۲۴-۱۸۲۳ء) مولانا شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ ۱۷۵۰ء۔۔۔ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء) حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید (متوفی ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۰ء) مولانا فضل امام خیر آبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ ۲۹-۱۸۲۸ء) اور ان کے فرزند شمس العلما مولانا فضل حق آزردہ (۱۲۱۱ھ ۹۷-۱۷۹۶ء - ۱۲۷۸ھ ۶۲-۱۸۶۱ء) نواب الٰہی بخش خاں معروف (متوفی ۱۲۴۲ھ ۲۷-۱۸۲۶ء) منشی صدر الدین آزردہ (۱۲۰۴ھ ۹۰-۱۷۸۹ء ۱۲۸۵ھ ۶۹-۱۸۶۸ء) امام بخش صہبائی (شہید ۱۸۵۷ء) مطابق ۱۲۷۴ھ) اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جیسے جلیل القدر اور ثقہ علما و ادبا کی سنجیدہ صحبتوں میں بھی ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ اور شعر و شاعری کا دور چلتا رہتا تھا۔ "مولانا فضل امام کے گھر پر عصر کی نماز کے بعد ہمیشہ ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا فضلِ حق نے بھی ان روایات کو زندہ رکھا اور انتہائی پابندی سے یہ نشستیں منعقد کرتے رہے۔"[2] یہ وہی فضل حق ہیں جن کی پیہم تنبیہ پر مرزا غالب نے طرزِ بیدل کی پیروی سے کنارہ کش ہو کر اپنے اردو کلام کا دو تہائی حصہ دیوان

---

[1] گلستانِ سخن ص ۱۶۲۔ ۱۶۳ و آبِ حیات ص ۴۵۴

[2] ڈاکٹر خلیق انجم کے مضمون "امام بخش صہبائی" مشمولہ ماہنامہ "نگار" دہلی امروز سالنامہ ۱۹۵۹ء (ص ۳۸) کے حوالے سے۔

سے خارج کر دیا تھا[1]۔ اور جس سے مذہب کے سلسلے میں نظریاتی اختلاف کی ایک جھلک مومن کے اس مقطعے میں موجود ہے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

نواب الٰہی بخش خاں معروف "کہنہ مشق اور نادر الکلام سخنور" اور صاحب حال و قال" بزرگ تھے[2]۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بقول "لطفِ کلام کے عاشق تھے اور شعر کے دقائق و حقائق پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے[3]۔" مفتی صدر الدین آزردہ کے علمی وقار اور ان کی صحبت و ہم نشینی کی برکات کا اندازہ شیفتہ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ "بہ اعتقادِ من روزے کہ بے شرفِ مجالستِ ایشان بہ پایاں آید داخلِ ایامِ عمر نیست[4]" مولانا ابو الکلام آزاد اپنے والد کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ

"مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک وقت و یک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا[5]۔"

امام بخش صہبائی کو "فنونِ متعارفہ سخنوری میں وہ کمال حاصل تھا

---

[1] یادگار غالب ص ۱۰۹ و ۱۱۰
[2] ذکر غالب ص ۴۷
[3] آب حیات ص ۳۰۴ و ۳۱۴
[4] گلشن بے خار طبع اول ص ۱۵
[5] بحوالہ غالب از غلام رسول مہر ص ۲۰۹

جس کی نقلیں بہت کم ملتی ہیں[1]۔ آزردہ نے دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی کے لئے تین قابلِ انتخاب اساتذہ کی فہرست میں آپ کو غالب اور مومن کے پہلو بہ پہلو جگہ دی تھی[2]۔ کہا جاتا ہے کہ قادر بخش صابر سے منسوب تذکرہ "گلستانِ سخن" بھی انھیں کی تالیف ہے[3]۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی اس زمانے کے اربابِ کمال میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ دہلی میں ان کی قیام گاہ صہبائے سخن کے متوالوں کے لیئے دیرِ مغاں کا حکم رکھتی تھی بڑے بڑے باکمال سخنور ان کی دوستی اور ہم مجلسی پر ناز کرتے تھے۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ "لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور انکی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی[4]۔ غرضیکہ اس دور میں دہلی کے شعراء کے لئے ان کے اکابرِ علم و ادب کی موجودگی حالی کے بقول بعینہ ایسی تھی جیسا کہ عرفی و نظیری کے حق میں خانخاناں ابوالفتح فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں موجود ہونا[5]۔

مگر شعر سے دلچسپی کا یہ ماحول اور مشاعروں کی گرم بازاری صرف پایۂ تخت تک محدود نہ تھی اس کے اثرات مضافات میں بھی دور دور تک پہنچ گئے تھے۔ شیفتہ کے فیضانِ سخن اور یمنِ صحبت کا سلسلہ میرٹھ اور دوسرے قریبی قصبات تک وسیع تھا۔ وہ اپنی جاگیر کے انتظام

---

[1] تذکرۂ اہلِ دہلی مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ص ۱۳۸

[2] طبقات الشعرائے ہند۔ ص ۱۲۴؛ [illegible] ذکرِ غالب ص ۱۰۴

[3] مجلہ دہلی۔ اختر سالنامہ ۱۹۵۹ء ص ۳۸؛ مومن از کلب علی خاں فائق ص ۲۱۰

[4] یادگارِ غالب ص ۱۰۲

[5] یادگارِ غالب ص ۱۹۱

اور دیکھ بھال کی غرض سے زیادہ تر جہانگیر آباد (ضلع میرٹھ) میں مقیم رہتے تھے۔ دہلی کی طرح وہاں بھی ان کی مجلسیں اہلِ ذوق کے لئے تہذیب فکر و نظر کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ میرٹھ میں غلام محی الدین عشق و مبتلا کا مکان ادبی و شعری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ۱۲۲۱ھ کے بعد ایک مرتبہ شاہ نصیر نے بھی جو بیر صدر جہاں کی درگاہ کا زرِ سالانہ وصول کرنے کی غرض سے میرٹھ جاتے رہتے تھے۔ اپنی جانب سے ان کے یہاں دو مشاعرے منعقد کئے تھے جن میں اچھے خاصے ادبی معرکوں کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی[1]۔ سکندر آباد (ضلع بلند شہر) میں لالہ ہرگوپال خستہ اور خیراتی لال بے جگر شعر و شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے۔ بے جگر سرکار انگریزی کے ملازم تھے۔ تبادلے پر جہاں کہیں جاتے ان کے گرد شعرا کا ایک حلقہ قائم ہو جاتا تھا۔ اگر باہر سے کسی شاعر کی آمد کی اطلاع ملتی تو وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اس سے ملنے کے لئے پہنچتے اور اس کا کلام سننے اور بزموں کو سنوارنے کا بندوبست کرتے تھے۔ اس زمانے میں دہلی میں جو تذکرے لکھے گئے ان میں "عیار الشعرا" سب سے قدیم ہے۔ اس تذکرے کے مؤلف لالہ خوب چند ذکا کے آبا و اجداد بھی اسی سکندر آباد کے رہنے والے تھے[2]۔

گذشتہ صفحات میں جن شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے بعض کی تفصیلات بطور خاص اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں اردو شاعری کے اس دور پر سب سے زیادہ شاہ نصیر کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ ان کی ہر غزل حریف شاعروں کے لئے آزمائش اور تیاری کا

---

[1] تذکرہ بے جگر مخطوطہ لندن ورق ۱۹۳

[2] عیار الشعرا مخطوطہ لندن ص ۲۰۳

شعلہ بن جاتی تھی اور پھر مدتوں اس کے جواب کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ گویا وہ تمام شورشیں جن کے دم سے اس وقت کا شعری نظام زندہ و تابندہ تھا، مختصر ہو کر ایک ذات میں مجسم ہو گئی تھیں۔ نصیر کا حلقۂ تلامذہ اور اس کا دائرۂ اثر بھی بہت وسیع تھا۔ اردو کا وہ عہد آفریں تذکرہ نگار جس نے ایک طویل خلا کو عبور کر کے دہلی میں تذکرہ نگاری کے فن کو دوبارہ زندہ کیا اسی حلقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری مراد لالہ خوب چند ذکا سے ہے جن کا ذکر ہم اوپر کی سطور میں بھی کر آئے ہیں۔ ذکا شاہ نصیر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ عیار الشعرا انھوں نے اپنے استاد کی فرمائش ہی پر مرتب کیا تھا۔ یہ تذکرہ ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد ۱۲۱۷ھ/ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے اس پر نظر ثانی کی اور ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء کے قریب تک وقتاً فوقتاً حسب ضرورت اضافے اور ترمیمیں کرتے رہے۔ عیار الشعرا کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں ہمہ گیری اور جامعیت کے رجحان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے قبل جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں شعرا کی شمولیت ان کے کارناموں کے ادبی مرتبے یا پھر سہل الحصول معلومات کی پابند ہے۔ ذکا نے اس روش کو قابل ترک قرار دے کر یہ اصول وضع کیا کہ ہر وہ شخص جو طبع موزوں رکھتا ہے تذکرے میں شمولیت کا مستحق ہے، خواہ اس کے کلام کا معیار پست ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ انھوں نے اس طرف بھی دھیان دیا کہ تذکرہ نگار کی ذمہ داریاں صرف ان شعرا کے ذکر پر ختم نہیں ہو جاتیں جن کے حالات و کلام کی دستیابی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ان شاعروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا بھی اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے جن سے لوگ عام طور پر واقفیت نہ رکھتے ہوں یا جن کے کلام تک آسانی کے ساتھ دسترس ممکن نہ ہو۔ ذکا کے اس طریقہ

کار سے ان کے معاصرین بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں نواب
اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے انھیں خصوصیات کے ساتھ جو عیارالشعرا
کا طرۂ امتیاز ہیں "عمدۂ منتخبہ" مرتب کیا۔ اس تذکرے میں بھی کم از کم
۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تک اضافے کیے جاتے رہے۔ ۱۲۴۴ھ/۲۹-۱۸۲۸ء
میں حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" کی تکمیل کی۔ یہ تذکرہ بھی اسی
سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ذکا کے تذکرے کا نقش اول سنین کے التزام
سے بالکل عاری تھا۔ نظر ثانی اور بعد کی اضافوں کے دوران وہ اس
کمی کے ازالے کی طرف راغب ہوئے لیکن سابقہ معلومات پر کوئی قابل
لحاظ اضافہ نہ کر سکے۔ سرور کے یہاں اگرچہ تاریخی حوالوں کی تعداد بہت زیادہ
نہیں تاہم اس میدان میں ان کا قدم ذکا سے کچھ آگے بڑھا ہوا ہے تاہم
اس معاملے میں ذکا اور سرور دونوں اس سے پیچھے ہیں۔ ان کا تذکرہ "عیارالشعرا"
اور "عمدۂ منتخبہ" کے بعد کی تالیف ہے مگر اس میں ایک دو مقامات
کے علاوہ کسی واقعے کا زمانہ واضح طور پر مذکور نہیں۔ تاریخی نوعیت
کے اس مابہ الامتیاز فرق سے قطع نظر سرور نے ذکا کی معلومات پر اور قاسم
نے سرور اور ذکا دونوں کے فراہم کردہ معلوماتی سرمایہ پر کچھ اضافے بھی
کیے ہیں۔ سرور کے تذکرے کی روشنی میں دہلی کے ادبی و تہذیبی ماحول کا
"عیارالشعرا" کی بہ نسبت کہیں زیادہ بہتر طور پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے جبکہ
"مجموعۂ نغز" اس وصف میں دوسرے تمام تذکروں سے ممتاز ہے۔
یہ تذکرہ طرزِ ترتیب کی ندرت اور باقاعدگی کے لحاظ سے بھی اپنی نظیر
نہیں رکھتا۔ شعرا کی ردیف وار تقسیم کے ساتھ تخلص کے حرف اول و
دوم کی رعایت اور ہر ردیف کی ابتدا میں اس کے تحت ذکر کیے جانے

والے شعرا اور ان کے اشعار کی مجموعی تعداد کا تفصیلی بیان اس کے تذکرے کی انفرادی خصوصیات ہیں۔

"مجموعۂ نغز" کے بعد ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی نے "طبقات سخن" ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے قریب آزردہ نے تذکرۂ مختصر ریختہ گویان، ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء سے قبل شرف الدین مسرور نے تذکرہ شعرائے اردو بہ زبان اردو، ۱۲۴۰ھ میں خیراتی لال بے جگر نے تذکرہ بے جگر اور ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء اور ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے درمیان نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے "گلشن بے خار" تالیف کیا۔

"طبقاتِ سخن" اگرچہ ہماری معلومات میں بعض اہم اضافے کرتا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے تذکرہ نگاری کے ارتقا میں اسے کوئی خاص مقام نہیں دیا جاسکتا۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے تذکرے کا کوئی مکمل نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ کارپس کرسٹی کالج کیمبرج کے کتب خانے میں ایک ناتمام نسخہ محفوظ ہے جو قائم چاندپوری کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس نسخے میں جن شعرا کے حالات درج ہیں، وہ بالعموم نہایت مختصر اور تواریخ و سنین کے التزام سے عاری ہیں البتہ بعض شعرا کے کلام کے بارے میں مؤلف کی رائیں بڑی جامع اور مختصر معلوم ہوتی ہیں میر کے متعلق ان کا یہ قول مشہور کہ "پستش اگرچہ اندک پست است، اما بلندش بسیار بلند" جو شیفتہ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے[1] اس ضمن میں آتا ہے۔ شرف الدین مسرور، غلام محی الدین مبتلا کے فرزند تھے۔ خیراتی لال بے جگر، شیفتہ اور لالہ سری رام کے بیانات سے معلوم ہوتا

۱؎ گلشن بے خار طبع اول۔ ص۔ ۱۳۲

ہے کہ اپنے والد کی طرح انھوں نے بھی شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا[1]۔ یہ تذکرہ اُردو میں لکھا گیا تھا اور اس کی ضخامت اٹھارہ انیس جز کے قریب تھی[2]۔ مسرور کے اس تذکرے کا ایک قطعی نسخہ لالہ سری رام کے کتب خانے میں موجود تھا لیکن اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

بے جگر کے تذکرے کا ایک ناقص نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں دریافت ہوا ہے۔ خصوصیات کے لحاظ سے اس تذکرے کا سلسلہ "چمنستانِ شعرا، گلِ عجائب، اور گلزارِ ابراہیم" سے ملتا ہے لیکن اسکا پایہ ان تمام تذکروں سے بلند ہے۔ بے جگر نے جس کثرت کے ساتھ تواریخ وسنین کے حوالے دیئے ہیں اور اس طرح ایک مخصوص دائرے میں فنی معیار کا جو اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ہے[3] اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں کسی دوسری جگہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ تذکرے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے جگر تلاش و جستجو اور محنت کے عادی ہیں اور انھوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ شعرا کے حالات کی چھان بین کی ہے۔ یہ ضرور ہو کہ اس راہ میں انھوں نے بعض جگہ ٹھوکریں بھی کھائی ہیں اور بعض اوقات حالات سے مجبور ہو کر انھیں اپنی روش بھی بدلنا پڑی ہے لیکن محض تساہل کی بنا پر وہ کسی جگہ بھی سپر ڈالتے یا جی چھوڑتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

---

[1] تذکرہ بے جگر۔ نسخہ لندن ورق ۱۰۲ الف گلشن بے خار طبع اول ص ۶۴ و خمخانہ جاوید جلد چہارم ص ۱۷۰
[2] ...
[3] تذکرہ بے جگر ورق ۱۰۲ الف

شیفتہ تعارف نویسی میں مشورہ کے قدم بہ قدم ہیں۔ البتہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ شعرا کے حالات جمع کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اچھے اشعار کی گرد آوری کو اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے ترتیب میں تخلص کے حرف اول کے ساتھ حرف دوم کی بھی رعایت ملحوظ رکھ کر انھوں نے کسی حد تک قاسم کی پیروی کی ہے بعض شعرا کے کلام کے بارے میں بھی ان کی رائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ... کچھ قد آور شخصیتیں ان کے یہاں اس طمطراق اور شکوہ و شان کے ساتھ صفحہ قرطاس پر جلوہ گر ہوئی ہیں کہ ان کی ہر ادا دامن دل کو ہوا دیتی ہے اور ہمارے اندر ان کی تخلیقات کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا کر لیتی ہے۔ شوق انگیزی کی اس فضا کا دائرہ محدود سہی لیکن اس سے بہر حال تذکرہ نگار کی عظمت و انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ عوام کے ادبی ذوق کی تہذیب اور انھیں فن کی خدمت کرنے والوں سے قریب لانے کی کوشش بھی تذکرہ نویسی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

اودھ میں تذکرہ نگاری کا یہ دور مصحفی، انشا اور ان کے معاصرین کی ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہے۔ مصحفی جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے، ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ انشا، غلام قادر روہیلہ اور مرہٹوں کی باہمی آمیزش میں دہلی کی تباہی کے بعد غالباً ۱۲۰۳ھ ۱۷۸۹ء میں وارد ہوئے اس کے بعد ۱۲۰۵ھ ۹۱-۱۷۹۰ء میں شاہ عالم کے فرزند رشید زادہ آفاق شہزادہ سلیمان شکوہ اپنی جانشینی کے لئے فضا ہموار کرنے کی غرض

لکھنؤ آئے[1] اس زمانے میں اگرچہ آصف الدولہ بقید حیات تھے، اور ان کے دربار میں شعرا کے لئے قدر و منزلت کی کوئی کمی نہ تھی پھر بھی شہزادہ موصوف کے شہر میں ورود کے ساتھ ہی ادبی محفلوں کی تمام تر رونق ان کے گرد سمٹ آئی۔ سعادت یار خاں رنگین اس سفر میں شہزادے کے ہم رکاب آئے تھے[2]۔ لکھنؤ میں موجود ممتاز شاعروں میں سے غالباً انشاء کو سب سے پہلے آپ کی خدمت میں باریابی اور رسوخ کا شرف حاصل ہوا۔ بعد از ان جب شہزادے کی توجہ وسیع پیمانے پر شاعروں کے انعقاد کی طرف منعطف ہوئی تو ایک دن مصحفی بھی جو اس قسم کی محفلوں کی ترتیب و تنظیم میں دوسرے شعرا کی بہ نسبت زیادہ تجربہ اور مہارت رکھتے تھے۔ انشاء کی وساطت سے "حسب الطلب" حاضر خدمت ہوئے اور اسی تاریخ سے داخلِ ملازمت کر لئے گئے[3]۔ رنگین، انشا اور مصحفی کے علاوہ میر سوز، قلندر بخش جرأت، مرزا نعیم بیگ جوان اور شیخ ولی اللہ محب بھی اسی مجلس کے اراکین خصوصی میں شامل تھے۔ ان تمام شعرا کو شاہزادے کی سرکار سے ماہوار تنخواہوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً گراں قدر تحائف اور انعامات بھی ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ مصحفی کا بیان ہے کہ:

"بعد چندے (از انسلاک در سلک ملازمین) از کلام فقیر محظوظ شدہ در جائزہ قصائد مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیت عیدین

---

[1] سوانحات سلاطین شاہانِ اودھ (قیصر التواریخ) جلد اول ص ۲۸۰

[2] مجمع الانتخاب مخطوطہ علی گڈھ ورق ۳۰۲ الف

[3] تذکرہ ہندی ص ۱۲۱

[4] تذکرہ ہندی ص ۶۶، ۱۰۱، ۱۲۱، ۱۳۱؛ عمدہ منتخبہ ص ۳۱۳؛ مجموعہ نغز ص ۲۳۱

بودند بہ انعام بتریک بحور بر احقر را از حضیض خاک بہ اوجِ افلاک رسانیدند و ہم چنیں قلندر بخش جرأت.. بہ نوازشِ خسروانہ در آمدہ و نیز نوکر شدہ و میر سوز.. در اوائلِ شاعرہ بہ انعام یک دو شالہ و یک پچھو سرفرازی یافتہ و میر انشاء اللہ خاں...... ہمیشہ موردِ گوناگوں الطافِ خسروی باشد و چند بار بہ انعام لائقہ قبا و گوشوارہ سرمباہات برافراختہ اند[1]"

سلیمان شکوہ کی مصاحبت اور بزم آرائی کے اس زمانے میں کچھ دن کی دوستی اور رفاقت کے بعد مصحفی اور انشا کے درمیان اختلافات رونما ہوئے اور مہذب حریفانہ چشمک سے رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل اور کوچہ بہ کوچہ ہجو سرائی تک نوبت پہنچی۔ حتیٰ کہ امیر احمد علوی کے اندازے کے مطابق ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) کے قریب مصحفی شہزادے کی ملازمت سے علیحدہ ہو گئے اور انشاء کو ان کے ساتھ حد درجہ توہین آمیز سلوک کی پاداش میں نواب آصف الدولہ کے حسب الحکم شہر بدر کر دیا گیا[2]۔

ربیع الاول ۱۲۱۲ھ (ستمبر ۱۷۹۷ء) میں آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد تین ساڑھے تین مہینے تک زمامِ اقتدار وزیر علی خاں کے ہاتھ میں رہی۔ پھر رجب ۱۲۱۲ھ (جنوری ۱۷۹۸ء) میں انگریزوں کی تائید و حمایت سے سعادت علی خاں نواب وزیر مقرر

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۲۱

[2] ماہنامہ نگار مصحفی نمبر ص ۳۱، ۳۲

ہوئے۔ وزیر علی خاں اور سعادت علی خاں کے درمیان وراثت کی اس کش مکش سے فائدہ اٹھا کر انشاء دوبارہ لکھنؤ چلے آئے اور حسب سابق سلیمان شکوہ سے وابستہ ہو گئے چنانچہ مرزا علی لطف اور شاہ کمال کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں وہ لکھنؤ میں مقیم اور "مرشد زادہ آفاق" سے متوسل تھے[1]۔ مصحفی کچھ دن تک پریشان حال اور بے روزگار رہنے کے بعد ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کے قریب مرزا محمد تقی ہوس کے یہاں ملازم ہوئے[2] ہوس کا تعلق اودھ کے برسر اقتدار خاندان سے تھا[3]۔ وہ میر حسن کی وفات (محرم ۱۲۰۱ھ/نومبر ۱۷۸۶ء) کے بعد سے مصحفی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو چکے تھے اور دوسرے امراء و روسا کی طرح اپنے یہاں مشاعرے منعقد کرتے رہتے تھے[4]۔ "مخزن الغرائب" مولفہ شیخ احمد علی سندیلوی (مرتبہ ۱۲۱۸ھ) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں انشا کسی ناراضگی کے باعث سلیمان شکوہ کی ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد کچھ دن الماس علی خاں خواجہ سرا کی رفاقت میں رہ کر نواب سعادت علی خاں کے مقربین خاص میں شامل ہو چکے تھے[5]۔

انشاء اور مصحفی کے معرکوں کے علاوہ مصحفی اور جرات اور جرات اور نوا بدایونی کے معارضے بھی اس دور کے ادبی ماحول کی تشکیل میں

---

[1] گلشن ہند طبع ثانی ص ۱۶، مجمع الانتخاب مخطوطہ علی گڑھ ورق ۱۳۹ الف

[2] ریاض الفصحا ص ۲ — [3] تعلیقات تذکرہ ابن طوفان ص ۴۰

[4] ریاض الفصحا ص ۲۶۷ — [5] ریاض الفصحا ص ۲

[6] بحوالہ دستور الفصاحت مرتبہ عرشی حاشیہ ص ۱۰۵

خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مصحفی اور جرأت کے درمیان چشمک کا آغاز غالباً ۱۲۰۹ھ - ۱۷۹۴ء کے قریب ہوا۔ مصحفی اس زمانے کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "بہ ہمسری من می پرداز د و در باطن ہمیشہ تخم کینہ می کارد۔"[1] یکتا لکھنوی کا بیان ہے کہ جرأت کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ جب مشاعرے میں آتے تو شرکائے محفل میں نصف بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ تو ان کے تلامذہ کی ہوتی تھی۔[2] ادھر مصحفی نے بھی رفتہ رفتہ اپنے گرد شاگرد جمع کر لیے تھے۔ مشاعروں میں ان دونوں گروہوں کے درمیان خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

جرأت و نوا کے درمیان مطارحات و ہجاجات کے واقعے تذکرہ ہندی کی تکمیل (۱۲۰۹ھ) کے بعد اور ۱۲۲۱ھ، ۱۸۰۶ء کے قریب نوا کی سفر حج کو روانگی سے قبل پیش آئے۔ نوا اگرچہ یک و تنہا تھے لیکن یکتا کے بقول ان معرکوں میں انھوں نے کئی مرتبہ جرأت اور ان کے شاگردوں کو شکست فاش دی تھی حتیٰ کہ یہ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ نوا بھی ہمیشہ "زبان سناں" اور "تیغ زباں" دونوں سے آمادۂ جنگ رہتے تھے۔ باہمی کشیدگی کا یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ بالآخر محمد عاشق تصور کی کوششوں سے دونوں حریفوں میں مصالحت ہو گئی۔[3]

۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں جرأت کا انتقال ہو گیا۔[4] اگلے سال ۲۰ شعبان (۲۱ اگست ۱۸۱۰ء) کو میر بھی چل بسے۔[5] ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں سعادت علی خاں نے وفات پائی اور ان کی جگہ غازی الدین حیدر

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۸۶
[2] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۹۹
[3] دستور الفصاحت، مرتبہ عرشی ص ۱۰۹
[4] دستور الفصاحت حاشیہ ص ۹۹
[5] دلی کالج میگزین (میر نمبر) ص ۴۱

برسرِ اقتدار آئے۔ ان کے زمانے میں ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں انشا بھی جن پر کئی سال سے جنون کی کیفیت طاری تھی، راہیِ ملکِ بقا ہو گئے[1]۔ جرأت میر اور انشا کے اس طرح یکے بعد دیگرے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد میدانِ سخن تنہا مصحفی کے ہاتھ رہ گیا۔ اس زمانے تک مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے تقریباً تیس شاعر ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو چکے تھے[2]۔ اس کے علاوہ بھی لکھنوی شعرا کی نوجوان نسل پر ان کے اثرات کافی گہرے تھے۔ نئے شعرا کی یہی نسل جس میں آتش و ناسخ جیسے استاد سخن بھی شامل ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری کے ربعِ ثانی و ثالث میں لکھنؤ کے ادبی ماحول کی روحِ رواں بنی۔ ۱۲۴۰ھ (۲۵-۱۸۲۴ء) میں مصحفی دنیا سے سدھارے[3]۔ اس کے چھ سال بعد ۱۲۴۶ھ میں ظہور اللہ خاں نوا کا بھی انتقال ہو گیا[4]۔ ان دونوں شعرا کے ساتھ ادبی معرکہ آرائیوں کا ایک عہد ختم ہو گیا۔

سیاسی سطح پر بھی اس اثنا میں ایک اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ (۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء) کو غازی الدین حیدر نے انگریزوں کے اشارے پر "ابو المظفر معز الدین شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ غازی" لقب اختیار کر کے حکومتِ اودھ کی خود مختاری اور مرکز سے بے تعلقی کا اعلان کر دیا[5]۔ نظامِ حکومت کے اس تغیر کی رو سے سب سے

---

[1] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۱۰۱ [2] ریاض الفصحا ص ۲۸۷

[3] نگار لکھنؤ، مصحفی نمبر ص ۴۲

[4] تاریخ رحلت "نوا شد بہ ایوانِ بود و نبود" سے نکلتی ہے۔ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی شمارہ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۴۰ [5] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد چہارم ص ۱۴۴

زیادہ شہزادہ سلیمان شکوہ پر پڑی جنھیں اس وقت تک شاہ دہلی سے نسبت فرزندی کی بنا پر اقتدار اعلیٰ کا نمایندہ اور خصوصی تعظیم و تکریم کا مستحق سمجھا جاتا رہا تھا۔ غازی الدین حیدر اعلان بادشاہت کے بعد بندگی کے آبائی مراسم موقوف کر کے شہزادے سے ساویانہ تعلق کے خواستگار ہوئے۔ سلیمان شکوہ اگرچہ بدلے ہوئے حالات میں بظاہر اس خواہش کے احترام پر رضامند ہو گئے لیکن اندرونی طور پر راہ و رسم کی یہ تبدیلی دونوں خاندانوں کے درمیان ایک قسم کی کشیدگی اور منافرت کا بیج بو گئی۔ یہاں تک کہ ۱۲۴۳ھ، ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد سلیمان شکوہ نے لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے آگرے میں بود و باش اختیار کر لی۔[1]

نصیر الدین حیدر ۱۲۵۲ھ، ۱۸۳۷ء تک برسر حکومت رہے۔ ان کے مزاج پر لہو و لعب غالب تھی۔ اس لئے چند ایسے شاعروں کے سوا جنھوں نے مرثیہ گوئی کی جانب توجہ کی، عام شاعر ان کے دربار میں بار نہ پا سکے۔ احمد حسین سحر لکھنوی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ظہور اللہ خاں نوا کو شاہنامہ نظم کرنے کا حکم دیا تھا۔[2] لیکن نوا ان کے برسر اقتدار آنے کے بعد صرف ڈھائی سال زندہ رہے اور ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ شعر و ادب سے نصیر الدین حیدر کی عدم دلچسپی اور سلیمان شکوہ کے لکھنؤ سے رخصت ہو جانے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بہادر شاہ ظفر ص ۱۰۱ تا ۱۰۳

[2] بہار بے خزاں، مخطوطہ، دار العلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

کے باعث درباری سطح پر شعرا کی پرورش اور سرپرستی میں کچھ کمی ضرور آئی لیکن بحیثیت مجموعی اردو شاعری کی ترقی اور مقبولیت پر حالات کی اس تبدیلی کا کوئی منفی اثر مرتب نہ ہوا۔ لکھنؤ میں یوں بھی ہر طرف تمول اور خوش حالی کا دور دورہ تھا اور شعرا کی سرپرستی لازمۂ امارت سمجھی جاتی تھی۔ امرائے شہر میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں موجود تھے جو اپنے یہاں شاعرے منعقد کرتے اور شعرا کو نوازتے رہتے تھے۔ مصحفی کے ساتھ مرزا محمد تقی ہوس کے حسنِ سلوک اور شعر و ادب سے ان کی دل چسپی کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ میرزا سیف علی خاں شگفتہ، نواب کلب علیخاں جلال الدولہ مہدی علی خاں بہادر شجاعت جنگ متخلص بہ مہدی اور افتخار الدولہ معین الملک میرزا فخر الدین احمد خاں بہادر صولت جنگ معروف بہ مرزا حاجی قمر بھی ایسے ہی ادب نوازوں کے زمرے میں شامل ہیں۔ شگفتہ نواب شجاع الدولہ کے صاحبزادے تھے۔ مصحفی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"بہ مقتضائے موزونیٔ طبع کہ از طفولیت بود، خود را ہمیشہ مصروفِ غزل گوئی داشتہ۔ در سرکارِ ایشاں از موزوناں شہر یعنی مرزا کاظم علی جواں متخلص و منتظرہ شاہ ملول الہام آمد و شدی کردند"[1]

کلب علی خاں اور مہدی علی خاں، نواب سعادت علی خاں کے فرزند تھے۔ کلب علی خاں کو بظاہر سخن گوئی سے تعلق خاطر نہ تھا لیکن سخن پرستی

---

[1] ریاض الفصحا، ص ۱۰۵

اور سخن نوازی انھیں وراثت میں ملی تھی۔ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے قریب کچھ دن تک مصحفی ان کے دربار سے بھی وابستہ رہے تھے[1]۔ مہدی علی خاں مہدی کو دوسرے "فنون دانش مندی و دانائی" کے ساتھ فکر شعر میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں مصحفی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

"در سرکار دولت مدار ایشان بعضے از صاحب کمالان ایں فن بہ صیغہ شاعری عز امتیاز دارند۔ دراں جملہ فقیر ہم داخل است و پیش ازیں در حین ۔۔ حیات نواب مغفور (سعادت علی خاں) ہم با شعرائے چند لازم ایشان ماندہ"[2]

... الدین احمد قمر اور ان کے والد مرزا فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر، غازی الدین حیدر کے متوسلین خاص میں سے تھے[3]۔ جعفر فارسی میں اور قمر اردو میں فکر شعر کرتے تھے۔ مولوی عبد القادر حقیق رامپوری نے اپنے روزنامچے میں ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) سفر لکھنؤ کی روداد بیان کرتے ہوئے مرزا جعفر کے یہاں شاعرے کے انعقاد کا ذکر کیا ہے[4]۔ مصحفی اور دیگر لکھنوی کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاعرہ مرزا حاجی ترکی ادب دوستی کا رہین منت تھا[5]۔ حسن اتفاق سے اس زمانے میں شاہ نصیر بھی اپنے بیٹے کی تلاش میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ مصحفی

---

[1] ریاض الفصحا ص ۷ اور ۲۵۰ [2] ریاض الفصحا ص ۲۸۲

[3] تعلیقات تذکرہ ابن طوفان ص ۶۷ و ۶۸

[4] بحوالہ دستور الفصاحت حاشیہ ص ۹۳ و ۱۱۴

[5] ریاض الفصحا ص ۶۹، دستور الفصاحت مرتبہ عرشی ص ۱۱۴

تبدیل اور ناسخ وغیرہ کے ساتھ وہ بھی اس مشاعرے میں شریک ہوتے اور اپنے کلام سے اہلِ محفل کو محظوظ کرتے تھے[1] لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کا رجحان بھی اسی دور میں عام ہوا جس کے ساتھ اردو شاعری تفریحی محفلوں میں محدود رہ کر اعزا داری کی سنجیدہ مجلسوں میں بھی بار پا گئی اس طرح اسے ایک نئے میدان میں اپنے وسیع امکانات کو بروئے کار لانے کے مواقع حاصل ہوئے۔

لکھنؤ کی یہ ادبی فضا جس کے زیرِ سایہ گروہ بندی اور معرکہ آرائی کے رجحانات خصوصیت کے ساتھ پروان چڑھے، تذکرہ نویسی کے لئے حد درجہ معاون اور سازگار ثابت ہوئی۔ مصحفی جو ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں "عقد ثریا" کے نام سے شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ مرتب کر چکے تھے اس دور کے اہلِ قلم میں اردو تذکرہ نویسی کی حیثیت سے سب سے پہلے سامنے آئے... ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے قریب انھوں نے میر حسن کے صاحبزادے اور اپنے شاگرد رشید میر مستحسن خلیق کی فرمائش پر "تذکرۂ ہندی" کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ یہ تذکرہ نظرِ ثانی اور بعض اضافوں اور ترمیموں کے بعد ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء میں مکمل ہوا۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں لالہ چنی لال طریف کی فرمائش پر انھوں نے ایک اور تذکرہ ریاض الفصحا کی داغ بیل ڈالی تاکہ ان شاعروں کو کسی وجہ سے پچھلے تذکروں میں جگہ نہ پا سکے تھے یا گزری ہوئی درمیانی مدت میں منظرِ عام پر آئے تھے اہلِ ذوق سے متعارف کرایا جا سکے۔ اس تذکرے کی تکمیل ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں ہوئی ہے اور اس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے

---

[1] دستور الفصاحت مرتبہ عرشی۔ ص ۱۱۴

شاعر شریک ہیں لیکن غالب تعداد شعرائے ریختہ ہی کی ہے۔[1]

مصحفی کے ان تذکروں کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت سوانحی اور تنقیدی عناصر کا امتزاج ہے۔ تواریخ اور سنین کے حوالے ان کے یہاں کم ہی ملتے ہیں لیکن ہر شاعر کے حال میں حتی المقدور اس کی زندگی اور شخصیت کے مختلف گوشوں کے جائزے کی کوشش اور اس کی عمر کا تخمینی تعین ان کے معمولات میں داخل رہا ہے۔ کلام کے بارے میں بھی ان کی رائے بڑی جامع اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ جن شاعروں کے کلام کے تفصیلی مطالعے کا انھیں موقع ملا ہے ان کے ذکر میں انھوں نے نہایت غیر جانبداری، وسعت نظر اور فراخ دلی کے ساتھ ان کے کمالات کا اعتراف اور معیار فن کی نشاندہی کی ہے۔ زندگی اور شخصیت اور فن کے اجتماعی مطالعہ کا یہ رجحان اردو تذکرہ نویسی کو مصحفی کی دین ہے اور اس نے انھیں اس دور کے دوسرے تمام تذکرہ نگاروں سے سربلند کر دیا ہے۔

مصحفی کے علاوہ اس دور سے متعلق اردو کے دوسرے تذکرہ نگار

---

[1] جناب بشیر احمد علوی نے مزید دو تذکروں "ید بیضا" اور "نور ازل" کو مصحفی سے منسوب کرتے ہوئے نگار کے "مصحفی نمبر" میں "مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں" کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون سپرد قلم کیا ہے لیکن کافی تلاش و تحقیق اور بعض باخبر حضرات سے تبادلۂ خیال کے بعد یہ ثابت ہوا کہ علوی صاحب کی یہ دریافت ایک جعل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ تذکرہ مضمون میں جو اقتباسات بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان تذکروں کا کوئی خارجی وجود تھا بھی تو یہ "عقد ثریا"، "تذکرۂ ہندی" اور "ریاض الفصحا" کے مختلف حصوں کو یکجا کر کے مرتب کر لئے گئے تھے۔

شیخ امام بخش کشمیری ہیں۔[۱] امام بخش کے سلسلہ میں مصحفی کا بیان ہے کہ انھوں نے عبرت تذکرہ نگار کہلائے جانے کے شوق میں ان (مصحفی) سے "تذکرہ ہندی" کے مسودات مستعار لے کر ان کی بنیاد پر اپنے ایک توسل بیر شاہ حسین حقیقت سے ایک تذکرہ مرتب کرایا تھا[۲] بہ الفاظ دیگر اس تذکرے کی اصل حیثیت "تذکرۂ ہندی" کے چربے یا نقل سے زیادہ نہ تھی۔ مصحفی کے علاوہ سعادت خاں ناصر نے بھی ایک جگہ اپنے تذکرے کے ماخذ کے ذیل میں "تذکرۂ احبا" کے نام سے اسکا حوالہ دیا ہے[۳] لیکن ابھی تک اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

تذکروں کے پہلو بہ پہلو یہاں دو ایسی کتابوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو مخصوص اصلاحی معنوں میں تذکروں کی تعریف میں نہیں آتیں لیکن ان کے بعض حصے شعرائے اردو کے تعارف کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اس اعتبار سے کافی اہمیت رکھتے ہیں ان میں سے پہلی کتاب احمد علی خاں یکتا لکھنوی کی دستور الفصاحت ہے جو ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء کے قریب تصنیف ہوئی اور ۱۲۴۹ھ ۳۴-۱۸۳۳ء میں نظر ثانی کے بعد از سر نو مرتب کی گئی۔ اس کتاب کا خاتمہ اردو کے ۳۵ صاحب طرز اہ

---

[۱] جناب امیر احمد علوی نے بیر بخش مترود کا کوروی شاگرد مصحفی سے بھی شعرائے اردو کا ایک تذکرہ منسوب کیا ہے جس کا نام "بیاض صبح ازل" اور تاریخ تکمیل ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ (۱۲ نومبر ۱۸۲۳ء) بتائی گئی ہے اس تذکرے کے متعلق ان کی معلومات جناب بشیر احمد علوی کے مرتب کئے ہوئے ایک قلمی نسخے پر مبنی ہیں اس لئے ہمیں مصحفی کی دو بیاضوں کی طرح اس کا وجود بھی مشکوک نظر آتا ہے۔

[۲] تذکرہ ہندی ص ۸۶، ۸۷

[۳] خوش معرکہ زیبا۔ مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری ورق ۳۱ ب

ممتاز شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ کمیت کے اعتبار سے یہ حصہ بظاہر ناقابلِ اعتنا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے محدود دائرے میں یکجا کئے مفید اور معتبر معلومات کا جو سرمایہ فراہم کیا ہے اس کی وجہ سے اس کی افادیت کافی بڑھ گئی ہے۔ کتاب کا مقدمہ اردو کے لسانی جائزے سے متعلق ہے۔ جناب عرشی رامپوری نے ان دونوں ابتدائی اور آخری حصوں کو یکجا کر کے اسے ایک تذکرے کی صورت دے دی ہے۔ دوسری کتاب بہادر سنگھ دہلوی کی "تالیف "یادگارِ بہادری" ہے۔ یہ کتاب جسے مختلف علوم و فنون کی انسائکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے، کئی سال کی مسلسل کوشش و محنت کے بعد ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کے قریب لکھنؤ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ مولف نے اس میں دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی طرح شرق کی مختلف مشہور زبانوں کے شعرا کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ہر زبان کے شعرا کے لئے انھوں نے ایک علیحدہ فصل مخصوص کی ہے۔ شعرائے اردو سے متعلق فصل میں ۹۲ شاعروں کے حالات اور کلام کے مختلف نمونے شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر شعرا کے بارے میں بہادر سنگھ کے بیانات کا ماخذ تذکرہ "نکات الشعرا" ہے لیکن بعض جگہ انھوں نے ذاتی واقفیت کے کچھ عجیب تر کی معلومات بر اضافے بھی کئے ہیں اور بعض شاعروں کے متعلق تمام تر معلومات خود ہی فراہم کی ہے اس لئے تذکروں کی بنیاد پر تاریخ ادب اکھے مرتب کرنے کے سلسلے میں "خاتمہ دستور الفصاحت" کی طرح "یادگار بہادری" کے اس حصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

دکن میں پچاس سال کے اس عرصے میں شاہ کمال الدین حسینی عرف شاہ کمال کے "مجمع الانتخاب" کے علاوہ کسی اور تذکرے کی

ترتیب کا پتہ نہیں چلتا۔ شاہ کمال کڑہ مانک پور کے رہنے والے تھے[1]۔ آصف الدولہ کے عہد میں انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں وہ لکھنؤ سے حیدرآباد چلے گئے[2] جہاں ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں انھوں نے یہ تذکرہ مرتب کیا[3]۔ لیکن اس کے لئے تمام ضروری مواد وہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی میں جمع کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے اس کی تالیف درحقیقت دکن کی فضائے شعری سے زیادہ اودھ کے ادبی ماحول کی رہین منت ہے۔ کمال نے اس تذکرے میں شعرا کے حالات زندگی بیان کرنے سے زیادہ کلام کے انتخاب پر زور دیا ہے۔ حالات کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالعموم میر، قائم اور مصحفی کے تذکروں سے ماخوذ ہے۔ اس لئے اس تذکرے سے مختلف شاعروں کے کلام کے منتخب اور متنوع سرمایہ کے علاوہ کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

دکن کی طرح عظیم آباد اور اس کے قرب و جوار میں بھی تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول میں تذکرہ نگاری کے رجحان کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی چنانچہ "تذکرہ عشقی" مولفہ شیخ وجیہہ الدین عشقی عظیم آبادی کے علاوہ اب تک اس دور سے متعلق کسی دوسرے اردو تذکرے کا سراغ نہیں ملا ہے۔ یہ تذکرہ سرسری اندازے کے مطابق ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۲ء اور ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء کے درمیانی عرصے کی تالیف ہے۔ لیکن اس کے بیشتر حصے تیرھویں صدی کی پہلی تین دہائیوں کے

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۹۰

[2] مجمع الانتخاب مخطوطہ علی گڑھ ورق ۴ ب

[3] " " " ۶ ب

درمیان اور بالخصوص دوسرے عشرے میں لکھے گئے ہیں۔ عمومی انداز تعارف کے لحاظ سے اس تذکرے کا فنی معیار اوسط درجے کے عام تذکروں سے زیادہ مختلف نہیں۔ لیکن خاص خاص شاعروں کے ذکر میں عشقی نے اجمال و اختصار کی عام روش ترک کر کے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہیں نہ کہیں سنینِ وفات کے حوالے بھی دئے ہیں اور منظوم تاریخیں بھی نقل کی ہیں۔ شعرا کی مجموعی تعداد کو دیکھتے ہوئے اس قسم کے مستثنیات کا تناسب اگرچہ بہت کم ہے لیکن ان کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے تذکرے کا وقار کافی بلند ہو گیا ہے۔

دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور پٹنہ کے پہلو بہ پہلو تذکرہ نگاری کے اس دور کی تاریخ میں سرزمین بنگال بھی ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں جو تذکرے لکھے گئے ان میں حیدر بخش حیدری کا "گلشنِ ہند" سرِ فہرست ہے خود حیدری کے بیان کے مطابق انھیں اس کام کی ترغیب رجب ۱۲۱۴ھ، دسمبر ۱۷۹۹ء میں بنارس سے مرشد آباد کے سفر کے دوران اپنے ایک رفیقِ سفر مرزا محمد علی دہلوی سے ملی تھی۔ شرائے اردو کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو اردو زبان میں مرتب ہوا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت مسلم ہے لیکن چونکہ صعوبات سفر اور تکالیف زمانہ سے پریشان علی[1] کے عالم میں اور نہایت عجلت کے ساتھ لکھا گیا ہے نیز مولوی غلام حسین شہید غازی پوری اور مظہر علی خاں ولا کے علاوہ کسی شاعر کے حالات بھی ایک دو جملوں سے متجاوز نہیں ہیں اس لئے اسے اس دور کے تذکروں میں کوئی خاص

[1] حیدری بقول خود علی ابراہیم خاں خلیل کی مجلس کے تعلیم یافتہ تھے۔

مقام نہیں دیا جا سکتا۔

بنگال میں مرتب ہونے والے شعرائے اردو کا دوسرا تذکرہ مرزا علی لطف کا "گلشن ہند" ہے جو تذکرہ فورٹ ولیم کالج کے ترجمہ و تالیف کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور حیدری کے "گلشن ہند" کی طرح اردو ہی میں لکھا گیا ہے۔ جنگ بکسر (۱۷۶۶ء مطابق ۱۱۷۸ھ) میں فتحیابی کے بعد انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سیاسی بالادستی کے استحکام اور نظم نسق کی پائیداری کے لئے جن مختلف منصوبوں پر عمل کیا ان میں مقامی زبانوں اور بالخصوص اردو کی تحصیل بھی شامل تھی۔ ۱۸۰۰ء (۱۲۱۵ھ) کلکتہ میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مستقر تھا، فورٹ ولیم کالج کا قیام اسی مقصد کے تحت عمل میں آیا۔ اس ادارے کے زیر انتظام آسان زبان میں درسی کتابوں کی ترتیب و تالیف کے فرائض کی انجام دہی کے لئے فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے واقفیت رکھنے والے مستشرقین کی سربراہی میں ملک کے بہترین زبان داں اور اہل قلم ملازم رکھے گئے۔ چونکہ اس زمانے تک اردو میں نثر نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی اور ایسی کتابیں یکسر مفقود تھیں جن کی وساطت سے غیر ملکی طالب علم روزمرہ زبان سے صحیح طور پر واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس لئے عربی، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مستند شاعروں کے کلام کے مجموعے بھی خاص اہتمام کے ساتھ مرتب کئے گئے۔ اس کام میں بعض ایسے ارباب قلم نے بھی ہاتھ بٹایا جن کا کالج سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ مرزا علی لطف نیم متعلق مصنفین کے اسی زمرے میں آ جاتے ہیں۔ "گلشن ہند"

انھوں نے کالج کے شعبہ ہندوستانی کے سربراہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر علی ابراہیم خلیل کے تذکرے "گلزارِ ابراہیم" سے ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۵ھ میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اس ترجمے کو صرف ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ مترجم نے خلیل کے بیانات پر اپنی طرف سے جو اضافے کئے ہیں، وہ کیفیت اور کمیت دونوں ہی کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور ان کے واسطے سے بہت سی نئی باتیں ہمارے علم میں آتی ہیں۔ اس لئے جہاں یہ تذکرہ اپنے ذریعۂ اظہار کی وجہ سے اردو کے لسانی ارتقا اور اسلوب نثر کی تاریخ سازی میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، وہیں مواد کی گراں مایگی کے اعتبار سے بھی اس کی حیثیت درجۂ اوّل کے دوسرے تذکروں سے کسی طرح کم نہیں۔

فروری ۱۸۰۴ء (ذی قعدہ ۱۲۱۸ھ) میں گلکرسٹ کے مستعفی ہو جانے کے باعث فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں تقریباً ختم ہو گئیں لیکن اس ادارے کے زیر اثر سادہ و سلیس زبان میں نثر نویسی کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ ملک کے گوشے گوشے میں عام ہو گئی۔ خود کلکتے میں بعد کے زمانے میں جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں لالہ بینی نراین دہلوی اور ان کے بڑے بھائی لالہ کھیم نراین رند کی کئی داستانیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ بینی نراین کی تصانیف میں شعرائے اردو کا ایک تذکرہ "دیوانِ جہاں" بھی شامل ہے۔ یہ تذکرہ ۲۰/ستمبر ۱۸۱۲ء (۱۲/رمضان ۱۲۲۷ھ) کو مکمل ہوا ہے[1]۔ حیدری کے "گلشنِ ہند" کی طرح اس

---

[1] دیوانِ جہاں، مرتبہ کلیم الدین احمد ص ۲۵۰

تذکرے میں بھی شعرا کے حالات حد درجہ اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن کلام کے انتخاب میں خاصی وسعت اور باقاعدگی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں مولف نے ذاتی پسند اور انتخاب کے اصول کو نظر انداز کر کے بالالتزام ہر شاعر کے ذکر میں اس کی چند مکمل غزلیں نقل کر دی ہیں تاکہ کلام کے حسن و قبح اور پست و بلند کا کوئی پہلو قارئین سے مخفی نہ رہے۔ بعض جگہ غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی شامل انتخاب ہیں آخر میں بینی نرائن نے کلکتے کے ایک مشاعرے کی چند طرحی غزلیں نقل کر دی ہیں۔ یہ مشاعرہ ۲۵ر جولائی ۱۸۱۲ء کو منعقد ہوا تھا۔ "دیوان جہاں" کے بعد ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء تک بنگال میں شعرائے اردو کا کوئی اور تذکرہ نہیں لکھا گیا۔

ان تذکروں کے ذکر کے ساتھ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) کے درمیان ہندوستان کے مختلف ادبی مراکز میں اردو تذکرہ نویسی کے فن کا یہ اجمالی جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ آیندہ اوراق اسی درمیانی مدت کے اندر مرتب ہونے والے تمام اہم اور دستیاب تذکروں کے تفصیلی مطالعے پر مشتمل ہیں۔

نکات الشعراء اور دوسرے ابتدائی تذکرے

زیر نظر باب کے تحت ہم تذکرہ نگاری کے میدان میں اُردو کے ادیبوں کی ان ابتدائی کوششوں کا جائزہ لیں گے جو ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور اسکے بعد کے چند برسوں کی مختصر سی مدت میں وجود عمل آئی ہیں۔ اس مقصد کے لئے میر کے "نکات الشعرا" حمید اورنگ آبادی کے "گلشن گفتار" سید فتح علی گردیزی کے "گلشن راز" یا تذکرہ ریختہ گویان" قوت کے "ریاض حسنی" اور قائم کے "مخزنِ نکات" کا انتخاب کیا گیا ہے "نکات الشعرا" اور "گلشن گفتار" دونوں ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء کی تالیف ہیں اور ان کے درمیان تقدیم و تاخیر کے تعین کو کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں لیکن قطع نظر اس سے کہ میر صاحب اردو ادب کی تاریخ میں ہر طرح حمید اورنگ آبادی پر فوقیت رکھتے ہیں، چونکہ ہمارے یہاں تذکرہ نگاری کے موضوع پر بیشتر کام شمالی ہند میں ہوا ہے اور میر صاحب نے اپنے بعد آنے والے تذکرہ نگاروں کی زیادہ قرینے اور سلیقے کے ساتھ رہنمائی کی ہے اس لئے بہ لحاظ ترتیب ان کے تذکرے کو "گلشن گفتار" پر ترجیح دی گئی ہے۔ باقی تذکروں کے معاملے میں اس قسم کے کسی غلط مبحث کا امکان نہیں۔ اس لئے انکے درمیان

ترتیب کے سلسلے میں تحقیقی طور پر متعین کیے ہوئے سنین تکمیل کو معیار بنایا گیا ہے

نکات الشعرا

میر تقی میر (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نے فارسی نثر میں تین کتابیں "نکات الشعراء" "ذکر میر" اور "فیض میر" اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے جو شہرت و مقبولیت "نکات الشعرا" کے حصے میں آئی ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔ شعرائے اردو کا یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد دکن کی جانب سے دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے پہلا اڈیشن ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۳۵ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ترتیب دیا جس کی طباعت غالباً انجمن کے ذاتی پریس ہی میں عمل میں آئی۔ یہ اڈیشن جس قلمی نسخے کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے ترقیمہ کے بموجب اس کی کتابت سید عبدالولی عزلت سورتی کی فرمائش پر سید عبدالغنی ابن سید محمود نے ۷ رمضان المبارک ۱۱۷۲ھ (۴ مئی ۱۷۵۹ء) کو اورنگ آباد میں مکمل کی تھی۔[1] یہ ترقیمہ اشاعت اول میں شامل نہیں اس لیے بظاہر یہ دونوں اشاعتیں دو مختلف نسخوں پر مبنی معلوم ہوتی ہیں لیکن باہمی مقابلے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نواب صدر یار جنگ کے سامنے کوئی دوسرا نسخہ موجود نہ تھا۔ تذکرے کا تیسرا اڈیشن جنوری ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر محمود الہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور

۱؎ یہ نسخہ عام اطلاع کے برخلاف انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے

یونیورسٹی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ ایڈیشن پیرس کے قومی کتب خانے کے خطی نسخے پر مبنی ہے جو "بندر سورت میں نقل کیا گیا ہے اور چہار شنبہ ۱۷ ماہ شوال ۱۱۸۰ھ (۱۰ اپریل ۱۷۶۵ء) کو مکمل ہوا ہے اس نسخہ کے کاتب نے چوبیس شعرا کے تراجم اپنے نزدیک ان کے اشعار کو "بیہودہ و لایعنی" تصور کرتے ہوئے قلم انداز کر دیئے ہیں اسکے علاوہ ورق نمبر ۲ بھی غائب ہے۔ ایسا ہی ایک ناقص قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی موجود ہے۔ ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کے علاوہ بعض حضرات نے سر سلیمان کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں محفوظ ایک بیاض کے چند منتشر اوراق کو اس تذکرے کے اجزائے پریشان قرار دے کر کچھ نتائج اخذ کئے ہیں لیکن یہ محض قیاسات ہیں اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اوراق "نکات الشعرا" کے بجائے کسی اور ہی تذکرے کے اجزا معلوم ہوتے ہیں[1]۔

میر صاحب نے یہ تذکرہ کس سنہ میں مرتب کیا، اس سلسلے میں انکا کوئی واضح اور صریح بیان موجود نہیں لیکن بعض بیانات کی روشنی میں اس تحقیق طلب مسئلے کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تذکرے کے بالکل ابتدائی صفحات میں رائے انندرام مخلص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

---

[1] یہ چونکہ ہماری نظر میں ان اوراق کا "نکات الشعراء" سے کوئی تعلق نہیں اس لئے یہاں اس بحث کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ان کے متعلق ایک تفصیلی نوٹ اس جائزے کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

"از مدتے آزار نفث الدم داشت۔ قریب یکسال است کہ درگذشت[1]"
رائے لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے مطابق مخلص کا انتقال
۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں ہوا ہے[2]۔ لالہ بھگوان داس ہندی بھی اس حادثے
کو احمد شاہ کے چوتھے سال جلوس یعنی ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۴ھ/۱۴ مارچ
۱۷۵۱ء اور ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۵ھ/۲ مارچ ۱۷۵۲ء کے درمیانی عرصے
کا واقعہ قرار دیتے ہیں[3]۔ اس طرح یہ حقیقت پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ
میر صاحب نے ان کا حال ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں سپرد قلم کیا ہے اور یہی
تذکرے کا سال ترتیب ہے۔ دوسرے کلیدی اشارات جن سے زمانے
کے اس تعین کی تائید ہوتی ہے، سید عبد الولی عزلت کے دہلی میں ورود
و قیام سے متعلق صراحت اور جابجا ان کے ذکر کی صورت میں ملتے ہیں
میر صاحب نے انھیں تازہ وارد ہندوستان" کہ عبارت از شاہجہاں
آباد است) قرار دیا ہے[4]، اور متعدد شاعروں کے تعارف میں انکی بیاض
اور زبانی گفتگو سے استفادے کے حوالے دئے ہیں۔ علامہ غلام علی
آزاد بلگرامی کی تحریر کے مطابق عزلت ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ (۱۵ اپریل
۱۷۵۱ء) کو دہلی میں وارد ہوئے تھے[5]۔ اس لحاظ سے ان تمام شعرا کے
حالات یقینی طور پر اس تاریخ کے بعد لکھے گئے ہوں گے اور یہ زمانہ
۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء کے اواخر سے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے اوائل تک منتہی ہو سکتا
ہے۔ میر صاحب نے بیدل، گرامی اور مخلص کے حالات میں خان آرزو

---

[1] نکات الشعرا" طبع ثانی ص ۹
[2] "تذکرہ گل رعنا" ص ۱۲۷
[3] سفینۂ ہندی ص ۱۹۶
[4] نکات الشعرا طبع ثانی ۔ ۹۲
[5] سرو آزاد" ص ۲۳۶

کے تذکرے (مجمع النفائس) کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تذکرے کا سال تکمیل ۱۱۶۴ھ ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ "نکات الشعراء" کے اوراق پر اس کے حوالے اس سنہ کے بعد ہی دئیے گئے ہیں۔ ان حقائق و واقعات کی روشنی میں یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء میں مکمل ہوا۔ اس سنہ کے بعد جو ترمیمیں یا اضافے کئے گئے ان میں سے محمد یار خاکسار کے متعلق ان جملوں کے علاوہ کہ "علی الرغم ایں تذکرہ نوشتہ است، بنام معشوق چہل سالہ خود، احوال خود اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعراء پیش خود قرار داد" کسی تحریر کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔

جناب عرشی رام پوری کا خیال ہے کہ "نکات الشعراء" کا اختتام ۱۱۶۵ھ ہی میں ہوا ہے لیکن ترتیب کا کام اس سے کئی سال قبل ۱۱۶۱ کے قریب شروع ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں موصوف کی اہم ترین دلیل جعفر علی خاں زکی سے متعلق میر کے اس بیان پر مبنی ہے کہ

"بادشاہ محمد شاہ برائے فرمایش مثنوی حقہ کردہ بود و دو سہ شعر موزوں کرد۔ دیگر سرانجام از دنیا نست۔ اکنون شیخ محمد حاتم ...... با تمام رسانیدہ آں مثنوی خالی از رنگینی نیست"[1]

عرشی صاحب یہ اقتباس نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"حاتم نے "دیوان زادہ" میں اس مثنوی کے عنوان پر لکھا ہے کہ "حسب الحکم محمد شاہ بادشاہ معرفت جعفر علیخاں

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۱۴ [2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۳۶

صادق "یہ مثنوی نظم کی گئی ہے (ورق ۱۸۹ الف) اگر لفظ "اکنون" خود میر صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے اور کاتبوں نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ یا کسی دوسرے لفظ کی جگہ اسکی لشبیت کا ارتکاب نہیں کیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ "نکات الشعرا" کی یہ عبارت محمد شاہ متوفی ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کی زندگی میں یا اس کے انتقال سے کچھ بعد لکھی گئی تھی چونکہ حاتم کے منتخب کلام میں میر صاحب نے صرف ایک ہی شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۱۶۱ھ کے کسی مشاعرے کی طرح میں لکھی گئی تھی۔ اس بنا پر قرین قیاس یہ ہے کہ زکی اور حاتم کا حال اسی سنہ میں تحریر کیا ہے۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی کہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنے ہوتے جو دلی کے مشاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں[1]"

ہمارے خیال میں یہ قیاس زیادہ صحیح نہیں کیونکہ "اکنون" اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ کبھی عدم احتیاط کی بنا پر ایسے واقعات کے لئے بھی استعمال کر لئے گئے ہیں جو زمانۂ تحریر کے اعتبار سے ماضی بعید سے تعلق رکھتے ہیں۔ کاتب کی طرف سے اضافے کا احتمال اس پر مستزاد ہے۔ رہا حاتم کی ۱۱۶۱ھ کے بعد والی غزلیات انتخاب اشعار کا سوال تو ہمیں اس سلسلے میں مولف کی اس صراحت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ترتیب تذکرہ کے وقت ان کے پیش نظر ان کا ایک غیر مکمل

---

[1] دیباچہ دستور الفصاحت صفحہ ۳۴ و ۳۵

مجموعۂ کلام تھا جس میں ردیف میم تک کی غزلیں شامل تھیں[1]۔ اس کے علاوہ ظاہری انداز ہے کہ مطابق جتر لے شاعروں کے حالات ابتدا ہی سے موجودہ ترتیب کے بموجب لکھنا شروع کئے تھے۔ ایسی صورت میں محتشم علی خاں حشمت متوفی ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۰ء کا ذکر صیغہ مرحومین کے تحت کرنے کے بعد آیندہ ورق پر حاتم کا تذکرہ ہمارے شبہات کو تقویت بخشتا ہے اس کے باوجود بفرض محال اگر عرشی صاحب کے استدلال کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو نکات الشعراء کا زمانۂ ترتیب ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء اور ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے درمیان قرار پاتا ہے اور چونکہ اس وقت تک شمالی ہند میں شعرائے اُردو کا کوئی تذکرہ تکمیل کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر نہیں آیا تھا، اس لئے میر اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ۔

"در فنِ ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلائے شاہ جہاں آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف نشدہ، کہ احوالِ شاعرانِ این فن بصفحۂ روزگار بگاند، بناءً علیہ تذکرہ کہ مسمٰی بہ نکات الشعرا است، نگاشتہ می شود[2]"

طبع ثالث (مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی) کے مطابق نکات الشعراء بشمول مولف ایک سو چار شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے[3]۔ اسکے

---

[1] دیوانش تا ردیف میم بدست آمدہ بود بارہ اشعار آن نگاشتہ می شود۔ نکات الشعرا طبع ثانی۔ ص ۵۷

[2] نکات الشعرا: طبع ثانی۔ ص ۱

[3] ڈاکٹر محمود الٰہی کے مرتبہ نسخے میں ایک شاعر عطا بیگ ضیا کا اضافہ ہے جس کا ترجمہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے خطی نسخے میں موجود نہیں۔

برخلاف مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں میر سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ "میں اس کتاب میں ایک ہزار شعرا کا حال لکھوں گا"[1] لیکن اس انتساب کی صداقت پر یقین نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ۱۱۶۵ھ / ۵۲-۱۷۵۱ء تک شعرائے اردو کی تعداد کا ایک ہزار تک پہنچ جانا بعید از قیاس ہے۔ تاہم ایسے قرائن و شواہد آج بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس تذکرے کا ایسا کوئی نسخہ ضرور تھا جس میں شاعروں کی تعداد متداول نسخے کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر بھیمی نراین شفیق اورنگ آبادی نے خواجہ احسن اللہ بیان کے حال میں[2] اور مرزا کاظم مبتلا لکھنوی نے جون دہلوی کے ذکر میں[3] اس تذکرے سے استفادے کا اعتراف کیا ہے لیکن موجودہ نسخہ ان دونوں شاعروں کے ذکر سے خالی ہے۔ ولی کے متعلق میر سے منسوب مشہور قول "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" بھی متداول نسخوں میں شامل نہیں حالانکہ میر سے اس کے انتساب پر شبہہ کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، کیونکہ قدرت اللہ قاسم کی معاصرانہ شہادت[4] کے علاوہ میر خال کمترین کی ہجو کا یہ مصرع بھی کہ "ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں"[5] واقعے کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔[6]

۱؎ آب حیات، ص ۲۲۷ ۲؎ چمنستان شعرا۔ ص ۵۳۔

۳؎ گلشن سخن قلمی مملوکہ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ ورق ۴۲ الف

۴؎ مجموعہ نغز جلد دوم ص ۲۲۳ و ۲۳۰ ۵؎ مجموعہ نغز جلد دوم۔ ص ۲۹۷

۶؎ اس سلسلے میں مصحفی کا یہ شعر بھی غور طلب ہے:

ہونا بہت آسان ہے شیطان سے مشہور پر ہو تو لے اول کوئی دنیا میں ولی سا

تذکرے کا آغاز شمالی ہند کے شاعروں کے ذکر سے ہوتا ہے۔ میر صاحب نے دیباچے میں اس التزام کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اگرچہ ریختہ در (از) دکن است چوں از انجا یک شاعر مربوط برنخواستہ لہذا شروع بنام انہا کردہ و طبع ناقص بصرف ایں ہم نیست کہ (از) احوال اکثر آنہا ملال اندوز گردد، مگر بعضے از انہا نوشتہ خواہد شد" (ص ا طبع ثانی)

اس تصریح کے فوراً بعد ہی ان الفاظ میں حضرت امیر خسرو کا حال لکھتے ہیں۔

"مجمع کمالات و صاحب حالات، فضائل او اظہر من الشمس است۔ احوال امیر مذکور در تذکرہ ہا مسطور۔ نوشتن ایں احقر العباد فضولی است۔ اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار وارد۔ دریں خو ترددے غیرت از آن جملہ یک قطعہ تیمناً نوشتہ آید" (ص ۲ طبع ثانی)

اس اقتباس کی روشنی میں تذکرہ نگاری کے متعلق میر صاحب کے مخصوص تصور اور شعرا کے تعارف کی عمومی روش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نکات الشعراء سے قبل شعرائے فارسی کے جتنے اہم تذکرے منظر عام پر آچکے تھے اور جن سے قریبی واقفیت کی جانب منقولہ بالا سطور میں ایک مبہم سا اشارہ بھی کیا گیا ہے اگر ان سب کو نظر انداز کر کے صرف مجمع النفائس کو جس سے استفادے کا میر صاحب نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے، مقابل کی غرض سے پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نکات الشعراء میں اس صنف کی قدیم روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ کسی شخص کے حالات اور تفصیل سے محروم ان

بنا پر احتراز کرنا کہ دوسرے تذکرہ نگار اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اصولی طور پر مناسب نہیں اور میر صاحب نے جا بجا یہی نامناسب راہ اختیار کی ہے۔ وہ عملاً اس چیز کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے کہ تعارف کے ذیل میں کسی استثنا کے بغیر حتی الامکان تمام شاعروں کے خاص خاص سوانح حیات بھی ضبطِ تحریر میں لائے جائیں تاکہ قارئین انکی زندگی کے نشیب و فراز اور ان مخصوص کوائف اور حالات سے بے خبر نہ رہیں جن میں ان کی شخصیت اور شاعری نے نشو و نما پائی ہے۔ معدودے چند مستثنیات سے قطع نظر اگر کہیں ایسے کچھ جملے انکے قلم سے نکل بھی گئے ہیں جن سے کسی حد تک حالات و واقعات کا علم ہوتا ہے تو ان کی نوعیت بھی تسلی بخش نہیں۔ یہاں اس قسم کے چند اقتباسات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) مرزا عبدالقادر بیدل۔ "اوائل جوانی نوکر شاہزادہ محمد اعظم شاہ بود۔ از چندے ترکِ روزگار گرفتہ فردکش ترکِ روزگار گرفتہ فردکش گردید" (ص ۲)

(۲) ولی اللہ اشتیاق: "مولد او سرہند است۔ در کوٹلہ فیروز شاہ سکونت داشت" (ص ۶)

(۳) محمد شاکر ناجی: "معاصر میاں آبرو۔۔۔ در طلبش شاہجہان آباد جوان از جہان رفت" (ص ۲۲)

(۴) محتشم علی خاں حشمت "سپاہی عمدہ روزگار۔۔۔ از خاک پاکِ دہلی بود در مغل پورہ سکونت داشت" (ص ۲۳)

(۵) درکی دکنی۔ "از خاکِ اورنگ آباد است می گویند که در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود۔" (ص ۹۰)

(۶) عارف علی خاں عاجز "دہ دوازدہ سال شدہ باشد که در شاہجہاں آباد سکونت داشت اکنون۔ در بریلی نور است" (ص ۹۴)

(۷) محمد علی حشمت: "از شاگردانِ غنی بیگ قبول است — ہمراہ قطب الدین خاں در جنگ روہیلہ کشتہ شد استاد عبد الحئی تاباں بود۔" (ص ۱۰۷)

(۸) محمد امان اللہ غریب۔ "قریب دو سال است که به سمت بنگالہ رفت۔" (ص ۱۳۸)

(۹) محمد محسن، محسن۔ "برادر زادہ فقیر مولف است بس نام خدا تا بہ بیست سالگی رسیدہ باشد (۱۳۹)

اس میں شک نہیں کہ یہ بیانات بجائے خود اہم ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ دوسرے ذرائع سے مزید تلاش و تحقیق کے بغیر ان کی روشنی میں کسی فیصلہ کن مرحلے تک پہنچنا دشوار نظر آتا ہے۔ مثلاً تذکرے کی ترتیب کا صحیح زمانہ متعین کرنے سے قبل عاجز اور غریب کی دہلی سے ہجرت کے سنین اور محسن کے ولادت کی دریافت قطعاً ناممکن ہے۔ اس طرح محمد علی حشمت کے سال وفات سے واقفیت کے لئے تاریخ کے واسطے قطب الدین خاں اور روہیلوں کی معرکہ آرائی کے بارے میں ضروری تفصیلات کا مطالعہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے

لیکن ہمیں میر صاحب سے صرف شکوہ نہیں کہ انھوں نے حالاتِ زندگی کے انضباط پر بقدرِ ضرورت توجہ صرف نہیں کی بلکہ یہ شکایت بھی ہے کہ وہ تقریباً تیس شاعروں کے معاملے میں صرف ان کے نام یا تخلص کے ساتھ اشعار کی نقل پر اکتفا کر گئے ہیں، وجہ بے توجہی اور سہل پسندی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

میر صاحب کے کمال اور نکات الشعرا کی مقبولیت کا راز در اصل سیرت و شخصیت کے ان مرقعوں کی دلکشی اور جامعیت میں پنہاں ہے، جو ایک خاص تعداد میں جا بجا تذکرے کے اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں۔ الفاظ کے تار و پود سے بنائی ہوئی یہ تصویریں جاذبِ نظر بھی ہیں اور زندگی سے بھرپور بھی۔ حتیٰ کہ بعض جگہ ایجاز و اختصار کے باوجود ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول ہم ان نقوش میں وہ معنویت اور مصورانہ دقتِ نظر پاتے ہیں جو تفصیل میں نہیں مل سکتی[1]۔ اپنے استاد اور پیر و مرشد خان آرزو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آب و رنگِ باغ نکتہ دانی چمن آرائے گلزار معانی متصرف ملکِ زور طلب بلاغت، پہلوان شاعر عرصۂ فصاحت چراغ دودمانِ صفائے گفتگو کہ چراغ روشن بالا سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً شاعر زبردست، نقادِ سخن عالم فاضل تا حال ہیچ الشان بہ ہندوستان جنت نشاں ہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود۔ شہرہ آفاق، در سخن نہمی طاق۔ صاحبِ تصنیفات دہ پانزدہ کتب و رسالہ

[1] شعرائے اردو کے تذکرے" ص ۳۰

و دیوان و مثنویات و حاصل کمالات او شان از حیزۂ بیان بیرون است
ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگرد آن بزرگوار اند۔ گاہے
برائے تفنن صبح دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما
اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند" (۳۱)

شاعرانہ حیثیت سے میر صاحب اپنی روزمرہ زندگی میں بڑے استاد
کو خاطر میں لانے والے نہ تھے۔ کسی کو اپنا مد مقابل اور مخاطب صحیح
سمجھنا ان کے لئے تقریباً نا ممکن تھا۔ انانیت اور خود پرستی کی یہ حد
سے بڑھی ہوئی لے ایک غزل کے مقطع میں اس دعوے پر ختم ہوتی ہو کہ

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

سودا جیسے باکمال اور قادر الکلام شاعر کی ذات پر جہالت کا یہ
اطلاق اگر ایک طرف میر کی سیرت کا ایک خاص پہلو کا آئینہ دار ہے
تو دوسری طرف نکات الشعراء کا درج ذیل اقتباس تذکرہ نگار کی
حیثیت سے ان کے کردار کی وضاحت کرتا ہے۔

"جوانیست خوش خلق، خوش خوے، گرم جوش، یار باش شگفتہ
روئے۔ ... غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی
ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی او ست ... ...
چنانچہ ملک الشعرائے ریختہ او را شاید" (ص ۳۲)

خواجہ میر درد میر کے عہد کی ان گنی چنی محترم ہستیوں میں سے ایک ہیں
جن کی عظمت و فضیلت کے اعتراف میں کوئی اختلاف رائے نہ تھا
یہ ہمہ گیر مقبولیت انھیں ان کے حسن اخلاق وسعت مشرب اور بزرگی و

بزرگ زادگی کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی۔ میر بھی ان اوصاف کی قدر کرتے ہیں

"در کمالِ علائقگی وارستہ۔ خلیق۔ متواضع۔ آشنائے دوست
گرمی بانیاز و وسعت مشرب اوست۔ غرض از آشنائی مطلب
اوست ـ ..... بزرگ و بزرگ زادہ۔ جوان صالح۔ از
درویش، بہرۂ وافی دارد۔ فقیر را بخدمت او بندگی خاص
است اگرچہ حسنِ سلوک او عام، سر حسن سلوک بجائے خود
گرفتہ اعزاز را از گوشہ دل نہادہ" (ص ۵۰)

تاباں کی زندگی کے آخری ایام میں میر صاحب ان سے کسی بات پر بددل ہو گئے تھے اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف ان کے محاسن ذات و صفات کی تعریف و توصیف میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے بلکہ نہایت خوش دلی اور خلوص کے ساتھ اپنی غلطی اور کوتاہی کا اقرار بھی کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کے بیانات سے جہاں تاباں کی شخصیت اپنی پوری دلکشی اور آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ وہیں میر صاحب کی بلندی کردار بھی ظاہر ہوتی ہے اور ثانوی طور پر ان کے مزاج کی رنگینی اور جمال پرستی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"نوجوانِ بامزہ بود ... .. بسیار خوش فکر و خوبصورت
خوش خلق۔ پاکیزہ سیرت، معشوق عاشق مزاج تاحال در
فرقہ شعرا ہمچو او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطونِ عدم بوصفہ
ظہور جلوہ گر نہ شدہ بود ... از دیدن رنگ و آبش
بے اختیار از دہن من گل کمالش سر می زد[1] ...... با فقیر

[1] مطبوعہ نسخوں میں (علی گڑھ اور پیرس کے خطی نسخوں کے عین مطابق اس جملے میں "رنگ و آبش" بجائے "رنگ آتش" مرقوم ہے۔ یہاں عبارت کو بامعنی بنانے کی غرض سے اکی قیاسی تصحیح کر دی گئی ہے۔

یک صفائی داشت از چندے بسبب کم اختلاطی این بیچداں
کہ درتے بیمان آسودہ بود - اجلش مہلت ندار کہ تلافیش
کردہ آید۔ ..... آفتاب تابانِ عمر او زود بہ لب بام رسید
معشوقِ عجیبے از دستِ روزگار رفت افسوس - افسوس.
افسوس"۔ صفحات ۱۰۸ تا ۱۰۹)

اب تفصیل سے اجمال کی طرف آئیے اور مختصر الفاظ میں اظہار
خیال کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔

(۱) قزلباش خاں امید: "عزیز زلہا، یارباش، خوش
اختلاط ہمیشہ خنداں و شگفتہ رد
بسر بود" (ص ۷)

(۲) شرف الدین مضمون: "حریف ظریف بشاش بشاش
ہنگامہ گرم کن مجلسہا - - - -
بسیار گرم اختلاط" (ص ۱۴)

(۳) میاں صلاح الدین پاکباز - شخصے است گوشہ نشین
بسیار کم اختلاط گویا آشنا شدن
رانمی داند — مزاجش
خالی از وحشت نیست" (ص ۹۰)

(۴) قائم چاندپوری: "جوانیست خیرہ و طیرہ حسن پرست نوکر پیشہ
(ص ۱۲۲)

(۵) میر عبدالرسول نثار "جوانِ سعادت مند — بسیار آراستہ
و پیراستہ سنجیدہ و فہمیدہ" (ص ۱۳۵)

(۶) میاں ضیاء الدین ضیا: "جوانیست، مودب، مہذب، متصوف" (ص ۱۴۲)

(۷) نصر: "شخصے است دلدستہ، از قید مذہب و ملت برجستہ اوباش وضع" (ص ۱۴۷)

(۸) حافظ حکیم: "مرد لیست بسیار گرم جوش و چیاں اختلاط" (ص ۱۴۹)

ان بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر صاحب خوش خلقی و خوش مزاجی و زندہ دلی و یار باشی اور شرافت و سادگی کو انسانیت کا جوہر اور کمالِ ظاہری کا معیار سمجھتے تھے اور جس شخص کی ذات میں انھیں یہ خوبیاں نظر آتی تھیں، اس کی تعریف و توصیف میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض جگہ انھوں نے شاعرانہ مرتبے کی پستی اور ذاتی ناپسندیدگی کو بھی اس راہ میں حائل نہیں ہونے دیا ہے لیکن جو لوگ ان اوصاف سے عاری و محروم تھے ان کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے بقول میر نے یہ طرزِ عمل اسٹیونسن اور عظیم بیگ چغتائی کی طرح اپنی کسی کمزوری یا محرومی کو چھپانے کی غرض سے اختیار نہیں کیا ہے[1] بلکہ وہ خود بھی ایک زندہ دل اور یار باش انسان تھے اور وہ تمام خوبیاں جنھیں وہ معیارِ انسانیت خیال کرتے ہیں ان کی شخصیت میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ زوالِ سن و سال اور حالات کی تبدیلیوں کے

[1] میر تقی میر ـ حیات اور شاعری ص ۵۲۷

ساتھ یہ خوبیاں بھی رفتہ رفتہ زائل ہو گئی ہوں لیکن تقریباً تیس برس کی عمر یعنی تذکرے کے زمانۂ ترتیب تک ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ اس خیال کی تائید کے لئے یہ اقتباسات ملاحظہ طلب ہیں۔

اشرف علی خاں فغاں: "دریں ایام طبع او مائل لطیفہ بسیار است۔ چنانچہ ناگرمل راکہ دیوان ترن در خیل بادشاہی است" گھی کی منڈلسی کا سانڈ" گفتہ۔ ہر کہ دیدہ را در دربار اعلیٰ "گاوِ گجراتی" نام کردہ ہر کہ حکیم صاحب را بہ جنید دانند، بعدہ بخدمت او بسیار مربوطم" (ص ۴۴)

فضل علی دانا: "اتفاقاً در موسم ہولی تاریخ پانزدہم کہ (برائے) مجلس خانہ فقیر مقرر است، واقع شد۔ میاں دانا نیز تشریف داشت لیکن بہ لباس عجبے یک (نیم) تنی سیاہ بر کردہ کہ دامنش بزانو بود۔ چوں رنگ ذات شریف در لیش از حد زیادہ ہر دو سیاہ بودہ، فرزند او فیع بجود شاہدہ کردن او گفت کہ "یار رہ ہولی کا ریچھ آیا" کہ بزبانِ فارسی "خراس ہولی" می توان گفتے۔۔۔ ایں لطیفہ ایں بسیار بموقع افتاد بلکہ صورت گرفت (ص ۱۲۰)

میاں نجم الدین سلام۔ "فقیر را آباد از تہ دل اخلاص است چنانچہ
اکثر اوقات اتفاق باہم فکر شعر کردن و
گپ زدن و مزاح نمودن می افتد۔
جوانے خوبیست۔ جواز مزہ دارد" (ص ۱۳۲)

محمد امان غریب۔ "یادش بخیر یک آشنائے بامزہ داشتم بسیار
خوش ظاہر بود...... چوں اکثر
در باغات مغلپورہ می رفت بندہ او را "رند
باغاتی"[1] می گفتم" (ص ۱۲۸)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے لطائف و ظرائف اور بذلہ سنجیاں ایک خوش مزاج اور ہنگامہ پسند انسان ہی کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کر سکتی ہیں اس لئے محض چند واقعات کی بنیاد پر قیاس کر لینا کہ میر صاحب فطرتاً حد درجہ کم آمیز، مردم بیزار، متکبر اور تنگ مزاج تھے، صریح ناانصافی کے مترادف ہوگا لیکن اسی کے ساتھ ہم نواب عماد یار جنگ کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کر سکتے کہ "تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میر صاحب کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے ان کی خود بینی و خود پسندی یا بد دماغی و تعلی عیاں ہوتی ہو"[2]

---

[1] طبع اول ثانی میں نسخہ انجمن کے مطابق "رند باغاتی" کی جگہ "اوند باغاتی" لکھا ہوا ہے لیکن یہ یقینی طور پر غلط ہے میر صاحب نے یہ ترکیب اپنے اس شعر میں نظم کی ہے ۔

ہے حزیں نالیدن اسکا نغمہ طیور سا
خوشنوا مرغ گلستاں رند باغاتی ہو میاں

کلیات میر ۔ مرتبہ آسی ص ۱۳۹

[2] مقدمہ نکات الشعرا نسخہ آصفیہ ۔ د طبع اول ص ۱

کیونکہ وہ ذاتیات سے بلند ہو کر اظہار خیال کی روش کو ہر جگہ برقرار نہیں رکھ سکے ہیں اور بعض لوگوں کے ساتھ انھوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر کھلی ہوئی زیادتیاں کی ہیں۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی عیب بینی و ہنر پوشی کی ان سرحدوں کو چھو لیا ہے جہاں انصاف اور دیانتداری کی تمام قدریں پامال ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر شاہ حاتم کا ذکر ان کے معاصرین نے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ میر حسن انھیں "شاعر صاحب کمال و پسندیدہ افعال عالی ہمت و بلند فطرت"[1] کہتے ہیں۔ قدرت اللہ شوق نے "مرد فہمیدہ و سنجیدہ"[2] اور مرزا کاظم مبتلا نے "شاعر فصیح بیان و سرآمد ریختہ گویان"[3] قرار دیا ہے۔ مصحفی ان کو "مرد بزرگ و جہاں دیدہ"[4] اور "نغمہ سنجان دھنع و شریف" کو ان کی مسلم الثبوت استادانہ حیثیت کا معترف بتاتے ہیں[5]۔ لیکن میر صاحب نے ان کی شخصیت کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس کا کوئی پہلو معایب سے مبرا یا قابلِ تحسین نہیں۔ فرماتے ہیں کہ :-

"مرد لیست جاہل و متمکن و منقطع و ضع، زیر آشنا غاند اروو دریافتہ نمی شود کہ ایں رگِ کہن بہ سبب شاعری است کہ ہیچ من دیگرے نیست یا وضع او ہمیں است" (ص ۵۰)

لہجے کی یہی تلخی و زہرناکی محمد یار خاکسار کے متعلق اس بیان میں بھی

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع جدید۔ ص ۶
[2] طبقات الشعرا نسخہ آصفیہ۔ ورق ۶۱ الف
[3] گلشنِ سخن نسخہ رامپور ورق ۳۴ ب
[4] عقد ثریا۔ ص ۲۳
[5] تذکرہ ہندی گویان۔ ص ۸۰

موجود ہے کہ :

"خود را دور می کشد و بسیار سفلگی می کند، بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بہ آب رسانیدہ۔ چنانچہ علی الرغم ایں تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است...... و خطاب خورشید الشعرا پیش خود قرار دادہ۔ آتشِ کینہ کہ بے سبب افروختہ است، چوں کجا ہم بول دہد۔ ایں قسم بے سخن رسیدن می ناید کہ گوئی بسر رسن تاب است۔ مجمع معشوق گفتہ..... چوں شنید کہ خاکسار کلو ہم نام دارد، بداہتاً گفتہ ع

کتا ہے در یار کا کلو اس کا نام

چوں کلو اکثر نام سگہا می گذارند، لطف ہم رسانید۔ ہر کہ دم لالہ او دیدہ است می داند۔ فخر او ہمہ ریختہ است۔ طرفہ ایں کہ ان ہم نام بوطہ خود او ہم نادرست" (ص ۱۱۴ - ۱۱۵)

میر حسن اس بیان کے بعض حصوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ :

"آنچہ میر تقی در تذکرہ خود نوشتہ است کہ خود را بسیار دور می کشد۔ غالب کہ ایں حرف راست نباشد..... اگر چنیں می بود[1] خاکسار تخلص نمی نمود گو در مزاج جنانچہ خواہد بود"

اس سلسلے میں جب ہم مصحفی کی اس روایت کو: "میر در عالم شباب منظور نظر او بود"[2] کریم الدین کے اس بیان کے ساتھ کہ: "میر تقی اوائل میں جب شعر کہتا تھا، خاکسار اس کو اصلاح دیا کرتا تھا"[3] ملا کر دیکھتے ہیں تو یہ رائے

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی۔ ص ۶۱ [2] تذکرہ ہندی ص ۸۰

[3] طبقات شعرائے ہند مخطوطہ رضا لائبریری۔ رامپور۔ ص ۵۱

تاہم کہنا پڑتی ہے کہ میر صاحب کی عاید کردہ فرد جرم میں اصلیت بہت کم ہے اور عناد و پرخاش کی یہ داستان محض حقایق پر پردہ ڈالنے کی غرض سے تصنیف کی گئی ہے۔ انعام اللہ خاں یقین کی موزونی طبعی اور سخن فہمی سے انکار اور ان کے سرمایۂ کلام کو میرزا مظہر کے نتائج افکار سے منسوب کرنے کی کوشش بھی بے جا ستم اور حقائق کی شکست و ریخت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر ریختہ می دہد و وارث شعرہائے ریختہ خود گردانیدہ۔ از قبول کردن ایں سخن بندہ را خندہ می آید کہ ہم چیز بوارث می رسد الا شعر مثلاً کسے بر شعر پدر خود یا بر مضمون او متصرف شود، ہمہ کس او را دزد خواہند گفت تا بشعر استاد چہ رسد۔ القصہ (او) پوچ چندے کہ یافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم یافت ایں قدر بر خود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پست دست بر زمیں می گذارد۔ بعد از ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں را مردماں گمان ناموزونیت در حق او داشتہ باشند جمعے بر ایں اتفاق دارند کہ شاعری از یقینی نیست چراکہ شاعر ایں قسم کم فہم نمی باشد[1]" (ص ۸۱-۸۲)

---

[1] مطبوعہ نسخوں میں "شاعری از یقینی نیست" کی جگہ "شاعری او خالی از نقص نیست" لکھا ہوا ہے۔ پہلے دو ایڈیشنوں کی جگہ کتب خانہ آزاد، مخطوطہ علی گڈھ کی عبارت میں مرتبین کا اضافہ ہے اگرچہ اس نسخے میں "یقینی" کی کتابت واضح اور صاف نہیں لیکن تھوڑے سے غور و فکر کے بعد سیاق و سباق کی روشنی میں اس کی صحیح قرأت کی جا سکتی ہے۔

اس عبارت کو غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو صرف ذائقۂ شعر فہمی سے محرومی کے متعلق ایک جملے کی روشنی میں بخوبی اس پس منظر کا تصور کیا جا سکتا ہے جس کے زیر اثر میر صاحب نے یقین کی شخصیت پر یہ وار کئے ہیں۔ مصحفی کے بقول یقین ایک "میرزا مزاج" انسان تھے[1] بعید از امکان نہیں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے قیاس کے مطابق انھوں نے کسی موقع پر خلاف توقع میر صاحب کے کلام کی داد نہ دی ہو اور یہی واقعہ باہمی رنجش و آزردگی کا سبب بن گیا ہو۔[2] بہر صورت اس قسم کی بے رحمی و بیدردی کو کس طرح معقول اور سنجیدہ تنقید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر کی زندگی ہی میں ان کی اس کج ادائی اور نامناسب روش کے خلاف ردعمل کا آغاز ہو گیا تھا۔ گردیزی نے "تذکرۂ ریختہ گویاں" میں شفیق اورنگ آبادی نے "چمنستان شعرا" میں ابو الحسن امر اللہ الہ آبادی نے "مسرت افزا" میں میر غلام حسین شورش عظیم آبادی نے "شورش" معروف بہ "تذکرۂ شورش" میں اور حکیم قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں اس موضوع پر جس انداز خامہ فرسائی کی ہے وہ سب اسی مخالفانہ تحریک کا ایک جز ہے۔

سیرت و شخصیت کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کے ساتھ ہی میر صاحب نے جا بجا کلام کے معائب و محاسن کی طرف اشارے کئے ہیں اس سلسلے میں اگرچہ ہم ڈاکٹر سید عبد اللہ کے اس قول کی تائید نہیں کر سکتے کہ "نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے"[3] کیونکہ تقریباً جو نسٹھ شاعروں کے حالات میں میر صاحب نے انکی شعری

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۲۰۵ [2] مقدمہ دیوان یقین ص ۳۰ [3] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۲۰

تخلیقات کے حسن و قبح سے متعلق کوئی بحث نہیں اُٹھائی ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے اس پہلو کو یکسر نظر انداز نہ کر کے تذکرہ نگاری کے ایک اہم اور بنیادی تقاضے کو حتی الامکان لیاقت اور سلیقہ مندی کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائیں بالعموم نہایت جامع اور متوازن ہیں اور تنقید کے وجدانی و تاثراتی انداز کے باوجود ان کی ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاہی کا پتہ دیتی ہیں۔ ان رایوں کی ایک قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اظہار میں آزادی مطلق سے کام نہ لیتے ہوئے بعض لسانی و فنی تصورات اور بنیادی اصولوں کی پابندی کی گئی ہے۔ تذکرے کے اختتام پر ریختہ کی اقسام اور ان کی تعریف بیان کرتے ہوئے میر صاحب نے لکھا ہے کہ

"ریختہ بر چندیں قسم است۔ ازاں جملہ انچہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید۔ اول آنکہ یک مصرع فارسی (باشد) و یک ہندی...... دوم اینکہ نصف مصرع ہندی (باشد) و نصف فارسی...... سیوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند و ایں قبیح است۔ چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند۔ اکثر ترکیب کہ مناسب زبانِ ریختہ می افتد، جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد، آن معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف (بر) سلیقۂ شاعری است۔ مختار فقیر ہم ہمیں است۔ اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود، مضایقہ ندارد و پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت۔ اکنون طبعہا مصروف

این صنعت کم است مگو بسیار برشتگی بستہ شود ۔۔۔۔۔ ششتم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آن محیط ہمہ صنعت ہاست تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی خیال این ہمہ ہا در ضمن ہمیں است و فقیر ہم از ہمیں دہیرہ محفوظم ہر کہ را دریں فن طرز خاصے است، این معنی را می فہمد۔ با عوام کار ندارم"۔ (ص ۱۷۹۔۱۸۰)

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ میر صاحب فارسی کی مانوس و شگفتہ تراکیب صنعتوں کے بے تکلف استعمال، صفائی بیان، برشتگی، بندش اور فصاحت و بلاغت کے اصول و ضوابط کی پاسداری کو لوازمات شاعری تصور کرتے تھے۔ انھوں نے شاعر کے لئے ذوق سلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک اکتسابی فن نہیں وہبی عطیہ ہے۔ بغیر فطری مناسبت کے کوئی شخص کامیاب شاعر نہیں بن سکتا ہے فارسی تراکیب کے استعمال کے سلسلے میں شاعر و غیر شاعر کی تفریق ان ہی اشارات کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاعری کو محض گل و بلبل کی داستان سرائی تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ اس برگ گل کی طرح پاکیزہ و رنگین دیکھنا چاہتے ہیں۔ عبدالحئی تاباں کے متعلق انھوں نے یہ رائے اسی نقطۂ نظر کے تحت ظاہر کی ہے کہ

"زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل ۔۔۔۔۔ سمند رنگینی نگارش با گلگونِ باد بہار طابق النعل بالنعل است ہر چند عرصہ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است۔ اما بسیار برنگینی می گفت ۔۔۔۔ نسبت او استادانہ او رارتبہ شاعری

ارتبود!" (ص ۱۰۸)

محمد حسین کلیم کی فنکارانہ انفرادیت اور خصوصیات کلام پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"طرزِ سخن بطرزِ کسے مانا نیست۔ اکثر بزبانِ بیدل حرف می زند۔ در فہم شعر تہ دارِ او فکرِ عاجز سخنان نیست دست بر زمین می گزارد۔ طبع روانِ او مانندِ سیل رواں است؛ فکر رسایش آں سوئے آسمان۔ بازوئے فکرش زور بین کش کمانِ معنی را۔ شعر بیجدار تاثیر او تیر کاکل ریا۔ اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است، اما کلیمِ ریختہ پیشِ نقیر ایں است۔" (ص ۴۲)

بلندی فکر اور شعر کی اثر آگینی و تہ داری کے علاوہ (جن کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے) نو بہ نو خیالات تک رسائی اور نت نئے مضامین و معانی کی تلاش بھی میر صاحب کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن الفاظِ تازہ کی تلاش جو شاعری کو محض گورکھ دھندا بنا دے مستحسن نہیں۔ چنانچہ سجاد اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"سخن او بپایۂ استادی رسیدہ چنیں خویش گو نہ معنی یاب اگرچہ در بندِ لفظِ تازہ است لیکن بزبان خامہ او خیل معانی سیاہی می کند۔۔۔۔۔ فکر رنگین او جنِ تلاش را بپایۂ ابرِ بہار ہے ہر مصرع بلندش را طرف لطف یا چنار ہے۔"[1]

---

[1] مطبوعہ نسخوں میں اس جملے میں "بلندش" کی جگہ "بندش" لکھا ہوا ہے۔ یہاں مخطوطہ علی گڑھ کے بموجب اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

ہر بیت بجر خفیفش بر جگر نشتر زن۔ زبانِ لطافت بیانش رگِ رجانِ سخن[1]۔ بے انصافی امر علٰحدہ است دگرنہ تہ داری شعر او نمایان است۔ ہر کہ واقف موشگافی طبع او ست، می داند کہ شعر سوختہ پیچ دارش بوے آتش دیدہ می ماند"

(ص ۶۰۔ ۶۱)

صحتِ الفاظ اور صحتِ محاورات کا خیال رکھنا بھی میر صاحب کے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ سجاد ہی کے ایک شعر میں "کانٹوں میں گھسیٹنا" کی بجائے "کانٹوں میں اینچنا" کے استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ "در خیل تصرف جائز نیست" (ص ۶۹) محمد حسین کلیم کے قصیدہ "روضۃ الشعرا" میں مرزا مظہر کا نام "جانجاں" کی بجائے "جانِ جاناں" موزوں کیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ تصرف بھی نامناسب ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"چوں اکثر عوام نام مرزا از غلطی جانِ جاناں می گویند شاعر مذکور نظر بشہرت ہم چنیں موزوں کردہ اگرچہ کمی بابت گفتگوئے ما با خواص راست" (ص ۸۲)

گویا شاعر کے مخاطب صحیح صرف خواص اور یارانِ نکتہ داں ہوتے ہیں اس لئے حتی الامکان غلط العوام کے استعمال سے احتراز کرنا چاہئیے میر صاحب کے خیال میں توارد ایک ایسی اصطلاح ہے جو شعرا نے

---

[1] طبع اول و ثانی میں اس جملے میں "لطافت" کی جگہ "طاقت" اور "رگِ جانِ سخن" کی بجائے صرف "رگِ سخن" مرقوم ہے۔ یہ غلطیاں مخطوطۂ علی گڑھ میں بھی موجود ہیں۔ اس لیے یہاں مخطوطہ کے مطابق صحت کردی گئی ہے۔

اخفائے حال کے لئے وضع کرلی ہے ورنہ تواردِ اشعار دراصل سرقہ ہی کے ذیل میں آتے ہیں ان کا بیان ہو کہ

"اکثر شاعرانِ ریختہ را متبدل بند یافتہ ام۔ متبدل می گویند و تواردی نامند گویا ایں شعرا و تا درحق اشانیست" ہرچہ گویند بے محل گویند ۔۔ تواردِ غزل غزل گویند (ص ۸۴)

یہی وہ فنی معیار اور تنقیدی اصول ہیں ۔

یہی وہ فنی معیار اور تنقیدی اُصول ہیں جو کلام کے متعلق اظہار خیال کے مواقع پر اکثر و بیشتر میر صاحب کے پیش نظر رہے ہیں۔ اور جن کو ذہن میں رکھے بغیر ان کے مختصر و مجمل جملوں کی وسعت و معنویت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ بعض شاعروں کے کلام کے بارے میں ان کے درج ذیل بیانات کا مطالعہ اگر اسی روشنی میں کیا جائے تو ان میں اجمال کے باوجود زیادہ تشنگی محسوس نہ ہوگی ۔

۱۔ احسن اللہ احسن ۔ "طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود ازیں جہت شعراؤ بے رتبہ ماند" (ص ۲۷)

۲۔ اشرف علی فغاں ۔ "شعر ریختہ را بخوبی می گوید" (ص ۸۴)

۳۔ عبد الولی عزلت ۔ "از اسالیب کلام شان واضح می گردد کہ بہرہ بسیارے از دردمندی دارند" (ص ۹۲)

۴۔ آزاد ۔ "بسیار بصفا حرف می زد" (ص ۹۴)

۵۔ عارف علی عاجز ۔ "زبانش (مانا) بزبان او باشان است" (ص ۵۷)

۶۔ محمد عارف عارف۔ ”ازبسکہ تلاشِ لفظ تازہ می کند از سائلے زما ہے بیتے از و موزوں می شود شعر او خالی از لطف نیست“ (ص ۱۳۰)

۷۔ ہدایت۔ ”ریختہ را بطرز می گوید۔۔۔۔۔۔۔ گیت خامہ او در عرصہ میدانِ سخن بالبتہ راہی رود۔ (ص ۱۳۰۔ ۱۳۱)

۸۔ کمترین۔ ”مزاحیش میلانِ ہزل بسیار دارد۔ موافق استعداد خود می گوید۔ بندہ شعر معقول او نہ شنیدہ ام۔ (ص ۱۴۶)

نکات الشعرا کی یہ تنقیدیں خصوصیات کلام کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے باوجود اپنے اندر ایک وزن اور وقار رکھتی ہیں اور صرف اسی اعتبار سے اہم نہیں کہ ان کے مطالعے سے متعلقہ شاعروں کے کلام کی ادبی حیثیت اور فنی محاسن و معائب کا سراغ ملتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ غور ہیں کہ ان کے ذریعے میر صاحب کے پسند و ناپسند کے معیاروں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ جن کی روشنی میں خود ان کے کلام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

استادی و شاگردی اور اصلاح و استصلاح کی روایت اردو زبان اور اس کی شاعری کے نوک پلک سنوارنے میں جس حد تک ممد و معاون رہی ہو، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ فن کے لوازمات پر عبور اور زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں تک رسائی کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ بساطِ سخن کے تازہ واردین کسی باکمال اور

صاحب نظر استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ میر صاحب بھی اپنی مسلم الثبوت زباں دانی اور استادانہ حیثیت کی بنا پر تہذیب فن کے اس رمز استادی میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں جن کے یمن تربیت اور فیضان اصلاح سے بے شمار طبیعتوں کی جلا ہوئی اور بہت سوں نے سخنوری کو درجۂ کمال حاصل ہوا۔ "نکات الشعرا" اگرچہ ان کے کسی خاص شاگرد یا مختلف شاگردوں کے کلام کا مجموعہ نہیں۔ عام شاعروں کا تذکرہ ہے تاہم ان کی وہ تنقیدی حس جس کا اصل دائرۂ عمل تلامذہ کے اشعار کی اصلاح و تہذیب تھا یہاں بھی بیدار اور فعال نظر آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انھوں نے اصلاح طلب اشعار میں ضروری ترمیم و تغیر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار استادانہ فیصلے کے انداز میں نہیں، ذاتی پسند اور دوستانہ مشورے کے طور پر کیا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں ان بلیغ اور استادانہ اصلاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کو بے جان اور بے روح چیز نہیں سمجھتے تھے بلکہ یقین رکھتے تھے کہ ہر لفظ میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا صحیح اور مناسب استعمال ہی شعر میں آب و رنگ پیدا کر سکتا ہے[1]۔ درج ذیل مثالیں اسی خصوصیت کو واضح کرتی ہیں۔

(الف) شاہ مبارک آبرو کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

نہیں یہ تارے بھرے ہیں شک کے نقط
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

---

[1] میر تقی میر — حیات اور شاعری ص ۵۳۰

میر صاحب کا خیال ہے کہ "اگر بجائے "اس قدر" "کس قدر" "می گفت" این شعر آسمان می رسید" (ص-۱۱)

(ب) مصطفیٰ خاں یکرنگ کا ایک شعر ہے ؎

سچ کہے جو کوئی سو ماہرا جائے　　راستی ہے گی دار کی صورت

میر صاحب فرماتے ہیں کہ "بہ اعتقاد فقیر بجائے "سچ" "حرف حق" اولیٰ است" (ص-۲۰)

(ج) یکرنگ ہی کا ایک اور شعر ہے۔

اس کو مت پوچھو سجن اور دل کی طرح
مصطفیٰ خاں آشنا یک رنگ ہے

لکھتے ہیں کہ "اگر شعر من می بود بیش مصرع این قسم موزوں می دادم
"مت تلوّن اس میں سمجھے آپ سا" (ص-۲۳)

(د) محمد شاکر ناجی کا شعر ہے۔

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
اب عدو کے تئیں ہر چند ہے گو ہر میں آب

میر صاحب کہتے ہیں کہ "بر متامل پوشیدہ نیست کہ بیش مصرع این چنیں بالیست۔

"مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خوردگی" (ص ۲۳-۲۴)

(ہ) سجاد اکبر آبادی کا ایک شعر ہے۔

کس طرح کوہ کن یہ گذاریں گا
ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میر صاحب کی نظر میں اس شعر کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے۔

ہجر بستریں میں کیونکر کاٹے گا
کوہ کن یہ پہاڑ سی راتیں (ص ۶۸)

(د) سجاد ہی کی ایک اور غزل کا مقطع ہے۔

بے تکلف ہو سیکھوں سے وہ ملے ہے سجاد
دختر رز بھی عجب طرح کی مستانی ہے

میر صاحب کا ارشاد ہے کہ "اگر شعر من می بود پیش مصرع ایں قسم می گفتم

"بے تکلف ہو بیٹھ سر پہ چڑھے ہے سجاد" (ص ۷۱)

(ز) لالہ ٹیک چند بہار کا ایک شعر ہے۔

تھی زلیخا مبتلا یوسفؑ کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجب مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

میر صاحب کے نزدیک بجائے اشارت تعبیر و کلمہ استعجاب کہ اول مصرعہ دوم بکار بردہ است، اگر "حسن کیا" می گفت ایں شعر واضح تر می شد"
(ص ۱۳۳، ۱۳۴)

ضروری نہیں کہ ان تمام اصلاحات یا مشوروں کو بغیر کسی چون و چرا اور پس و پیش کے قبول کر لیا جائے لیکن یہ بات بہر حال ماننا پڑتی ہے کہ میر کی نکتہ رس نگاہ شعر کے نازک ترین پہلوؤں تک پہنچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بعض اشعار میں معمولی ترمیم و تغیر کے ذریعہ وہ ظاہری و معنوی لطافت و بلاغت پیدا کر دی ہے جو اس سے قبل مفقود تھی یا پوری طرح ابھر کر سامنے نہ آ سکی تھی۔

"نکات الشعرا" سے ہمیں اس زمانے کی تہذیب و معاشرت، اہلِ علم کے باہمی روابط اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ بعض بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ علوم مجلسی کے ساتھ ساتھ شہسواری شمشیر زنی اور دوسرے فنون سپہ گری کے حصول کو عوام اور خواص دونوں ہی ذریعۂ عزت سمجھتے تھے اور اساتذہ اور بزرگ شعرا کی صحبتوں میں حاضری اور اہل اللہ سے عقیدت و ارادت کو عین سعادت خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میر صاحب ناقل ہیں کہ جب ولی دہلی میں وارد ہوئے تو انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن سے بھی شرفِ نیاز حاصل کیا اور اپنے کچھ اشعار سنائے جن کو سن کر موصوف نے ارشاد فرمایا کہ :۔

"ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" (ص ۹۰)

اس مشورے میں اردو شاعری کو نئے اطراف و جہات سے آشنا کرنے اور اس کے فکری و فنی سرمائے کو وسعت دینے کی جو خواہش پنہاں تھی وہ اس کے روز افزوں اثر و نفوذ کی غماز اور ہمہ گیر تقبولیت کی ترجمان ہے۔

میر صاحب خود بھی شہر کے ممتاز اور قابلِ احترام بزرگوں اور ادیبوں کی مجلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ شرکت خلوص و محبت کے جن رشتوں سے مربوط تھی اس کا اندازہ خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب کے متعلق اس بیان سے کیا جاسکتا ہے۔

"در ایامے کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار اشرف اندوز می شد از زبانِ مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد

الحمد للہ و المنۃ کہ حرف آں سرسلسلۂ خدا پرستان موثر افتاد

(ن) باطن آں خضر قافلہ اہل عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر

تر است زود کار کرد“ (ص۔ ۵۰)

”نکات الشعرا“ کے زمانۂ ترتیب سے قبل خواجہ میر درد کے یہاں ہر مہینے کی پندرہویں تاریخ کو ایک مجلس ”ریختہ گویاں“ منعقد ہوا کرتی تھی بعد میں جب کسی مجبوری کی بنا پر ان کے لئے اس سلسلے کو قائم رکھنا ممکن نہ رہا تو انھیں کی خواہش پر میر صاحب نے اس کی ذمہ داری سنبھال لی۔ تذکرے میں انھوں نے اس واقعہ کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے اس عہد کی اخلاقی روایات اور ارباب فضل و کمال کے لئے جذبۂ احترام کی ایک اور مثال سامنے آتی ہے لکھتے ہیں کہ:

ؒ نواب صدر یار جنگ نے اس عبارت کو خواجہ میر درد سے متعلق قرار دیتے ہوئے میر صاحب کے کمال شاعری کو ان کی دعاؤں کا رہین منت ٹھہرایا ہے (مقدمہ نکات الشعرا طبع اول صفحات ۳۔۴) قاضی عبدالودود صاحب بھی اس معاملہ میں ان کے ہم خیال ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: دلی کالج میگزین کا ”میر نمبر“ ص ۳۵) لیکن حقیقتاً اس عبارت کا تعلق خواجہ ناصر عندلیب سے ہے جن کا ذکر اس سے قبل کے جملوں میں صراحت کے ساتھ آچکا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس موضوع پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے (”آب حیات کا تنقیدی مطالعہ“ طبع ثانی ص ۱۲۰۔۱۲۷) ان کا خیال ہے کہ ”سرسلسلۂ خدا پرستان اور خضر قافلہ اہل عرفاں“ جیسے القاب اس وقت خواجہ ناصر ہی کے لئے استعمال کئے جا سکتے تھے اور خواجہ میر درد اپنے والد کی موجودگی میں اس غیر معمولی اکرام و احترام کے حقدار نہ تھے۔

"مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است' والله بخانۂ ہمیں بزرگ است۔ زیراکہ پیش ازیں ایں مجلس بخانۂ اوشاں مقرر بود، از گردشِ روزگار بے مدار برہم خورد۔ از بس کہ با ایں فقیر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع را اگر شما بخانۂ خود معین بکنید بہتر است نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد" (ص ۵۰-۵۱)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ اس مجلس کے موسس اول خان آرزو تھے[1]۔ ان کے بعد اس کا انتظام خواجہ میر درد نے سنبھالا اور پھر میر نے۔ اس دعوے کی تائید میں انھوں نے "چمنستانِ شعرا" اور "آبِ حیات" کے حوالے سے واقعات بھی نقل کئے ہیں لیکن لچھمی نرائن شفیق (مولف چمنستانِ شعرا) نے شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری کے واسطے سے اور مولانا محمد حسین آزاد نے قدرت اللہ قاسم (مولف مجموعۂ نغز) کے بیانات کی بنیاد پر خان آرزو کے یہاں شاعرے کے انعقاد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ "اس مجلس ریختہ" کا ذکر ہے جسے میر صاحب نے "نکات الشعراء" میں مجلس خانۂ بندہ" سے تعبیر کیا ہے۔ شفیق، خواجہ صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں:

"شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری می گوید کہ ایں عزیز بزرگ عالی: در زمان (میر درد) را فقیر مکرر بخانۂ خانِ آرزو روز

---

[1] زیر بحث مجلسِ ریختہ سے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی کا ایک وضاحتی فٹ نوٹ بھی فاروقی صاحب کے اس خیال کی تائید کرتا ہے (ملاحظہ ہو آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ طبع دوم حاشیہ ص ۱۲۳)

[2] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری ۵۵۲، ۵۵۳

کچھ اوراق علی گڑھ کے بارے میں

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سلیمان کلیکشن میں محفوظ یہ منتشر اور بے ترتیب اوراق جن کی مجموعی تعداد پچیس ہے اور جنھیں دوسری کئی بیاضوں کے ساتھ "کشکولِ متفرقات" کے نام سے موسوم ایک جلد میں یکجا کر دیا گیا ہے، پچپن شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ ان شاعروں میں سے غلام احمد احمد (احسن اللہ) بیان، جودت (؟) غلام مصطفے خاں دل، مہربان خاں رند، محمد رضا رضا، سید علی سید، فتح علی شیدا، علیوی (؟) غلام محی الدین عملاعی۔ مرزا ندوی (لاہوری) قاسم علی قاسم، شاہ قلندر، مرتضی خاں مرتضیٰ، (فخر الدین) منت اور (میر عسکری) نالاں کے تراجم اور دوسرے کئی شعرا کے بے شمار اشعار "نکات الشعراء" کے متداول نسخوں میں موجود نہیں۔ میر محمدی بیدار، جودت اور ولی کے اشعار باقی ہیں لیکن تعارفی حصے ضائع ہو چکے ہیں۔ بعض شعرا کے حالات لفظ بہ لفظ میر صاحب کی تحریر کے مطابق ہیں اور بعض جگہ معمولی ترمیم یا تلخیص کی صورت نظر آتی ہو جبکہ بعض مقامات پر عبارات متداول متن سے اس قدر مختلف ہیں کہ میر صاحب کے مرتب بیانات اور مخصوص جملوں کی نوعیت بالکل ہی بدل گئی ہے۔

یہاں تک کہ "نکات الشعرا" میں ایک شاعر کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان اوراق میں اس کے متعلق کچھ اور کہہ کر یہی تمام باتیں کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ ایسی صورت میں محض اکثر شاعروں کے اشتراک اور ان کے تراجم کی کلی یا جزوی مطابقت کی بنا پر

یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اوراق "نکات الشعراء" کے کسی ضخیم تر نسخے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر مسعود حسن رضوی[1] اور جناب نثار احمد فاروقی کے بیانات جن میں کسی مضبوط بنیاد اور مستحکم دلیل کے بغیر صرف اس سطحی اور جزوی مماثلت کو کافی سمجھ کر یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ اوراق میر کے اصل تذکرے کے اجزائے پریشان ہیں اور "نکات الشعراء" کا موجودہ نسخہ اس نقش اول کا خلاصہ یا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے۔ ہمیں پوری طرح مطمئن نہیں کرتے۔ جہاں تک رضوی صاحب کے بقول اصل تذکرے میں ترمیم و تنسیخ کے بعد موجودہ نسخے کی ترتیب یا بہ الفاظ دیگر ان اوراق کے قدیم تر ہونے کا سوال ہے۔ اس قسم کے کسی بھی دعوے کو پورے وثوق کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور غور طلب ہیں۔

(الف) متداول نسخے میں میر سوز کا تذکرہ میر تخلص کے ذیل میں اور ان اوراق میں سوز تخلص کے تحت کیا گیا ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ سوز نے یہ تخلص اول الذکر تخلص (میر) سے (میر صاحب کے حق میں) دستبرداری کے بعد اختیار کیا تھا معاصرین کے بیانات سے قطع نظر ان کا یہ مقطع بھی تبدیلی کی اس نوعیت کی جانب اشارہ کرتا ہے

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

---

[1] آب حیات کا تنقیدی مطالعہ طبع دہلی۔ ص ۱۳۶، ۱۳۷
[2] مضمون بعنوان "نکات الشعرا کی ایک اور روایت" مشمولہ دلی کالج میگزین میر نمبر۔ ص ۲۹۲ تا ۲۹۶

(ب) مطبوعہ نسخے میں میر قمرالدین منت کے حالات شامل نہیں لیکن ان اوراق میں ان کا ذکر موجود ہے اور انھیں وزیر عمادالملک کا ملازم بتایا گیا ہے۔ میر نظام الدین ممنون (فرزند منت) کے بیان کے مطابق منت کی ولادت ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کا واقعہ ہے[1] اور ان اوراق میں ان کا تذکرہ کرتے وقت ان کی عمر یقیناً سولہ سترہ سال سے کم ہوگی جب کہ نکات الشعرا کا متداول نسخہ انکی ولادت کے صرف سات برس بعد ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زیر بحث اوراق کے مرتب نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء کے کئی سال بعد ہی لکھا ہوگا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی اور جناب نثار احمد فاروقی کے متفق علیہ دعوے کی دوسری اور اہم ترین شق یہ مفروضہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کے نتائج قلم ہیں اور "نکات الشعرا" کی ایک مختلف روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے نظر میں پہلے فیصلے کی طرح یہ رائے بھی ناقابل قبول ہے کیونکہ ان اوراق کے مندرجات میں ایسے شواہد بکثرت موجود ہیں جن کی روشنی میں اضافہ و حذف اور ترمیم و تغیر کے اس عمل میں میر صاحب کے قلم کا دخل حد درجہ مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

(الف) مرزا جعفر جھٹلی (کذا) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"مرزا ملتش بسیار مائل بہ ہزل بود۔ بندہ با او یک ملاقات کردہ ام۔ شعر ہزل خود می خواند و مردمان را بخندہ می آورد۔

---

[1] دیوان ممنون قلمی مملوکہ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال۔ ورق ۲۰۴

"خود نمی خندید مگر گاہے تبسمے می کرد۔ وطنش شاہجہاں آباد است۔"

"نکات الشعرا" میں جعفر کے متعلق میر صاحب کا بیان اس سے بالکل مختلف ہے اور یہ تمام باتیں جو یہاں جعفر سے منسوب ہیں وہ محمد شاہ ناجی کے بارے میں کہی گئی ہیں[1]۔ اس اختلاف کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ میر صاحب نے جعفر کے نمونہ کلام میں اردو کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے جو عالمگیر کے پسر چہارم محمد اعظم شاہ کی ہجو سے تعلق رکھتا ہے اور انتہائی فحش ہے جب کہ ان اوراق میں ان کے نام سے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں، وہ بالعموم اس قسم کے ہیں ؎

طرفہ حالت ہو بتاں سخت گرفتاری ہو یہ چھپا کوئی نہیں، کیا تجھے بیماری ہو

بکر شب آن کے ہاتف نے کہا ہو جعفر شاد ہو وصل کی کچھ ان دنوں تیاری ہو

قطع نظر اس سے کہ بظاہر یہ اشعار زٹلی کے بجائے کسی اور ہی جعفر کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک تذکرہ نگار جسے ایک جگہ حد درجہ فحش کلام بطور نمونہ پیش کرنے میں کوئی باک نہ رہا ہو دوسری جگہ ایسے اشعار کے انتخاب پر اکتفا کرے جو کسی طرح شاعر کے غالب رجحانِ طبیعت کی نمائندگی نہیں کرتے۔

(ب) سید عبدالولی عزلت کو ان اوراق میں مرزا مظہر کا شاگرد بتایا گیا ہے جو صریحاً خلاف واقعہ ہے۔ چونکہ میر صاحب عزلت سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ اس لئے اس قسم کی غلط بیانی ان کے نامۂ اعمال میں درج نہیں کی جا سکتی۔

(ج) سراج اورنگ آبادی کے بارے میں ان اوراق کے مرتب کا

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۲۳

بیان ہے کہ "ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ، چنانچہ مشقِ سخن "ریختہ" در اینجا می کرد"۔ (سراج ۱۱۲۸ھ ۱۷۱۶ء تا ۱۱۷۷ھ ۱۷۶۴ء) میر صاحب کے ہم عصر ہیں اور دہلی میں ان کے ورود اور مشقِ سخن کے متعلق اس بیان کے علاوہ کوئی وقیع یا غیر وقیع شہادت موجود نہیں۔ اس لئے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ یہ جملے میر صاحب کے قلم سے نکلے ہونگے بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ بدوِ شباب سے تقریباً ساٹھ سال کی عمر تک ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گذرا ہے اور مسودۂ اول ایڈیشن کی ترتیب کے وقت یعنی سراج کی وفات سے بارہ سال قبل تک وہ ذاتی طور پر ان سے قطعاً ناواقف تھے۔ سراج جیسے شاعر کا دہلی آنا اور میر صاحب کا ان کے ورود سے عرصہ دراز تک بے خبر رہنا بظاہر بعید از قیاس ہو۔

(د) انعام اللہ خاں یقین کا تعارف ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

"انعام اللہ خاں یقین تخلص پسر اظہر الدین خاں اولاد حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبیرہ حضرت اشیا (کذا) محمد معصوم عمر دیبالو سقالہ (کذا) (عروۃ الوثقیٰ) شاگرد مرزا مظہر جانجاناں خوش خلق، خوش خو مے، گرم جوش و یار باش، شگفتہ رو ہے۔ جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوش خوانِ چمن این فن، زبانِ گفتگویش گرہ کشائے زلفِ شاہدِ مدعا مصرع نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکلِ صبح خوش نما طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستانِ انداز ست گاہے درکوچۂ بلاغ مشق

بطریق گل گشت قدم رنجہ می فرماید در چمن بندی شورش (لفظ) رنگین چمن (چمن) گل چین خیال اور گل معنی وہ چینا شاعر زور آور ریختہ، در کمال علاقگی دارستہ، متواضع، آشنائے دوست بندہ اکثر ملاقات کردم۔ فقیر را اخلاص دلی است۔ ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و هکم شرکردن کہ در عہد عالمگیر بادشاہ باشد خدا مغفرت کند"!

یہاں اس بات کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ معنوی اعتبار سے یہ تعارف میر صاحب کے بیان سے کسی قدر مختلف ہے اور دونوں تحریروں میں کس حد تک تضاد پایا جاتا ہے لیکن اس توارد کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس اقتباس میں "خوش خلق" سے "شگفتہ رو ہے" تک جن اوصاف کا ذکر آیا ہے "نکات الشعرا" میں وہ یقین کی بجائے مرزا رفیع سودا سے منسوب ہیں اور ان اوراق میں بھی ان کے ترجمۂ احوال سے خارج نہیں کیے گئے ہیں باقی عبارت کا بیشتر حصہ (جوش بہار ــــ تا ــــ آشنائے دوست) میر صاحب کے یہاں خواجہ میر درد سے متعلق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان اوراق میں یقین سے قبل خواجہ صاحب کا تعارف بھی (میر صاحب کے بیانات کے دوسرے حصوں کو حذف کرتے ہوئے بعینہٖ انھیں الفاظ) میں سپرد قلم کیا جا چکا ہے اور "جوش بہار" سے "چمنستان انداز" تک کام جملے مرزا رفیع سودا کے ذکر میں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نہ تو یقین کا تعلق "عہد عالمگیر" سے تھا، نہ اس عہد کے کسی شاعر سے میر کے دوستانہ مراسم کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔

(۵) "نکات الشعرا" میں اور ان اوراق میں بھی) احسن اللہ خاں

احسن کی یہ شاعرانہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ "طبعش بسیار، مائل بہ ایہام بود"[1]۔ مرزا کاظم مبتلا لکھنوی نے اس مفہوم کو قدرے وضاحت کے ساتھ ادا کیا ہے کہ "در دیوانش شعرے یافتہ نمی شود کہ خالی از ایہام باشد۔ دریں صنعت دست گاہ تمام داشت"[2]۔ مبتلا ہمارے علم کی حد تک وہ تنہا تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے احسن کے دیوان کا مطالعہ کیا ہے اور جن کے یہاں ان کے کلام کا سب سے مفصل اور جامع انتخاب ملتا ہے اس لئے ان کی اس رائے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ بہر صورت ان اوراق میں احسن کے نام سے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں ان میں سے ایک مشہور اور زبان زد شعر (یہی مضمون خط ہے احسن اللہ، کہ حسنِ خوبرویاں عارضی ہے) کے علاوہ کسی شعر میں اس صنعت کے التزام کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ (طوالت) یہ غزل اس قسم کی تمام رعایتوں سے کلیتاً مبرّا ہے۔

نہ خلوت نہ جلوت کے ہم یار ٹھہرے — نہ قطرہ دیکھنے کے گنہ گار ٹھہرے
وہ مشکل ہے راہِ محبت کہ جس میں — نہ کافر ہی ٹھہرے نہ دیندار ٹھہرے
نہ دیکھا کبھی دل کو آباد ہم نے — تم اس گھر میں جس دن سے مختار ٹھہرے
تسلی ہوئی دل کو دیر و حرم میں — ترے در پہ ہم آ کے ناچار ٹھہرے
صبا بوئے گل تو نے پہنچائی سب کو — ہمیں تیری آنکھوں میں اک خار ٹھہرے
جفا تک عقوبت ہو دل دے کے اپنا — ہم ان سب کے احسن سزاوار ٹھہرے

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۲۷ [2] گلشن سخن مطبوعہ ص ۵۳

احسن کے رنگِ سخن سے واقفیت رکھنے والے اصحابِ ذوق بیک نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار ان کی تصنیف نہیں ہو سکتے اور واقعہ بھی یہی ہو کہ یہ غزل ایک دوسرے شاعر مرزا احسن علی احسن لکھنوی کی تصنیف ہے جو میر ضیاء اور سودا کے شاگرد تھے اور بہ اعتبارِ زمانہ احسن اللہ احسن کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(ز) مندرجہ ذیل مطلع ان اوراق میں خان آرزو سے منسوب ہے،

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

خان آرزو کے سلسلہ میں کسی شخص کی معلومات میر صاحب کے علم سے زیادہ قابلِ اعتبار اور مستند نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اس شعر کو آرزو کے بجائے مرزا مع. نظرت سے منسوب کیا ہے۔ اس لئے عام حالات میں انتساب کے اس فرق کو ان کی لغزشِ قلم سے تعبیر کرنا خلافِ عقل معلوم ہوتا ہو۔

یکساں خیالات کی تکرار، ہم الفاظ عبارتوں اور جملوں کے اعادے خلافِ واقعہ بیانات کی موجودگی، شاعر کے جاننے پہچاننے رنگِ سخن کی تمیز سے محرومی اور اشعار کے غلط انتساب کی ان مثالوں کے بعد بھی اگر بعض ناقابلِ لحاظ مطابقتوں کی بنا پر ان اوراق کو "نکات الشعرا" کا ایک جز قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے

ؔ "خوش معرکۂ زیبا" از سعادت علی خاں ناصر قلمی محفوظہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی ورق ۲ الف

ؔ "نکات الشعراء" طبع ثانی ص ۸

کہ میر صاحب حد درجہ ذہنی افلاس اور شعوری کم مائیگی کا شکار تھے۔ ان کی معلومات کا سرمایہ بہت ہی محدود اور کم ارز تھا اور اظہار مافی الضمیر پر وہ دسترس حاصل نہ تھی جس کی ان جیسے ممتاز اور معروف صاحب قلم سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ تمام باتیں کسی درجہ میں بھی قابل قبول نہیں اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کی بجائے کسی ایسے کم نظر اور ناپختہ کار مصنف کی کوششوں کا نتیجہ ہیں، جس نے اشعار کی جمع و تدوین سے اپنی دلچسپی کو عملی شکل دینے کے لئے میر صاحب کے بیانات کی قطع و برید پر اکتفا کیا ہے اور اس کی مطلق فکر نہیں کی ہے کہ یہ سرقہ اہل نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے گا۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اس قسم کی دست درازیوں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

گلشنِ گفتار

"گلشنِ گفتار" خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کی تالیف ہے اور پروفیسر سید محمد ایم اے کی ترتیب و تحشی کے بعد حیدر آباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس تذکرے میں صرف بتیس (۳۲) شاعروں کے مختصر حالات اور منتخب کلام جمع کیا گیا ہے۔ بیشتر شعرا دکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تذکرے کے آغاز سے اختتام تک کے مراحل تھوڑی سی مدت میں طے کر لئے ہوں گے۔ قطعی سنہ ترتیب کی شہادت مؤلف ہی کے کہے ہوئے درج ذیل قطعہ تاریخ سے ملتی ہے۔

لکھا ہم نے جب تذکرے کو حمید ہوا خوش جسے فہم اشعار ہے
تلاش اس کی تاریخ کی کر کے دل کہا "گلشنِ بزمِ گفتار" ہے
۱۱۶۵ھ

دیباچے کے تحت حمد و نعت کے بعد اسبابِ تالیف کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ۔

"من جرعہ چشِ صہبائے سخن معنی سنجان خواجہ خان بن ترکتاز خان بہادر قوی جنگ بن یکہ تاز خاں غفر اللہ لہما مسمّٰی بہ تخلص حمید بہ احیائے سخنِ سلفِ مدام بہ جامِ سخنوری مست و سرشار بودہ و بہ انکارِ زمانہ ناہنجار بیزار گردیدہ ذکرِ اشعارِ روشن فکرانِ معانی آرایان نصیحت می دانم و فکرِ سخنانِ ہوش بخش مسرت افزا غنیمت می شمارم بلکہ از فیضِ سخن شوکت ہا یافتم، چمنِ خاطر را نزہت بخشیدم، دل را از افکارِ علائق غنی ساختم و طبیعت را از کشاکش

خلائق بے نیاز گردانیدم۔ خواستم کہ شغلے پیش گیرم و تذکرۃ الشعرا نویسم لیکن چوں عبارت آرایاں سعی طراز اکثر تذکرۂ شعرائے فارسیہ بحیطہ تحریر آوردہ اند، تالیف آں تحصیل حاصل می انجامد بنابریں تذکرۃ الشعرائے ہندیہ ترتیب دادم و بہ مضامین "تازہ دل ہا را گلشن گلشن ساختم و نامش گلشن گفتار نہادم" (ص ۳ و ۴)

گویا میر اور قائم کی طرح حمید کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ ان کا تذکرہ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جہاں تک دکن کا تعلق ہے وہاں ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء سے قبل اس موضوع پر کوئی کتاب معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ شمالی ہند کے تذکروں میں زمانۂ ترتیب و تکمیل کے لحاظ سے "نکات الشعراء" کو اولیت حاصل ہے لیکن وہ بھی اسی سال کی تالیف ہے اور ہمارے پاس ایسا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ان دونوں تذکروں کے زمانۂ ترتیب کی تقدیم و تاخیر کا فیصلہ کیا جا سکے۔ عین ممکن ہے کہ میر کا تذکرہ "گلشن گفتار" کے بعد مکمل ہوا ہو یا اس کی شہرت اتنی کم عرصے میں دکن تک نہ پہنچ سکی ہو لیکن یہ بات بے حد تعجب خیز ہے کہ حمید صرف "نکات الشعرا" ہی سے بے خبر نہیں میر کے وجود سے بھی ناآشنا ہیں کیونکہ خود اور شمالی ہند کے دوسرے کئی شاعروں کی موجودگی کے باوجود میر صاحب کا نام اور کلام تذکرے میں شامل نہیں۔ یہ ناواقفیت تذکرہ نویسی میں اولیت کا دعویٰ کرنے کے لئے دانستہ اغماض پر بھی مبنی ہو سکتی ہے

حمید نے زیادہ تر شعرا کا تعارف نہایت مختصر الفاظ میں کرایا ہے اور ترتیب میں حروف تہجی کے بجائے زمانے کی تقدیم و تاخیر پیش نظر رکھی ہے۔ تذکرے کی ابتدا ملک الشعرا نصرتی کے ذکر سے ہوتی ہے جس کے

بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"متوطن بیجاپور موسوم بہ تخلص نصرتی کہ نسخہ مدماالت بہ زبان ہندوی بہ نزاکتِ تمام و مضامین پُر انجام ترتیب دادہ چنانچہ از پادشاہے خطاب ملک الشعرائی یافتہ و در تعریفِ زلفِ دوست خوب از ریختہ او ہست۔" (ص ۶-۷)

نصرتی کے بعد وجدی کا نام آتا ہے جن کا ذکر اس کے مقابلے میں کسی قدر تفصیلی ہے ملاحظہ ہو۔

"وجدی محمد احمد آبادی عجیب فکر رسائے داشت و دیوان دلچسپ رنگینے طرح نمودہ۔ اکثر اوقاتِ خود در طلب علم گزرانیدہ در بلدہ دار السرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت و جناب میاں سید مولی کہ از مشائخ زادہ ہائے گجرات بودند میل تمام داشت دیوان مشہور و معروف دارد۔ آخر عمر در گجرات وفات نمود۔" (ص ۸)

مضمون کے بارے میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ:

"عجب شاعر متوکل بودہ متوطن احمد آباد او ست موجد ایہام" (ص ۱۹)

شاہ حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

"محمد حاتم باشندۂ حضرتِ دہلی، مرد صاحب ہمت طبع عالی دارد و بخل در دادن شعر ہر گونہ کردہ و دریں امر کہ فی الحقیقت سخن درست بہ شایہ دراست گوئے از حاتم بردہ صرفہ نہ دارد" (ص ۲۵)

سودا کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ :-

"مرزا محمد رفیع سودا تخلص منصب دار بودہ۔ متوطن شاہجہاں آباد۔ مردے بود امزاج و کم سخن" (ص ۳۷)

شاہ مبارک کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ :-

"میر مبارک آبرو تخلص در ایام محمد شاہ بادشاہ ترک منصب و دنیا کردہ بود۔ متوکل و صاحب دیوان است۔ اشعارش در تمام ممالک محروسہ مشہور و معروف۔ در دارالخلافہ شاہجہاں آباد مستقل سکونت است۔" (ص ۵۵)

ان اقتباسات سے حمید کے عمومی طرز تذکرہ نگاری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے عام طور پر شعرا کے بارے میں اپنے تاثرات و معلومات اس قسم کے مجمل و مختصر جملوں میں سپرد قلم کیا ہے۔ اس اختصار میں غالباً رجحان طبیعت کے ساتھ ساتھ ان کی بے خبری و لاعلمی بھی کارفرما رہی ہے جو اس زمانے کے حالات کے پیش نظر زیادہ قابل تعجب نہیں۔ تاہم اس تذکرے کے اوراق میں کہیں کہیں تفصیلات کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے جس کی امتیازی کیفیت پڑھنے والوں کو چونکائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک مزاح نگار شاعر عبدالرحیم کے بارے میں مولف کا درج ذیل بیان اسی قسم کے مستثنیات میں سے ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"محمد شاہ بادشاہ علیہ الرحمہ بادشاہ رحم دل، رنگین مزاج بودہ کہ احدے را در سلطنت اذیت بہ نوعے نرسیدہ و اہل کمال را نہایت دوست می داشت صاحب سخن بود و طبعش راغب مزاح نیز بود۔ چنانچہ در آن ایام عبدالرحیم نامی از اہل کشمیر

حاجی (ھاجی) بود، نام خود را ادٹ کولیس قرار دادہ ہر کسے کہ شعرے خواند فی الحال در جوابش شعر موزوں بطور تبلیح و ملیح بدیہہ می خواند روزے بادشاہ طلبیدہ بایکے از اہلِ محفل اشارت خواندنِ شعر نمودہ، چنانچہ امیر خاں مرحوم ایں شعر را بزبان راند

آہ من العشق و حالاتہ احرق قلبی بحراراتہ

ما نظر العین الی غیرکم اقسم باللہ و آیاتہ

شعر مذکور کہ بہ اتمام رسید، اڈ کلیس بدیہہ در جوابش خواند

آہ من اللاہ و پکاراتہ از کمرش گرد بچھاراتہ

سلطان متبسم شدہ انعامے بخشید۔ او بتاریخ بست و ہفتم شہر ربیع الثانی در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت ہجری از دہلی انتقال نمود۔" (ص ۲۶)

سید محمد کامل برہان پوری کے حال میں رقم طراز ہیں کہ۔

"طبعِ عالی داشت و تمام عمر خود را در گفتن مدح و مرثیہ حضرات صرف نمودہ دیگر شعر اصلاً و مطلقاً گاہے قصداً و عمداً بر زبانش نرفتہ سبحان اللہ چہ سعادت مندئی او بہ تحریر قلم آید چند مطلع مرثیہ ہائش نوشتہ می شود ...... یک مطلع دیگر از مرثیہ گفتہ او ست شاید ہیچ مضمون ہیچ کس از شعرا نیافتہ باشد و نخواہد یافت ایں است"

قیامت انتقامِ آلِ احمد دیر کھینچا ہے

فلک نے مضطرب ہر ماہ نو شمشیر کھینچا ہے

۔ اکثر اعزہ کہ متصدع اوقات میر ند کو ، برائے گفتن ریختہ می

شدند بہ حسب ضرورت ریختہ گفتہ می دارد لیکن رسوخ و اعتقادے

کہ داشت از ہر شعرش مظہر است و در ہر مقطع قطع سخن کردہ۔"

(ص ۵۳-۵۴)

داؤد اورنگ آبادی کی شخصیت اور شاعری پر ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔

"مرزا داؤد بیگ مغل زاد، باشندہ خجستہ بنیاد اورنگ آباد اگرچہ بر کتاب صرف و نحو وغیرہ عبورے نداشت لیکن در کلام او لغزشے ظاہر نیست۔ عزیز خوش طبع و خوش فکر اکثر تازہ مضمون طرح نمودہ، معاصر شاہ سراج بود۔ در ایام خورد سالی پیشہ کارچوبی اختیار نمودہ لیکن بعد ازاں بفکر رسا و جید دہر گشتہ بلکہ در محفل شمع وار داعیۂ سربلندی داشت و بہ شعلۂ فکر پروانۂ دلہا می سوخت سراج را مثال چراغ بے نور می انگاشت روزے یک بیت بہ خطاب شاہ سراج از شبستان خاطرش سرزد، ایں است

جو بے زبانی تو کرے بزم سخن میں سراج
تیغ سین گل گیر کی ورنہ کٹے گا سر آج

چوں شعر او ایں بیت بہ پردۂ گوش شاہ سراج رسید، بے اختیار از سوختگی آہے کشید و از زبان برآورد

نہ بھول کسب قدیمی کو اپنے اے مرزا
وگرنہ پھر نہیں کارچوب ہووے گا

ص ۵۷-۵۸

عارف الدین خاں عاجز کے ذکر میں بھی اسی قسم کی تفصیلات ملتی ہیں۔

ملاحظہ ہو۔

"عاقبت الدین خاں عاجز تخلص عرف میرزا بی اکثر اوقات خود اوائل بہ تجارت مصروف داشتند مبلغے در سفر گجرات کہ طریق ترغیب بہ فخر الدولہ ناظم آں ملک معاونت نمودند از ہنگامہ اشتیا منقدمہ در لشکر برہم خوردہ زر ایشاں نیز رائگاں رفت۔ دست از وے برداشتہ بہ خجستہ بنیاد آمدند شخصے سریع الفکر دیدہ گو۔ ہر سخن و در گفتن تاریخ عدیم المثال۔ سبحداطبع ایشاں بہ اظہار سخن اصلاً و مطلقاً نہ بلکہ احدے را از اشعار خود مطلع نمودند تا بہ نوشتن و خواندن چہ رسد۔ از انجا کہ ایں احقر با ایشاں محبت تمام دارد ہم سخن گوے بہ برکت فیض ایشاں اکثر قصائد بے نقط وغیرہ معہ غزلیات دیوان فارسی ترتیب دادہ و اشعار متفرقہ ہندی نیز بہ دستور معروف جمع نمودہ دیوان ہندی ایشاں مرتب ساختہ طرفہ دیوانے مرقوم گردانیدہ۔ اکثر ریختہ ہائے صنائع۔ مثل در بحرے سہ بحرے چہار بحر دلف و نشر مرتب از دیوان مذکور معلوم خواہد گردید" (ص ۵۹)

ان بیانات سے متعلقہ شاعروں کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک ابتدائی قسم کی وہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں جن کی روشنی میں ان کی شخصیات اور شاعری کے متعلق رائے قائم کرنا زیادہ دشوار نہیں رہتا لیکن یہ استثنائی صورت حال محض اتفاقات یا خصوصی تعلق اور دلچسپی کی رہین منت ہے ورنہ جیسا کہ ابتدائی سطور میں پیش کیے گئے دیباچے کے اقتباس سے ظاہر ہے۔ "گلشن گفتار" کی ترتیب کسی سنجیدہ محرک کے

بجائے تفریح طبع اور وقت گزاری کے خیال سے عمل میں آئی تھی۔ اس لئے عام حالات میں مولف سے اہم واقعاتِ زندگی کی نشاندہی نیز شخصیت اور شاعری کی تنقید کے سلسلے میں کسی خاص تحقیق و تلاش اور غور و فکر کی توقع رکھنا مناسب بھی نہیں۔ در حقیقت یہ تذکرہ ایک ایسی بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے جس میں ارباب ذوق اپنا منتخب اور پسندیدہ کلام یا مختلف شاعروں کی مشہور غزلیں یا نظمیں جمع کر لیتے ہیں۔ ہماری اس رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حمید نے بالعموم مکمل غزلیں یا ہم عصر شعرا کا اہم طرح کلام نقل کیا ہے۔

اس عمومی حیثیت سے قطعِ نظر "گلشنِ گفتار" کے چند اہم اور انفرادی پہلو بطور خاص قابلِ ذکر ہیں مثلاً:

ولی سے متعلق تاریخ ادب کے بیانات اور تنقیدی و تحقیقی مضامین میں درج ذیل شعر اکثر زیرِ بحث آتا ہے ؎

دل ولی کا لے لیا دِلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمّد شاہ سوں

"گلشنِ گفتار" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں شرف الدین مضمون کا ہے۔ صفحہ ۱۶ پر اس زمین میں ان کی ایک غزل ملتی ہے جو پانچ اشعار پر مشتمل ہے اور ان کے درمیان یہ شعر کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں چوتھے نمبر پر درج ہے۔ دوسرے اشعار نظر انداز کرتے ہوئے یہاں ایک شعر نقل کیا جاتا ہے تاکہ اختلافِ لفظی کی وضاحت ہو جائے۔

اس گدا کا دل لیا دِلّی نے چھین — جا کہو کوئی محمد شاہ سین

محتشم علی خاں حشمت کے ذکر میں ان کے دو مخمس نقل کیے ہیں جن میں ایک حمد میں ہے اور دوسرا نعت میں اس طرح شاہ حاتم کے منتخب کلام کے تحت غزلیات کے متعلق حقہ سے متعلق ان کی مشہور مثنوی بھی شامل ہے جو کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ملتی۔

عبدالحئی تاباں کے حال میں میرزا مظہر اور شاہ مبارک آبرو کے درمیان معاصرانہ چشمک کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جو کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

"روزے مصرع از زبانِ میر مبارک آبرو بدیہہ طبع زاد گردید۔ مصرع ایں است"

"دہلی کے شاعروں میں اک آبرو ہوا ہے"

چنانچہ از اہلِ محفل تاباں در مجلس میرزا مظہر جانِ جاناں مصرع صدر برخواند۔ میرزا در جوابش فی الفور ایں مصرع رسانید۔ ع

"جانے سے ایک چشم کے بے آبرو ہوا ہے"

مردماں ایں مصرعِ ثانی را باز بہ سمع میر مبارک آبرو رسانیدند، میر فوراً برزبان راند ؎

کیا ہوا حق کے کئے سے کور میری چشم ہے
آبرو جگ میں رہے تو جان جاناں پشم ہے

میرزا مظہر جانِ جاناں در جوابش فی الفور گفت۔ ع

"مبارک باد تم کو آبرو صاحب سخنور ہو
بھلے ہو یا بُرے ہو خوب ہو کان جواہر ہو" (ص ۴۲، ۴۳)

درد کا ذکر تقریباً تمام ہی قدیم تذکرہ نگاروں نے کیا ہے لیکن...

یہ بات پہلی بار اس تذکرے سے معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے ایک عرصہ تک برہان پور میں بھی قیام کیا تھا۔ ان کے نام اور وطن کے بارے میں بھی حمید کے بیانات اکثر مصنفین کی روایتوں سے مختلف ہیں اور بڑی حد تک تحقیق جدید کے نتائج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اگرچہ شمالی ہند کے شاعروں کے بارے میں حمید کے بیانات قابلِ اعتنا نہیں لیکن مرتب تذکرہ پروفیسر سید محمد کے بقول "شعرائے دکن کی نسبت تذکروں کی ناقص معلومات کے پیش نظر "گلشنِ گفتار" کی اطلاعات اس لحاظ سے کہ اس کا مولف خود دکن کا باشندہ تھا اور اکثر دکنی شاعروں سے شخصی طور پر واقف تھا، زیادہ مستند و معتبر ہیں اور جن دکنی شاعروں کا ذکر دوسرے تذکروں میں قطعاً مفقود ہے۔ ان کے متعلق اس تذکرے کے بیانات سے اہلِ تحقیق کو بڑی مدد مل سکتی ہے"[1]۔

---

[1] مقدمہ گلشن گفتار (ص ۸-۹)

گلشنِ راز - یا - تذکرہ ریختہ گویان

یہ تذکرہ عرف عام میں "تذکرہ ریختہ گویان" کے نام سے مشہور ہے بعض مصنفین نے جن میں قدیم تذکرہ نگار اور جدید ناقدین دونوں ہی شامل ہیں، اسے اس کے مولف سید فتح علی حسینی الگردیزی (متوفی ۱۲۱۴ھ ۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) سے نسبت دیتے ہوئے "تذکرہ گردیزی" کے نام سے بھی یاد کیا ہے، لیکن جیسا کہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے ایک قلمی نسخے کی لوح اور ترقیمے کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے، اس کا اصل نام "گلشنِ راز" ہے[1]۔ شعرائے اردو کے دوسرے متعدد تذکروں کی طرح اس تذکرے کی طباعت واشاعت بھی مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق وتلاش اور ترتیب وتدوین کی رہینِ منت ہے۔ راقم السطور نے اس تذکرے کے مطالعے میں انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد

---

[1] - اس نسخے کے صفحہ اول پر کتاب کا نام "گلشنِ راز" یعنی تذکرۂ بے بدل ہندی از تصنیف فتح علی خان" تحریر ہے اور آخری صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"تمام شد کتاب گلشنِ راز بجہت خانِ عالی شان، بلند مکان قبلہ دو جہان عبدالغنی خان فیض رسان سلمہ الرحمان نوشتہ شد از دست فقیر حقیر سکین دعاگو دولت جوئے امیدوار فضل وکرم، بندۂ درگاہ محمد شریف عاجز۔"

بحوالہ ہندوستان "قومی زبان" کراچی جلد نمبر ۲۳ شمارہ نمبر ۹-۱۰ یکم ۱۶ مئی ۱۹۶۳ء) ص ۵۰

کے ۱۹۳۲ء میں شائع کئے ہوئے اس نسخے کے علاوہ بعض مقامات پر متن کی تصحیح و تصدیق کی غرض سے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن کے ایک قلمی نسخے سے بھی مدد لی ہے۔ یہ نسخہ کتب خانے کی فہرست مخطوطات میں نمبر ۲۱۹ پر درج ہے اور اپنے کاتب اور زمانۂ کتابت کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کرتا۔

"گلشن راز" شمالی ہند کا پہلا تذکرہ ہے جو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے اور جس کی تالیف پر ہمارے اندازے کے مطابق بہت کم مدت صرف ہوئی ہے۔ اگرچہ معاصر تذکرہ نگاروں کی طرح گردیزی نے بھی اس کے زمانہ آغاز کے سلسلے میں خاموشی اختیار کئے ہوئے صرف تاریخ اختتام ۵ محرم الحرام ۱۱۶۶ھ (مطابق ۱۳ نومبر ۱۷۵۲ء) بیان کر دی ہے[1]۔ تاہم بعض قرائن سے جن پر آیندہ سطور میں بالتفصیل بحث کی جائے گی، یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس تذکرے کی ابتدا ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں "نکات الشعرا" کے منظر عام پر آنے کے بعد ہوئی اور اس کی تکمیل میں چند ماہ سے زیادہ نہیں لگے۔ البتہ جناب عرشی رام پوری بعض داخلی شہادتوں کی بنیاد پر اس تذکرے کے آغاز کا زمانہ ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء کے قریب قرار دیتے ہیں۔ موصوف نے اس فیصلے کی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

"میر ناصر ساماں، ولی اللہ اشتیاق سرہندی اور اسد یار خاں انسان کو لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو چند سال ہوئے۔ "نشتر عشق" میں ساماں کا سال وفات ۱۱۴۷ھ اور اشتیاق کا

---

[1] تذکرۂ ریختہ گویان مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۱۶۸

۱۱۵۰ھ اور تاریخ محمدی میں انسان کا سنہ وفات ربیع الاول ۱۱۵۰ھ درج ہے: "چند" کا لفظ تین سے نو تک اعداد پر بولا جاتا ہے۔ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ گردیزی نے ہر جگہ "چند" سے تین مراد لئے ہیں تو ان مرحومین کے سالہائے وفات کے پیش نظر ان کا حال ۱۱۵۰ھ، ۱۱۵۳ھ اور ۱۱۶۱ھ میں لکھا جانا چاہئے اور اگر یہ کہا جائے کہ گردیزی کی مراد ہر جگہ نو ہے تو پھر ان کا حال علی الترتیب ۱۱۵۶ھ، ۱۱۵۹ھ اور ۱۱۶۷ھ میں لکھا گیا ہوگا اور اگر ۱۱۵۶ھ سے حساب کیا جائے تو پھر علی الترتیب "چند" کا اطلاق ۱۰- ۵ اور ۷ برس پر ہوگا۔ ان میں سے آخری استعمال تو صحیح رہتا ہے مگر دو پہلے قطعاً درست نہیں، حساب کی رو سے اور نہ ہمارے روز مرہ کے اعتبار سے۔ اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ گردیزی نے چند سے نو سال مراد لئے ہیں اور اس کا آغاز ۱۱۵۶ھ کے قریب کیا ہے[1]"

ممکن ہے کہ ایک عام قاری کے لئے بحث کے اس انداز اور ما حصل سے اتفاق میں کوئی قباحت نہ ہو لیکن جہاں تک تحقیق و تفحص کے ذریعہ دریافت حقائق کا تعلق ہے عرشی صاحب کا یہ قول فیصل کہ "چند" کا لفظ تین سے نو تک کے اعداد پر بولا جاسکتا ہے اور اسکے خلاف اسکا اطلاق حساب اور روز مرہ دونوں کے لحاظ سے صحیح نہ ہوگا، ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے خود "دستور الفصاحت" میں جس کے دیباچے سے منقولہ عبارت ماخوذ ہے۔ ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں لفظ چند کے التزام کے ساتھ

[1] دیباچہ "دستور الفصاحت" ص ۴۸ و ۴۹

پچاس اور ستّر کے درمیان اشعار بطور نمونہ نقل کئے گئے ہیں نیز مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں جو ١٢٠١ھ اور ١٢٠٩ھ کے درمیانی عرصے میں مرتب ہوا ہے، اشرف علی خاں فغاںؔ متوفی ١١٨٦ھ کی وفات کو چند سال قبل کا واقعہ قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ تصور کر لینا کہ گردیزی اس مخصوص حسابی دائرے سے تجاوز کے مرتکب نہ ہوئے ہوں گے۔ کسی طرح درست نہیں۔ اس کے برخلاف بیشتر شواہد اسی خیال کی تائید کرتے ہیں کہ انھوں نے تذکرے کا آغاز "نکات الشعراء" کے بعد کیا ہے اور زیادہ تر میرؔ کے خوانِ نعمت ہی سے زلہ ربائی کی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل تصریحات سے اندازہ ہوگا۔ دیباچے کے تحت تذکرے کی تالیف کے اسباب و محرکات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"از آنجا کہ عشقِ سخن بہ آب و گِلم سرشتہ اند و تخم معنی بہ مشتِ خاکم گشتہ از ملاحظہ تذکرہ ہائے اخوانِ زماں کہ مشتمل بر اسامی ریختہ گویانِ عہد محرر ساختہ اند و علت غائی تالیف شاں خوردہ گیری ہمسران و بستم ظریفی با معاصر انست، در اظہار ما صدق نفس الامر با یجاز پرداختہ بلکہ از جرأت عدم اغتنا و قلت تتبع ذکر اکثر نازک خیالان رنگیں نگار را از قلم انداختہ مہٰذا در تصحیح اخبار و تحقیق احوالِ اعزہ اغلاطِ صریح بکار بردہ و خطا ہائے نمایاں کردہ اند بخاطر نامرز ریخت کہ تذکرۂ مرقوم سازد کہ بے رو دیدگی از روئے انصاف خالیاً عن الاعتساف و اسامی نامی شعرا را بہ ترتیب حروف تہجی بنویسد تا حاضران را تذکارے

رغائبان را یادگارے بود۔" (ص ۳)

اس عبارت میں "تذکرہ ہائے اخوانِ زمانی" کے متعلق جس وثوق کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب سے قبل شعرائے اردو کے کسی تذکرے گردیزی کی نظر سے گذر چکے تھے لیکن اصل میں یہ اندازِ بیان میر کے خلاف اس جذبۂ عناد کی پردہ پوشی کے لئے اختیار کیا گیا ہے جس کے نمونے تذکرے کے صفحات پر جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مرتب تذکرہ مولوی عبدالحق کے بقول:

"اس نے اپنے سارے تذکرے میں کہیں کسی تذکرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اشارہ تک نہیں کیا — البتہ قرائن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کا تذکرہ اس کی نظر سے ضرور گذرا ہے اور دیباچے میں اس نے تذکرہ نگاروں کی غلطات جو زہر اُگلا ہے اس کا ہدف نکات الشعرا ہی کا ہے"[1]

آگے چل کر مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ہمارے اس قیاس کی تائید میں ایک پُرلطف بات یہ ہے کہ میر صاحب کے حالات میں صرف دو تین سطریں لکھی ہیں جس سے صاف بے اعتنائی ٹپکتی ہے — ...... سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ حالات کے بعد میر صاحب کے کلام میں سے صرف ایک شعر نقل کیا ہے اور وہ بھی بہت ہی معمولی حالانکہ معمولی سے معمولی اور گمنام شاعروں کے کلام سے بھی رجب

---

[1] "تذکرۂ ریختہ گویان" دیباچہ مرتب ص۔ ۱۱-۱۲

مل گیا ہے تو) صفحے دو صفحے ضرور نقل کر دئے ہیں[1]۔"

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مثالیں گردیزی کی اس معاندانہ روش کو بے نقاب کرتی ہیں۔

(الف) میر "نکات الشعراء" میں محمد یار خاکسار کے متعلق لکھتے ہیں۔

"خود را دور می کند و بسیار سفلگی می کند..... علی الرغم ایں تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است..... احوال خود اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ، آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است چوں بجا بلدی می دہد ایں قسم بیٹے ریسمان می تابد کہ گوہی بیپرہ سن تاب است.....

نثر او ہمہ بر ریختہ است طرفہ ایں کہ آں ہم نامربوط و خود او ہم نادرست..... الغرض بسیار کم فرصت و بے تہ است[2]"

اس کے علاوہ گردیزی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:۔

"گویند بسیار بری پیچد، خود را از شعرائے مسلم محسوب می کند۔ بہر حال شخرش از موزونیت خالی نیست و آنکہ بعض اعزہ سر بانکار موزونیت او بر آوردہ اند او از زمرۂ شعراء خارج می کنند، ناشی از ستم ظریفی و بے انصافی است۔" (ص ۵۲)

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ مولف نے خاکسار کی نا اہلی سے واقفیت کے باوجود محض میر کی مخالفت میں ان کی حمایت کی کوشش کی ہے۔ نیز اگر آخری جملے کے الفاظ "بعض اعزہ"

---

[1] تذکرہ ریختہ گویاں۔ دیباچہ مرتب۔ ص ۱۳-۱۴

[2] نکات الشعراء مرتبہ عبدالحق۔ ص ۱۱۴-۱۱۵

اور ستم ظریفی دہلے انصافی" کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسباب تالیف کے سلسلے کی عبارت پر ایک بار پھر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ "اخوانِ زمان" سے "نکات الشعراء" کا مولف ہی مراد ہے۔

(ب) میر صاحب انعام اللہ خاں یقین کی موزوں طبعی اور سخن فہمی سے صرف غیر مطمئن ہی نہیں، بلکہ کسی حد تک منکر بھی ہیں۔ گردیزی نے اس بحث سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے بڑی فیاضی کے ساتھ ان کے فضل و کمال اور خوش بیانی و قادر الکلامی کی داد دی ہے۔ اس مبالغہ آمیز ستائش میں بھی میر صاحب کے خلاف معرکہ آرائی کا جذبہ کارفرما معلوم ہوتا ہے

(ج) میر نے نکات الشعرا کے دیباچے میں ریختہ کو "شعرے بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلّٰی شاہجہاں آباد دہلی"[1] قرار دیا ہے گردیزی بادنیٰ تغیر الفاظ اسی مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں "آں شعریست بزبان اُردوئے معلّٰی مملکتِ ہندوستان حرسہ اللہ تعالیٰ، بطرزِ شعر فارسی در موزوں نیست" (ص ۴)

(د) میر نے تذکرے کے اختتام پر ریختہ کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں۔

"اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی ......
دوم اینکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی ......
سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند ایں قبیح است چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبانِ ریختہ

---

[1] نکات الشعراء طبع ثانی ص ۱

می افتد آں جائز است و ایں طریق عام نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقہ شاعری است ..... اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضایقہ ندارد پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنون طبیعتہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار بشتگی بستہ شود معنی ایہام ایں است کہ لفظے کہ برو بنائے بیت بود آں دو معنی داشتہ باشد یکے قریب و دیگے بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است تجنیس۔ ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت۔ ادا بندی خیال وغیرہ ایں ہمہ ہا در ضمن ہمیں است[1]"

گردیزی اپنے تذکرے میں تھوڑی سی ترمیم اور اضافے کے ساتھ انھیں خیالات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"اول، قسمے است کہ مصرع اول فارسی و ثانی ہندی و دوم کہ نصف مصرع فارسی و نصف ہندی باشد نزدیک تازہ گویان مستہجن و مستقبح است۔ اما ترکیبات فارسی کہ مناسب و مانوس بزبان ریختہ افتد جائز و ترکیب غیر مانوس الاستعمال جائز نے۔ دفارق دیگر ایہام او وجز صاحب سلیقہ زباندان کہ با فصاحت و بلاغت آشنا باشد۔ دیگرے نمی تواند شد و ایہام کہ در زمان

---

[1] نکات الشعراء طبع ثانی ص ۱

سلف ترویج یافتہ بود، اکنون طبیعت ہا مصروف باین صنعت کم اند مگر بیا بریشتگی و زشتگی بستہ شوند ابہام در اصطلاحِ ارباب بدیع عبارت از آں حرف است کہ بنائے بیت برو باشد و آں در معنی دو محل داشتہ باشد یکے قرب و دیگرے بعید و دراں مقام معنی بعید منظور شاعر باشد و قریبہ متروک آن و انداز کہ مختار تازہ گویان زماں است، محیط صنعتہائے فصاحت و بلاغت است۔ فصاحتِ کلام عبارت از خلوص آں ست (از ضعفِ تالیف و تنافرِ کلمات و تعقید لفظی و معنوی[1]) و ضعفِ تالیف عبارت از کلام غیر مطابق قواعدِ مشہورۂ نحویہ است و تنافرِ کلمات (ثقل آنست بر زبان[2]) و بلاغت عبارت از مطابقت کلام است بمقتضائے مقام مع فصاحت کلام و مقام چیزیست کہ متکلم را باعث است بر تکلم علمی بوجہ مخصوص"! (ص ۴-۷)

(۵) میر، عشاق کے متعلق لکھتے ہیں کہ "سلیقہ اش از تخلص پیدا است" گردیزی کے اسی جملہ کو اپنے یہاں اس طرح نقل کر دیا ہے۔

"رسائی طبعیش از تخلص پیدا است" (ص ۱۰۶)

(۶) میر کے یہاں شاہ حاتم کا منتخب کلام چھبیس[3] اشعار پر مشتمل ہے

---

[1] زیر توسین عبارت مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں، معنوی خلا کو محسوس کرتے ہوئے نسخۂ آصفیہ سے نقل کی گئی ہے۔

[2] یہاں مطبوعہ نسخے میں "ثقلیہ آنست برزبان" منقول ہے جس کے مقابلے میں نسخۂ آصفیہ کی یہ روایت قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

[3] نکات الشعرا" طبع ثانی ص ۱۴۰

گردیزی نے بہ تغیر ترتیب اسی انتخاب سے چودہ اشعار اپنے تذکرے میں درج کر لئے ہیں۔

(ز) نکات الشعرا میں عبدالحئی تاباں کے سینتالیس اشعار نقل ہوئے ہیں۔ گردیزی کے یہاں ایک شعر زائد ہے اور باقی تمام اشعار کی ترتیب بعینہ نکات الشعرا کے مطابق ہے۔

(ح) دلاور خاں بیرنگ کے اشعار کی ترتیب و تعداد دونوں تذکروں میں بعینہ یکساں ہے۔

(ط) میر صاحب اپنے بھتیجے محمد محسن محسن کے نمونۂ کلام میں پانچ شعر پیش کئے ہیں۔ گردیزی کے تذکرے میں سولہ اشعار ملتے ہیں لیکن ایک شعر کے علاوہ جو نکات الشعراء میں شامل نہیں، بعض لفظی اختلاف کے باوجود تمام اشعار کی ترتیب میر صاحب کی تحریر کے مطابق ہے۔

(ی) نکات الشعرا میں ولی کے انتخاب کلام کے تحت اکیس شعر درج ہیں۔ گردیزی نے ان میں سے اپنے یہاں تیرہ اشعار نقل کر لئے ہیں اور ایک شعر اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ آخری دو شعروں کی ترتیب الٹ گئی ہے۔

(ک) میر کے یہاں مصطفی خاں یک رنگ کے کلام میں مندرجہ ذیل شعر بیالیسویں نمبر پر ہے

یک رنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہے دو نین جو کہو تو نظر کرے

گردیزی نے یہ شعر سب سے پہلے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد میر صاحب

کی قائم کردہ ترتیب کے عین مطابق اپنے پسندیدہ اشعار کو جگہ دی ہے۔

(ل) محمد شاکر ناجی کے نمونہ کلام میں کچھ اشعار "نکات الشعرا" سے اور سات شعر ان کے دیوان یا کسی بیاض سے نقل کیے گئے ہیں۔ موخر الذکر سات اشعار کے علاوہ باقی تمام شعروں کی ترتیب لفظ بہ لفظ "نکات الشعرا" کے مطابق ہے۔

ان شواہد کی موجودگی میں یہ باور نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ "نکات الشعرا" کے مطالعے کے بعد ہی گردیزی نے اپنے تذکرے کی ترتیب کا آغاز کیا اور اس کا بنیادی مطمح نظر میر کے خلاف انتقامی کارروائی کے سوا کچھ نہیں۔ اس فیصلے کے ساتھ یہ بات خود بخود طے ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا کا زمانہ ۱۱۵۶ھ کے قریب قرار دینا یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔

"نکات الشعرا" یا تذکرہ بائے اخوانِ زماں" پر گردیزی نے جو اعتراضات وارد کیے ہیں یا جن کوتاہیوں نے انھیں جوابی اقدام پر مجبور کیا ان کی تفصیل یہ ہے۔

(الف) تذکرے کی تالیف کے پیچھے ہمدردی کی خوردہ گیری اور معاصرین کے ساتھ ناانصافی و ستم ظریفی کا جذبہ کار فرما ہے

(ب) تحریر میں تفصیل و تشریح کے بجائے ایجاز و اختصار کی روش اختیار کی گئی ہے۔

(ج) بے اعتنائی اور ذوقِ تحقیق کے فقدان کی بنا پر اکثر رنگین نگار شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(د) حالات کے بیان میں صحت کا خیال نہیں رکھا گیا چنانچہ

جا بجا صریح غلطیاں موجود ہیں۔

ان محرکاتِ تالیف کو نظر میں رکھتے ہوئے جب ہم "گلشنِ راز" کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ نہ تو گردیزی نے ان منظوم شعرا کی نشان دہی کی جو حریفوں کی بے جا خوردہ گیری اور ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہیں اور نہ اپنے منظورِ نظر شاعروں کے حالات میں تفصیل و توضیح کا وہ انداز اختیار کیا ہے جو ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو آئینہ کی طرح نمایاں کر دے۔ اس تذکرے میں کل نوّے ریختہ گویوں کا ذکر کیا گیا ہے[1] جس میں دو تہائی شاعروں کے تعارف ایک ڈیڑھ یا دو سطروں سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ میر سے اعتراض کے جواب میں بھی مولف نے اپنی غیر جانب داری اور وسعتِ معلومات کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ ان کے یہاں شاعروں کی مجموعی تعداد بھی میر کے تذکرے کے مقابلے میں کم رہی ہے اور ایسے کسی خوش گوار اور رنگین نگار شاعر کا اضافہ بھی نہیں جس کو نظر انداز کر دینے کی پاداش میں میر ...

---

[1] مقدمے کے ذیل میں مولوی عبدالحق صاحب کا یہ بیان کہ گردیزی نے اٹھانوے شعرا کا ذکر کیا ہے" درست نہیں موصوف نے ردیف با کے تحت قزلباش خاں امید کو بھی شامل تذکرہ شاعروں کی فہرست میں شمار کر لیا ہے۔ حالانکہ ان کا ذکر صلاح الدین پاکباز کے حال میں ضمناً آیا ہے اور ان کے نام سے منقول اشعار پاکباز ہی کی تصنیف ہیں جن میں پہلے شعر کے بارے میں امید نے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

بے اعتنائی اور کوتاہ قلمی کا الزام عاید کیا جا سکے۔[1] میر نے ایک سو چار (۱۰۴) شاعروں کے حالات اور اشعار قلم بند کئے ہیں جن میں سے تئیس (۲۳) شاعروں کے احوال اور اشعار سے زیر بحث تذکرہ خالی ہے۔[2] اور گردیزی کے یہاں ایسے پچیس (۲۵) شعرا کا ذکر ملتا ہے جنھیں میر نے اپنے تذکرے میں جگہ نہیں دی ہے...

آخری اعتراض میں بھی صرف برائے بیت ہے چونکہ گردیزی نے کہیں بھی ان صریح اغلاط کی وضاحت نہیں کی ہے جو شعرا کے حالات کے بیان میں بیشتر تذکرہ نگاروں سے سرزد ہوئے ہیں۔

اس پہلو سے قطع نظر تذکرہ گردیزی کی سرسری ورق گردانی ہی ہمیں یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس کا مولف تذکرہ نگاری کے اصول و آداب

---

[1] جن شعرا کے نام "نکات الشعراء" کی فہرست سے خارج ہیں ان میں عمدۃ الملک امیر خاں انجام اور خواجہ احسن الدین بیان قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں لیکن "چمنستان شعرا" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرے کے کسی دوسرے نسخے میں جس سے اس کے مولف شفیق اورنگ آبادی نے استفادہ کیا ہے بیان کا حال اور کلام موجود تھا... ایسی صورت میں دوسرے شعرا کے سلسلے میں بھی بالیقین یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ میر فی الواقع ان سے صرف نظر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چونکہ گذشتہ اوراق میں تذکرہ میر کے موجودہ نسخے کے اس نقص پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ اس لئے یہاں مزید توضیح و تشریح غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

[2] غیر حاضر شعرا کی اس فہرست میں قزلباش خاں امید، مرزا عبدالقادر بیدل، جعفر زٹلی، امیر خسرو، بندرابن راقم، مرزا محمد فطرت اور آنند رام مخلص جیسے لوگ شامل ہیں جن کی ادبی یا کم سے کم تاریخی حیثیت مسلم ہے۔

کی پابندی اور اس کے تقاضوں کی تکمیل میں بکھیرنا کام رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور نمایاں کوتاہی یہ ہے کہ اس نے انتخاب کلام پر حد سے زیادہ زور دیا ہے۔ یہاں تک کہ مولوی عبدالحق صاحب کے بقول اگر کسی معمولی سے معمولی اور غیر معروف شاعر کا کلام بھی دستیاب ہوگیا ہے تو اس سے دو تین صفحات رنگ دئے ہیں[1]۔ اس کے برخلاف صرف معدودے چند مشہور و ممتاز شاعروں کو خاص توجہ کا مستحق سمجھکر ان کے حالات میں چھ چھ سات سات سطریں لکھ دی گئی ہیں۔ ان میں بھی حقایق و واقعات کی سادہ و صاف ترجمانی کے بجائے قصیدہ سرائی کا انداز جھلکتا ہے۔ بطور ذیل میں چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جنھیں اس قسم کے بہترین نمونوں یا گردیزی کے شاہکاروں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو۔

نخلِ ہستیش از ریاض خاندانِ شیخ محمد غوث گوالیری قد کشیدہ و از ابتدائے بہارِ جوانی جا بہ شاہجہاں آباد چمن بنیاد گزیدہ۔ نامش در قلمرو سخن فرمان روا است و بہ بانگ بلند اناوِ لاغیری صدا دیوانِ ضخیم با قصائدِ غرا جمع نمودہ و تمام دیوانِ فغانی و سلیم را جواب گفتہ۔ و در جواب "محمود و ایاز" زلالی مثنوی (مسمی) بہ شورِ عشق دارد و در ان تلاش ہائے بسیار کردہ دادِ معنی یابی دادہ بر اکثر اشعار معاصرین مثل افضل المتاخرین شیخ محمد علی حزین از ستم ظریفی دستہا بر گرفتہ ہائے ہزار در غیرہ ارہ دارد و تا الی یومنا

[1] تذکرہ ریختہ گویاں، مقدمہ مرتب ص ۱۴۱

دہلی غیر از صرفِ اوقات در تحصیل و افادۂ طلبۂ علم نصب العین او نیست گاہے بہ تفنن طبع ریختہ ہم می گوید و میان آبرو و میاں مضمون کہ بنائے ریختہ ایشاں ریختہ اند انتباطِ سخن با او دارند و زبان ریختہ از و گرفتہ اند" (ص - ۶ - ۷)

میر عبد الحئی تاباں۔

"نخل بندِ گلشنِ بیان میر عبد الحئی تاباںؔ، جوانے بود خوبصورت و خوش سیرت شمعِ محفلِ جانہا و چراغِ بزمِ دلہا۔ در خاکِ پاک ہندوستان گلِ حیاتش برومند شدہ و زہمیں گل زمیں بہ نشو و نما رسیدہ در عینِ عنفوانِ جوانی خاک مال فلک خوردہ بساطِ حیاتِ مستعار چیدہ داعیِ اجل را اجابت کرد۔" (ص - ۳۱)

مرزا محمد رفیع سودا۔

"نکتہ دان بے ہمتا مرزا محمد رفیع سوداؔ، مرد لیست سپاہی پیشہ و درست اندیشہ حقا کہ مرتبۂ شعرش عالی است و سخن در وہندام اش حالی امروز در میانِ گفتگوئے سبقت از اقران و امثال خود ربایدہ داد معنی یابی و رنگین خیالی می دہد" (ص ۶۷)

ولی، دکنی۔

"مظہر کمالاتِ خفی و جلی محمد ولی در دکن چہرۂ ہستی افروختہ، از بدو شعور دولتِ معنی اندوختہ کمانِ پرزور سخن را بہ تیر کو سے

نکہت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بہدفِ معنی رسیدہ، ہرچند اشعار آبدارش زیبِ صفحۂ لیل و نہار است، گوشوارۂ سوامع سخن سرایانِ روزگار، لیکن بنا برالتزام بتحریر بیتے چند بایجاز و اختصار پرداخت۔" (ص ۱۴۲)

یہ مثالیں اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ گردیزی حالات نویسی کے فرائض اور سیرت نگاری کے فن سے ناآشنا ہیں۔ انھوں نے جب بھی کسی شاعر کے ذکر کو طول دینا چاہا ہے، عبارت آرائی اور الفاظ کی طلسم بندی کا یہی انداز اختیار کیا ہے البتہ مرزا مظہر جانجاں کا تعارف اس روشِ عام سے مستثنیٰ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مرزا صاحب موصوف سے گردیزی کو خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ ان کا ذکر آتے ہی ان کے ذہن کی رفتارِ عمل نسبتاً تیز تر ہو جاتی ہے۔ اور جنبشِ قلم میں کسی قدر روانی اور سنجیدگی و متانت کا احساس ہونے لگتا ہے درج ذیل اقتباس جو اس تذکرے کا طویل ترین تعارفی نوٹ ہے، اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

"دادا نہم معنی پروری مرزا جان جاناں مظہر اصلش از مملوۂ بخارا و مولد و منشائش اکبر آباد است۔ بہ شرافتِ نسب و نبالتِ حسب موصوف است و بمکارم اخلاقِ شریف معروف حقا کہ ذاتش مظہرِ تجلیاتِ الٰہی است و منظر انوار فیوضاتِ غیر متناہی از بدو حیاتِ الٰہی یومنا ہذا کہ عمر شریفش بہ پنجاہ رسیدہ یقین است، از بلند مشتی بتوکل و انزوا بسر بودہ و انوالا ہمتی! سر استغنا بہ بادشاہ و وزیر فرو نساختہ، متمکن مسندِ فراغت و متربع نشین چار بالشِ عزلت است۔ از انجا کہ از علم و نقد

وحدیث حظے وافر دارد و از کتب سیر و تواریخ بہرۂ تمام۔ سرش از بلند ہمتی بشعر و شاعری فرو نمی آید و ایں شغلہ ہا را سرمایۂ افتخار نمی انگارد۔ چنانچہ اکثرے از اشعارش از راہ بے پروائی از صفحۂ خاطر محو و منسی شدند و برخے از عدم التفات و توجہ بایں فن مہجور و ابتر گشتند لیکن چوں عشق سخن سرشتۂ آب و گلش ہست و مہر معنی جاگزین دلش از فرط استیلائے عشق معنی ہرگاہ از صحبت صوفیان خانقاہ مستفیدانِ خدا خواہ فرصتش دست بہم می دہد متوجہ ایں شغل بے حاصل می گردد۔ و میرزا مظہر فارسِ میدان و والیِ مملکتِ بیان است و شعر فارسیش بغایت لطافت و نظم ریختہ اش بنہایت عذوبت۔" (ص ۱۳۱ - ۱۳۲)

تذکرے کے صفحات پر اس استغنا کی دو ایک مثالیں اور بھی مل جاتی ہیں۔ یہاں بہ نظر اختصار، صرف عمدۃ الملک امیر خاں انجام کا حال نقل کیا جاتا ہے جس سے ان کی نوعیت کا اندازہ ہو گا۔

"نواب امیر خاں عمدۃ الملک انجام غفرہ الملک العلام شاگرد میرزا بیدل مرحوم۔ در فارسی و ریختہ گوئی و ہندی و علم موسیقی و لطیفہ و بدیہہ سرائی و حاضر جوابی و ہمہ کمالات بے بدل بودہ۔ شش سال پیش ازیں برحمت حق رسید۔" (ص ۳۰)

ان مثالوں کے بعد اب ہم گردیزی کی حالات نویسی کے کچھ ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو گا کہ دوسروں پر مختصر بیانی اور تحقیق سے بے نیازی کا الزام عاید کرنے والا یہی تذکرہ نگار خود کس طرح انہیں کوتاہیوں کا مرتکب ہوا ہے۔ بطور مثال قائم چاند پوری جو اپنے

دور کے نادر الکلام اور خوش گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں، اس کے نزدیک اس ایک جملے سے زیادہ تعارف و تعریف کے مستحق نہیں۔

"محمد قائم - قائم تخلص - شورش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ"۔ (ص ۱۲۳)

اسی قبیل کی کچھ اور مثالیں یہ ہیں:

بیدار - "برحالش آگہی دست نداد" (ص ۲۰)

بسمل - "نمی دانم کہ بسمل کیست" (ص ۲۵)

داؤد - "از تربیت یافتگانِ عزلت است" (ص ۶۰)

صافی - "زاد گاہش گل زمین بلگرام است" (ص ۱۰۱)

میر ضیا - "نشو و نمایش از خاک پاک ہند و شائع است"۔ (ص ۱۰۲)

ندا - "نمی دانم کیست و کجا عینیت" (ص ۲۲)

محمد محسن کلیم "سخنش دل پذیر است و حرفش بدل جاگیر"۔ (ص ۱۲۷)

میر گھاسی - "بر احوالش اطلاع نیست" (ص ۱۳۰)

سوانح نگاری کے مطالبات سے بے خبری کے پہلو بہ پہلو گردیزی کے یہاں تنقیدی شعور کے تجزیاتی عمل کا بھی فقدان نظر آتا ہے پورے تذکرے میں انھوں نے صرف بیس بائیس شاعروں کے کلام کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور وہ بھی نہایت سرسری اور عاجلانہ انداز میں مثلاً :-

احسن اللہ احسن۔ "بہ آبرو ہم طرح بود و در سخن تلاش معنی تازہ نمود شعرا بطرز ایہام می گفت" (ص ۱۰)

محتشم علی خاں حشمت۔ "دیوانش نظر فقیر گزشتہ، چشمے آب دادہ حقا کہ دوران تلاش معنیٔ تازہ کردہ و الفاظ رنگین بہ رنگ بجائے کار آوردہ۔" (ص ۴۹)

سعادت امروہوی۔ "در سخن تلاش معنیٔ تازہ می نمود" (ص ۸۵)

مصطفےٰ خاں یکرنگ۔ "با آبرو یک طرح بودہ تلاشِ معنیٔ تازہ نمودہ رتبۂ سخنش بلند است و پایہ شعرش ارجمند" (ص ۱۶۴)

حسن علی شوق۔ "مضامین را آب و رنگ بستہ و تلاش معنی تازہ کردہ است۔" (ص ۹۹)

عنبر خاں عنبر۔ "در سخن تلاش معنیٔ تازہ می نمود" (ص ۱۱۶)

محمد مزمل، مزمل۔ "معاصرین میاں آبرو بودہ، در سخن تلاش معنیٔ تازہ می نمود۔" (ص ۱۱۶)

میر تقی میر۔ "فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ حقا کہ دوران تلاش معنیٔ بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بجائے کار آوردہ" (ص ۱۴۸)

گویا گردیزی کی نظر میں کمالِ شاعری کی معراج صرف "معنیٔ تازہ" کی تلاش ہے۔ اور اگر کسی شاعر نے "معانی تازہ" کے ساتھ الفاظِ رنگین کا التزام بھی رکھا ہے تو اسے پیغمبریٔ سخن کا مستحق سمجھنا چاہیئے۔ بہ الفاظِ دگر ان کی ناقدانہ بصیرت کا دائرۂ عمل "تلاشِ معانیٔ تازہ" کی تحسین و تعریف تک محدود ہے ایک ہی خیال کی اس پے بہ پے تکرار کے علاوہ جملوں کی ساخت کا یکساں انداز اور ایک ہی قسم کے الفاظ و تراکیب کا اعادہ

بھی ان کی لسانی کم مائگی اور عجز بیان کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہی چند جملے نہیں بلکہ اس نوع کی بے شمار مثالیں تذکرے کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں، جو بیک نظر اس نقصِ تحریر کا احساس دلانا شروع کر دیتی ہیں۔ کچھ اقتباس ملاحظہ ہوں :-

۱۔ الف۔ زین العابدین آشنا۔ "طبع سلیم و ذہنِ مستقیم دارد" (ص ۱۹)

ب۔ دلاور خاں بیرنگ۔ "طبع سلیم و ذہنِ مستقیم می داشت" (ص ۱۱)

ج۔ عاصی برہان پوری۔ "طبع سلیم و ذہنِ مستقیم دارد" (ص ۱۱۷)

۲۔ الف۔ شرف الدین علی خاں پیام۔ "زاد گاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد" (ص ۲۶)

ب۔ خواجہ احسن اللہ خاں بیان۔ "زاد گاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد" (ص ۱۷)

ج۔ میر تقی میر۔ "زاد گاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد" (ص ۱۳۷)

۳۔ الف۔ قائم چاند پوری۔ "شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ" (ص ۱۲۳)

ب۔ محمد میر کبیر میر ستہ (؟)۔ "شعرش پسندیدہ است و سخنش سنجیدہ" (ص ۱۴۸)

۴۔ الف۔ محمد صلاح آگاہ۔ "شعرش دل پذیر است و فکرش بدل

جاگیر" (ص ۲۱)

ب- محمد حسین کلیم- "سخنش دل پذیر است و خوش بدل جاگیر" (ص ۱۲۷)

۵- الف- محمد اسمٰعیل بیتاب- "پایۂ سخنش بلند است و حرفش دلپسند است" (ص ۲۵)

ب- سجاد اکبر آبادی- "در سخن پایۂ رتبہ اش بلند است و در پایہ اش ارجمند" (ص ۳۲)

ج- محتشم علی خاں حشمت- "سخنش دلپسند است و فکرش بلند" (ص ۴۸)

د- میر یحییٰ، عاشق- "فکرش بلند و سخنش ارجمند" (ص ۱۱)

ہ- فضلی دکنی- "طبع بلند و فکر ارجمند دارد" (ص ۱۲۲)

۶- (الف) صلاح الدین تمکین "معمورۂ شاہجہاں آباد بسر می برد و ریختہ را ہموار می گوید" (ص ۳۴)

ب- عارف علی خاں عاجز- "ریختہ را ہموار می گوید و در رنجستہ بنیاد می گذراند" (ص ۱۱۹)

ج- سید خلیل تمادری- "ریختہ را ہموار می گوید و در دکن بسر می برد" (ص ۱۲۷)

اعادۂ مضامین و تکرار الفاظ کے علاوہ گردیزی کا یک اندازۂ بیان کا عیب یہ بھی ہے کہ وہ اکثر تجزیۂ کلام کے دشوار گذار مرحلے سے راہ فرار اختیار کرکے محض شاعر کے نام یا تخلص کی رعایت سے خصوصیات شاعرانہ کا تعین کر دیتے ہیں مثلاً:

(الف) کرم اللہ خاں دردؔ۔ "سخنش خالی از چاشنی درد نیست"
(ص ۶۰)

(ب) عارف شاگرد مضمونؔ۔ "معرفت سخن از شعر عارفانہ اش پیدا است" (ص ۱۰۵)

(ج) محمد زماں غریبؔ۔ "شعرش خالی از غرابت معنی نیست"
(ص ۱۲۱)

(د) قدرت اللہ قدرتؔ۔ "بر سخن قدرت دارد" (ص ۱۲۶)

اس تفصیلی جائزے کی روشنی میں "گلشن راز" کے متعلق اس کے سوا کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ بحیثیت مجموعی یہ ایک اوسط درجے کا تذکرہ ہے۔ جس کا خارجی وجود دوسروں کی خوشہ چینی و نقالی اور سطحی آرائش و زیبائش پر منحصر ہے۔ اسی لئے ہم مشہور مستشرق اور کتب خانہ شاہان اودھ کے فہرست نگار اشپرنگر کے اس قول سے کہ "اس کو ممکنات الشعرا کا بہترین ایڈیشن سمجھنا چاہئیے۔[1] اتفاق نہیں کر سکتے۔

[1] بحوالہ "یادگار شعرا" (ص ۶)

ریاض حسنی

ریاض حسنی شعرائے اردو کے ان تذکروں میں ہے جو ابھی تک طباعت سے محروم ہیں اور اپنی قدامت اور مخطوطات کی کمیابی کے لحاظ سے ادبی دنیا میں نوادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ سینٹرل رکارڈ آفس حیدرآباد دکن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ بظاہر اس کے علاوہ اس کی کوئی اور نقل ہند یا بیرون ہند کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ تذکرے کے مولف خواجہ عنایت اللہ فتوت اورنگ آباد کے متوطن اور سرکار آصفیہ کے منصب دار تھے۔ تذکرہ مخطوطے کی کتابت ان کے ایک "رفیق انیق" خواجہ محمد اکرم[1] نے کی ہے۔ لیکن یہ املا کی لاتعداد غلطیوں اور تحریر کے بے شمار نقائص سے مملو ہے۔

رکارڈ آفس کی فہرست مخطوطات میں جناب نصیر الدین ہاشمی نے ریاض حسنی کے اس نسخے کو "بجز ایک ابتدائی ورق کے مکمل" بتلایا ہے[2]۔ لیکن یہ اطلاع درست نہیں کیوں کہ اول تو کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس کی بنا پر شروع کے گم شدہ اوراق کی صحیح تعداد کا تعین کیا جا سکے۔ پھر موجودہ صفحہ نمبر ۲۰۴ کے بعد سے کم از کم ایک ورق جس پر فہرست کے مطابق چار شاعروں کے حالات و اشعار درج تھے، یقینی طور پر غائب ہے۔ اس کے

---

[1] یہ غالباً وہی خواجہ محمد اکرم ہیں جنھوں نے قیام چاند پوری کے تذکرے کی تاریخ مخزنِ نکات سے نکالی ہے

[2] فہرست کتب خانہ رکارڈ آفس (قلمی) جلد اول۔ ص ۳۵۲

علاوہ شروع کے بعض متقابل صفحات میں ایک صفحے کی آخری اور دوسرے کی ابتدائی عبارات کی بے ربطی جو یقیناً غلط شیرازہ بندی کا نتیجہ نہیں، اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس حصے سے کچھ اوراق بھی ضائع ہو چکے ہیں۔ بہرحال بصورتِ موجودہ یہ نسخہ ستائیس صفحات کے ایک دیباچے اور ایک سو چھیاسی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہے۔

دیباچے میں جو اہم اور قابلِ ذکر امور زیرِ بحث آئے ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے کہ عمر کی ایک ایسی منزل میں جب کہ "انتشارِ حواس" اور "ابتدائے ناتوانی" کے باعث زندگی کی تمام رنگینیاں گریز پائی پر مائل تھیں اور "وحشتِ مزاج" کسی طرح "شکیبائی" سے آشنا نہ ہوتی تھی خواجہ محمد اکرم نے سید عبدالولی عزلت کے کتب خانے سے جو انکے زیرِ انتظام تھا، شعرائے متقدمین و متاخرین کے دواوین اور بعض دوسری کتابیں مہیا کر کے مؤلف کے لیے "دلبستگی" اور تفریحِ طبع کا سامان فراہم کیا۔ ان کتابوں میں سراج الدین علی خاں (آرزو) دہلوی کا تذکرہ "مجمع النفائس" بھی تھا جس کے مطالعے کے بعد ان کے دل میں "ایجادِ تذکرۂ ہندی" کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اپنی دسترس کے حدود میں رہتے ہوئے انھوں نے مختلف اردو شاعروں کے حالات اور اشعار جمع کیے اور انھیں ایک تذکرے کے طور پر کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ مختصراً یہی اس تذکرے کی شانِ نزول ہے۔

تذکرے کی تاریخِ ترتیب خود مؤلف نے درجِ ذیل رباعی میں نظم کی ہے ؎

تاریخ بنائے این ریاضِ حسنی جستیم ز فیضِ خاصِ آلِ مدنی

ازروئے سرِ بیدلی ہاتف بگفت اکرام گلدستۂ ریحانِ بہارِ معنی

پیشِ نظر نسخے میں اس رباعی کے آخری مصرعے کے نیچے ۱۱۷۵ھ مرقوم ہے لیکن دراصل اس سے ۱۱۶۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس اختلاف کو یکسر نظر انداز کر کے سر بیدلی یعنی ب کے دو اعداد کے اضافے کے ساتھ سالِ ترتیب ۱۱۶۸ متعین کیا ہے[۲] لیکن ہاشمی صاحب کے اس موقف کو قبول کرنے میں کئی قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ بصورتِ موجودہ مصرعِ ثالث ناموزوں ہے اور اس میں "بیدلی" سے پہلے واو عاطفہ کی موجودگی اور اس سے قبل بغیر کسی فعل کے "روئے" اور "سر" کے اجتماع کی بنا پر تعمیہ کی صورت پوری طرح واضح نہیں۔ دوسرے یہ کہ تذکرے کے آخر میں مولف نے اعداد کی کمی یا بیشی کا ذکر کیے بغیر صرف مصرعِ چہارم کو تاریخ تالیف کا حامل قرار دیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

"چوں دو دو خرد انکار خواطر دریا مقاطر نیساں طبعاں و گل ہائے ہمیشہ بہار رنگین خیالاں دریں (تذکرہ) مجتمع بودند، سالِ تاریخ و نامش گلدستۂ بہارِ معنی است۔" (ص ۲۲)

اس صورت میں بظاہر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مصرعِ ثالث کو محرف اور ناقابلِ فہم ہونے کی بنا پر خارج از بحث قرار دے کر ۱۱۶۶ھ کو سالِ تالیف تسلیم کر لیا جائے لیکن اس طرح تحقیق کے تقاضے پورے

---

[۱] ممکن ہے کہ اس نسخے کی کتابت ۱۱۷۵ھ میں ہوئی اور کاتب نے ازراہِ سہل انگاری سنہ دستہ تالیف کی بجائے سالِ رواں (سنہ کتابت) لکھ دیا ہو۔

[۲] سہ ماہی ہندوستانی الہ آباد شمارہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء ص ۴۸۳؛ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی شمارہ ماہ اپریل ۱۹۵۶ء ص ۶۷

نہیں ہوتے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مولف کے دوسرے بیانات کی طرف رجوع کیا جائے۔ گزشتہ سطور میں دیباچے کے حوالے سے یہ بات ہمارے علم میں آچکی ہے کہ قوت نے اس تذکرے کی ترتیب سے قبل سید عبدالولی عزلت کے کتب خانے سے استفادہ کیا تھا۔ آگے چل کر ردیف العین کے تحت ان کے حالات میں انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"از چندے در نجف بنیاد حیدر آباد منبسط بساطِ اوقات فرحت آیات است۔" (ص ۱۵۵)

عزلت کے کتب خانے اور ان کی ذات سے متعلق قوت کے ان بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تذکرہ حیدر آباد میں اس زمانے میں لکھا ہے جب کہ عزلت کو وہاں رہتے ہوئے کچھ مدت گزر چکی تھی۔ یہ بتانا محال ہے کہ وہ کس سنہ میں حیدر آباد میں وارد ہوئے لیکن بعض قرائن کی بنیاد پر اس زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ حیدر آباد پہنچنے سے قبل وہ مرشد آباد میں نواب علی وردی خاں مہابت جنگ (متوفی ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء) کی سرکار سے وابستہ تھے اور اس سے پہلے دو ڈھائی برس دہلی میں وہ چکے تھے۔ دہلی کے زمانۂ قیام میں علی قلی خاں والہ داغستانی نے اپنے تذکرے ریاض الشعراء کا ایک قلمی نسخہ انھیں بطور تحفہ پیش کیا تھا جو اب کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد کے ذخیرۂ مخطوطات میں شامل ہے۔ اس نسخے کی ابتدا میں عزلت نے اپنے قلم سے درج ذیل عبارت تحریر کی ہے :-

"تذکرۂ لے بدل کہ ریاض الشعرا نام دارد تصنیف علی قلی خاں

داغستانی والہ تخلص در شاہ جہاں آباد در ۱۱۶۱ھ از مصنف
تصنیفش تمام شد و ایں نسخہ خود نذر فقیر عزلت نمود و فقیر در
بنگالہ بود کہ در ۱۱۷۰ھ او برحمت خدا رسید!"

حیدرآباد میں ۱۱۷۰ھ کے بعد آنے والے برسوں میں ان کی موجودگی کا ثبوت جن ذرائع سے ملتا ہے، ان میں سب سے اہم گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں کے اس قلمی نسخے کا ترقیمہ ہے جس پر مولوی عبدالحق نے اپنے شائع کردہ متن کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ نسخہ سید عبدالغنی ابن سید محمود اصفہانی نے عزلت کے "حسب الفرمائش" غالباً انھیں کے کتب خانے کے لئے غرہ شعبان ۱۱۷۲ھ، ۲۹ مارچ ۱۷۵۹ء کو حیدرآباد میں مکمل کیا تھا۔ ظاہری اندازے کے مطابق عزلت اس سے کم از کم چار چھ ماہ قبل حیدرآباد پہنچ چکے ہوں گے۔ گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے جمادی الاول ۱۱۷۰ھ/ جنوری ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست اور شہادت کے بعد حالات کی ناساعدت کے باعث مرشد آباد کی سکونت ترک کی ہوگی۔ یہ بات بہرحال طے شدہ ہے کہ وہ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷ء سے قبل حیدرآباد نہیں پہنچے تھے۔ اس لئے ریاض حسنی اس سے پہلے کی تالیف نہیں ہو سکتا۔

آئندہ سطور میں پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہوگا کہ عزلت کے اس تذکرے کا ایک بڑا حصہ تذکرہ گردیزی سے ماخوذ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دوسری کتابوں کی طرح یہ تذکرہ بھی انھیں عزلت کے کتب خانے ہی سے حاصل ہوا ہوگا۔ بہ گمان غالب یہ ۱۱۷۲ھ، ۱۷۵۹ء کا لکھا ہوا وہی قلمی نسخہ ہوگا جس پر مطبوعہ نسخے کا متن مبنی ہے۔ اس قیاس کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ریاض حسنی شعبان ۱۱۷۲ھ، اپریل ۱۷۵۹ء کے بعد

مرتب ہوا ہے۔

متذکرہ قیاسی تاریخ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مولف کی نظم کی ہوئی رباعی کے مصرعِ ثالث کی تصحیح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس کے تیسرے لفظ کو "سر" کی بجائے "ہنر" پڑھا جائے[1]۔ اس صورت میں الفاظ ما قبل تعمیہ کی علامت قرار پائیں گے اور ان کی بنا پر "ہنر" اور "بذل" کے پہلے حروف یعنی "ہ" اور "ب" کے ساتھ عدد مصرعِ ثالث کے اعداد میں شامل کر لے کے بعد ۱۱۷۳ھ حاصل ہوگا۔ چونکہ دوسرے تمام شواہد سے اس سنہ کی تائید ہوتی ہے، اس لئے ہمارے نزدیک یہی ریاضِ حسنی کا سالِ تالیف ہے۔

دیباچے کے حوالے سے فتوت کا یہ بیان کہ انھیں سراج الدین علی خاں (آرزو) کے فارسی تذکرے (مجمع النفائس) سے ایجادِ تذکرۂ ہندی کی ترغیب ملی، ابتدائی سطور میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ممکن ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہو لیکن ریاضِ حسنی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مجمع النفائس سے کہیں زیادہ گردیزی کے تذکرۂ ریختہ گویاں کے اثرات قبول کئے ہیں۔ اگرچہ کلیم اللہ لسان کے متعلق اس ایک مجمل و مختصر جملے کے علاوہ کہ "در رفاقت محمد الحسینی الگردیزی مصنف تذکرۂ شعراء ہند بسر اندوز گشتہ" نہ تو ان کا کوئی بیان اس تذکرے سے ان کی براہِ راست واقفیت کا پتہ دیتا ہے اور نہ کوئی دوسری تحریر اس کے مطالب سے استفادے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لیکن تقابل اور موازنے کی نظر سے دونوں تذکروں

---

[1] زیرِ بحث مصرع اس ترمیم کے بعد بھی ناموزوں رہتا ہے لیکن اگر "عاطفہ کہ" "ہنر" کے حرفِ آخر کے بجائے "بذل" کے حرفِ اول کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ سقم دور ہو جائے گا۔ قدیم شعرا کے یہاں اس قسم کی بے ضابطگی کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

کا سرسری ورق گزرا: ان کے ساتھ ہی یہ حقیقت منکشف ہونے لگتی ہے کہ یہ تذکرہ
ں کے پیش نظر رہا ہے اور انھوں نے اس کے مشتملات سے صرف استفادہ
ہی نہیں، سرقے کی حد تک خوشہ چینی کی ہے۔ درج ذیل مثالوں سے
اس کیفیت کا اندازہ ہوگا:

گردیزی	شوقؔ

میر محمد باقر حزیںؔ

گردیزی	شوقؔ
"صاحب تلاش معنی انگیں، میر محمد باقر حزیں ..... غنچۂ استعدادش از نسیم انفاس میرزا مظہر شگفتہ۔" (ص ۳۶)	"صاحب تلاش معنی انگیں، میر محمد باقر حزیں۔ چمن فکرش آب یہ دردِ میرزا مظہر است۔" (ص ۷۸)

خواجہ میر دردؔ

گردیزی	شوقؔ
"در معنی یابی فرد، خواجہ میر درد، از شعرائے ممتاز زمانہ است و در سخن گوئی یگانہ۔ بے اغراق طبع بلندش رسا است و فکر دل بندش والہ" ص ۵۳	"سخن دردانگیزش ہمہ قطعہ و فرد خواجہ میر درد۔ طوطیِ شکریں مقال شکرستانِ ہند است۔ حقا کہ در سخن گوئی یگانۂ آفاق و طبع بلند و فکرش رسا است۔" (ص ۹۸)

سیتارام عمدہؔ

گردیزی	شوقؔ
"سیتارام عمدہ تخلص، زادگاہش کشمیر است ... در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین می نماید و شعر را بشستگی و درستگی می گوید"	"عمدہ تخلص سیتارام ... وطن اصلش کشمیر۔ سخن را بطرز انعام اللہ یقین می گوید و تلاش بشستگی و درستگی دارد"

(ص ۱۰۷) (ص ۱۵۳)

میر تقی میر

"سخن سنج بے نظیر میر محمد تقی میر متخلص زادگاہش اکبر آباد است دطبعش معنی ایجاد۔ شمع استعدادش برکردہ شعلہ ادراک سراج الدین علی خاں آرزو است ..."

(ص ۱۳۰)

"والا فکر بے نظیر، میر محمد تقی میر زادگاہش اکبر آباد است و فکرش رنگینی ایجاد، مصباح طبعش برکردۂ تجلی کدۂ ادراک سراج الدین علی خاں آرزو است..."

(ص ۱۰۸ تا ۱۰۹)

مصطفیٰ خاں یکرنگ

"معنی یاب بے درنگ مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ باآبرو یک طرح بودہ در تلاشِ معنیٔ تازہ نمودہ"

(ص ۱۶۴)

"معنی یاب بے درنگ مصطفیٰ خاں یکرنگ، مسموع گردیدہ کہ با آبرو ہم طرح بود..."

(ص ۸۲)

یہ وہ مقامات ہیں جہاں قدرت نے گردیزی کے بیانات سے بعض جملے لفظاً بلفظ اور بعض کسی قدر ترمیم و تغیر کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلانا کوئی بری بات نہیں۔ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے اپنے پیش رو مصنفین کی معلومات سے استفادہ کیا ہے، البتہ اس طرح دوسروں کے رشحاتِ قلم پر دست درازی بلا شک و شبہ غیر مستحسن اور قابلِ گرفت ہے اس کے باوجود اس بنا پر کہ یہ تذکرہ ایک ایسے زمانے میں لکھا گیا ہے جب کہ حصولِ معلومات کے ذرائع اور دریافت و تحقیق کے امکانات محدود تھے، معنوی اشتراک کی یہ صورت بھی کسی حد تک گوارا کی جا سکتی ہے

لیکن نوتن نے بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ "تذکرۂ گردیزی" کے مشتملات پر شب خون مارا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مقامات کی بھی نشان دہی کر دی جائے جہاں دونوں تذکروں کے درمیان سے دوئی کے تقریباً تمام ہی حجاب اٹھ گئے ہیں اور نوتن کے لیے سرقے کے الزام سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ درج ذیل اقتباسات اسی ضمن میں آتے ہیں:

گردیزی	نوتن
(۱) "عمدۂ امرائے ذیشان، اسد الدولہ انسان، در عہدِ سعادت عہد حضرت فردوس آرام گاہ بمنصب ہفت ہزاری ذی جمیع سامانِ کمنت و حشمت کہ منتہائے متمنائے امارت است، رسیدہ محسودِ اقران و امثال گردیدہ۔ با وصفِ کثرتِ مشاغل دنیوی باقتضائے موزونیِ طبیعت شعر بزبانِ ریختہ می گفت و در معنی در نصیحت می سفت ..." (ص ۱۷)	"عمدۂ امرائے ذی شان، اسد الدولہ انسان، در عہدِ سعادت عہد حضرت فردوس آرام گاہ بمنصب ہفت ہزاری ذی جمیع سامان کمنت کہ منتہائے متمنائے امارت است رسیدہ محسودِ اقران و امثال گردیدہ۔ و با وصفِ کثرتِ مشاغل دنیوی[1] باقتضائے موزونیِ طبع شعر بزبانِ ریختہ می گفت و در معنی در نصیحت می سفت ..." (ص ۴۰-۴۱)
(۲) "ازا فہم معنی پرور، مرزا جانجاناں مظہر، اصلش از معمورۂ بنجالہ و مولد و منشأش اکبرآباد است ..."	"نکتہ رس معنی پرور، مرزا جانجاناں مظہر گوہر اصلش از دریائے بنجالہ و مولد و منشأش اکبرآباد است

---

[1] اصل نسخے میں کسی شخص نے زیر توسین عبارت کو قلم زد کر کے حاشیے پر "سرفرازی داشت" بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نوتن ہی کی تحریر ہو۔

حقا کہ ذاتش مظہر تجلیات الٰہی است
و مظہر انوار فیوضات غیر متناہی...
از انجا کہ از علم فقہ و حدیث خطے
وافر دارد و از کتب سیر و تواریخ
بہرۂ متکاثر۔ سرش از بلند ہمتی بشعر و
شاعری فرو نمی آید و این مشغلہ ہا را
سرمایۂ افتخار نمی انگارد... لیکن چوں
عشق سخن سرشتۂ آب و گلش ہست و
ہر معنی جاگزین دلش، از فرط استیلائے
عشق معنی ہرگاہ از صحبت صوفیان
خانقاہ و مستفیدان خدا خواہ فرصتش
دست بہم می دہد، متوجہ این شغل
بیحاصل می گردد... ...؟

(ص ۱۳۱ تا ۱۳۲)

(۳) "صاحب تلاش معنی رنگیں
انعام اللہ خاں یقین تخلص، پسر
اظہر الدین خاں بہادر مبارک جنگ
نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی
است و تلمیذ نواب حمید الدین خان
مرحوم۔ شہباز خیالش بصید معنی بلند
پرواز است و ہمائے اندیشہ اش

متانت ذکرش مظہر تجلیات الٰہی است
و مظہر فیوضات غیر متناہی می گویند کہ
(الف) بلند ہمتی بہ شعر و شاعری سر فرو
نمی آرد و این را سرمایۂ افتخار نمی
انگارد۔ (ب) اکثر اوقات گرامی خود را در
تکرار حدیث صرف می دارد و از سیر
(د) تواریخ سلف بہرۂ متکاثر حاصل
می نماید۔ از انجا کہ آب و گلش تخمیر
یافتہ سخن است، عنان اشہب فکر را
در ساحت فصاحت این فن می
گرداند۔ غرض امام الشعرائے عصر خود است
منصفان سینہ صاف افضل المتاخرین
می گویند و در ثنا و مدحش بسر و چشم می پویند۔

(ص ۱۸۳ تا ۱۸۴)

"صاحب تلاش معنی رنگیں
انعام اللہ خاں یقین، خلف الصدق
اظہر الدین خاں بہادر مبارک جنگ
نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی و
تلمیذ نواب حمید الدین مرحوم۔ شہباز
خیالش بصید معنی بلند پرواز است
و ہمائے اندیشہ اش بر قلہ قاف سخن

برتلاحاتِ سخن بہ پریشانی ممتاز و	بہ پریشانی ممتاز بے اغراق
بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند	ریختہ گوئی را بر طاق بلند
گزاشتہ و تخم معنی در زمینِ سخن	گزاشتہ و تخم معنی در زمین سخن
کاشتہ آنچہ از طبعش سر زدہ از	کاشتہ و آنچہ از طبعش سرزدہ از
فرطِ شیوع و حسنِ قبول در تمام ہندوستاں	فرطِ شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان
بر افواہ السنہ جاری است۔ استفادۂ	برافواہ و السنہ جاری است۔ استفادۂ
سخن از افادت گاہ میرزا جانِ جاناں	سخن از افادت گاہ مرزا جانِ جاناں
مظہر گرفتہ۔ چنانچہ می گوید۔	مظہر گرفتہ۔ چنانچہ می سراید۔
جیوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں	جیوں نماز اپنے پہ صبح و شام لازم کر یقیں
حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا"	حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا"
(ص ۱۴۶)	(ص ۲۱۱)

بغیر کسی حوالے کے اخذ و اقتباس کا یہ انداز ایک قسم کی علمی خیانت ہی نہیں، مولف کی کم سوادی اور عجز بیان کی دلیل بھی ہے۔ گردیزی نے اپنے تذکرے میں ستانوے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے میر محمدی بیدار اور محمد اسمٰعیل بیتاب کے علاوہ باقی تمام شعرا بعینہ اسی ترتیب اور اکثر اسی قدر انتخاب کلام کے ساتھ ریاض حسنی میں شامل ہیں۔ گویا اس تذکرے کا تقریباً نصف حصہ مستعار سرمائے پر مشتمل ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے بقیہ نصف حصے کے بارے میں بھی وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولف نے اس کی بنیاد ذاتی معلومات اور تلاش و تحقیق کے نتائج پر رکھی ہے۔ تاہم چونکہ اس کے خلاف کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں اس لئے ہم اسے اس جا پر تبیع اور قابل اعتنا قرار

نہیں دے سکتے کہ قدرت نے شعرا کے تعارف میں عام طور پر گردیزی ہی کی روش کا اتباع کیا ہے۔ ان کے یہاں بھی مختصر نویسی اور چند گنے چنے الفاظ کے اعادے کی وہی کیفیت حاوی و غالب نظر آتی ہے، جو تذکرہ "ریختہ گویاں" کے بیانات میں جاری و ساری ہے۔ البتہ دکن کے بعض مشاہیر سخن کے تراجم کسی حد تک اس روش عام سے مستثنیٰ ہیں۔ اگرچہ ان مواقع پر بھی قدرت نے سادہ و سلیس زبان میں واقعات کی پیش کش سے زیادہ زور قلم عبارت آرائی پر صرف کیا ہے، پھر بھی کہیں کہیں ان منتخب مرقعوں کے نقش و نگار میں زیر بحث شعرا کی شخصیتوں کے خط و خال کا عکس دیکھا جا سکتا ہے مثال کے طور پر درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(۱) مرزا رضا بیگ رضا:- "گل سر سبد گلشن ہمیشہ بہار رنگیں، سرو ممتاز جویبار چمن ایجاد تمکیں، پیرایش دہی (دہ) ریاض مضمون، آرایش کنہ دکن) الفاظ موطول (موزوں) حنائی ساز دست شاہد خیال، نزاکت فہم معنی بندان عدا المثال (عدیم المثال)، غازہ کش چہرہ عرائس رنگیں بیانی، سرمہ ریز دیدۂ بصران معانی، خوش خرام صفائے تکلم (کذا) مراۃ مجلائے انتظار ترحم (کذا) فروغ شمع صفا، زبادہ رحیق (رحیق وفا)، مرزا رضا بیگ رضا، چراغ حسین آباد خجستہ بنیاد است۔ طبعش از برکت (پرتو) روشنی حضرت شاہ سراج الدین مد ظلہ، ضیا پذیر و در خستگی بدر اشعارش جہاں گیر، کواکب الفاظ موطول (موزوں) عالی نگرش چوں سطور ابیات کہکشاں طالع و انوار جملہ صفات او از کلامش شائع زمین ریختہ را بایں طور شرقستان خورشید

سخنی می سازد ... (ص ۱۱۳ و ۱۱۴)

۲- سراج اورنگ آبادی۔

"سراج انجمن محفل قدسی اساساں، بدر منیر آسمان شب زندہ داراں، خلص سخنی سراج المنیر، ترجمہ ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر، خورشید مطلع حقیقت، اختر برج طریقت، مخزن سرایہ مصطفوی، معدن جواہر دُر منور مرتضوی نائب مناب مرتبہ مسیح اللہ۔ اسجنجل منور نتبارک اللہ، رہنمائے جادہ بیابان سفر معرفت، قائم مقام جانشینان صدر شریعت، خلاصہ صفات اہل تصوف، سلالۂ سلسلۂ با تصرف، خندہ (زن) بہ عیش اسم صفت، زندہ دل مسیحا سیرت، مشہور آفاق، یگانہ تلوب بے نفاق، فخر انصحان فصاحت بیاں، جان گلزار سخنان اعجاز توامان، داد گر اہل کمال، فریادرس خوش نوایان صاحب حال، فخر ہند و دکن، عزیز دل ہائے پُر فن، از قدوم میمنت لزومش دکن خجستہ بنیاد و از انفاس متبرکہ اش رنگیں سودائی حیدر آباد، برگزیدہ اہل بہشت، کامل رشید خاندان اہل چشت، والا رتبہ، عالی مزاج، حضرت شاہ میر سراج الدین حسینی، سراج، از سادات حسینی صحیح النسب الست۔ بہ جناب قدوۂ سالکان حضرت شاہ عبدالرحمٰن قدس سرہٗ دست بیعت دارند۔ بکمال توکل و استغنا بدریافت معنی من یتوکل علی اللہ فہو حسبہٗ اوقات ملکوتی صفات

---

۱ اس اقتباس میں ہم نے خاص طور پر الفاظ کو ان کی اصل مخطوطی شکل کے مطابق نقل کرکے قوسین میں صحیح صورت پیش کر دی ہے تاکہ قارئین زیر نظر خطی نسخے کے تحریری نقائص کا اندازہ کر سکیں لیکن دوسرے مقامات پر سہولت کی غرض سے اس قسم کی تمام تصحیحات متن میں شامل کر لی گئی ہیں۔

را در خجستہ بنیاد بہ یادِ حق می گزراند و در مبادیِ نشو و نما برنگِ گُل خرقۂ
درویشی در بر کردہ و بتباشیرِ صبحِ شعور بسانِ بلبلِ زمزمۂ سخن سنجی پیش گرفتہ
زمزمۂ سخن گوئی از شانِ صفاتِ او مرتبہ ادنیٰ است و اعجازِ معجزات
از کلامِ عیسیٰ سامِ او ہویدا۔ صاحب کمالانِ مصنفِ ہند و دکن
افضل المتاخرین می گویند و در میدانِ وصفش بسر و چشم می پویند"

(ص ۱۳۰ و ۱۳۱)

۲۔ سید عبدالولی عزلت۔

" اعلیٰ پایہ گاہ، بلند فطرت، والا رتبہ، رفیع الدرجت، برگزیدۂ
فضلاء العلما، پیشوائے فقراء الاتقیا، سخن را برسائی فکرش معراج
طبعِ صفا، منزلِ او بحرِ مواج، دلش (از) آبادیِ علمِ لدنی معمور،
چشمش از شاہدۂ جمالِ ان اللہ جمیل پر نور، عالمِ علومِ وہبی، کاسبِ
فنونِ کسبی، عارفِ معارفِ مکنوناتِ عرفان، واقفِ کلیاتِ اسرارِ شہود
امکان، معزز مرتبت شاہ عبدالولی المتخلص بہ عزلت، خلفِ الصدق
حضرت سید سعد اللہ است۔ سلسلۂ نسبش بہ حضرت پیر اشرف ....
می رسد۔ مسکن و ماواش بندر مبارک سورت دارد۔ در ترکیب و
تعلیم جمیع علم و فن کوشیدہ ملبس خلعتِ تہذیبِ اخلاق، خلقِ کریمِ حقیقی
پوشیدہ۔ ذات منبع البرکات او از جملہ فخرِ موجودات، از چندے در
فرخندہ بنیاد حیدرآباد منبسط بساطِ اوقاتِ فرحت آیات است۔"

(ص ۱۵۴ و ۱۵۵)

ان اقتباسات کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نوٹ
جہاں تفصیل کی طرف راغب ہوتے ہیں وہاں ان کی توجہات حالاتِ زندگی کے

..... اس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ان خاکوں میں زیر بحث شعراء کی شخصیات کا ایک پہلو غیر معمولی طور پر نمایاں ہو گیا ہے تو بعض گوشے پوری طرح اُبھر کر سامنے نہیں آسکے ہیں اور بعض یکسر تاریک رہ گئے ہیں۔ ریاض حسنی کے تقریباً وہ تمام ہی طویل تعارفی خاکے جنھیں مؤلف کی ذاتی کوشش و کاوش کا ماحصل کہنا چاہیئے اور جن کی مجموعی تعداد دس بارہ سے متجاوز نہیں، اسی لیے اعتدال کے آئینہ دار ہیں۔ حتیٰ کہ جن مقامات پر انھوں نے خاص خاص حالات و واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نسبتاً بہتر طور پر تعارف کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں بھی ان کا قلم اس کوتاہی کے ازالے سے قاصر رہا ہے۔ درج ذیل اقتباس ہماری اس رائے پر شاہد ہیں:

(۱) عارف الدین خاں عارف۔

"وطن بزرگانش بلخ است۔ مردے در ہندوستان کوس سخنوری می نواخت و در سبقت از ہمگنان عصر می باخت۔ آخر الاوقات بہ خجستہ بنیاد کہ وطن گزیدہ و در گ جاں از علائق دنیوی بریدہ، قمری آسا لباس خاکستری در بر کردہ و از قبولیت حضرت شاہ محمود خلیفہ حضرت بابا شاہ مسافر نقش بندی خجوری مخاطب بہ لقب شاہ ایچ کردہ اند...... در فن تاریخ گوئی بے نظیر و مغتنم عصر، عزیز صاحب کمالان دہر......" (ص ۱۹۰)

(۲) ولی دکنی

"زاد بومش دکن است و دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضائے گجراتی قدس سرہ دادہ۔ موجد ریختہ گوئی و بانی بنائے فصاحت زبان ہندی اوست۔ در فن ریختہ گوئی امام الشعراست، مردے در بلدۂ

گجرات عافیت صفات چہرۂ ہستی افروختہ - آخر الامر از سورۃ

(کذا) جہان بے بنیاد گذشتہ بملک تدیم تشافت" (ص ۲۰۸)

تاریخی و سوانحی عناصر کی طرح نتوت کے یہاں نقد شعر کا عنصر بھی تقریباً

مفقود ہے - پورے تذکرے میں خصوصیات کلام اور فنی امتیازات کے

بارے میں اظہار خیال کی بہ مشکل آٹھ دس مثالیں ملتی ہیں اور انکی نوعیت

بھی کچھ اس قسم کی ہے:

(الف) خان آرزو -

" نہال مضموں را بہ آب و تاب دازمین موزونیت بہ آئین

نہیں می نشاند" (ص ۳۳)

(ب) مرزا داؤد -

" خاک قالب الفاظ را بہ آتش معنی رنگیں تاب دادہ" (ص ۱۰۵)

(ج) عارف الدین خاں عارف -

" شعر فارسی و ہندی بلا تشبہ سخن غیر می گوید و جادۂ مستحکم نازک

خیالی می پوید" (ص ۱۶۰)

(د) نصرتی بیجاپوری -

" اکثر قصہ ہا و دیوان ہا بزبان ہندی مرتب ساختہ و دراں تلاش

ہائے بسیار کردہ و داد معنی یابی دادہ" (ص ۲۰۶)

مواد و موضوع سے متعلق متذکرہ بالا کوتاہیوں کے علاوہ نتوت کے یہاں

واقعات کی غلط تعبیر اور حقائق سے انحراف کی مثالیں بھی جا بجا موجود ہیں.

یہاں ان میں سے چند کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

(الف) نصرتی بیجاپوری کے حالات میں رقمطراز ہیں کہ:

"وقتے کہ شاہ اورنگ زیب عالم گیر غازی ...... ولایت دکن را در تسخیر در آورد، حکم بہ قاضی نبوخت کہ سخن سنجانِ ایں ملک را در نظر بگذرانند۔ بموجب حکم گذرانیدند۔ کلام نصرتی را بر ہمہ افضل فرمودہ بخطاب ملک الشعرائے ہند سرفرازی یافت۔" (ص ۲۰۶)

یہ روایت خلاف واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نصرتی کو ملک الشعراء کا خطاب اورنگ زیب نے نہیں، بیجاپور کے فرماں روا علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ – ۱۰۸۳ھ / ۱۶۵۶ء – ۱۶۷۳ء) نے عطا کیا تھا، اور وہ (نصرتی) ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء میں بیجاپور پر اورنگ زیب کے تسلط سے بارہ برس قبل ۱۰۸۵ھ / ۱۶۷۴ء میں شہید ہو چکے تھے[1]

(ب) گردیزی کے تذکرے سے استفادے کے باوجود ان کی روایت کے برخلاف شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کو شیخ مبارک اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں:

(ج) عارف الدین خاں عاجز کا ذکر ان کے اصل تخلص (عاجز) کی بجائے نام کے جزِ اول (عارف) کے تحت کیا ہے:

(د) خواجہ احسن الدین خاں بیاں کے حالات بہ تفصیل دو جگہ لکھے ہیں:

ا۔ "رگِ سخن را بابا و پیوند جان، خواجہ احسن اللہ بیاں جہاں آبادی شمع اوراکشی بر کردۂ تجلی کدہ مرزا مظہر۔" (ص ۶۲)

[1] تاریخ شہادت کسی نامعلوم شاعر نے اس طرح نظم کی ہے

ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ — جا کے جنت میں خوش ہوا ہے
سالِ تاریخ آملائک نے — یوں کہے نصرتی شہید ہوا ہے
۱۱۸۵ھ

[2] مزید تفصیلات کے لئے دیکھیے علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۳۰۱۔

۲- رگِ سخن را با او پیوند، محمد حسن بیاآں، از جہاں آباد است"
(ص ۲۶)

وہ مرزا رفیع سودا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ
"بلبلِ طبعش از آئینہ نمائی محمد میر میر گویا شدہ، چنانچہ می سراید
سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ سے (کذا) میر سے استاد کی طرف ...." (ص ۱۲۲)

نوبت کی علمی لیاقت اور ان کے تذکرے کے مندرجات کی نوعیت کیفیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ آخری بیان ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک ایسے سلیس و سادہ شعر کے مفہوم تک رسائی کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اس سے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام دینے اور بالخصوص تذکرہ نویسی کی کارگاہِ شیشہ گری سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مخزنِ نکات

سودا کے مایہ ناز شاگرد قائم چاندپوری (متوفی ۱۲۰۸ھ ۹۴-۱۷۹۳ء) جہاں اُردو کی بیشتر اصنافِ سخن پر قدرتِ کاملہ کی بدولت اکثر ناقدینِ شعر و ادب کے نزدیک اربابِ کمال کی صفِ اول میں شمولیت کے مستحق قرار پائے ہیں وہیں ان کے فکر و شعور کی پختگی اور اندازِ نظر کی انفرادیت شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں کی فہرست میں بھی انھیں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے "مخزنِ نکات" ۱۹۲۹ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو ہند اورنگ آباد دکن کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ ایڈیشن بشمول مولف ایک سو بیس[۱۲۰] شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے لیکن ایک قلمی نسخے میں جو انڈیا آفس لائبریری لندن کی ملکیت ہے اور غالباً مولف کی نظرِ ثانی کے بعد مرتب ہوا ہے[۱]۔ علیم دکنی، اعظم سندیلوی، علی نقی کافر، قمر الدین منت، مرزا علی حیرت اور محمد شاکر شاکر کے حالات کے اضافے کی بنا پر یہ تعداد ایک سو چھبیس[۱۲۶] تک پہونچ گئی ہے۔ علاوہ ازیں "طبقاتِ سخن" کے مولف غلام محی الدین مبتلا میرٹھی کے بیان کے مطابق قائم نے ان کے حالات اور کلام کو بھی اپنے تذکرے میں جگہ دی تھی[۲]۔ چونکہ یہ دونوں نسخے ان کے ذکر سے خالی ہیں

---

[۱] حال ہی میں یہ نسخہ قلمی ڈاکٹر اقتدا حسن کے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے شائع ہو گیا ہے۔ [۲] مولف در خدمت ایشاں قائم الحال المخاطب رابطۂ آشنائی داشت چنانچہ اکثر از اشعار بن و حیدان بقید احوالی در تذکرہ اش ثبت است "طبقاتِ سخن مخطوطہ جی، ایف کالج شاہجہاں پور۔ (ص ۳۰۰)

اس لئے یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ شعرا کی فہرست میں توسیع کا سلسلہ موخر الذکر نسخے کی ترتیب و تحریر کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قائمؔ کو مختلف شعرا کے کلام کی فراہمی میں پنجاب کے ایک غیر معروف شاعر اور میرزا سودا کے دوست رائے سنگھ عاقل کا تعاون بھی حاصل رہا تھا۔ چنانچہ ان کی پرخلوص مساعی کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

"شاید کہ اگر از اعانت ایں بزرگ نمی بود، ایں کار از ہم چوں من بیدماغ صورت نمی بست"۔

تذکرے کا نام خواجہ اکرمؔ کے درج ذیل قطعہ تاریخ سے ماخوذ ہے۔

قائم رکھے ہمیشہ خدا تیرے نام کو
کرنے سے ذکر خیر کے ہو موجب نجات
تاریخ اس کتاب کی جب میں نے کی تلاش
پیر خرد نے مجھ سے کہا مخزنِ نکات"

تاہم اس نام کی رو سے تذکرے کا سالِ ترتیب ۱۱۶۸ھ قرار پاتا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ اکرمؔ کے حالات کے تحت قائمؔ نے لکھا ہے کہ۔

"چوں بردشتنِ ایں بیاض ادراد تو فے حاصل شد یک قطعہ متضمن بر تاریخ .... معہ دیگر ابیات پیش نیقر آورد از آنجا کہ مادۂ تاریخ مناسب نام کتاب بود بنا ءً علیہ بہمان اسم موسوم نمود" (ص ۶۶-۶۷)

گویا جس وقت اکرمؔ نے یہ قطعہ ادر اپنے اشعار قائمؔ کی خدمت میں

پیش کیے تھے "مخزن نکات زیرِ ترتیب تھا۔ اس لئے نہ تو ہم ۱۱۶۸ھ کو اس کا سالِ آغاز ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ سنہ اتمام قرار دے سکتے ہیں۔ لہٰذا ابتدائے ترتیب اور اختتامِ کار کے سنین متعین کرنے کی غرض سے اس قطعے کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے قرائن و شواہد کا سہارا لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے دیباچے کی درج ذیل عبارت ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے لکھتے ہیں کہ:

"بر ضمیر نیر تنویر سخن طرازان ہندوستان مخفی و محتجب نماند کہ الی الآن در ذکرِ بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نہ گردیدہ و تا ایں زمان ہیچ انانے از ما جرائے شوق افزائے سخنوران ایں فن سطرے بتالیف نرسانیدہ بنا برایں فقیر مولف محمد قیام الدین قیام بعد کوشش تام و سعیِ تمام دواوین ایں اعزہ فراہم آوردہ پارہ ابیات از ہر کدام بر سبیلِ یادگار در ذیل ایں بیاض کہ بہ مخزن نکات موسوم است بقیدِ قلم آوردہ" (ص۔۱)

"مخزن نکات" سے قبل میر اور گردیزی کے تذکروں کی ترتیب و تکمیل سے باخبری کے باعث بادی النظر میں اس دعوے کو اولیت کا فخر حاصل کرنے کی ایک غلط کوشش پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن تحقیق کے تقاضے ہمیں اس سرسری فیصلے پر مطمئن ہو جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ گردیزی سے قائم کے تعلقات کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں البتہ میر سے اپنے مراسم کی نوعیت اور ہمسائیگی کے بارے میں انھوں نے خود ہی وضاحت کر دی ہے[1]۔

---

[1] "چوں قریب بندہ خانہ تشریف دارند اکثر اتفاق ملاقات می شود" (نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن)

ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ وہ "نکات الشعراء" کی تالیف سے بے خبر رہے ہوں یا بر بنائے مصلحت انھوں نے دانستہ اس کے وجود سے انکار کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میر سے بہت پہلے تذکرے کی ترتیب کا کام شروع کر چکے تھے۔ درج ذیل شہادتیں ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہیں:

(۱) شاہ ولی اللہ اشتیاق کے متعلق قائم نے لکھا ہے کہ:

"مدتِ ہفت سال شد کہ بدار البقا انتقال نمود" (ص ۸)

خیراتی لعل بے جگر لکھتے ہیں کہ:

"فی سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ .... بہ اشتیاق سیرِ فردوس رخت عزیمت بربست راقم آثم در سالِ وفاتش بہ تعمیہ یک عدد و دلِ چاک کہ مراد از الف باشد ایں قطعہ بہم رسانید

وہ چہ سازیم شاہ ولی اللہ دست بر زندگی خود افشاند
با دلِ چاک بے جگر تاریخ گفت صد حیف اشتیاق نماند[1]

سالِ وفات کی اس دریافت کے بعد منقولہ صدر اقتباس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ قائم نے اشتیاق کے حالات ان کے انتقال کے سات برس بعد ۷ ۱۱۵ھ، ۴۴-۱۷۴۳ء میں تحریر کیے ہیں۔ جناب عرشی رام پوری نے اسی بنیاد پر سنہ مذکور کو "مخزنِ نکات" کے آغاز کا زمانہ قرار دیا ہے[2]۔ اگرچہ ہمارے لیے احتیاط کے پیشِ نظر اس رائے سے حرف بہ حرف اتفاق ممکن نہیں تاہم اس حد تک محقق موصوف کی ہم خیالی تمام قیاسوں سے

---

[1] تذکرہ بے جگر" نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن۔ ورق ۹ - الف - ب

[2] دیباچہ دستور الفصاحت" ص - ۵۲)

مستغنی ہے کہ وہ ۱۱۸۸ھ؍۱۷۷۴ء میں قائم کی توجہات تذکرے کی ترتیب و تالیف پر مرکوز ہو چکی تھیں۔

(۲) محمد علی حشمت کے ذکر میں ان کی شہادت کا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"سابق بریں در سال برفاقت قطب الدین علی خاں ...... سمت چکلۂ مراد آباد رفتہ بود چوں در انجا با فوج علی محمد روہیلہ پائے جنگ بمیان آمد ہماں جا مع خانِ مذکور بجراحت تمام کشتہ شد" (ص - ۲۶ و ۲۷)

حشمت کے مشہور شاگرد میر عبدالحئی تاباں استاد کی اس دردناک موت پر رنج و غم کے شدید جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ایک طویل مرثیے کے آخر میں کہتے ہیں کہ:-

تیرا تاباں غریب خستہ جگر   فکر تاریخ میں تھا حد مضطر
مصرع آخری پہ کی جو نظر   کہ سے ہاتف نے اس کو دی یہ خبر
ہائے حشمت شہید زاد پیلا[1]

آخری مصرع کے اعداد میں مصرع چہارم کے پہلے لفظ "کہ" کے عدد شامل کرنے کے بعد ۱۱۶۱ھ برآمد ہوتا ہے "سیر المتاخرین" کے مصنف نے بھی متعلقہ معرکے کی تفصیلات اسی سنہ کے واقعات کے تحت درج کی ہیں۔ اس لئے بظاہر حشمت کے حالات ۱۱۶۳ھ؍۱۷۵۰ء میں شامل تذکرہ کئے گئے۔[2]

یہ دونوں شہادتیں اس صورت حال کو بخوبی واضح کر دیتی ہیں کہ قائم "نکات الشعرا"

---

[1] دیوان تاباں مرتبہ مولوی عبدالحق شائع کردہ انجمن ترقی اُردو مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۲۰۶

[2] بحوالہ مراۃ السلاطین ترجمہ سیر المتاخرین جلد سوم صفحات ۲۵،۲۲

کی تکمیل سے بہت پہلے تذکرہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے اور معاصر مصنفین پر سبقت و اولیت کے متعلق ان کا دعویٰ بے بنیاد یا مبالغہ آمیز نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اکرم کا قطعہ تاریخ دریائی ۶ عے کی تصنیف ہے کیونکہ تذکرے میں ایسے کچھ بیانات بھی موجود ہیں جن کا اندراج بالیقین ۱۱۶۰ھ کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً:-

(۱) میر صاحب کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ۔

"بخدمت خانِ مغفرت نشان شیخ سراج الدین علی خاں آرزو نسبت خواہر زادگی داشت بعد فوتِ والد بزرگوار بہ ہیں مناسب وارد شاہ جہاں آباد گردیدہ مدتے بخدمتِ ایشاں استفادہ آگاہی نمود[1]"

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی تحریر کے مطابق آرزو کا انتقال ۲۲، ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ (۲۶ جنوری ۱۷۵۶ع) کو ہوا ہے[2] اور یہ عبارت یقیناً ان کی وفات کے بعد معرض تحریر میں آئی ہے۔

(۲) محتشم علی خاں حشمت کے بارے میں خبر دیتے ہیں کہ

---

[1] یہ عبارت انڈیا آفس لائبریری کے نسخے سے نقل کی گئی ہے۔ اس نسخے میں میر کے حالات متداول نسخے سے بالکل مختلف ہیں لیکن آرزو کا ذکر دونوں ہی جگہ صیغۂ ماضی کے تحت کیا گیا ہے۔

[2] "خزانہ عامرہ" صفحہ ۱۱۹۔ فاضل مصنف نے اس سے قبل "سرو آزاد" میں جمادی الاخریٰ ۱۱۶۹ھ کو زمانۂ رحلت قرار دیا ہے لیکن دوسرے ذرائع سے اس روایت کی تائید نہیں ہوئی۔

"قبل ازیں ہفت سال برگ رفعتہ از جہاں رفت"[1] (ص ۲۰)

لچھمی نرائن شفیق[2] اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی[3]، خیراتی لعل بے جگر[4] نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ[5] اور مولوی عبد الجبار ملکاپوری[6] کے بیانات کے بموجب حشمت کا سال رحلت ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ء) ہے۔ اس لئے ان کا حالی یا کم سے کم یہ آخری جملہ ۱۱۷۰ھ / ۵۷-۱۷۵۶ء کے قریبی زمانے میں لکھا گیا ہے۔

(۳) میر قمر الدین منت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"نوجوانیست از نجیب زادہ ہائے بلدۂ سونی پت ...... از بدو شباب بقافیہ سنجی مشغول است و مشق سخن پیش فقیر مولف می نماید۔ حسن قیافہ اش دال است بر آن کہ بعد مشق رشدے کافی وحظے وافی از سخن دانی بہم خواہد رسانید"[7]

منت کے فرزند میر نظام الدین ممنون نے ایک قطعہ تاریخ میں "خورشید والا

---

[1] انیس گگر نے یہاں بھی وہی غلطی کی ہے جس کا حوالہ محمد علی حشمت کے حالات کے تحت دیا جا چکا ہے۔ وہ ۱۱۶۸ھ کو بنیاد بنا کر حشمت کا سالِ وفات ۱۱۶۱ھ متعین کرتے ہیں (بحوالہ یادگار شعرا۔ ص ۷۵)

[2] گل رعنا، مشمولہ "تین تذکرے" مرتبہ نثار احمد فاروقی ۲۲۶

[3] گل عجائب" مرتبہ مولوی عبد الحق۔ ص ۴۸

[4] "تذکرۂ بے جگر"، نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن ورق ۵۹ ب

[5] "گلشن بے خار" طبع اول۔ ص ۸۶

[6] "محبوب الزمن، تذکرہ شعرائے دکن" حصہ اول ص ۳۴۸

[7] منقول از نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن

کو ان کے سالِ ولادت کا متضمن قرار دیا ہے[1]۔ جس سے ۱۱۰۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر "بدو شباب" کو تیرہ، چودہ برس کی عمر تک محدود کرتے ہوئے اس تعارف کو اس کے قریبی زمانے کی تحریر تسلیم کر لیا جائے تب بھی ۱۱۲۰ھ تک کارِ ترتیب کے تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔

(۴) خواجہ میر دردؔ کے حال میں درجِ ذیل معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

"رسالہ در علم تصوف مسمّٰی بواردات ... تصنیف کرد کہ متعلق بدیوان است ... ...

... ... والدِ شریفش خواجہ محمد ناصر ... ... بہ نسبت مریدی و فرزندی دے افتخار ہا دارد" (ص ۲۹)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت قائم خواجہ میر دردؔ کے حالات قلم بند کر رہے تھے "واردات" کی تصنیف کا کام ختم ہو چکا تھا اور ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب بقیدِ حیات تھے۔ خواجہ صاحب موصوف کی وفات ۱۱۷۲ھ، ۱۷۵۹ء میں ہوئی ہے اور میر دردؔ نے "واردات" کا بیشتر حصہ ان کے انتقال سے کچھ دن قبل ہی لکھ لیا تھا۔ جیسا کہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بیشتر ازیں رسالہ یعنی اکثر واردِ حضورِ اقدس ... ... قبلہ گاہی در سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و دو ہجری تحریر یافتہ بود ... ... در ہمیں سال بتاریخ دوم ماہِ مبارکِ شعبان المعظم روز شنبہ بین العصر و المغرب رحلت آن جناب شدہ است[2]"

---

[1] دیوان مخزونہ مخطوطہ: آزاد سینٹرل لائبریری بھوپال۔ ورق ۲۰۴ ب

[2] "علم الکتاب" ص ۹۱ بحوالہ دیباچہ "دستور الفصاحت" ص ۵۴

اس طرح یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قائم نے خواجہ صاحب کا حال ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں تحریر کیا ہے۔

(۵) مرزا رفیع سودا کے حالات پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت وہ دہلی میں موجود تھے اور نہایت عزت و دولت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے لیکن مہربان خاں رند کے ذکر کے ذیل میں ان کی ادب نوازی اور اربابِ کمال کی قدر شناسی کے متعلق درجِ ذیل بیان ایک دوسری ہی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"دریں اثنا حضرتم مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ تعالیٰ برفاقت وزیر الممالک نواب غازی الدین خان بہادر در بلدۂ فرخ آباد رسیدند۔ خانِ موصوف (مہربان خان) از نواب وزیر درخواستہ مرزائے موصوف را برفاقتِ خود گرفت۔" (ص ۵۵)

حسین قلی خاں عاشقی اور خیراتی لعل بے جگر کی روایات کے بموجب سودا کا ترکِ وطن احمد شاہ ابدالی کی دوسری یورش۔ دوران ...... (۲۰ جمادی الثانی ۱۱۷۴ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء سے ۱۴ شعبان ۱۱۷۴ھ مطابق ۲۲ مارچ ۱۷۶۱ء تک) دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد کا واقعہ ہے[1]۔ غازی الدین خاں عماد الملک اس سے بہت پہلے ابدالی کے

---

[1] (الف) "بعد تخریب دہلی از آمدنِ مکرر احمد شاہ درانی وطنِ خود را خیرباد گفتہ بہ تماشا برآمدہ و در فرخ آباد و لکھنؤ مدتے گزرانیدہ" (نشترِ عشق مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، ورق ۲۳۲ - الف)

(ب) "بعد تخریب مولد خود دہلی از آمدنِ مکرر احمد شاہ درانی وطنِ مالوف خود را خیرباد گفتہ متوجہ بسیاحتِ بلاد گشتہ" (تذکرۂ بے جگر نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۹۳ الف)

حملے کی اطلاع پاتے ہی ۸، ۹، ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ (مطابق ۲۹-۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء) کو یکے بعد دیگرے عالمگیر ثانی اور اس کے وزیر انتظام الدولہ خانخاناں کو قتل کر کے بھرت پور میں سورج مل جاٹ کے پاس جا چھپے تھے[۱]۔ گمان غالب یہ ہے کہ سودا نے بھی غریب الوطنی کے دن گزارنے کے لئے انھیں کے دامانِ کرم کے سائے میں پناہ لی ہوگی اور ۱۱۷۶ھ، ۱۷۶۲ء میں جب فرخ آباد پر شجاع الدولہ کی فوج کشی کے وقت وہ احمد خاں بنگش کی دعوت پر ان کی مدد کے لئے فرخ آباد پہنچے ہیں[۲]، تو یہ بھی ان کے شریک سفر رہے ہوں گے۔ اسی سال میں نواب مہربان خاں رند کی شادی کے موقع پر لکھے ہوئے ایک قطعۂ تاریخ سے بھی جو کلیات سودا میں موجود ہے[۳]، ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال اس طرح دو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قائم نے رند کا حال کم از کم ۱۱۷۶ کے اواخر یا ۱۱۷۷ھ کی ابتدا (۱۷۶۳ء) میں سپرد قلم کیا ہے اور دوسرے یہ کہ "مخزنِ نکات" دہلی میں سودا کے عروج و اعزاز کے عہد شباب سے فرخ آباد میں

---

[۱] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ ہندوستان" از مولوی ذکاء اللہ جلد نہم صفحات ۲۹۶ تا ۲۹۹ و "میر کی آپ بیتی" (ترجمہ ذکر میر) از نثار احمد فاروقی حاشیہ صفحات ۱۱۹، ۱۲۵، ۱۳۶

[۲] "تاریخ اودھ" از نجم الغنی جلد دوم صفحات ۶۵، ۷۱، ۷۲۔ فاضل مصنف نے شجاع الدولہ کی فوج کشی کو ۱۱۷۹ھ کا واقعہ قرار دیا ہے لیکن دوسرے واقعات اور سنہ عیسوی (۱۷۶۳ء) سے عدم مطابقت کی بنا پر یہ روایت سہو کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

[۳] "کلیات سودا" مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ (طبع ۱۲۸۹ھ) ص ۳۱۴۔ آخری مصرع "ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا" سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتا ہے۔

ان کے ورود دکن کے زمانے تک برابر اضافہ و ترمیم کے مراحل سے گزرتا رہا ہے۔

قائم نے مختلف ادوار کی ادبی و لسانی روایتوں کے فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تذکرے کو تین طبقات پر تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اول سعدی، امیر خسرو، ولی دکنی، مرزا عبد القادر بیدل، سراج اورنگ آبادی نیز انکے بیشتر و اور ہم عصر ریختہ گویوں سے متعلق ہے۔ ان میں سے ابتدائی دور کے بعض شاعروں کی تخلیقات ان کے نزدیک متاخرین کے قائم کردہ معیار فصاحت سے ساقط ہیں اور صرف تبرکات کی حیثیت رکھتی ہیں[1]۔ البتہ عبد اللہ قطب شاہ کے عہد (سال جلوس ۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۵ء) سے بہادر شاہ (متوفی ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۱ء) کے زمانے تک، جو شاعر گزرے ہیں، انھوں نے بھی اگرچہ دکنی روزمرہ کی تقلید میں بہ کثرت ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے ہمارے (شمالی ہند والوں کے) کان مانوس نہیں تاہم ان کا طرز کلام نہایت مربوط و معقول ہے[2]۔ طبقہ دوم "سخنوران متوسطین" یعنی خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، یک رنگ، مضمون، شاہ حاتم اور ان کے معاصرین کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس طبقے کے شعرا کے

[1] "سلیقۂ سخن سنجی آں وقت دور از فصاحتِ ریختہ گویان حال است لیکن بپاس طبیعت شناخان۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو سہ چار بیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تبرکاً و تیمناً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قلمی می گردد" (ذکر سعدی دکنی ص ۲)

[2] "از عہد عبد اللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانہ بہادر شاہ کسانی کہ شعرائے ریختہ اند، نسق کلام اینہا بسیار مربوط و معقول است ہر چند اکثر الفاظ غیر مانوس گوش ما مردم مستعمل ایشان است لیکن چوں موافق زبان دکن است درست است" (ص ۱۳۰)

انکار و خیالات پر بالعموم "تلاشِ لفظ تازہ" اور "ایہام" کی حکمرانی رہی ہے
تیسرا اور آخری طبقہ "اشعار و احوالِ سخن طرازان متاخرین" کے بیان
میں ہے اور اس میں مرزا مظہر، مرزا سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور
ان کے ہم عصر فن کار شامل ہیں۔ ان شعرا کی مشترک خصوصیاتِ شاعری
اور منزہ کات و مختارات کی تفصیل یہ ہے:

"طرز کلام اینها مانند بر دیه شعر فارسی است چنانچه جمیع
صنائع شعری که قرار دادۂ اساتذۂ اسلاف است، بکار می
برند و اکثرے از ترکیبات فرس که موافقِ محاورۂ اردوئے
معلی مانوس گوش می یابند، منجملہ جواز الابیان می دانند الا ترجمان
زبانِ مغل بر ریختہ کردن مقبوح است چو دریں صورت صحت زبان
یکے از ہر دو نمی ماند و اگر بعضے از اصطلاح کہ زبان زد مردم
فصحائے این دیار بود کردہ آید، چنداں مضائقہ ندارد۔ اما
اتباع و تقلید کسان طبقہ اولی کہ یک مصرع شان ریختہ و دیگر
فارسی است و در بعضے مقام ریختہ و فارسی بالفاظ غیر مانوس
مخلوط ہم ساختہ، مذموم محض می انگارند" (ص ۲۳)

قائم نے اردو شاعری کے نشوونما اور ارتقائی سفر کی کامیابی میں دکن
کے سلاطین و امرا کی سرپرستی اور شعرا کی ادبی خدمات کو کافی اہمیت دی
ہے۔ چنانچہ طبقہ اول کے ذیل میں سعدی، خسرو، ملا نوری اور محمد افضل
کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

"پیدا است کہ چوں ریختہ دران وقت از محل اعتبار ساقط بود
بنائے علیہ ہیچکس بر آں عمل وال اقدام نمی نمود الا دو چہار بیت کہ ازینہا

کہ بنام اساتذۂ معتبر مرقوم است اغلب کہ منشائے نظمش ہر لے ایش
بنا شد اما بعد ازیں بہ سمتِ بلادِ دکن در عہد عبد اللہ قطب شاہ کہ
باسخنوران بہ محبت و مواسا پیش می آمد ریختہ گفتن بزبانِ دکن
بسیار رواج گرفت" (ص۔ ۳)

مولوی عبد الحق صاحب اس بیان پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز
ہیں کہ:

"عبد اللہ قطب شاہ کے عہد سے (ریختہ کی) ابتدا قرار دینا
صحیح نہیں کیونکہ اس سے قبل سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قلی
قطب شاہ خود بڑے شاعر گذرے ہیں[1]"

لیکن یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ قائم کی تحریر سے یہ بات قطعاً ظاہر
نہیں ہوتی کہ وہ عبد اللہ قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶۷۲ء) کے
عہد سے قبل ریختہ کے وجود سے منکر یا نابلد ہیں۔ انھوں نے صرف اس
قدر کہا ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ کے دور میں اس زبان کی شاعری کو
کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے جن دکنی شعرا کا ذکر
کیا ہے وہ سلطانِ مذکور کے عہد اور زمانۂ مابعد ہی سے تعلق رکھتے ہیں
جس سے قبل کے شاعروں کو نظر انداز کر دینے کی اصل وجہ فراہمیٔ کلام کے
وسائل اور حصولِ معلومات کے ذرائع کا فقدان ہے، جس کا شکوہ کرتے
ہوئے انھوں نے آئندہ سطور میں لکھا ہے کہ

"اکثر مستعدان ایں فن کہ دراں وقتے بودند، مردم ایں دیار بر
اشعار و احوال یکے ازیں ہا اطلاع نیافتہ اند کہ معدودے

[1] مقدمہ "مخزن نکات" (ص ۱۱)

چند کہ در زمانہ سلطان ابوالحسن لوائے شہرت برافراختند و پارۂ
از ابیات ایں اعزہ بر اوراق بیاض ہائے سخن سنجانِ ہندوستان
قلمی نمودند بنابریں یک گونہ از اسم و رسم اینہا تعارفے با قیست
...... دارم رأیت حوصلہ فہم معنی آگاہان پوشیدہ نیست کہ
دماغ بے دماغانِ بے دماغان بکاوکاو مشقت بسیار نمی تابد۔ ہر آن چہ
معقول و سہل الحصول دید بقید قلم درکشید و ہمدرسے کہ با فوقِ
طاقتِ خودیافت، در تحقیق و تفحصِ آن نیفتاد و سفت و قتے
راکہ بدلش متصور نیست بہ اندیشہ طول و طویل برباد نداد" (ص)
بفرضِ محال اگر اس عذر کو نہ تسلیم کرتے ہوئے یہ مان لیا جائے
کہ قائم نے ابتدائی زمانے کے شعرا کے احوال و اشعار کی تحقیق و
تلاش سے دانستہ کنارہ کشی کی ہے تب بھی "مخزنِ نکات" کی ادبی و تاریخی
حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا کیونکہ تذکرہ نگاری کے اس ابتدائی دور میں
اپنے عہد کی علمی روایات اور تصنیفی شعور کے مطابق اس فن کے تقاضوں
کی تکمیل میں انھیں جس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اپنی قسم کی واحد
مثال ہے۔ بالخصوص شعرا کو ادوار یا طبقات میں تقسیم کر کے انھوں نے تاریخی
ترتیب کے التزام کی جو روایت قائم کی ہے اسے اردو میں ادبی تاریخ نگاری
کے اس طویل سلسلے کا سنگِ بنیاد کہنا چاہیے جس کا پہلا کامیاب نمونہ "آب حیات"
کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ "مخزنِ نکات" کی دوسری نمایاں اور قابلِ ذکر
خصوصیت اختصارِ الفاظ و وسعتِ معانی کا امتزاج اور طرزِ بیان کی متانت
اور سادگی ہے۔ مولف نے اساتذہ کے علاوہ اکثر شعرا کے تعارف میں اختصار
سے کام لیا ہے لیکن بیشتر مقامات پر مطالب کی جامعیت اس ظاہری نقص کا

کا ازالہ کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روش اس تشبیہات و استعارات سے معمور طویل مگر لا حاصل عبارت آرائی کے خلاف ردِ عمل کا نتیجہ ہے جسے اس زمانے کے اہلِ قلم اپنا طرۂ امتیاز سمجھے ہوئے تھے۔ بطورِ ذیل عبرا شعرائے دکن سے متعلق تذکرے کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے قائم کے طرزِ احوال نگاری اور اسلوبِ تحریر دونوں کا اندازہ ہو گا۔

محمد غوث غوثی۔ "در جمیع علوم و فنون مشار الیہ بود۔ ہمیشہ بدرس و تدریس اشتغال داشت گاہ بمقتضائے موزونیٔ طبیعت و مصرع ریختہ و فارسی نیز موزوں می کرد۔ در آخر عمر دردِ طلب دامن گیر حالِ او شد۔ از خویش و قوم بر آمدہ بزیارتِ حرمینِ شریفین زادہما اللہ تشریفاً مستعد گردید و ہما آنجا ودیعتِ حیات سپرد۔" (ص۔ ۵)

شجاع الدّین نوری۔ "ہر چند از ساداتِ بلدہ گجرات است اما تمام عمر بملاقہ روزگار در حیدر آباد بسر بردہ۔ آخر حال بر عہدۂ تعلیم پسر وزیر سلطان ابو الحسن پایۂ امتیاز یافت۔ چندے بمنصبِ عہدۂ قیام می نمود کہ ناتوان بینانِ روزگار بر بیل حسد بخشی وزیر را دم متہم ساختہ از خدمتِ مامورہ باز داشتند۔ چوں بو توت این حال رسید بیچارہ انفعال کشید۔ بے اطلاع ہمہ کس از حیدر آباد بر آمدہ در قصبہ پرچنڈہ رخت اقامت انداخت۔ در ہمان جا نگاہ بجوار ایزدی

پیوست"۔ (ص ۳۱)

شاہ قلی خاں شاہی

"متوطن بھاگ نگر بود۔ بہ درستی طبع و رسائی فکر داد سخن سرائی میدادند تے بتوسل نوکری بادشاہی در بلدۂ حیدر آباد می گزرانیده۔ آخر حال بمنصب ندیمی تانا شاہ معزز و مباہی گشته۔ اکثر حسب الایمائے بادشاہ مذکور شعر مرثیہ فکر می کرد۔ چنانچہ سابق برین پنجاہ سال ابیات مرثیہ اش در بلدہ ہندوستان دست بدست گردیده اند و بالفعل جز اندراس بگوشہ خمول کواغذ فرسودہ و آخزیدہ سوائے این مطلع اشعار غزل ازو بگوش مسموع نیست"۔ (ص ۶)

ولی۔ دکنی۔

"شاعریست مشہور۔ مولدش گجرات است۔ گویند کہ بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیائے مشاہیر است، افتخار داشت۔ در سنِ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بہ جہان آباد آمد۔ گاہ گاہ بزبانِ فارسی دو سہ بیت در وصفِ خط و خالش می گفت چوں در آنجا بسعادتِ ملازمتِ حضرت شاہ (سعد اللہ) گلشن قدس سرہٗ مستفید (گردید) بگفتن شعر بہ زبانِ ریختہ او فرمودند این مطلعِ لغز موزوں کردہ حوالہ او نمودند

خوبیِ اعجاز حسن یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

بالجملہ ہمین تقولِ زبانِ ایشان سخن این بابا چنان حسنِ قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش سارۂ روشن تراز مطلعِ آفتاب گردیدہ در ریختہ راقسے بہ فصاحت وبلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آن وقت از راہِ ہوس شعرِ ریختہ موزوں می نمودند .... (صفحہ ۱۰)

یہ خاکے اگرچہ مختصر ہیں تاہم ان کی جامعیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا میر اور گردیزی نے ان شعرا میں سے صرف ولی کا ذکر کیا ہے لیکن وہ بھی ان کی شخصیت کی کوئی مکمل تصویر پیش نہیں کرسکے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قائم کی تحریر اپنے ان معاصرین کے بیانات سے زیادہ وقیع ہو قطع نظر اس سے بحیثیت مجموعی دکنی شاعروں کے متعلق جس قدر معلومات "مخزنِ نکات" میں بہم پہونچائی گئی ہیں۔ "نکات الشعراء" اور "تذکرہ گردیزی" ان کی فراہمی سے قاصر ہیں۔ شمالی ہند کے متعدد اساتذہ کے بارے میں قائم کے اظہارِ خیال کا انداز کسی قدر ارادتمندانہ ہے لیکن یہ عقیدت وارادت بالعموم درج ذیل قسم کے جملوں کے ساتھ آغازِ کلام تک محدود ہوگی۔

میرزا مظہر:- مرہم گذارِ سینہ ریش بمعنی بادشاہ ولایت صورتِ ش معنی آگاہ، عارف باللہ میرزا جانجاناں مظہر سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ (ص ۳۲)

میرزا سودا:- عندلیب خوش نغمۂ گلشن رنگینی گل سر سبد محافلِ اشعار یگانہ کشورِ افضال نقاوۂ دودمانِ کمال، انتخاب نسخۂ صاحب کمالی حضرت میرزا رفیع سودا مدظلہ العالی جت ۳۵

میر تقی میر - "ضیعِ انجمن عشق بازان، فروغ محفل سخن پردازان جامع آیاتِ سخندانی، مجمع کمالاتِ انسانی، معجز طراز کرامت تحریر، محمد تقی المتخلص بہ میر" (ص ۔ ۴۰)

درجۂ دوم کے اساتذہ اور عام شعرا کے اخلاق و اوصاف پر اظہار خیال نیز متعلقہ واقعات کی نشان دہی کے لئے قائم نے جو انداز اختیار کیا ہے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

مہر علی رافتؔ :- "از غایت بے جگری و زیاد گوئی معاصران خود را بطعن و استہزا می رنجانید و ہیچ کس را در برابر خود مقدارے نمی نہاد۔" (ص ۷۰)

برہان الدین عاصمیؔ :- "در کمال دانائی و ہشیار خرامی و بذلہ گوئی و نادر کلامی ستنائے روزگار بود و در عالم جواہر شناسی بصارت تمام داشت۔" (ص ۴۶)

ہدایت اللہ ہدایتؔ :- "بسیار باستغنا می گذراند و آبرو بر دو جہانی دارد بالجملہ مردے از قوم افاغنہ باین جمعیت اخلاق و احوال برنخاستہ۔" (ص ۸۴)

محمد یار خاکسارؔ :- "در حقیقت متمکن و باعتقاد خود ظریف ہر چند بہ خلق با آشنا و غیر آشنا بر سر رختہ مزاح می آرد لیکن تمکینش تاب خندیدن جواب ندارد۔ بنا بریں از تمام عالم شاکی است۔" (ص ۵۲)

میر ضیاؔ :- "بشاہد پرستی مشہور است ذلیل و نہار با شاہدان روزگار محشور۔ ظاہر حالش آراستہ تمکین و صلاح است مگر کہ باطنش نیز بخیر و فلاح باشد" (ص ۷۰)

خوشوقت رائے شتابؔ :- "ہیولائے استعدادش قبول تربیت باسانی می کند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بازاں و امثال خود باعتقاد

امتیاز بسر می برد۔ از آنجا کہ بسیار مودب و مہذب است، جائے او در خلوت سرائے دل ہا خالی است۔" (ص - ۷۲)

نول رائے وفا۔ " جدتِ ذہن و جودتِ فہم و اصابت رائے و لطافت مزاج بدرجہ اتم دارد۔" (ص - ۷۲)

میر قمر الدین منت :- " آثار فراست و شواہد کیاست از جبینِ نور آگینش ہویدا و استعداد اوابت، جمیعِ مراتب کمال از ہیولائے مزاجش پیدا۔"

(منقول از انڈیا آفس)

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر سیرت نگار کی حیثیت سے قاسم کے رتبے کا تعین زیادہ دشوار نہیں۔ انھوں نے جس خوبی کے ساتھ شعرا کے محاسنِ سیرت اور اخلاق و کردار کی کوتاہیوں کا احاطہ کیا ہے اس سے ان کی ژرف نگاہی اور دُور بینی کے پہلو بہ پہلو صاف گوئی اور خلوص کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کے یہاں فن کے حسن و قبح سے بحث میں بھی کار فرما رہی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں ہر طبقے کے شاعروں کی نمایاں خصوصیات کلام پر مجموعی تبصرے کے باعث اس موضوع پر اظہارِ خیال کی نوبت کم ہی آئی ہے تاہم جہاں کہیں کسی شاعر کے انفرادی کمالات یا قابلِ گرفت نقائص کا تذکرہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے وہ پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر دیتے ہیں۔ مثلاً،

میرزا علی قلی ندیم : " مرثیہ حضرت ابی عبداللہ الحسین بقوتِ تمام و قدرتِ تمام می گفت، در مشکل ترین ردیف و قوافی۔ طبع

آزمائی ہا می کرد۔" (ص - ۲۵)

احسن اللہ احسن :۔ "تلاشِ لفظِ تازہ و ایہام می کرد اما از بحالیتِ ہجوم الفاظ معنی شعرش کمتر بنظر می آید۔ ابیاتے (چند) بعد غربال کردن دیوانش برآوردہ۔۔۔۔" (ص ۲۲)

سجاد، اکبر آبادی :۔ "صنائع لفظی را بتلاشِ ہائے معین مقارن معنی نشاندہ و معنی را بو ساطتِ الفاظِ رنگین بادرجِ سربلندی رسانیدہ۔۔۔۔۔۔ (در دیوانش)۔۔۔۔ شعرِ بے حاصل کمتر بو می آید۔" (ص ۲۸)

کمترین :۔ "در عالم ہزل گوئی و ہجو پردازی نظیر خود نداشت" (ص ۳۲)

خواجہ میر درد :۔ "ابیات و رباعیات بطور صحابی و خیام بسیار دارد۔۔۔۔۔۔ کلامش۔۔۔۔۔۔ ہمگی لب لباب و تمامی انتخاب است۔" (ص - ۳۹)

میر تقی میر :۔ "انواع شعر را بہ شستگی و رفتگی سرانجام دہد"
(ماخوذ از نسخہ لندن)

محمد حسین کلیم :۔ "چنیں شاعر زبردستے است کہ او را پہلوان میدان سخن می تواں گفت۔ قریب بیست ہزار بیت طور قصیدہ و غزل بوضع میرزا بیدل در حیز خامہ دو ز بانش ترتیب یافتہ۔" (ص - ۴۳ - ۴۴)

بسمل :۔ "آہنگ سخن گوئی دارد۔ اما از کم بضاعتی در کوچہ عاجز بیانی است چیزے کہ در دل او بزاید، برلب

اظہار نمی تواند آورد۔" (ص ۶۲)

میر ہادی :- "دیوانش قریب ہفصد بیت از نظر گذشتہ بعد یک دو ورق شعر با مزہ من بر آید۔" (ص ۶۴)

مغل بیگ ناظر :- "با وجود کم بضاعتی در مشقی طرزِ کلامش خالی از انداز نیست۔" (ص ۶۷)

بندرابن راقم :- "غزل را بر نگے مخمس کند کہ زیادہ از پنجہ خائی گل رخاں ناخن بدل زند۔" (ص ۵۶)

"مخزنِ نکات" کے مطالعے سے جہاں ہمیں مختلف شاعروں کے بارے میں بہت سی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہیں شعر و ادب کے متعلق مولف کے بعض نظریات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قائم کا تعلق اردو شاعری کے اس دور سے ہے جبکہ ایہام گوئی اور مناسبتِ لفظی کے خلاف ردِ عمل شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے اساتذہ کے شانہ بشانہ وہ خود بھی اس روایت کی شکست و ریخت میں پیش پیش تھے۔ تذکرے میں بھی جا بجا اس رجحان کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ چنانچہ شعرائے طبقۂ دوم کے اندازِ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"شاعرانِ ابتدائے زمانہ محمد شاہ باعتقاد خود تلاشِ الفاظ تازہ در ایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختند تا بمعنی چہ رسد غرض ناگفتہ بہ۔" (ص ۱۴)

شاہ حاتم کے ذکر میں جنھیں ایہام گوئی سے خاص شغف تھا، قمطراز ہیں کہ:-

"ابیات دیوانش قریب چار ہزار بیت از نظر گذشتہ۔ شعر

خوب جستہ جستہ می برآید۔" (ص ۱۴۰)

یہ رائے بھی اسی نظریے کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔

شاہ آبرو کی استادی کے ثبوت میں قائم کی یہ دلیل کہ "شعر ریختہ بہ وضع خود بسیار مربوط می گوید" اس خیال کی نشان دہی کرتی ہے کہ ان کے نزدیک ایہام بندی کی صورت میں محاسن معنوی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی فنکاری اور قدرتِ کلام کی ضرورت ہے۔ ورنہ جیسا کہ احسن اللہ کے کلام پر تبصرے کے دوران واضح کر چکے ہیں، شعر صرف الفاظ کا ایک طلسم بن کر رہ جائے گا۔

قائم عاشق مزاجی اور اس کے نتیجے میں شعر گوئی کو مقتضائے شباب تصور کرتے ہیں۔ یہ بات مرزا مظہر کے متعلق ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے کہ:

"در اوائل جوانی کہ مقتضائے آن ظاہر است بشعر و شاعری مشغول بود۔" (ص ۲۴)

اس کے باوجود ان کی رائے کے مطابق علوم رسمیہ میں دست گاہ کامل حاصل کیے بغیر قافیہ پیمائی تو کی جا سکتی ہے لیکن شاعری کے مراتبِ اعلیٰ تک رسائی دشوار ہے۔ کرم اللہ خاں درد کے بارے میں ان کا یہ قول اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ

"پارۂ از علوم رسمیہ اندوختہ بقافیہ سنجی مشغول شد۔ تم استعدادش ہمچناں "نارسیدہ بر خاکِ افتاد"۔" (ص ۵۹)

اس اشارے کی وضاحت محمد حسین کلیم کے متعلق درج ذیل بیان سے ہوتی ہے کہ:

"مراتب دانش کسب کردہ سرمایۂ سخن سرائے بدست آوردہ۔" (ص ۹۴)

ندیم کے ذکر میں معاصرین کے اندازِ مرثیہ گوئی پر اس طرح تنقید کرتے ہیں کہ

"بالفعل طورِ گفتن مرثیہ بے ادبانہ متدینین مردم است!!"

(ص ۲۵)

اس جملے کی تہ میں یہ عقیدہ کارفرما ہے کہ زبان و بیان پر ایسی قدرت کاملہ کے بغیر جس کے سہارے حفظ مراتب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ مرثیہ نگاری کے میدان میں قدم اٹھانا مناسب نہیں۔

"مخزن نکات" کی تحریروں میں تاہم کئی ادبی اور علمی صلاحیتوں کے حسین پہلوؤں کی جھلک جابجا نظر آتی ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کا مورخانہ شعور ہے جو انھیں ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس وصف خاص کا اظہار ان واقعات سے ہوتا ہے جو انھوں نے شعرا کے حالات میں ضمناً نقل کئے ہیں۔ تواریخ و سنین کے حوالے دینا تو اس وقت ضروری سمجھا ہی نہ جاتا تھا اس لئے یہ کمی ان کے یہاں بھی موجود ہے البتہ بعض جگہ ظہورِ واقعات کی مدت متعین کر کے انھوں نے کسی حد تک اس نقص کی تلافی کر دی ہے جس کی بدولت تھوڑی سی تلاش و جستجو کے بعد بہ آسانی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بیک نظر اس التزام کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو لیکن انفرادیت خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو بہر حال انفرادیت ہے اور اس کی قدر و قیمت کا تعین معاصرانہ روایات سے تقابل کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس قبیل کے کچھ نمونے زمانۂ ترتیب کی بحث کے ذیل میں خواجہ ولی اللہ اشتیاق، محتشم علی خاں حشمت اور محمد علی حشمت کے حالات سے نقل کئے جا چکے ہیں اور کچھ یہ ہیں

ولی دکنی :- "در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر

ابو المعانی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بجہان آباد آمد"۔ (ص۔۱۰)

برہان الدین عاصمی: "سابق بریں دو سال از جہان رفت" (ص ۲۶)

نادر: "قبل ازیں دو سال در کوٹلہ فیروز شاہ کہ قدیم مسکن وے بود، مسلول شدہ انتقال نمود"۔ (ص ۲۸)

اشرف علی خاں فغاں: "بعد انقضائے زمان دولت را احمد شاہ، برنجش وزیر الممالک نواب غازی الدین خاں بہادر تمام از شہر برآمدہ خود را بہ عظیم آباد پٹنہ رسانید"۔ (منقول از نسخہ انڈیا آفس لائبریری)

رسوا: "چند ماہ است کہ۔ ۔ ۔ ۔ از جہاں رفت"۔ (ص ۳۲)

نجم الدین سلام: "ہمراہ لشکر نواب صفدر جنگ بہ پورب رفتہ ودیعت حیات سپرد"۔ (ص ۶۲)

آخر میں قائم کے بعض ایسے بیانات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو غلط فہمی یا حقایق سے ناواقفیت پر مبنی ہیں اور ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔ بطور مثال سعدی کے ذکر سے تذکرے کے طبقۂ اوّل کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اتفاقِ جمہور برآنست کہ چوں حضرت شیخ سعدی شیرازی قدس اللہ روحہ) در ہنگام (سیر و) سیاحت بطرفِ گجرات تشریف آوردند بسببِ مجاورت سومنات چنانکہ در نسخۂ بوستاں خود شش ابیاتے بر آں فرمودہ انداختے بر زبان ایں دیار وقوف یافتہ یک دو غزل ریختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برسبیلِ تفنن ارشاد

فرمودہ نمبر[۱] (ص - ۲)

"تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دیارِ ہند کی زبان میں طبع آزمائی کرنے والے سعدی شیخ شیراز سے بالکل مختلف شخصیت ہیں۔ ان کے وطن کے متعلق محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ وہ ہندی نژاد تھے حتیٰ کہ خود قائم ہی کے زمانے میں میر صاحب کے عام روایت کے برخلاف انھیں سعدی دکنی قرار دیا ہے۔ اور واضح الفاظ میں یہ حقیقت بیان کر دی ہے کہ

"آنچہ بعض ایں را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند، خطاست"[۲]

ولی دکنی کا نام میر ابو المعالی کے بیٹے سید محمد تقی کی تحریر کے مطابق "ولی محمد" ہے[۳] لیکن قائم انھیں "شاہ ولی اللہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ولی اور ابو المعالی کے قریبی تعلقات کے پیش نظر ہمیں پہلی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"مخزنِ نکات" کی ایک اور خامی جو عمومیت کے ساتھ تقریباً تمام ہی تذکروں میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ مؤلف نے بعض شاعروں

---

[۱] انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں یہ عبارت کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں ملتی ہے زیرِ قوسین الفاظ اسی ترمیم شدہ روایت سے ماخوذ ہیں علاوہ ازیں اس نسخے میں زیرِ تبصرہ اقتباس کے دوسرے لفظ "جمہور" کے بجائے "بعضے از مورخین" درج ہے جس سے قائم کے بیان میں نسبتاً لچک پیدا ہو گئی ہے۔

[۲] "نکات الشعراء" مولوی عبدالحق۔ ص ۱۰۲

[۳] ترتیبہ دیوان ولی بحوالہ "علمی نقوش" از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ۔ ص ۲۸

کے ذکر میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں ابتدائی تفصیلات بھی یکسر نظر انداز کر دی ہیں، مثلاً بیخوا (ص - ۲۳) نادر (ص - ۲۸) کمترین (ص - ۳۲) نسبتی (ص ۶۲) شاغل (ص ۶۲) اور آشنا (ص - ۷۰) کے حالات میں ان کے نام درج نہیں - مہربان خاں رند کے حال میں غیر معمولی توضیحات کے باوجود یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ان کا تخلص مہربان یار رند تھا - اس قسم کی کوتاہیاں اگرچہ تحقیق و تنقید کے موجودہ معیار کے لحاظ سے کافی اہم ہیں پھر بھی اس زمانے کی روایات اور مولف کی مجبوریوں کا خیال کرتے ہوئے ان پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بحیثیت مجموعی "مخزن نکات" ایک گراں مایہ اور قابل قدر ادبی دستاویز ہے جس کا مطالعہ اردو شاعری کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے صرف سودمند ہی نہیں ناگزیر بھی ہے -

چمنستان شعرا سے گلشن سخن تک

یہ باب ابتدائی تذکروں کے بعد اور تیرھویں صدی ہجری کے اختتام سے قبل ترتیب پائے ہوئے مندرجہ ذیل تذکروں کے جائزے پر مشتمل ہے

۱۔ چمنستانِ شعرا۔ مولفہ لالہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی۔

۲۔ طبقات الشعراء مولفہ مولوی قدرت اللہ شوق سنبھلی۔

۳۔ تذکرہ شعرائے اردو مولفہ میر حسن دہلوی۔

۴۔ تذکرہ شورش (رموز الشعراء) میر غلام حسین شورش عظیم آبادی۔

۵۔ مسرت افزا مولفہ ابوالحسن امیرالدین احمد عرف امراللہ الہ آبادی۔

۶۔ گل عجائب مولفہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی۔

۷۔ گلزار ابراہیم مولفہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی۔

۸۔ گلشن سخن مولفہ میرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی۔

چمنستان شعرا کا سال ترتیب ۱۱۷۵ھ، ۱۱۹۲ھ ۱۱۹۶ھ ہے اس لیے اسے ان تذکروں میں سر فہرست رکھا گیا ہے۔ طبقات الشعرا نے اگرچہ موجودہ صورت ۱۱۸۸ھ، ۱۱۸۹ھ میں نظر ثانی کے بعد اختیار کی ہو لیکن اس کا نقش اول ۱۱۸۸ھ، ۱۱۷۷ھ میں تیار ہو چکا تھا۔ اس لحاظ سے اسے بہ اعتبار زمانہ اس سنہ (۱۱۸۸ھ) کے بعد مرتب ہونے والے تذکروں پر فوقیت حاصل ہے۔ ہم نے یہاں اس تقدم کو برقرار رکھتے ہوئے "چمنستانِ شعرا" کے فوراً بعد اس کا ذکر کیا ہے۔ میر حسن کے شعرائے اردو کا سالِ تکمیل عام طور

بہ ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء خیال کیا جاتا ہے مگر قاضی عبدالودود صاحب کے کتب خانے کے قلمی نسخے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد صرف چند اضافے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء کے بات ترتیب پانے والے تذکروں سے پہلے جگہ دی گئی ہے۔ شورش عظیم آبادی اور امراللہ الہ آبادی کے تذکرے علی الترتیب ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء اور ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں مرتب ہوئے ہیں۔ گل عجائب کا زمانۂ ترتیب واضح نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ ۱۱۹۶ھ/۱۸۸۲ء کے قریب پایۂ تکمیل کو پہونچا ہے۔ لہٰذا اس کا ذکر "مسرت افزا" کے بعد کیا گیا ہے۔ "گلزار ابراہیم" کا سال تکمیل اس کے مولف کے بیان کے بموجب ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء ہے۔ "گلشن سخن" میں اگرچہ بار بار ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء کے حوالے سال رواں کے طور پر دیے گئے ہیں اور مولف کے طبع زاد قطعہ تاریخ کے آخری مصرعے سے بھی یہی سنہ برآمد ہوتا ہے لیکن یہ تذکرہ اصلاً "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ ہے اس لیے ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء سے قبل اس کی تکمیل خارج از امکان ہے۔ اسی بنا پر اسے "گلزار ابراہیم" کے بعد جگہ دی گئی ہے۔

چمنستانِ شعراء

دکنی تذکروں میں حسنِ ترتیب جامعیت اور ادبی معیار کے لحاظ سے "چمنستانِ شعرا" کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس کے مولف لچھمی نرائن شفیق بڑے با صلاحیت اور ذی علم انسان تھے۔ اورنگ آباد جیسے گہوارۂ علم و ادب سے وطنی وابستگی اور علامہ آزاد بلگرامی کے فیضانِ تربیت کی بدولت ان کی شخصیت کے جوہر نکھرے اور کم عمری ہی میں شعر و ادب نیز تصنیف و تالیف سے اُنکی فطری دلچسپیاں بامِ عروج تک پہنچ گئیں۔ یہ تذکرہ جو انھوں نے صرف ۱۷ سال کی عمر میں ترتیب دیا تھا اور جسے بابائے اُردو مولوی عبدالحق ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اُردو ہند کی جانب سے شائع کرا چکے ہیں، ان کے اس غیر معمولی ذوق و شوق اور علمی و شعوری ارتقا کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اگرچہ بقول شفیق ان سے قبل دکن کے کئی مصنف اس میدان میں اپنے علم و بصیرت کی داد دے چکے تھے لیکن ان کا دائرۂ کار بیشتر دکنی فنکاروں کے تعارف تک محدود تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کمی تھی جسے شفیق نے محسوس کیا اور جب میر اور گردیزی کے تذکروں کی وساطت سے شمالی ہند کے ریختہ گویوں کے حالات اور کلام تک ان کی رسائی ہوئی تو انھوں نے اس کے ازالے کی غرض سے "چمنستانِ شعرا" کی تسوید و تحریر کا آغاز کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی یہ گرانمایہ تالیف تکمیل کے مراحل طے کر کے منظرِ عام پر آ گئی۔ دیباچے کے ذیل میں ان حالات و محرکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"دریں اثناء تذکرہ "نکات الشعراء" من تصنیف میر تقی میر، و تذکرہ فتح علی خالی تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالم انداخت و جہانے را در اشتیاقِ اشعارِ ہند کہ بہم رسیدن آن اہلِ دکن را خیلے دشوار است تہ و بالا ساخت۔ لہذا بخاطرِ خاطرِ ذکرِ ناقص گذشت کہ خود ہم این ہمہ اشعار ہر دو تذکرۂ گرفتہ و دیگر لآلی را یک جا جمع ساختہ بطورِ سفینہ کہ انیس یکتائی و ہمدمِ تنہائی شود، نقش باید بست زیرا کہ بدین تقریب غریب و تمہید عجیب شاید احوالِ بعضے محبانِ سخندان بر کرسی تعیین می تواند نشست ..." (بس) کمر را چست بستم و سمند صبا تکِ قلم بسرعتِ سریعہ در میدانِ تحریرِ این نسخہ برانگیختم" (ص ۲)

تذکرے کا سالِ ترتیب ۱۱۷۵ھ (۶۲-۱۷۶۱ء) ہے اسی لئے بقید تاریخ "چمنستانِ شعرا" نام رکھا گیا ہے۔ اس سنہ کے بعد ۱۱۷۶ھ، ۶۳-۱۷۶۲ء میں صرف چند اور برائے نام ترمیمیں عمل میں آئی ہیں۔ ان کی تصریح کر دی گئی ہے۔ زمانہ آغاز کے بارے میں عام تذکرہ نگاروں کی طرح شفیق نے بھی کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ البتہ میر مرتضیٰ ہمدمی کے متعلق ان کے اس بیان سے کہ "در سن اربع و سبعین و مائۃ والف در جنگ مرہٹہ شہید شد" (صفحہ ۲۹۲) یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۱۷۴ھ، ۶۱-۱۷۶۰ء کے بعد ابتدائے کار ہوئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کام صرف سوا سال کی اس مختصر سی درمیانی مدت ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ دیباچے کے منقولۂ بالا اقتباس میں "سرعت سریعہ" کی جانب اشارے کے علاوہ درج ذیل بیانات سے بھی اس قیاس کی

ناپید ہوتی ہے جیسے:-

(الف) شاہ حاتم:- "بوقتِ تحریر ایں چند ابیات دیوانے ضخیم از وے بد
اما فرصتِ انتخابش نہ شد۔ لاچار ایں چند گلہائے تازہ
بنابر جلدی از گلستانِ نقش جیدہ حوالۂ قلم می شود" (ص ۱۲۰)

(ب) کمال:- "دیوانِ اشعارش بہ مطالعہ در آمد لیکن فرصتِ انتخاب
دست نداد" (ص ۲۳۹)

دواوین کی دستیابی کے باوجود انتخابِ کلام کی مہلت نہ ملنا اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ مولف نے حد درجہ عجلت سے کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں اختتامیہ عبارت کا درج ذیل اقتباس بھی قابلِ غور ہے۔ تشبیہات و استعارات کے پیرایہ میں موضوعِ زیرِ بحث پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:-

"ایں چمنستانِ شعراء ایں گلستانِ فصحاء محض بہ افضالِ الٰہی بے امدادِ غیرے و بلے معاونتِ یارے در عرصہ قلیل کہ ختم ایام بدست دار دیا بہار کہ تشریف بہ بوستانِ آوردہ رونقِ تازہ در گلے از سر گرفت" (ص ۵۵۸)

شفیق کے اس اعتراف کے بعد ہمارے اس قیاس میں کہ "چمنستانِ شعرا" ۱۱۷۴ھ/۶۱-۱۷۶۰ء اور ۱۱۷۶ھ/۶۳-۱۷۶۲ء کے درمیانی عرصے کی تالیف ہے، کسی شک اور شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اتنے کم وقت کے اندر اتمامِ کار کی مثالیں نادر و نایاب تو نہیں لیکن کم یاب ضرور ہیں۔

اس تذکرے کی فہرست میں جسے شفیق نے غالباً "تاریخ گوئی سے شغف

خاص کی بنا پر قاعدہ جمل کے بموجب حروفِ ابجد کے اعتبار سے ترتیب دیا ہو
وہ کہ تیرہ (۲۱۳) شاعروں کے نام شامل ہیں۔ ضروری مواد کی فراہمی میں تیرا(؟)
گردیزی کے تذکروں کے علاوہ شاہ عبدالحکیم لاہوری کے "مردم دیدہ" خان
آرزو کے "مجمع النفائس" اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے "سروِ آزاد"
سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ خواجہ میر درد، محمد نقیبہ
درد مند، نور العین واقف بٹالوی، میرزا مظہر، میرزا معز الدین معز،
محمد عارف عارف اور نظام الدین احمد صانع بلگرامی کے حالات میں ان
تذکروں کے حوالے موجود ہیں۔ عبدالہادی ہادی۔ محمد ماہ محرم اور صابر
لاہوری کے حالات و اشعار ایک دوست حاجی میر اکبر علی اکبر کی تحریک اور
اطلاعات کی بنیاد پر داخل کئے گئے ہیں اور سراج اورنگ آبادی کے متعلق
بہت سی باتیں ان کے دیباچہ منتخب دواوینِ فارسی (منتخب دیوان ہا) سے
معلوم ہوتی ہیں۔

حالاتِ زندگی کے ضمن میں شفیق نے بالعموم انھیں باتوں کا اعادہ کیا ہے جو
ان سے قبل دوسرے تذکرہ نگار لکھتے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض جگہ حاکم
لاہوری، خان آرزو اور علامہ آزاد کے بیانات لفظ بہ لفظ نقل کر دئے گئے
ہیں۔ اس لئے تذکرے کا یہ پہلو بہ حیثیت مجموعی کسی خاص امتیاز اور انفرادیت
کا حامل نہیں البتہ دکن کے چند شاعروں اور اپنے بعض دوستوں کے ذکر
میں انھوں نے دوسروں کی فراہم کردہ معلومات پر اکتفا نہ کر کے ہو ئے ذاتی
علم و آگاہی اور تحقیق و تلاش سے بھی کام لیا ہے۔ دراصل وہ مقامات
ہیں جہاں وہ ایک باشعور تاریخ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے
ہیں اور ان کے قلم کی پرکاری کے جوہر کھلے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں تعداد

کے اعتبار سے کم سہی لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے کسی طرح نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔ اہم واقعاتِ زندگی کے انضباط اور سیرت و شخصیت کے تعمیری عوامل کے تجزیہ کا یہ خصوصی انداز میر اکبر علی رمال کے ذکر میں جو تقریباً تین صفحات کو محیط ہے پوری آب و تاب کے ساتھ بروئے کار آیا ہے۔ اس طویل ترجمہ احوال سے ماخوذ چند منتشر مگر داخلی طور پر مسلسل و مربوط جملے جنھیں شاعر تذکرہ کی سرگذشتِ حیات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے سطور ذیل میں بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

"از لاہور کہ مولد اوست در عمر بست و یک سالگی محملِ سفر بسمت بیت اللہ بربست و در شاہجہاں آباد سہ ماہ بمقتضائے قضا و قدر بہ اکابرانِ آنجا مثلِ مظہر جانِ جاناں و عبدالحیٔ تاباں و مرزا رفیع سودا در خوردہ۔ بعدہٗ از اکبرآباد بہ گوالیر آمدہ بہ سرد رنج رسیدہ ہفت ماہ در آنجا سکنی گزیدہ بدار السرور (برہانپور) چندے محمل انداخت۔ ازانجا عزم بیت اللہ بر خود مصمم کردہ بہ صورت وارد گشت و چہار ماہ دوران گل زمین بسر بردہ آخر بجہاز سوار شدہ در سہ ماہ بجدہ احرام بیت اللہ بربست و دو نیم سال در مکہ و شش ماہ در مدینہ منورہ سعادت حاصل کردہ عازم ایں طرف گردیدہ و دست بیعت بدامن خلاصہ اولیائے دکن حضرت شاہ یٰسین نذر پاکی نور اللہ مرقدہٗ در آویخت ۔ ۔ ۔ بعدہٗ در خجستہ بنیاد (اورنگ آباد) رسیدہ بہ کمالِ کاملِ سبانہ و از شاہ سامی ملاقات کردہ شوق ریختہ گوئی پیدا کرد ۔ ۔ ۔ پس ازاں در برہانپور بہ سید معز الدین خاں شحنہ آنجا ۔ ۔ ۔ در خورد و دو سال در آنجا بگذرانید ۔ ۔ ازانجا مراجعت بطرف خجستہ بنیاد نمودہ چندے اقامت کردہ

متوجہ حیدرآباد گشت"۔ (صفحات ۱۴۸ تا ۱۵۰)

دکن کے جن شاعروں کے حالات اس تذکرے میں شامل ہیں ان میں ولی کی شخصیت سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہے ان کے وطن کے متعلق محققین میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ کافی تحقیق و تلاش اور بحث و تمحیص کے باوجود آج تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن دلیل پیش نہیں کی جا سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ انھیں اورنگ آبادی الاصل منوانے پر مُصر ہیں اور بعض حضرات سرزمینِ گجرات کو ان کا مولد و منشا قرار دیتے ہیں۔ شفیق پہلے گروہ کے ہمنوا ہیں چنانچہ اپنے مخالفین کی غلط فہمیوں کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مولد او خاکِ پاک اورنگ آباد است چوں اکثر به گجرات در درگاہ حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کسب علم کردہ و در بیلی گنبد متصل گور مدفون گشتہ مردمان نسبت او بہ گجرات کردہ غلط محض"۔ (ص ۱۴۴)

سوانحِ حیات کے ذیل میں سنین کی نشاندہی ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن شعرائے اردو کے ابتدائی تذکروں کی یہ ایک بڑی خامی ہے کہ ان کے مولفین اس ضرورت کے احساس سے یکسر ناآشنا رہے ہیں۔ شفیق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس روشِ عام کے برخلاف واضح الفاظ میں بعض شاعروں کے زمانہ ہائے وفات کا تعین کیا ہے اس امر میں فنِ تاریخ گوئی سے ان کی دلچسپی ایک اہم محرک کی حیثیت سے کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہیں کہیں مفرد تاریخی مصرعے اور کہیں مکمل قطعات بھی بطور سند پیش کیے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱- خان آرزو :- "در ماہ جمادی الثانی سنہ تسع و ستین و مائتہ والف (۱۱۶۹ھ) بہ بلدۂ لکھنؤ ایں جہان فانی را وداع نمودہ جا در عالم باقی گزید" (ص - ۱۱)

۲- امیر خان انجام :- "در سنہ تسعہ و خمسین و مائتہ والف (۱۱۵۹ھ) تاریخ وفاتش نوشتہ اند۔ کاتب حروف تاریخ وفات چنیں یافتہ و یک عدد زاید را بایں حسن تعمیہ ساقط ساختہ۔

آں عمدۂ معنی آفریناں — در خلد بریں نمود آرام
رفت آن یکتا و گشت تاریخ — جان داد امیر خان انجام

(ص - ۳۰)

۳- انعام اللہ خان یقین :- "قطعہ تاریخ وفات از مولف تذکرہ :-

شاعر نازک سخن و خوش خیال — کرد سفر جانب ملک عدم
سال وصالش خرد نکتہ سنج — گفت یقیں رفت بسوئے ارم"

(ص ۲۶۱)

۴- رند اگراہی :- "در سنہ ست و خمسین و مائتہ والف (۱۱۵۶ھ) خرقۂ ہستی بگذاشت مورخے تاریخ رحلتش ایں مصرع یافت ع

"رندے عجبے از ایں جہان رفت"

(ص ۲۳۶)

۵- نورالدین حسین خان نگین :- بتاریخ بست و چہارم جمادی الثانی سنہ سبعین و مائتہ الف (۱۱۷۰ھ) لوائے عزیمت یک یاس

روز برآمد، در بلدۂ ایلچپور ..... بمرگ مفاجات

جان بحق تسلیم نمود۔" (ص ۵۱۹)

اپنے حالات میں شفیق نے جہاں اور بہت سی باتیں لکھی ہیں، وہیں تخلص کی تبدیلی کا واقعہ بھی التزام تاریخ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

الحال کہ سالِ ہژدہ از عمر گذشتہ باشد چوں مطلع شد کہ میر محمد مسیح صاحب تخلص در فارسی گزشتہ است بجناب فیض مآب حضرت میر صاحب و قبلہ (آزاد بلگرامی) التماس تخلص نمود آنجناب از راہِ شفقت تخلص شفیق عنایت فرمودند ......

تاریخ مرحمتِ تخلص "تخلص کو" (۱۱۷۶ھ) یافتم و مصرعے دیگر کہ از وہم اعداد سنہ حالی مستخرج می شوند قطعہ نمودم"

از حضرتِ فیض بخش آزاد گردید بے تخلص انعام
تاریخ بہ اہلِ بزم گفتم امداد شفیق شد مرا نام"

(ص ۔ ۴۹۴ - ۴۹۵)

سیرت و شخصیت کی خاکہ کشی کے معاملے میں بھی شفیق کی کوششیں قابل قدر ہیں اگرچہ بعض جگہ میر کی طرح انھوں نے بھی استعارات و تشبیہات کے وہ لطیف و رنگین پیرہن تراشے ہیں جو شاہد و مشہود کے درمیان ایک حجاب کی طرح حائل رہتے ہیں لیکن ایسے موقعوں کی بھی ان کے یہاں کچھ کمی نہیں جن کے خطوط میں فطری سادگی اور رنگ و روغن میں حقیقت و واقعیت کی جھلک بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ تصویریں بیک نگاہ ناظر کے ذہن پر ان اوصاف و محاسن کے نقوش مرتسم کر دیتی ہیں جن کی ترجمانی

ان کے خالق کے پیش نظر رہی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے خان آرزو کے حالات سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس کا اسلوب "نکات الشعرا" کے طرزِ خاص سے اثر پذیری کا غماز ہے۔ فرماتے ہیں۔

"گلدستہ بند گلہائے خیالاتِ رنگین دو بادہ نشانِ سخن ہائے دل نشیں است در گلشن ہند مثل او عندلیب ہزار داستان کم تر می تواں پنداشت و در مجلسِ دکن ہم چوں آن پروانۂ چراغ سخن عدیم باید انگاشت غزالان معنی را ابجدے مسخر کرد کہ می باید و بیہ خردگان الفاظِ پاکیزہ را نو عے حلقہ در گوش ساختہ کہ می شاید در غزل گفتن کوہ جاں می کند و دیوان خانۂ ریختہ ہم بنہایت پرکاری طاق می بندد خضر طبعش چشمہ چشمہ منطقش اجسام کتب را آبِ زندگی بخشندہ و آفتاب کلکش جمال جمال ظلمات نقص سخن غیر را مو کشاں کشندہ" (ص ۶)

یہ طرزِ تعارف آج کل نامناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اس زمانے کی روایات اور تقاضوں کے عین مطابق ہے جبکہ کسی عظیم فن کار کی پروقار شخصیت کو نمایاں کرنے کی غرض سے ایک مرعوب کن فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ شفیق اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا عبارت کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص خان آرزو کی علمیت، ہمہ دانی اور قادر الکلامی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، حالانکہ یہ اندازہ کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہے کہ ان اوصاف کی صحیح نوعیت و کیفیت کیا تھی اور ان کا اظہار کن صورتوں میں ہوا۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ان کے خضرِ طبیعت نے اجسام کتب کو آبِ حیات بخشا ہے ایک باشعور قاری کی تسکین کے لئے قطعاً ناکافی ہو

اس کے برخلاف سید عبدالولی عزلت سورتی کے بارے میں مولف کا درج ذیل بیان ان کی شخصیت کے خط و خال اور تابناک پہلوؤں کو زیادہ مناسب اور قطعی انداز میں نمایاں کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"نکات رنگین بہ یمن انفاس مسیحائش زندہ و خیالات شیریں بر طبع چالاکش تازندہ۔ در مصوری ندرتے دارد کہ مانی و بہزاد پیش او مانند پیکر تصویر در حیرت می مانند و در موسیقی و سنگیت دستے دارد کہ صاحب کمالان ایں فن بناخن دست بہ گوش می گزارند در علم دو ہرہ و کبت دریائیست مواج و بحریست متلاطم شر خوانی گلو سوزش جانے از سامعان می برد و سخن گوئی دلفروزش روحے تازہ عطا می کند۔" (ص ۴۹)

انعام اللہ خاں یقین نے بہت کم عمر پائی لیکن مرزا مظہر جان جاناں کے فیض تربیت نے انھیں مشق سخن کے ابتدائی دور ہی میں شہرت میں مقبولیت کی اس معراج تک پہنچا دیا تھا جو عام طور پر بڑے ریاض اور کہنہ مشقی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ فکری و فنی صلاحیتوں کے اس غیر معمولی نشو و نما کی بنا پر ان کی شخصیت معاصرین کے لئے رشک و حسد کا سبب بن گئی تھی اور بعض لوگ ان کی موزونی طبعی پر شبہ کرتے ہوئے ان کے کلام کو مرزا صاحب کے خرمن فکر کے تمتوات سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرے میں ان بدگمانیوں کے خلاف بڑے اعتماد کے ساتھ آواز اٹھائی ہے اور اس مقصد کے لئے کئی صفحات وقف کر کے ان نا انصافیوں کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک نادر الکلام اور خوش گو شاعر کی شہرت کو داغ لگانے کی خاطر روا رکھی گئی تھیں

اگرچہ اس ضمن میں کہیں کہیں ان کے خیالات کی حدیں باطل پرستی سے جا ملی ہیں پھر بھی ان کے بیانات ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور انکے زیر اثر ذاتی مطالعہ اور تحقیق و تلاش کی روشنی میں اصل حقیقت تک پہنچنے اور شاعر کا مقام متعین کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی شفیق کا منتہائے مقصود بھی ہے۔ تعارف کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"شہنشاہِ قلمرو سخن دانی یوسف کنعانِ معانی است۔ طوطیٔ شکر مقالِ از گلستانِ ہمتِ بر نخواستہ کہ با آں عندلیب ہزار داستان سخن بہ کشا بہ گواید و شہسوارے چابک خرام اورائے ضمان دکن پیدا نشدہ کہ قصب السبق از ال فارسِ میدانِ خوش تلاشی بربایدہ بسیارے از لشکر مقالانِ متینِ خیال پرہ ہم صفیری او برداشتند، آخر پشت دست بزمین نارسائی گذاشتند۔ اکثر از نازک خیالانِ شیریں مقال بہ مقابلۂ او برخاستند، آخر از قصور بہ گوش مالیٔ غود بر داختند از دست۔

یقیں تائید حق سے شعر کے میدان کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کون آسکتا ہے کیا قدرت

آرے عندلیب گلکش دم از ہمدمی عیسٰی می زند و مزاج عالیش معانی نازک می گزیند ہر قطرہ کہ از سحاب خامہ اش بچکید لالے گراں بہا شد و ہر سطرے کہ از سر دو زحمت عطا کن جانہا ست۔ معنی آفرینانِ ایں زمانی از نام تضمین کلامش گرم بازاری می دارند و خوش تلاشانِ ایں عصر از اصغائے نام نامیش دست بہ گوش می گذارند۔۔۔۔۔" (ص۔ ۱۶۱)

اس کے بعد ان الفاظ میں اپنی اس رائے کی توثیق کرتے ہیں۔

"الحاصل یقین یکتائے عصر و یگانہ زمانہ است چشم روزگار چنیں معنی آفرینے نکتہ رس ندیدہ و گوش سپہر دوار مثل ایں والا منشے آتش دم نشنیدہ سخن سرایان والا گوہر و آتش نفسانِ گرامی قدر مصرع عنبر ادش را چوں خیالِ قامت مصرع خوبان بدل جان دہند و بیت نقش بستہ کلکش را چوں بیت ابرو بر چشم می نہند۔ فی الواقع اگر آں سحر پرداز دعویٰ اعجاز می کرد سخن سازان را بجز ایمان آوردن چارہ نبود و ایں آیۂ گرانمایہ "واعبد ربک حتی یاتیک الیقین" زنگ شبہ از آئینۂ دل می زدود" (ص ۱۶۳)

مختلف شعرا کے حالات سے نقل کئے ہوئے ان اقتباسات میں شخصیت نگاری کے جو نمونے پیش کئے گئے ہیں ان میں سیرت و کردار اور اخلاق و عادات کو معرض بحث میں نہ لاتے ہوئے تمام تر توجہ ادبی و فنی اکتساب کی تحسین و توصیف پر صرف کی گئی ہے۔ یہ محدود اندازِ نظر ذاتی عدم واقفیت پر مبنی ہے اس لئے بعض ایسے شاعروں کے بارے میں جو مولف سے قریب تر رہے ہیں ان کے تبصروں کی کیفیت و نوعیت کا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ نقد و نظر کے تقاضے صحیح معنی میں پورے ہو سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر تذکرے کے درج ذیل بیانات توجہ طلب ہیں۔

۱۔ میر ایوب، ایوب:۔ "ستون اخلاق را از قوت بازوئے حسن خلق خود بادہ جود صغر سن بلند می ساؤد و سمند شعر فہمی را در مضمار فصاحت بہ نہایت

جولانی می تازد۔" (ص ۳۹۰)

۲۔ مرزا محمد اکبر طپش :۔ "بہ خرد منشی و عجز و انکسار کہ لازمۂ کمال است۔ یگانۂ روزگار و بہ جودت فہم و ذکائے ذہن و صواب رائے یکتائے عصر است۔" (ص ۱۶۰)

۳۔ الف خاں مبتلا :۔ "جوانے است صالح۔ سپاہی وضع .... آثار سعادت از جبینش ہویدا و نور نجابت از لمعانِ انداز او پیدا است گویا رسام قدر نقش ہمچنیں را از آب و رنگِ غربت و انکسار آراستگی بخشیدہ۔"
(ص ۲۰۳)

۴۔ مرزا منعم شورش :۔ "بسیار مجردانہ و قلندرانہ زندگی بسر بودہ .... اشعار ریختہ و فارسی بسیار گفتہ اما از کمال بے دماغی کہ داشت سودات بہ شمع و چراغ می سوخت۔"

(ص ۵۲۹)

یہ بیانات زیرِ تبصرہ شاعر دل کی طبیعت اور مزاج کے مختلف گوشوں کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بے نقاب کرتے ہیں اور اس کلیے کے پیشِ نظر کہ فن کار کی سیرت کے نمایاں عناصر اس کے فکر و شعور پر بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں ہی طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اس قسم کے اشارات کی مدد سے تحسین کلام اور تنقید فن کی منزل بڑی حد تک آسان

ہو جاتی ہے۔

"چمنستانِ شعرا" میں ابتدائی دور کی عام روایات کے برخلاف تنقیدی مواد بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ شفیق نے کلام کے متعلق عام طور سے جن الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے، ان کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شعر و سخن کے دائرے میں "معانیِ تازہ و مضامینِ بیگانہ کی تلاش اور "متانتِ خیال و شیرینیِ مقال" کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور صرف ان تخلیقات کو لائقِ تحسین خیال کرتے ہیں جو پڑھنے اور سننے والوں کے لئے "انشراحِ طبیعت کا سامان فراہم کر سکیں۔ گویا کوئی شخص اس وقت تک ایک کامیاب شاعر کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جبتک کہ اس کے کلام میں یہ تمام خوبیاں موجود نہ ہوں۔ آج بھی جبکہ اس زمانے کی بہ نسبت نقد و نظر کے معیار بڑی حد تک بدل گئے ہیں، ان نظریات و تصورات سے اختلاف ناممکن ہے اور یہی ان کی صحتمندی کی دلیل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شفیق کا طرزِ بیان آج کے عالمانہ اسلوبِ نگارش سے مختلف ہے۔ ان کی فارسی پر شمس العلماء آزاد کی اُردو کے خاصہ کی طرح رنگین نگاری و انشاپردازی کا رنگ غالب ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ الفاظ کے پیچ و خم میں سر رشتۂ مطالب ہی ہاتھ سے گم ہو جائے یا کوہ کنی کے بعد پرِ کاہ برآمد ہو۔ ہمارے ان بیانات کی تائید درج ذیل مثالوں سے ہوگی۔

۱۔ شاہ مبارک آبرو:۔ "در معنی یابی بہ دیوان موزوں خیالی

دادِ سخن می دہد و گل گشت خیابان

اشعارش انشراح فزادانِ بہ نظارگیان

می بخشد۔ متانتِ الفاظ و نزاکتِ معنیش بر سخن فہمان

انصاف دوست روشن است۔ اشعار ایہام

بسیار می دارد...... شاعرِ شیریں مقال و

معنی یاب متین خیال است...... لولوئے

گراں بہائے سخن را بہ نہایت آب وتاب در

رشتۂ نظم سفتہ"۔ (ص۔ ۹)

۲۔ احسن اللہ احسن :- "در ریختہ سنجی یگانہ روزگار و صاحب تلاشش معاش برکار است۔ از بسکہ طوطیٔ طبعش

شکر ایہام می ریزد، از صفائے مراعات

اظہار می گریزد...... نیسان کلکش لآلی

معانی می افشاند و شاطہ طبعش عروسِ سخن

را بوجہ احسن برکرسی رنگینی می نشاند" (ص ۲۳)

۳۔ ولی دکنی۔ "شاعرِ والا اقتدار دکنی سخن سنج شیریں گفتار است

رتبۂ سخن ریختہ در زمانش بہ اوجِ کمال رسیدہ

و بازار ایں زبانِ آمیختہ در دہ او گرم گردیدہ

اگرچہ در ازمنہ ماضیہ موزونانِ ایں جا شعر

را بہ زبانِ ریختہ گفتہ اند اما صاحب دیوانے

بہ ایں متانت و فصاحت از کتم عدم سر نہ کشیدہ

و شعرائے سلف ہر چند طوطیٔ شکر مقالِ

بوستانِ سخنوری اند لیکن چنیں بلبلِ ہزار داستان

بہ گوش نہ رسیدہ۔ آرے دانائے ولایتِ نازک

خیالی و شہنشاہِ نظم رو خوش مقالی است۔" (ص ۴۴)

۴۔ سید عبد الولی عزلت :۔ "شعر نارسیش گوہر لسبت آبدار و نظم ریختہ اش لولوئے شاہوار۔ نکاتِ رنگین بہ یمن انفاسِ مسیحائیش زندہ و خیالاتِ شیریں بہ طبع چالاکش ناز نندہ۔" (ص ۵۲۹)

تشبیہات آمیز زبان میں اظہارِ خیال کی ان مثالوں کے پہلو بہ پہلو شفیق کے یہاں تنقید کے ایسے نمونے بھی بکثرت موجود ہیں جن کی زبان سادہ و بے تکلف اور اندازِ بیان نسبتاً زیادہ سنجیدہ و سلیس ہے مثلاً :۔

۱۔ ملک الشعرا نصرتی :۔ "شاعرے بود فصیح البیان ... ... اشعار او اکثر مضامین تازہ دارد و معانیِ بیگانہ را بہ الفاظ آشنا می سازد۔ اگرچہ الفاظ طرز بطور دکنیان بر زبانہا گراں می آید، اما خالی از لطفے دلنوازے نیست۔" (ص ۳۲۲)

۲۔ میر سجاد اکبر آبادی :۔ "شعر ایہام بسیار می گوید و مضامین خوب خوب بہ نظم می آرد۔ حقا کہ رتبۂ عالی او فوقیت بر رتبہ میاں آبرو (استادِ آں) می دارد ... ... و شعر شیرینش در عذوبت ایں حقیر بہتر از دمی شمارد۔" (ص ۳۴۹)

۳۔ سراج اورنگ آبادی :۔ "بازار ریختہ در دکن بعد ولی دکنی از و گرم گردیدہ ... ... شعر پر سوزش دل خراش و سخن

پختہ اش گلوسوز است ... مثنوی شاہ صاحب
مسمّیٰ بہ "بوستانِ خیال" ...... بنظر درآمد
حقاکہ خون از رگِ اندیشہ چکانیدہ است"۔

(ص ۴۰ و ۳۹۸)

۴۔ عارف الدین خاں عاجز"۔ شاعریست زبردست و معنی آفرینے است
صاحب قدرت۔ زمین ہائے سنگلاخ ریختہ
طرح می کند و قوافی تازہ و عجیب بکار می
برد و ہیچ جا عاجز نمی ماند"۔ (ص ۶۶)

فارسی وارد و شاعری میں محب و محبوب کا روایتی تصور عربی اور
ہندی شاعری کی روایات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں حسن و عشق کی بنیاد
کے یہ دونوں کردار ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہاشم دکنی نے
اس غیر فطری اور غیر عقلی میلان کی پیروی نہ کرتے ہوئے اپنی راہ
الگ نکالی ہے۔ شفیق ان کے کلام کی اس منفرد خصوصیت پر تبصرہ کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:۔

"چوں مقرر است کہ در عربستان مرد عاشق زن است
اکثر اشعار در زبانِ مرد نسبت زن موزون می کنند۔ مثل لیلیٰ
و سلمیٰ و سعادہ۔ و در ایران و توران عاشق مرد، مرد است۔ چنانچہ ایں از
از خواندنِ اشعار ہندی یعنی گیت و دوہرا و دیگر تصانیف ہندی
واضح می گردد و طرفہ تر آں کہ در کلام مجید قصہ عاشقی زن بر مرد
واقع شدہ یعنی قصہ یوسف علیہ السلام ...... لہٰذا
ہاشم در اشعارِ خود بموجب ضابطہ ہندی اظہارِ عشق از طرف

زن می نماید" (ص ۱۰۲)

یہ رائیں مؤلف کے بلوغِ نظر اصابتِ فکر اور غائر مطالعے کا پتہ دیتی ہیں۔ مبالغہ آرائی اور تحسین بیجا سے احتراز کرتے ہوئے مناسب انداز اور محتاط الفاظ میں خصوصیاتِ کلام پر تبصرے کی یہ روش ان کے یہاں عام ہے۔ البتہ انعام اللہ خاں یقین کے معاملے میں میر صاحب کے بیانات کا شدید ردِ عمل انھیں اس جادۂ اعتدال سے ہٹا کر اغراق و غلو کی حدود تک لے گیا ہے جیسا کہ درجِ ذیل اقتباس سے اندازہ ہوگا

"عزیزے می گوید۔ رباعی۔

جس طرح سے لاتے ہیں مضامین متین
اشعار میں ریختہ کے سودا و یقین
ایسا کوئی نہیں ہند میں ہر چند کہ ہیں
سجاد و کلیم و میر و درد و مکین

اگرچہ یقین است کہ مرزا سودا در غزل و رباعی و مخمس و مثنوی و قصیدہ و قطعہ بند و غیرہ اشعار ریختہ رتبہ رفیع می دارد و عالی تلاشی فراوان می نماید لیکن در ریختۂ یقین فصاحت و ملاحت دیگر است لموکفہ۔

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا
کرے جو فکر تتبع یقیں کا از دل جاں
کہے گا معنیِ باریک خوب خیر ہی تو
ولے نزاکت و لطف و یہ قبول کہاں (ص ۱۶۲)

یقین کو سودا کے مقابلے میں لا کے اور ان سے میر و درد سے ممتاز شعرا سے بلند تر ثابت کرنے کی یہ کوشش کسی طرح مستحسن نہیں سجاد، کلیم، اور تمکین پر تو ان کی افضلیت کو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے کلام کو تمام خوبیوں کے باوجود سودا، میر اور درد جیسے اساتذۂ فن کی تخلیقات پر ترجیح دینا حد سے بڑھی ہوئی جانب داری ہے جس کی تائید کوئی بھی ذی شعور اور صائب الرائے انسان نہیں کرسکتا۔

بعض جگہ شفیق نے میر کی طرح الفاظ کے غلط انتخاب اور محاورات کی عدم صحت پر بھی بحث کی ہے۔ اور اشعار کے ظاہری و معنوی اسقام کو نمایاں کرتے ہوئے متبادل الفاظ اور مصرعے تجویز کیے ہیں۔ ہر چند کہ اس قسم کی تجاویز و اصلاحات تعداد کے اعتبار سے درخورِ اعتنا نہیں تاہم ان میں سے بعض کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان کی روشنی میں مولف کی ناقدانہ بصیرت اور شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کیا جاسکے۔ لالہ نہال کرن داغ کا ایک شعر ہے ؎

انتظاری ہے تری اے گل پر کیفیت
دیدۂ نرگسِ ذاں میں بھرے ہیں جالے

شفیق لکھتے ہیں کہ :-

"اگر بجائے پر کیفیت "نسرین رخسار" می گفت خوب است"

(ص۔ ۹۵)

یہ اصلاح رعایت پسندی کے رجحان کی آئینہ دار ہے جعفر علی خاں ذکی کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

دل میں آدے سو کرو اب کہ گرفتار ہوا   میں تو تحقیق محبت کا گنہگار ہوا

پہلے مصرعے میں کلام کے پہلو کی گرفت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"مصرعۂ اوّل خلاف محاورۂ نکتہ چیناں است اگر چنیں می گفت خوب بود"

"دل میں کیا ہے سو کہو اب تو گرفتار ہوا" (ص ۱۸۱)

محمد باقر حزیں کے حالات میں ان کے ایک شعر کی نسبت گردیزی کے اعتراض اور سید عبدالولی عزلت سورتی کی جوابی تنقید پر مولف کا قولِ فیصل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حزیں کا شعر اور متعلقہ تبصرہ درج ذیل ہے

فرش ہو جاتا ہوں سنگِ آستانِ تیرے کو دیکھ
طور کا کرتے تھے جیسے حضرتِ موسیٰ ادب

فتح علی خاں می گوید کہ "بیہوشی حضرتِ موسیٰ از ظہورِ تجلی بود نہ از مشاہدۂ طور۔ شرح و بسط ایں قصہ از فرطِ شیوع دریں نسخہ کم خیلے بہ ایجاز و اختصار خوشیدہ شد۔ مناسب نہ افتاد من ادّعیٰ تخلیہ السند" سید عبدالولی عزلت سلمہ اللہ تعالیٰ بر حاشیہ مرقوم نمودہ اند کہ بعد از ظہورِ تجلی بر طور حضرتِ موسیٰ ہرگاہ بر طور می رفتند، بہ آدابِ تمام پا می گذاشتند ......۔ و حزیں ادب حضرتِ موسیٰ را تمثیلے کردہ است نہ کہ بیہوشیٔ اوشاں۔ پس اعتراض مصنف بیجاست و ناشی از سوء تامل است۔ راقم سطور می گوید کہ بیہوشی حضرتِ موسیٰ از ظہورِ تجلی نوشتہ واقعی است چنانچہ ملک العلام در کلام ذوی الاحترام می فرماید فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ......۔ لیکن از بیت نو کور معنی بیہوشی استخراج نمی شود، مگر معنی

"فرش شدن" معنی "بیہوشی" قرار باید۔ در صورت این معنی ربط مصرع با مصرع نمی شود و چسپانی مطلق نمی گردد و جوابے کہ سید عزت سلمہ، ربہ نوشتہ بجا، زیرا کہ فرش شدن را چرا بہ معنی بیہوشی باید گرفت یعنی معنی قرب صاف از ادب استخراج چرا نہ باید کرد تا چسپانی مصرعین شود و معنی درست معلوم گردد"۔

(ص۔ ۱۲۲۔ ۱۲۴)

اس بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شفیق ذاتی غور و فکر کے ذریعہ مسائل کی تہ تک پہنچنے کے عادی ہیں۔ اور کسی شخص کے دعووں کو محض اس بنا پر کہ وہ ایک مسلمہ علمی و ادبی حیثیت کا مالک ہے بلا حجت تسلیم کر لینا آئین درایت کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نمونہ کلام کے سلسلے میں انھوں نے انفرادیت کو بالائے طاق رکھ کر بلا استثناء وہ تمام اشعار اپنے یہاں شامل انتخاب کر لئے ہیں جنھیں میر اور گردیزی اپنے تذکروں میں نقل کر چکے ہیں۔ "نکات الشعرا" سے منقول میر صاحب کے کلام کے بارے میں درج ذیل بیان اس ضمن میں ان کے موقف کی وضاحت کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"ایں قدر اشعار خود میر محمد تقی میر در اختتام تذکرہ "نکات الشعرا" می نویسد۔ اگرچہ دل نخواست کہ ایں ہمہ را بہ قید قلم آرد و ایں قلم درد سر بیجا بنظار رگیان دہد۔ لیکن چوں انتظام نمودہ کہ اشعار تذکرہ نیز ہم بر طرازم، مانع آمد لاچار۔ آں کل را نقل بر داشتہ می شود"۔

(ص ۲۶۲۔ ۲۶۳)

بعض شاعروں کے کلام کے تحت شفیق نے ضمنی طور پر کہیں کہیں اپنی ہم طرح غزلیں بھی نقل کی ہیں مثلاً۔

حاتم

جیوں کہا قاصد نے چل حاتم بلایا ہے تجھے
دل ستی جاتا رہا سُنتے ترا پیغام غم

کاتب الحروف دریں زمین ریختہ دارد ایں است

آج مجھ سے ہو گیا ہے من و عن آرام رم
اب تو کچھ جور و جفا کر اے بُتِ خود کام کم"

(ص ۔ ۱۳۹)

جامی

"مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستاں کی بہار"
"فقیر دریں زمین ریختہ بسلکِ نظم کشیدہ ایں مصرعہ را تضمین بچنیں نمودہ۔

چاہ کنعاں کی عبث صاحب سخن جامی کا سُن
مکتبوں میں ہند کے ہے یوسفستاں کی بہار

(ص ۱۶۱)

شفیق ہجو گوئی و ہزل نگاری کو پسند نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اصنافِ سخن بہت جلد شاعر کے سر پر شہرت و مقبولیت کا تاج رکھ دیتی ہیں۔ چنانچہ غلام حسین خاں آتش کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"از بسکہ ہجو بر مزاجش غالب آمد شہرۂ عوام گردید۔ در شعر تتبع زاں می نماید و اکثر مزاج او بہ طرف ہزل می آید . . .
. . . ۔ کاش کہ ایں خیالی در دل او جا نیا فتے و آفتاب اشعار رنگین بر سینہ اش نتافتے" (ص ۱۴۱)

گذشتہ اوراق میں صاحب "نکات الشعرا" سے شفیق کے شدید اختلافات کی جانب کچھ اشارے کیے جا چکے ہیں۔ یہاں ہم یقین کے حالات سے ایک اور اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں میر صاحب کی خوردہ گیری و نکتہ چینی کی عادت اور یقین کے ایک شعر پر سرقے کے الزام کی سخت ترلہجے میں گرفت کی گئی ہے۔ یہ عبارت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مولف نے اس بحث کے ضمن میں اپنے دستور العمل کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ "نکات الشعرا" کے ایک اقتباس سے ابتدا کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"کیا بدن ہوگا وہ جس کے کھولتے جامے کا بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

میر تقی میر در ترجمہ یقین می طرازد کہ "اگرچہ شاعران ریختہ را بتذل بند یافتہ ام۔ بتذل می گویند و توارد می نامند گویا ایں شعر استناد در حق الشان است

ہر چہ گویند بے محل گویند در توارد غزل گویند

لاکن شریفیں لفظاً لفظاً بتذل رائے اندرام مخلص است۔۔

۔۔۔۔ طرفہ تر اینکہ آں ہم دو سلیقہ مرتہ یک بودہ است خدا داند کہ ایں معنی در اصل از کیست شعر ایں است ۔۔۔۔۔

ناخن تمام گشت معطر چو برگِ گل
بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

انتہی" ناچار مہر سکوت از دہن بر می دارم و حرفے بنا سخن فہمی بنگارم کہ کسانیکہ تذکرہ می نویسند احوالی ہر یک را از ستم ظریفی بیجا پردہ پوجے بقلم می آرند۔ از شاں را چہ گوہر استفادہ بدامن

می افتند مگر اینکہ در دلِ خود نازاں می شوند کہ ما ہم چنیں ہستیم کہ بر چنیں
شاعراں دخل ہا کردہ ایم و غافل ازیں کہ "چاہ کندہ را چاہ
در پیش" مردانِ در پسِ غیبتِ مصنف ہر چہ کلماتِ ناشایستہ در
حق او می گویند۔ آرے

عیبِ مردم فاش کردن بدترین عیب ہاست
عیب گو اول کند بے پردہ عیبِ خویش را

چنانچہ مشاہدہ باید کرد کہ ہر چہ بد در حق ما کردہ در یقین چہ نیک
نمودہ کہ کمر برایذا بستہ ایم مگر بہ عیب گیری او خون بجوشے می
آید الفاظ چند بر جریدہ ثبت می نماید۔ اول می باید کہ خود
را بیاراید بعد ازاں بر دیگراں ستم ظریفی نماید۔ خود اصلا
مذاقِ سخن نمی دارد و بر دیگراں سخن می نہد۔ اگر در سخنِ خطا و
سرقہ بگیریم بیتے از انتخاب او کہ آخر تذکرہ خود نوشتہ، درست
نخواہیم یافت لیکن در روزِ ازل رسام ارادت بقسمت ما نقش
نہ نوشتہ کہ انگشت بر حرفِ کساں نہیم و ایں توفیق حق سبحانہ
تعالیٰ نہ دادہ کہ آہو گیری ابنائے جنس خود نمائیم باید کہ نیز از زبان
خود تامل می شود و دادِ کلام می نہد یعنی در جائے ترجمہ یقین می نویسد
از اشعر مرزا مظہر گفتہ می دہند بجائے نوشتہ کہ شعر یقین لفظاً لفظاً
بجنسہ لی رائے اشند رام مخلص است نیز گوید کہ او ہم سلیقہ شعر درست
نمی دارد۔ واللہ اعلم از کیست ازیں دریافت باید کرد و علیٰ ہذا القیاس
ما ہم می خواہیم کہ تیغ زبان برکشیم و دخل در قلم رو سخنِ غیر بجنبیم چنانچہ ما را
آں قدر احوالِ شعرا از نیک و بد معلوم است کہ دیگرے را دبرو اطلاع

یافتن بہ تنہا می کنند لاکن از روزِ شمار دسواس بہ خاطر راہ می یابد و اندیشہ از ابنائے نوع دامنِ دل می گیرد۔ لہذا ہر اداۓ را تعدد مقدور خود بہ نیکی یاد کردم و ہر جائے کہ در احوالِ آشنا مصرع ثقیل یافتہ از طرفِ خود ضم کردم و بجائے غیر مصرعے نوشتم و گفتم کہ ایں چنیں ہم خوب می نماید بارے اختیار پسند در قبضۂ مصنف است خود چرا تصحیح باید داد کہ من از و بہتر یافتہ ام آنانکہ مبصر اند می پسند ارند۔“ (ص ۱۹۹ تا ۱۹۸)

اس سلسلے میں آگے چل کر ”افسانہ از افسانہ می خیزد“ کے بمصداق ایک اور دلچسپ بحث نکل آتی ہے جو شاعری کی نوعیت کے بموجب شعرا کی گروہی تقسیم سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

”در دالتِ فقیر بود زبان چہار قسم اند یکے آنکہ شعرگے را کہ لفاظتِ الفاظ و معانی بنام خود خواز ایں را حاجتِ تمثیل نیست۔ دوم آن کہ معنی لطیف کسے دیدہ بہ لفاظتِ الفاظ تغیر دادہ بخود نسبت دہد۔ بریں حمل تو ار دہم می تواں کرد اما بہ ترکیب بستگی او نظر باید نمود کہ در ہر کہ نزاکتِ خاص باشد مقبول باید داشت۔ سوم جماعتے اند کہ ردوادِ مضمون و الفاظ غیر اصلاحی شوند، اگر توارد افتد ایں امر علیحدہ است لیکن تا مقدور لعد تحقیقات از دیوان خود حک می کنند کہ اولی قبیح باشد یا احسن۔ ایں را ہمت عالی می باید، از ہر کسے نمی تواند شد۔ چہارم گروہے اند کہ مضمون زبانے بزبانِ دیگر بہ احسن وجہ بیارند چنانچہ مضمون فارسی بریختہ و مضمون ریختہ بفارسی علیٰ ہذا القیاس ایں امر را احسن پندا شتہ

اندر دور انام نہادہ" (ص ۱۷۲)

شفیق نے جہاں کچھ شاعروں کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے متعلق کافی شرح و بسط کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے، وہیں بعض لوگوں کے بارے میں ان کے بیانات حد درجہ مختصر اور تشنہ ہیں۔ اس اختصار اور تشنگی کے لئے دوسرے اسباب کے علاوہ کسی حد تک ان کی عجلت پسندی بھی ذمہ دار ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ بے نوا۔ "شخصے معنی آفریں بہ طرز ہندوستان گرفتہ۔ احوال او بہ چہ خوب تنقیح نمی پذیرد" (ص ۵۰)

۲۔ شاہ عزیز اللہ عزیز۔ "عزیز سحر نازک خیالی است" (ص ۳۴۴)

۳۔ ندا۔ "احوالش بہ فقیر نرسیدہ۔ ایں قطعہ فتح علی خاں در تذکرہ خود نوشتہ بود بقلم آمد" (ص ۴۵۸)

۴۔ فخری۔ "احوالش معلوم نیست میر محمد تقی میر ایں یک بیت از وی نویسد" (ص ۴۸۶)

۵۔ قائم چاندپوری۔ "ذہن سلیم و طبع مستقیم دارد۔ اشعار آبدارش محتوی لطافت و ابکار افکارش حاوی ملاحت" (ص ۱۰۷)

تذکرے کا نمایاں نقص جس کی طرف اس سے پہلے بھی ضمناً اشارے کیے جاتے رہے ہیں، شفیق کا پُر تکلف اور صنائع آمیز اسلوبِ نگارش ہے، وہ سلاست و سادگی سے گریزاں اور رنگینی و رعنائی پر فریفتہ ہیں۔ اگرچہ ان کی سلیقہ مندی و چابک دستی نے عام حالات میں ان کی تحریر کو ابہام اور پیچیدگی کا شکار ہونے سے بچالیا۔ ہے جو مرصع سازی کے اس رجحان

کے نتیجے میں تقریباً ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن مست و سرشار قدم تمام حزم و احتیاط کے باوجود کبھی نہ کبھی لڑکھڑا ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ "چمنستان شعرا میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ درج ذیل مثالوں سے واضح ہو گا کہ بعض جگہ محض زبان پر حاکمانہ قدرت کے اظہار اور زورِ قلم کی نمود و نمائش کے لئے مولف نے کس قدر سامعہ فریب اور سحر آفریں انداز بیان اختیار کیا ہے۔ قزلباش خاں آمید کے حال میں اس مضمون کو کہ ان کے اشعار میر صاحب کے تذکرے سے نقل کئے گئے ہیں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

"طاؤسانِ خیال او با حسن و جمال از صحرائے تذکرہ میر بوجہ دریں سبزہ زار برقص می آیند و برِ دلِ تفرجیانِ ایں گلشن باغ تازہ بر آں می فزایند" (ص ۲۹)

لالہ ٹیک چند بہار کے ذکر میں بہار و چمن کے تلازمے ملاحظہ ہوں۔

"طرہ پر پیچ سنبلِ مویانِ نسرین رخسار نازک خیالی را پشانہ قلم و زبان وا می نماید و ابرہ ہائے خمدار سرو قامتانِ نو دو رضا شیریں مقالی را بہ سوادِ سیاہی وسمہ می آراید" (ص ۴۴)

اسی طرح کچھ اور شاعروں کے متعلق بھی ان کے نام یا تخلص کی رعایت سے نہایت مبہم و مختصر جملوں میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مثلاً:-

۱۔ میرزا اوآدہ۔ "شکر بیانی از شغلش پیدا و خوش الحالی از نامش ہویدا است" (ص ۸۰)

۲۔ مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ "یک رنگی اخلاصش از تخلص او بید و خلق محمدی از نامش ہویدا است" (ص ۲۴۳)

۳۔ محمد حسین کلیم۔ "عصائے گلشن سحر شکن می نماید و بخط بلندش۔ دار چشم ورق۔ سرمی آراید" (ص ۲۴۴)

عاجز دہلوی کے متعلق درج ذیل جملوں میں لفظ "عاجز" کی غیر ضروری تکرار گراں گزرتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"از شعرائے ہندوستان است۔ جو ذہن عاجز دکن مشہور آفاق و شوخی مزاج عاجز ہندوستان از ہمیں بیت او ہویدا است ظاہرا تخلص عاجز را شرف است۔ سوائے ایں بیت عاجز کہ بتذکرہ نکات الشعراء تحریر است دیگر بسمع ایں عاجز نرسید۔"

کلام کے انتخاب و اندراج میں شفیق (ص ۱۴۴)

کلام کے انتخاب و اندراج میں شفیق نے بالعموم احتیاط سے کام لیا ہے حتی کہ جن شعروں کی ملکیت کے بارے میں کوئی قابل اعتبار سند نہیں مل سکی ہے انھیں متن کی بجائے تذکرے کے آخر میں بطور ضمیمہ جگہ دی ہے پھر بھی بعض اشعار غلطی سے اصل مصنفین کے بجائے دوسرے شاعروں کے سرمایۂ افکار میں شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً میر حسن کے استاد میر ضیا دہلوی کا یہ شعر خان آرزو سے منسوب ہے۔

جب تلک تھا صاف قاصد کو جواب صاف تھا
اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

مندرجہ ذیل اشعار دیوان کے اکثر نسخوں میں موجودگی کی صراحت کے ساتھ انعام اللہ خاں یقین سے منسوب کیے گئے ہیں۔

بدلہ ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوبرو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے
قاتل ہماری نعش کی تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے

چونکہ یہ اشعار مزید ایک شعر اور مقطع کے ساتھ دیوان یقین کے مطبوعہ

نسخے میں بھی موجود ہیں[1]۔ اس لئے بظاہر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن سید
صباح الدین عبدالرحمن نے دیوان فغاں کے ایک قلمی نسخہ مملوکہ پنجاب
یونیورسٹی کے حوالے سے انھیں اشرف علی خاں فغاں کی تصنیف قرار دیا
ہے[2]۔ اور میر حسن نے پہلے دو اشعار پر مرزا رفیع سودا کی ملکیت ظاہر کی
ہے[3]۔ سودا کے دیوان میں الحاقی کلام کی افراط کے باوجود یہ آخری
انتساب ہمارے خیال میں اس بنا پر قابل ترجیح ہے کہ یہ تینوں شعر اُسکے
یہاں صرف متعلقہ غزل ہی میں شامل نہیں، اس تضمین میں بھی موجود ہیں
جو انھوں نے اپنی غزل کے اشعار پر کی ہے[4]۔ اور یہ ایک ایسا فیصلہ کن
ثبوت ہے جس کے بعد مزید تحقیق و تلاش کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے انتخاب کلام میں یہ اشعار بھی شامل ہیں۔

ملاحت ہے تمھارے حسن میں جا دیدہ روز افزوں
اگر شوخی کی موجا وے، ہوئے ہر دم عاشق کا

کھول کر بندِ قبا دل کے تئیں غارت کیا
کیا حصارِ قلب دلبر کے کھلے بند دل لیا

پہلے شعر کے متعلق تو اس وقت یہ بتانا محال ہے کہ یہ کس کی تخلیق ہو لیکن
دوسرا شعر بادنیٰ تغیر الفاظ خان آرزو اور احسن اللہ احسن سے منسوب
کیا جاتا رہا ہے۔ محمد شاہ کے انتخاب کی مثال کسی دوسرے تذکرے میں

---

[1] دیوانِ یقین مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ص ۴۴

[2] دیوان فغاں مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن ص ۳۱ و ۵۸

[3] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۸۵

[4] کلیاتِ سودا مطبوعہ نولکشور پریس (مطبوعہ ۱۲۸۹ھ) ص ۳۲۸ و ۳۲۹

نظر نہیں آتی۔

سوزؔ اکی ایک غزل کا مشہور مطلع ہے ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

شفیقؔ نے اسے قائمؔ کے کلام کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ چونکہ قائم کے تذکرے سے بھی سوزؔ ہی کی ملکیت کی تائید ہوتی ہے اس لئے یہاں بھی الحاق کا امکان مفقود ہے۔

ان معدودے چند خامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے بحیثیت مجموعی یہ یہ تذکرہ کافی اہم ہے اور قابل قدر ہے اور قدیم ادب سے متعلق تحقیق و تنقید کے مرحلے میں ایک ناگزیر ذریعۂ معلومات کی حیثیت رکھتا ہے۔

طبقات الشعراء

"طبقات الشعرا" کے مولف مولوی قدرت اللہ قدرت و شوق سنبھلی (متوفی ۱۲۲۴ھ ۱۸۰۹ء) جنھیں رام پور میں طویل قیام کی بنا پر بالعموم رامپوری کہا جاتا ہے اصلاً موضع موئی مضافاتِ سنبھل ضلع مرادآباد کے رہنے والے تھے[1]۔ وطن و مسکن کا یہ فرق اور شہرتِ عام کی منزل تک پہنچنے کے بعد قدرت کی بجائے شوق کا تخلص کے طور پر انتخاب تذکرہ نگاروں کے یہاں انکے تعارت کے سلسلے میں ایک قسم کے خلط مبحث کا سبب بن گیا ہے، چنانچہ مصحفی جو محمد یار خاں امیر رئیس ٹانڈہ کی ملازمت کے دوران قائم چاند پوری کی صحبت میں ان سے ایک ملاقات بھی کر چکے تھے "تذکرہ ہندی" میں انھیں مولوی قدرت اللہ قدرت مقیم رام پور مولف تذکرہ ہندی گویاں کی حیثیت سے[2] اور "ریاض الفصحا" میں مولوی قدرت اللہ شوق ساکن رام پور کے نام سے[3] یاد کرتے ہیں "عیار الشعرا"، "عمدۂ منتخبہ"، "مجموعۂ نغز"، "تذکرہ بے جگر" "گلشن بے خار" اور دوسرے تذکروں میں بھی غالباً مصحفی کی تقلید ہی کے نتیجے میں ان کی شخصیت اسی طرح دو مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے اس غلط فہمی سے قطعِ نظر تقریباً تمام تذکرہ نویس ان کے فضل و کمال کا دت، ذہانت اور استادی و مشاقی کے معترف ہیں۔ میر غلام علی عشرت بریلوی

---

[1] نسخۂ آصفیہ ورق ۸۶/۴ ب۔ آج کل یہ گاؤں تحصیل بہیڑی ضلع بریلی میں ہے۔

[2] تذکرہ ہندی ص ۱۷۵

[3] ریاض الفصحا، ص ۱۵۰

(متوفی ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء نے پدماوت (مصنفہ ۱۲۱۱ھ/ ۹۷-۱۷۹۶ء) کے دیباچے میں رام پور میں ہر ہفتے جمعہ کی نماز کے بعد ان کے مکان پر شاعرے کے انعقاد کا بھی ذکر کیا ہے[1] جس سے ان کی ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے تصنیفی و تالیفی کارناموں کے ذیل میں "طبقات الشعراء" کے علاوہ تاریخ عالم کے موضوع پر ایک کتاب "جام جہاں نما" (مرتبہ مابین ۱۱۹۱ھ و ۱۱۹۹ھ) اور شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ "تکملۃ الشعرا" (۱۱۹۹-۱۲۱۳ھ) بھی ان سے یادگار ہے۔

"طبقات الشعراء" کے دو قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری) اور سینٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن میں محفوظ ہیں۔ ترقیمے کے مطابق پہلے نسخے کی کتابت پنجشنبہ ۹ رجب ۱۲۰۱ھ/ ۲۶ اپریل ۱۷۸۷ء کو فیض علی کے قلم سے مکمل ہوئی ہے۔[2] دوسرا نسخہ سید محمد علی ملیح آبادی نے ماہ رمضان ۱۳۶۵ھ (اگست ۱۹۴۶ء) میں حیدرآباد ہی کے کسی کرم خوردہ مخطوطے سے نقل کیا ہے جس کی تفصیلات کتابت بعینہ اول الذکر نسخے کے ترقیمے سے مطابقت رکھتی ہیں۔

یہ دونوں مخطوطات درمیان سے ناقص ہیں اور اس اعتبار سے ان میں کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں لیکن بعض لفظی اختلافات کے پہلو بہ پہلو نسخۂ آصفیہ کے کرم خوردگی و بوسیدگی سے مبرا ہونے کی بنا پر ریکارڈ آفس کے نسخے کو اس سے منقول نہیں کہا جا سکتا۔ اس ظاہری صورت حال کے علاوہ زیر بحث مخطوطات میں ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ء کے بعد پیش آنے والے متعدد واقعات کے

---

[1] نجم الغنی "تذکرہ کاملان رامپور" ص ۳۰۱

[2] اس نسخے کی تلخیص ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے علیگڑھ میگزین، تعطیلات نمبر بابت اگست ۱۹۳۰ء میں شائع کر دی ہو مگر یہ تلخیص حد درجہ ناقص اور تحریف شدہ ہے۔

ذکر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے متن ۱۲۰۱ھ/۸۷-۱۷۸۶ء کے لکھے ہوئے کسی ایسے ناقص نسخے یا اس کی نقول پر مبنی ہیں جس میں کتابت کے عرصہ دراز کے بعد مولف کی نظر ثانی کے نتیجے میں وقوع پذیر تبدیلیاں اور اضافے شامل کر لئے گئے تھے۔ بحالت موجودہ حیدر آباد کے یہ نسخے دو سو اٹھاسی ۲۸۸ شاعروں کے تعارف اور منتخب اشعار پر مشتمل ہیں جن میں مرزا محمد رفیع سودا، قبول رائے دفا اور باقر علی ممنون کے حالات اور کلام کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا ہے[1]۔ ناقص الاول فہرست کی رو سے اس تعداد میں مزید بارہ شاعروں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

طبقات الشعرا کا تیسرا نسخہ کتب خانہ دار المصنفین اعظم گڈھ کی ملکیت ہے[2] ہوئے اتفاق سے یہ نسخہ بھی ناقص الآخر ہے چنانچہ اس کے کاتب اور سنہ کتابت کے بارے میں کوئی علم نہیں البتہ اس سے ان درمیانی کڑیوں کی دریافت میں کافی مدد ملتی ہے جن کی عدم موجودگی کے باعث سابق الذکر نسخوں کی سالمیت ختم ہو گئی ہے۔ اس نسخے میں حیدر آباد کے نسخوں کے مقابلے میں جن شاعروں کا ذکر زیادہ ہے، ان کو شامل کر کے شعرا کی مجموعی تعداد ۳۰۷ ہو جاتی ہے اس تذکرے کا ایک اور قلمی نسخہ لالہ سری رام کے کتب خانے میں موجود تھا[3] جو ایک اطلاع کے مطابق اب لاہور پہنچ چکا ہے منتشر اوراق کی صورت میں اس کی ایک نقل پٹنہ میں قاضی عبد الودود

---

[1] حال ہی میں شوق کا یہ تذکرہ جناب نثار احمد فاروقی کے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے شائع ہو گیا ہے یہ اشاعت حیدر آباد کے انھیں دونوں نسخوں پر مبنی ہے۔ [2] اس مخطوطے کی ایک نقل راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔
[3] خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۱۸

صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان اوراق کے سرسری مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ معلومات کی حد تک یہ اس تذکرے کا آخری ترمیم شدہ نسخہ ہے جس میں متعدد شعرا کا اضافہ کیا گیا ہے لیکن ان کی صحیح تعداد کا تعین دشوار ہے۔

تذکرے کی تالیف کے اسباب و محرکات کے سلسلے میں مولف کا بیان ہے کہ:۔

"از ایام طفلی بہ اتفاقِ صحبتِ سخن طرازاں...... شوق کلام موزوں از ہر زبانے کہ باشد خصوصاً زبانِ ریختہ بہ سبب مناسبتِ ہم زبانی در دل عزیزم زیادہ از حد بود۔ اکثر اشعار استادانِ ایں فن از دواوین مولفہ و ابیاض متفرقہ تلاش و تجسس نمودہ بودم۔ می خواستم کہ ایں ہمہ مخزناتِ رابطریق تذکرہ تالیف سازم نا ما بہ سبب عدم مساعدتِ روزگار فرصتِ وقت نمی یافتم و با وجود فرمائش بعضے عزیزان در تعویق می انداختم بالضرور رضا شدی آنہا کہ از جملہ لزومات بود، مقدم جمیع امور داشتم در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتا و و ہشت ہجری کہ تعطیل و تنہائی محض لاحق حالِ ایں ہیچدان بود، براین صور و نقوش کاغذی صحبت برگزیدم و ایں چند اوراق در سلکِ تحریر در آوردم ...... و تالیف ایں مختصر کہ مسمی بہ طبقات الشعرا است بر چہار طبقہ و خاتمہ نمودہ شد" (نسخۂ آصفیہ ورق ۲ ب و ۳ الف)

"تکملۃ الشعرا" میں شوق کے متعدد مقامات پر مختلف ناموں سے اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ کہیں وہ اسے صرف "تذکرہ ہندی" لکھتے ہیں اور

کہیں "تذکرۂ طبقات شعرائے ہندی" یا "حقیقت الشعرا" کے نام سے اس کا حوالہ دیتے ہیں[1]۔ ان میں سے پہلا نام ہمارے خیال میں کتاب کے موضوع کی وضاحت کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے نام میں ادبی تصرف کے بعد لفظ ہندی کا اضافہ بھی اسی رجحان کا آئینہ دار ہے۔ تیسرا نام اعزالدین عزیز عثمانی بدایونی کے مستخرجہ مادہ تاریخ "حقیقت شعرا" کی ترمیم یافتہ شکل ہے، جس سے تذکرے کا سال تکمیل سنہ ۱۱۸۹ھ برآمد ہوتا ہے[2]۔۔۔

سنہ تالیف سے متعلق یہ شہادت "طبقات الشعرا" کے نقش اول کی تشکیل و ترتیب کا زمانہ متعین کرتی ہے۔ مولف کے بیان اور تاریخ میں ایک سال کا فرق اس لئے قابل لحاظ نہیں کہ نواب محمد یار خاں امیر متوفی یکم ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ، ۲ جنوری ۱۷۷۵ء[3] کے ذکر میں اس واقعہ کے بیان سے کہ ان کے انتقال کو ایک ماہ کے قریب ہوا ہے[4]۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ جنوری ۱۷۷۵ء تک تذکرے کی تسوید و تحریر کا سلسلہ جاری تھا اور بظاہر شوق ۱۱۸۹ھ کے اوائل ہی میں اس کام سے فارغ ہوئے ہوں گے۔

شیخ چاند کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ء) میں مولف نے اس تذکرے میں "معتدبہ اضافہ کیا تھا"[5] سودا

---

[1] بحوالہ دستور الفصاحت دیباچہ مرتب ص ۱۰

[2] "تاریخ ایں تذکرۂ نغز "حقیقت شعرا" خوب گفتند" نسخۂ آصفیہ ورق ۷۰ ب الف

[3] اخبار الصنادید جلد اول ص ۵۶۰ و انتخاب یادگار ص ۳۴۲

[4] قریب یک ماہ شد کہ ازیں جہان فانی رحلت نمودہ" نسخۂ آصفیہ ورق ۸۸ اب

[5] سودا ص ۱۲۷

سے متعلق اپنے تحقیقی کام کے دوران شیخ صاحب موصوف ۱۲۰۸ھ میں ترتیب یافتہ نسخے کے ساتھ ہی اس نقش ثانی سے بھی استفادہ کر چکے تھے ..... لیکن ہمیں ایسے کسی نسخے کے بارے میں ابتک کوئی علم نہیں ہو سکا جس میں بالصراحت ۱۲۰۹ھ میں تشکیل جدید کے اس عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ البتہ جیسا کہ اس سے قبل بھی ضمناً عرض کیا جا چکا ہے، زیر نظر نسخوں میں ایسے قرائن و شواہد بکثرت موجود ہیں جن سے شیخ صاحب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہاں بنظر اختصار صرف چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) مصحفی کے بارے میں شوق کا بیان ہے کہ

"رتبۂ سخن از الحال بہ مرتبہ رسیدہ کہ در لکھنؤ در جرگہ شعرا داخل است" (ورق ۱۵۹ الف)

مصحفی دہلی سے ترکِ سکونت کے بعد ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں لکھنؤ پہنچے تھے[1]۔ ان کی شہرت کے عروج و شباب کا زمانہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز کے ساتھ شروع ہوا اگر اس مؤخر الذکر پہلو کو نظر انداز کر کے صرف قیام لکھنؤ ہی کی بنیاد پر زمانہ تحریر کا فیصلہ کیا جائے تب بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ شوق نے مصحفی کے حال میں یہ اضافہ ۱۱۹۸ھ کے بعد کیا ہے۔

(ب) میر ضیا دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"از استادان میر حسن کہ مصنف بدر منیر است بودہ" (ورق ۱۴۰ ب)

---

[1] عقد ثریا۔ ص ۱۴۴

میر حسن کی یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء کی تصنیف ہے[1]۔ اس لئے اس کے حوالے کی نوبت اس سنہ کے بعد ہی آئی ہوگی۔

(ج) مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ

"مدت است از یں جہان فانی راہ آخرت پیمودہ" (ورق ۷۵ الف)

جہاں دار شاہ کا انتقال شعبان ۱۲۰۲ھ (مئی ۱۷۸۸ء) میں ہوا ہے[2]۔ اور شوق کے انداز بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی تحریر کے وقت اس واقعے کو گزرے ہوئے چھ سات سال کی مدت ضرور ہو چکی تھی۔

(د) مرزا سلیمان شکوہ کے حال میں لکھتے ہیں کہ

"از مدتے بسبب افراط و تفریط روزگار ناہنجار از قلعۂ دہلی برآمدہ در لکھنؤ اقامت ورزیدہ، اوقات در گوشہ گیری می گزارد"

(ورق ۷۶ ب و ۷۷ الف)

سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد میر کا بیان ہے کہ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں بعہد آصف الدولہ لکھنؤ میں وارد ہوئے اور نصیر الدین حیدر کے زمانۂ جلوس (۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء) تک کمال اعزاز و احترام کے ساتھ وہیں مقیم رہے[3]۔ چونکہ شوق نے ان کے متعلق یہ جملے ایسے وقت میں سپرد قلم کئے ہیں۔ جب کہ قلعۂ معلی سے ان کے خروج اور لکھنؤ میں آمد کے واقعات

---

[1] مثنوی سحر البیان ص ۱۵۹-۱۶۰۔ [2] "تاریخ اودھ" از نجم الغنی جلد سوئم ص ۶۲ و "دی فال آف دی مغل ایمپائر" از جادو ناتھ سرکار جلد چہارم ص ۲۶۵۔ عرشی صاحب نے "نادرات شاہی" کے دیباچے میں (ص ۵۲-۵۳) ایک اہم دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر جہاندار شاہ کا زمانۂ وفات ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ کے بعد متعین کیا ہے۔

[3] سوانحات سلاطین اودھ و قیصر التواریخ جلد اول ص ۲۸۰-۲۸۲

بیتے ہوئے دنوں کی بات بن چکے تھے۔ لہٰذا ان کا ترجمہ بالیقین ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) کے کئی برس بعد کی تحریر ہے۔

(۵) قدرت اللہ بلیغ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

"چند سال شد کہ بطرف کعبۃ اللہ رفتہ بود۔ شنیدہ می شود کہ الحال بطرف نواح دکن استقامت دارد" (ورق ۱۶۱-الف)

عبداللہ خاں ضیغم کے بیان کے مطابق بلیغ ۱۲۰۸ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) میں دکن پہنچے تھے[۱]۔ اگر یہ روایت درست ہے تو ان کے حالات یا کم از کم یہ جملہ ۱۲۱۰-۱۱ھ/۹۷-۱۷۹۶ء یا اس کے بھی کچھ بعد کا اضافہ ہے۔

ان شواہد سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ شوق نے اس تذکرے میں شیخ چاند کی اطلاع کے بموجب ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ء) ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی جابجا اضافے کئے ہیں۔ یہ سلسلہ بہر صورت ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء کے تین چار سال بعد تک ضرور جاری رہا ہے۔

اپنے نام کی مناسبت سے یہ تذکرہ مفصلہ ذیل طبقات پر منقسم ہے۔

طبقۂ اولیٰ۔ در بیان ایجادِ شعر ریختہ و ذکر شعرائے دکنی و بعضے معاصرین آنہا (۲۹ شعرا)

طبقہ دوم۔ در ذکر شاعرانِ ایہام گو (۲۰ شعرا)

طبقہ سوم۔ در ذکر شعرائے متاخرین و بعضے نومشقانِ دیگر (۶۹ شعرا)

طبقہ چہارم۔ در ذکر شعرائے تازہ گو و بعضے نو مشقانِ دیگر مشتمل بر پنج مقالات (۱۹۷ شعرا)

مقالہ اول: در ذکر بعضے تازہ گویان سر آمد روزگار (۱۰ شعرا)

---

[۱] یادگار ضیغم قلمی بحوالہ فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو ص ۱۳۲

مقالہ دوم:۔ در ذکر بعض سلاطین روزگار و وزرائے نامدار و امرائے والا تبار و بعضے منصب داران سرکار فیض آثار و مصاحبان (۲۰ شعرا)

مقالہ سوم:۔ در ذکر بعضے امراء افغانان ایں دیار وغیرہ و افاغنہ قرب وجوار (۲۰ شعرا)

مقالہ چہارم:۔ در ذکر بعضے عزیزان و یاران ہمدم و دوست داران ثابت قدم (۱۱ شعرا)

مقالہ پنجم:۔ در ذکر بعضے برادران و خویشان و دوست داران و یاران ارشیان و بعضے نوشتقان کہ چنداں مایۂ شاعری ندارند و بسبب موزونی طبیعت خود را از خود زیادہ پنداشتہ در جرگہ شعرا می شمارند۔ (۸۶ شعرا)

مراتب اور زمانے کے اعتبار سے شعرا کی یہی مفصل اور واضح گروہی تقسیم "طبقات الشعرا" کا طرۂ امتیاز ہے۔ مورخانہ شعور کی اس کارفرمائی کی مثال اس سے قبل قائم چاندپوری کے علاوہ کسی دوسرے تذکرہ نگار کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ "مخزن نکات" کی طرح یہ نقص اس تذکرے میں بھی موجود ہے کہ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی ہوئی فہرست کے بغیر بعض اوقات کسی خاص شاعر کے حالات و کلام کی جستجو ایک مرحلہ دشوار کی صورت اختیار کر لیتی ہے تاہم تاریخی نقطۂ نظر سے شوق کے اس کارنامے کا اعتراف ناگزیر ہے۔

"طبقات الشعرا" سے پہلے شمالی ہند میں شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے جا چکے تھے، خیال ہے کہ شوق اپنے علمی شغف اور شعرائے اردو کے

جو تذکرے لکھے جا چکے تھے، خیال ہے کہ شوق اپنے علمی شغف اور شعر و ادب سے دلچسپی کی بنا پر ابتدا ہی میں ایک عام قاری کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کر چکے ہوں گے۔ بعد ازاں جب انھوں نے خود بھی اس میدان میں قدم رکھا تو دوسرے عوامل اور معلوماتی ذرائع کے ساتھ ہی پیش رو اہلِ قلم کے جلائے ہوئے ان چراغوں نے بھی انھیں ایک راہ و رسمِ سفر سے آگاہ مسافر کی طرح اپنی منزل کی طرف بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"چوں دیدم کہ ذکرِ اکثر استادان در تذکرۂ مؤلفین سابق کہ احوالش خواہد آمد، موجود است از انہا برآوردیم و اشعارِ اکثر استادانِ تازہ گویان و مشتاقان کہ خارج از تذکرہ ہا بود نیز از بیاض ہا تجسس نمودہ درج کردیم تا چندے موجبِ اشتہار و باعثِ یادگاری نام چندیں بزرگوار بر صفحۂ روزگار گردد۔" (ورق ۳ الف)

شوق نے اس سلسلے میں کن کن تذکروں سے استفادہ کیا، ان کی تحریریں اس کے متعلق واضح طور پر کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں۔ صرف خاکسار اور میر کے حالات میں مجملاً ان کے تذکروں کا ذکر آیا ہے لیکن وہاں بھی اس امر کی تصدیق کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ یہ تذکرے واقعتاً ان کی نظر سے گذر چکے تھے۔ تذکرہ خاکسار چونکہ نایاب ہے اس لئے اس امکان سے قطعِ نظر کہ اس کے متعلق شوق کی اطلاع میر کے بیان پر مبنی ہو سکتی ہے ان سطور میں اس استفادے کی نوعیت پر اظہارِ خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ البتہ "نکات الشعرا" کے مطالعے اور اس سے کسبِ فیض کی توثیق کے لئے دونوں تذکروں سے چند ہم مضمون عبارتیں یہاں نقل

کی جاتی ہیں۔

نکات الشعرا	طبقات الشعرا
مرزا مظہر۔ "خوش تقریر بمرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔" (ص ۵)	"خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی آید۔" (ورق ۲۶ ب)
آبرو۔ "از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ، چنانچہ مشقِ سخن ہم ایں جا کردہ۔ شاگرد خاں صاحب سراج الدین علی خاں است۔. ... مستغنیٔ وقتِ خود بود کہ عہدِ محمد شاہ باشد۔ خدایش مغفرت کند" (ص ۹)	"از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ مشقِ سخن بہم رسانیدہ۔ شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو مستغنی وقتِ خود بود۔ در عہد محمد شاہ ..... ازیں جہاں فانی برفت حق تعالیٰ مغفرتش کند۔" (ورق ب ۱۲)
حشمت۔ "سید صحیح النسب بود، سپاہی عمدۂ روزگار، شاعر خوب فارسی در ریختہ فہمیدہ و سنجیدہ..... جلسے بود کہ در دلِ ہمہ کس جائے او خالی است ..... در مغل پورہ سکونت داشت۔ برادرِ کلانِ او کہ میر ولایت اللہ خاں باشد از مغتنمات روزگار است۔" (ص ۷۳)	"سید صحیح النسب، متواضع و خلیق کہ در دلِ ہر کسے جائے او خالی است۔ عمدۂ روزگار، ساکن مغل پورہ، شاعر زبردست فارسی و ریختہ بسیار سنجیدہ فہمیدہ برادر کلاں (او) میر ولایت اللہ خاں از مغتنمات روزگار بود" (اوراق ۲۵ ب)

عزلت: "خلف الصدق حضرت سید سعد اللہ سورتی قدس سرہ کہ متنبئہ شاہ عالمگیر بودند درویش وضیع عالم فاضل بزرگ متوکل مشق شعر فارسی ہم کردہ اند لیکن مزاج ایشان میلان ریختہ بسیار دارد۔ تازہ وارد ہندوستان کہ عبارت از شاہجہاں آباد است، شدہ اند ..... از اسالیب کلام ایشان واضح می گردد کہ بہرۂ بسیارے از ہندی دارند"۔ (ص ۹۲)	"خلف الرشید سید سعد اللہ سورتی قدس سرہ کہ متبنئ (مرشد) شاہ اورنگ زیب عالم گیر بود درویش متوکل فاضل مستعد۔ اگرچہ مشق شعر فارسی زیادہ می کرد اما مزاج او بطرف اشعار ریختہ مائل بسیار بود۔ در ہندوستان کہ عبارت است از شاہجہاں آباد دہلی، نیز بطریق سیر آمدہ بود سخن او خالی از دردمندی نیست"۔ (ورق ۸ ب و ۹ الف)

میر صاحب نے نکات الشعراء کو ریختہ کے مختلف اقسام کی تعریف و تشریح پر ختم کیا ہے۔ طبقات الشرا کا خاتمہ بھی اسی موضوع سے متعلق ہے، اور یہاں بھی نکات الشرا سے کسب فیض کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ نکات الشرا کا متعلقہ اقتباس اس سے قبل گذشتہ باب میں دو جگہ نقل کیا جا چکا ہے۔ طبقات الشرا کی عبارت درج ذیل ہے۔

"بداں کہ ریختہ بر چند اقسام است اول آنکہ یک مصرع فارسی و یک ہندی دوم آنکہ نیم مصرعہ فارسی و نیم ہندی و قسم ثالث کہ مناسبت تمام با کلمۂ ریختہ دارد، آنکہ کلمۂ فارسی و کلمۂ عربی و کلمۂ ہندی بود۔ تا آں الفاظ مستعمل باید آورد و

کلمہ عجیب و غریب بیارد۔ چنانچہ روزمرۂ ہندوستان کہ عبارت الف از
شاہجہان آباد و محاورۂ عوام و خواص آنجاست و ہمیں قسم ثالث در
استعمال شعراء ایں زمان مستحسن و معتبر است اما شاعر ایں فن را ایں
قدر امتیاز لابدی است کہ از آوردن حروف مفردۂ فارسی بدون
متعلق آن در ریختہ اجتناب نماید چنانچہ "در" یا "بر" یا "از" وغیرہ
و اکثر تراکیب کہ موجب ثقل تلفظ زبانی باشد، باز ماندن ازان
اہم ضرور بل واجب است اگرچہ مرکب از کلمات فصیح باشد و رعایت
در رسالہ عروض مذکور است البتہ شاعر ازان خبردار خواہد شد،
بس دریں مختصر نوشتن فضول است" (ورق ۲۹۳ ب)

بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق نے اس تذکرے کی ترتیب میں نکات الشعراء کے علاوہ کچھ اور تذکروں سے بھی مدد لی ہے۔ چنانچہ مرزا مظہر کے حالات علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے "سروِ آزاد" سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں اور تذکرے کا انداز ترتیب "مخزن نکات" سے اثر پذیری کی غمازی کرتا ہے۔ محمد یار خاں امیر کی سرکار میں قائم کے ساتھ ان کی رفاقت و ہم نشینی کا حال اس سے پہلے ہی مصحفی کی وساطت سے ہمارے علم میں آچکا ہے اس کے بعد تذکرے پر نظر ثانی سے قبل رام پور میں جو قائم (متوفی ۱۲۰۸ھ) کا مدفن بھی ہے، دوبارہ دونوں تذکرہ نگاروں کی ملاقات اور قدیم تعلقات کی از سر نو استواری بھی خارج از امکان نہیں۔ مزید برآں بعض تذکرہ نگاروں نے شوق کو قائم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے[1]۔ اس لئے "مخزن نکات" کے

۱؎ گلشن بے خار۔ طبع اول۔ ص ۲۱۵ و تذکرہ خوش معرکۂ زیبا؛ مولف سعادت خاں ناصر
مخطوطہ علی گڑھ

مطالعے سے ان کی محرومی بظاہر ناممکنات کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ شوق پر اپنے مآخذ کے ذکر سے صرفِ نظر کے باوجود نہ تو گردیزی کی طرح تحقیق و اجتہاد کے بلند بانگ دعووں کے بعد تقلیدِ محض تک محدود رہنے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے، اور نہ نوبت کی مانند کسی پیش رو تذکرہ نگار کے فراہم کردہ سرمایۂ معلومات پر غاصبانہ تصرف کے خلاف فردِ جرم لگائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان کے تذکرے کا دو تہائی حصہ اُن معروف اور غیر معروف فن کاروں کے تعارف پر مشتمل ہے جو اس وقت تک کسی دوسرے تذکرہ نگار کے یہاں بار نہ پا سکے تھے اور اس طرح دوسروں کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کا تناسب ناقابلِ لحاظ حد تک کم ہو گیا ہے۔

تذکروں کے علاوہ شوق نے مختلف ادبی مراکز سے ترکِ وطن یا سیر و سیاحت کر کے آئے ہوئے احباب ذاتی ملاقاتوں اور اسی قسم کے دیگر ذرائع و رسائل سے بھی حصولِ معلومات میں کافی مدد لی ہے۔ ہم عصر شاعروں کے احوال و اشعار کی تحقیق و دریافت کا یہی وہ بہترین اور مناسب طریقہ تھا جو انھوں نے اختیار کیا اور جس کی بہتات کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شاہ حاتم :۔ " بعضے آشنایان کہ الحال در دہلی از و ملاقی شدند چند غزل متفرقہ نوشتہ آوردہ بودند ۔۔۔۔۔

بعضے از آن بتحریر خواہد آمد " (ورق ۲۱ الف)

۲۔ برہان الدین عاصی :۔ " چند اشعارِ آن بزرگوار دریں روزگار بزبانی ۔۔۔۔۔ سید معصوم طالب علم مانک پوری کہ در

خانۂ شاعر مسطور بود ، بطریق نوکری ماندہ ، بسمع

رسیدہ" (ورق ۸۷ ب)

۳۔ میر تقی میر :۔ "از غزلیات تازۂ اوست کہ بایں راقم الحروف

نوشتہ" (ورق ۹۳ ۔ الف)

۴۔ محمد اکرم :۔ "بزبانی پسرش کہ بلاقی نام دارد ، چند اشعار ستفرقہ

او بسمع رسیدہ" (ورق ۱۰۱ ب)

۵۔ علی محمد خندان :۔ "چند ابیات کہ بخط خاص مرقوم نمودہ بود بہ

تحریر می آید" (ورق ۱۲۱ ب)

۶۔ میر حسن :۔ "چند اشعار او بعضے احباب (از لکھنؤ) نقل

کردہ آوردہ بودند ، از آں انتخاب نمودہ بتحریر

می آید" (ورق ۱۴۲ الف)

۷۔ جلیل شاہ سائل :۔ "چند غزلیات بعد ملاقات او از مسودہ اش

بقلم آوردہ شد" (ورق ۱۵۶ الف)

تذکرے کی ابتدا حضرت امیر خسرو کے ذکر سے ہوتی ہے ۔ شوق نے انھیں اردو شاعری کا موسس اول قرار دیا ہے ، اور ان کے تعارف سے قبل ان الفاظ میں "ایجاد شعر ریختہ" سے متعلق اپنے زمانے کی مقبول روایات اور اہل علم کے مختلف نقطہ ہائے نظر کی نشان دہی کی ہے ۔

"باید دانست کہ ابتدائے انشائے فن ریختہ بعضے نسبت بشیخ سعدی شیرازی کردہ اند و بعضے بہ سعدی دکنی ۔ اما بہ تحقیق نمی پیوندد کہ کلام سعدی است یک غزل بہ نام او مشہور است تحریر خواہد آمد واکثرے اتفاق دارند کہ موجد ایں فن امیر خسرو

زبلوسی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ است۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر صنائع و بدائع آن بزرگوار مثل پہیلی و مکرنی و دو سخنہ و انمل و ڈھکوسلا و ریختہ و نسخۂ اعجاز خسروی و خالق باری و جمیع دیگر راگ و راگنی از تصانیف او بزبان ہندی و فارسی مشہور و متعارف اند۔ لہذا شروع بنام آن بزرگوار نمودہ شد۔" (ورق ۳ ب)

خسرو کے متعلق شوق کا بیان ہے کہ

"اصلش از اویماقِ ہزارہ من بلادِ ترکستان مولدش (تولدش) در سنہ احدی و خمسون و ست مایہ (۶۵۱ھ) در قصبہ پٹیالی مضافات صوبہ دار الخلافہ اکبر آباد معمولہ ہندوستان و بعضے بر آنند کہ در سن سہ سالگی ہمراہ والدین خود از ولایت بہ ہندوستان آمد۔ پدرش امیر محمود در عہدِ سلطنت سلطان ناصر الدین بدرجۂ امارت رسیدہ بود بعد وفات پدرش ہمان منصب بروے مقرر و مفوض گشتہ بعد انقضائے چند ایام آن فرید الدہر و حید العصر، خسرو ولایتِ سخنوری، مخزنِ اسرارِ الٰہی، مطلعِ انوارِ نامتناہی، ترکِ روزگار نمودہ چند لمحہ جلس و نقد در راہِ الٰہی صرف نمودہ از زہد اختیار نمود و از صحبتِ شیخ المشائخ، امام الاتقیا نظام الدین اولیا نور اللہ مضجعہ و مرقدہ باایں کمالِ فضل و بلاغت ظاہری و دانش و بینش معنوی صفائے قلبی و مکاشفۂ باطنی حاصل نمود۔ از اعاظم متعدان و اکابرِ عالی فطرتانِ جہان بود۔ فضائل او از دائرۂ امکان و طاقتِ لسان خارج است۔" (ورق ۴ الف)

"طبقات الشعرا" میں علی العموم حالات نویسی کا یہ انداز نہیں ملتا اور نہ خسرو کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کا سنہ پیدائش یا زمانۂ عمر و وفات ہی اس تذکرے میں مذکور ہے۔ پھر بھی نصف سے زائد شعرا کے ذکر میں

زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات نقل کر کے شوقؔ نے کس حد تک اس تشنگی اور اختصار کی تلافی کر دی ہے، جو ابتدائی دور کے تذکروں کا ایک نمایاں اور مشترک نقص ہے۔ دکن میں شفیقؔ اورنگ آبادی ان سے بہت پہلے التزام سنین کے ساتھ بعض شاعروں کی روداد حیات ترتیب دے کر تذکرہ نگاری کے فن کو نئے اطراف وجہات سے آشنا کر چکے تھے لیکن شمالی ہند میں اس وقت تک ایسا کوئی تذکرہ معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا جس کے مولف کی نظر روایات کے دھندلکوں سے پرے ایک جہانِ تازہ اور وسیع تر دائرہ کار کے تجسس میں سرگرم عمل رہی ہو۔ اس اعتبار سے طرزِ تعارف کی یہ ناتمام مگر قابل لحاظ تبدیلی "طبقات الشعرا" کو شعرائے اُردو کے تذکروں کے درمیان ایک سنگ میل کی حیثیت عطا کرتی ہے۔ مثال کیلئے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

مسکین ۔ "مردے بود صاحب درد و مسکین و صبح محبت از اولادِ نبی و آلِ علی دردِ دل خود بدرجہ کمال داشت۔ تمام عمر خود در تصنیفِ مرثیہ امام حسن و امام حسین ۔ ۔ ۔ صرف نمودہ بوقتِ مرگ خود یک صندوقچہ پر از مسودات مرثیہ بجائے ترکہ گذاشت و بوارثہ (ورثاء) خود وصیت نمود کہ ہر سال یک پرچہ کاغذ جدید از منابر آوردہ در ایام عاشورہ رواج دہند چنانچہ اکثر مرثیہ ہائے او در ایام محرم الحرام خواص و عوام با لحن خوش و صوت حسن در ماتم الامین ھما امین سعیدین شہیدین ابی محمد الحسن و ابی عبد اللہ الحسین می خوانند و خاک فرقت در دیدۂ اعدا می اندازند۔"

(ورق ۲۰)

قلندر :- "قوم کھتری، متوطن دہلی، جوانے بود قابل و خوبصورت و آزاد سیرت۔

حوصلہ عالی و وضع لاابالی داشت ہرچند عمدہ روزگار بود اما صحبت
ہر دو جہاں را پس پشت داد۔ قریب دو لکھ نقد و جنس در یک لمحہ
یک مشت تصرف نمودہ در فرقۂ ناکس بہتھی فقیر شد و اصلا بریں مال
و منال اشتغالے ننمود چنانچہ مقولہ اوست

دو جہاں ایک داؤ ہے میرا
کھیلتا ہوں قمار آنکھوں میں

لباس آزادی را در بر کردہ رمی گو دیدہ تماشائے نیرنگی گردش
دور دوار کج رفتار از دیدۂ عبرت بیں می نمود و اصلا لب بشکوہ و
شکایت و طمع پیش کسے نمی کشود بعضے اعزہ کہ احوالات او نقل
می کردند چنیں تعجب دوئے می داد کہ از انسان ایں چنیں کارہا
بوقوع آمدن ممکن نباشد مثلاً بعض وقت در دل او می آمد کہ
طعام نباید خورد ہفتہ دو ہفتہ بلکہ تا یک ماہ علی الاتصال
گرسنہ می ماند و ہرگز کسے معلوم نمی کرد، عجب مرد دیوانہ بود
چنانچہ خود می گوید

وہ سکہ کہ جس کے واسطے دکھ سے مرے ہیں لوگ
میں اس کو اپنے نقش پہ دھر کر اڑا دیا

ایں شعر قلندرانہ دال بر آزادی و بے پروائی اوست از چند سال
در بلدۂ بریلی آمدہ بہ وطن اقامت گرفتہ بود چوں اجلش نزدیک رسیدہ
دفعتہً بیماری شدید کشیدہ در حالت نزع از صاحب خانہ گفت
کہ چہارپائے او رکھنے وادی بنہید۔ شاید کہ ایں طائر روح
ازیں قفس تن بپراند شاید و ایں قالب خاکی باد و وش میسر شود

آشنایان ہر چند منع نمودند، اصلاً پ اجابت نہ کشود۔ ناچار نعش
او در وادی نہادند آخر ہمان جا در گذشت۔ فکر صائب و ذہن مناسب
داشت بعد وفات او مسودہ اش ہولاس رائے رنگین ۔۔۔ ۔۔۔
جمع نمودہ نزد خود نگاہ داشتہ۔ دیوانش از نظر ایں عاصی گذشتہ "
(ورق ۱۰۸ تا ۱۰۹)

ندوی لاہوری :- "فیض اللہ بیگ ندوی ساکن ضلع پنجاب مردے بود ذو بوئے
ابلہ رو ئے زیادہ گوئے جنگ جوئے، نوکری پیشہ بے اندیشہ
مائل برفض۔ گزاف لایعنی و سخنان بے معنی پیش ہر کس می
گفت و باوجود ہیچمدانی خود را ہمہ دان می شود۔ بموجب
مقولہ کسے ۔

ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدہر بماند

بسبب سخنان بیہودہ با کسے صحبت بر آرنمی شد۔ قریب دو ماہ شد کہ از
بیماری تپ دلرزہ در بریلی فوت شد با ایں راقم در قصبہ آنولہ یک
دو ملاقات شدہ بود۔ اکثر غزلیات قطعہ بند او بنظر ایں مولف
گذشتہ شعر را بوضع خود تراشی بطور شاہنامہ بہ آواز کرخت می خواند
سامعان نافہم لب تحسین و آفریں می کشودند۔ غرہ شاعری در دل خود
چناں داشت کہ خود را زیادہ از خود می پنداشت بعضے اعزہ در
مرض الموت برائے ملاقات او رفتہ بودیم بمجرد ملاقات گفت کہ
یاران بشنوید دریں روز ہا چہ مطلع تازہ مضمون موزوں کردہ ام ۔ مطلع
پہلو میں بیٹھے درد اٹھا دل کے متصل بیٹھا رقیب ساتھ جو وہ مل کے متصل

طبعِ موزوں و مناسب داشت قصہ یوسف زلیخا را در زبانِ ریختہ بوجہ احسن بستہ۔"
(ورق ۱۱۲)

حالات کے بیان میں تفصیل و وضاحت کی اس بنیاد گزاری کے ساتھ ہی شوق نے شخصیت کے خط و خال کی جلوہ آفرینی میں بھی فنکارانہ مہارت و مشاقی کا ثبوت دیا ہے۔ الفاظ کے ذریعہ پیکر تراشی کا یہ عمل جس چابک دستی، خوش سلیقگی اور امعانِ نظر کا مطالبہ کرتا ہے وہ اس سے واقف بھی ہیں اور بہرہ یاب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تراشیدہ مرقعے ایک ماہرِ فن بت ساز کے مجسموں اور کامیاب مصور کی تصویروں کی طرح اہلِ نظر کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالحئی تاباں کے بارے میں ان کا یہ بیان بطورِ خاص ملاحظہ طلب ہے۔

"جوانے بود وجیہ و شکیل و در حسن و خوبی بے تمثیل۔ ہمانا حورے بود در لباسِ انسانی یا فرشتۂ از عالمِ نورانی۔ خندہ رو، کشادہ پیشانی کہ چشم بیندہ را از ومانند آئینہ سراسر حیرانی و پریشانی روی داد و شگوفہ بکمال استیلاء آتشِ شوقِ دیدار متاعِ خرد و ہوش برباد می ساخت بسیار۔۔۔۔۔ خوش لباس و خوش پوشاک، جامہ زیب و دلفریب بود۔۔۔۔ تا حال در فرقۂ شعراء ہم چو شاعرے خوش ظاہر محبوب، خوش اسلوب در لطافت و خوبی، حسن و نزاکت خوش اسلوبی از کتم عدم پائے بمعمورۂ وجود نہادہ۔"
(ورق ۱۴۱ ب و ۱۴۲ الف)

اہلِ علم کی تعظیم و تکریم اور اربابِ فضل و کمال کی قدر شناسی مشرقی تہذیب کے آداب میں داخل رہی ہے۔ اس روایت کا احترام کرتے ہوئے تذکرہ نگاروں نے بھی بالعموم بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان فن کاروں کے ذاتی اوصاف و

محاسن کا اعتراف کیا ہے جنھیں اپنی گرانقدر خدمات کے صلے میں کاروانِ شعر و ادب کی رہبری کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگوں نے اظہارِ مطالب کے لئے سادگی و سلاست کی راہ اپنائی ہے اور بعض الفاظ کے تار و پود میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ شوق پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ ان کے یہاں نہ مبالغے کی کثرت ہے اور نہ غیر ضروری الفاظ ہی سے انھوں نے اپنی عبارت کو بوجھل کیا ہے۔ کام کی زبان میں کام کی بات کرنے کا یہ انداز قاری کو مطمئن بھی کرتا ہے اور متاثر بھی۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس خصوصیت کا اندازہ ہوگا۔

مرزا مظہر: "زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین، واقفِ رموز جناب اکبر کا شعب سخنورِ طریق پیغمبر مرزا مظہر جانِ جاناں متخلص بہ مظہر مرو لیست فرشتہ صورت ۔ ۔ ۔ درویش صاحب حال باکمال خوش مقال۔ مرجع و مستندِ عالم، معزز و محترم عالم متبحر تحریر، فاضل مستعد و بے نظیر خوش گو و خوش تقریر ۔ ۔ ۔ در شاہجہان آباد دہلی کی منتخب ہفت اقلیم بود ہم چو او شخص خوش قماش نازک طبع برنخاستہ۔"

(ورق ۲۶)

خان آرزو: "ملک الشعرائے ہندوستان ۔ ۔ ۔ صاحبِ طبع دقت آفریں پایہ سخنوری و سخن فہمی و محاورہ دانی را بدرجہ کمال رسانیدہ بود از فصحائے زمانہ و استادِ یگانہ بود۔ در تمام خطہ ہند ہمچو او شاعر پرگو و زود و خوش گو تا در سخن باین فضل و کمال پیدا نشدہ۔ حاصل کمالات او از حیز تحریر و تقریر بیرون ۔ اکثر استادانِ فارسی و ریختہ از تلامذہ او بیند!" (ورق ۲۷ ب)

مرزا سودا ہے: "مردیست بسیار سنجیدہ و فہمیدہ ...... بجمیع صفات انسانی موصوف و در سفتن لآلی آبدار ...... سردفتر امروز در ہندوستان جنت نشاں کہ بہ ہستی می نوازد و داد سخن وری و خوش خیالی می دہد۔ ہر بیتش ورد زبانِ سخنوران و لوح دیوانش محراب سجود معنی گستران۔ در فنون انواع سخن سنجی طاق و بجمیع کمالاتِ سخنوری شہرۂ آفاق ...... در قیافہ دانی نہایت رسا و قابل و در فن موسیقی استادِ کامل۔ اگرچہ تحریر کمالش خارج از دائرہ گفتگوست اما بیارہ بگو و خوش گوست ...... در مغتنماتِ روزگار است"

(مخطوطہ اعظم گڈھ ص ۱۱۵)

میر تقی میر: "از اعاظم مستعدان و اکابر عالی نظرانِ زمانِ خود است شاعرِ مغز و ہمہ دان استاد ہم چشمانِ اکثر سخن طرازان و معنی یابان محاورات و رموزاتِ این فن از ایشان اخذ نمودہ۔ از مغتنماتِ زمانہ و استادِ یگانہ شہسوارِ سمندِ عرصۂ فصاحت ناسخِ مضامینِ بلاغت مجمعِ قابلیت صاحب طبع و خوش فکر سرآمدِ مستعدانِ عصر و محاورہ دانِ متین" (ورق ۲۵ الف)

اپنے عہد کے جن شاعروں سے شوق کے دوستانہ تعلقات تھے یا جن لوگوں سے بربنائے اتفاق کسی مجلس یا ادبی صحبت میں ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا تھا ان کے ذکر میں انھوں نے ان کے مزاج و طبیعت، عادات و خصائل اور وضع قطع کے بارے میں اظہارِ خیال کو بھی خاص اہمیت دی ہے اور مختصر مگر جامع الفاظ میں اس خوبی کے ساتھ ان پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے کہ پڑھنے

والے کو کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ درج ذیل مثالیں اس ضمن میں آتی ہیں۔

سید عبدالرشید مارہروی:۔ "جوانے بود جامع کمالات انسانی ۔۔۔ در زمرۂ علماء چنیں شخص در عرصۂ وجود نیامدہ و ندیدہ بلکہ گوش کسے نہ شنیدہ۔ مجمع ہنر و اخلاق در استقامت عقل و ظرافت طبع یکتا و طاق۔ خاطرش بہ طرف لطیفہ گوئی بسیار مائل و لطیفہ اش بر السنۂ عوام و خواص متداول۔" (ورق ۹۴ ب)

تسلیم، چاندپوری:۔ "بسیار آدم بامزہ و اہل درد متواضع و خلیق۔ مہذب صورت، پاکیزہ سیرت نہایت بگو و خوش مقال ۔۔۔ از خوش خیالان زمان و بلند فطرتان جہاں ۔۔۔ فضائل او از حیزۂ تحریر بیرون است" (ورق ۷۷ الف)

فضل علی ممتاز:۔ "جوان خوش عنوان ۔۔۔ طبع سلیم جولان داشت ۔۔۔ بجمیع فضائل انسانی موصوف و مستثنیٰ ۔۔۔ صاحب امتیاز و در چشمان خود ممتاز ایں راقم الحروف نیز در آں نولکھ دانف راز و نیاز او شدہ بود۔ بسیار متواضع و مدارا جیش می آید۔" (ورق ۱۰۵ الف)

مراد علی حسرت:۔ "جوانے بود قابل درویش سیرت۔ آزادانہ مزاج خوش تقریر و درد مند، متواضع و خلیق۔" (ورق ۱۰۵ الف)

اکرام اللہ محتشم۔ "جوانیست قابل، سعادت مند، خوش خصال پسندیدہ افعال...... پاکیزہ سیرت خلیق۔ آشنا پرست..
...... مزاج آزادانہ و در یگانگی ایں جہاں ثانی یگانہ، طبع سلیم و ذہن مستقیم دارد۔"

(ورق ۱۱ ب)

واصل بدایونی۔ "جوان قابل، بشاش بشاش، حریف ظریف خوش خلق و خوش خو۔"

(ورق ۲۷ الف)

شوق کے یہاں تنقید کلام کا عنصر نسبتاً کم ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تمام شاعروں کو ان کے زمانے اور مراتب کے فرق نیز سن و سال کے اعتبار سے مختلف طبقات میں تقسیم کرکے اپنے نزدیک فرداً فرداً ہر شخص کے نتائج فکر کے بارے میں اظہار خیال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ طبقہ اول میں ان شاعروں کا ذکر ہے جو ہماری روایاتِ شعری کے موسسین میں شمار کیے جاتے ہیں اور جن کا کلام اس نوخیز اور نازک کلی کی طرح جو پھول بننے کے ابتدائی مراحل میں ہو، سادگی و بے تکلفی کا منظر ہے۔ طبقہ ثانی ایہام پسند شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

"بعد از طبقۂ شاعرانِ دکن کہ معاصران ولی بودند رواج ایہام بسیار شد و ایہام عبارت است از لفظے کہ دو معنی داشتہ باشد۔ قریب و بعید۔ بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او۔"

(ورق ۲۱ ب)

طبقہ ثالث اگرچہ بلحاظ عنوان صرف "شعرائے متاخرین و بعضے نو مشقان

گو" سے متعلق ہے، لیکن درحقیقت اس کے ذیل میں ان شعراء کے حالات و کلام کو جگہ دی گئی ہے جنھوں نے ایہام گوئی کو قابلِ ترک قرار دے کر صاف و سادہ اور شستہ و رفتہ زبان میں فکر سخن کی طرح ڈالی اور جن کے شیوۂ گفتار کی بنیاد ولی پر غزل کے اس قصرِ جمیل کی بنا استوار ہوئی جس کا حسن اندازِ نظر کی مسلسل تبدیلیوں اور فکری و ذہنی انقلابات کی پیہم یورشوں سے سینہ سپر رہنے کے باوجود آج بھی جوان اور دلکش و دلفریب ہے۔ اس طبقے کے آغاز میں مولف نے یہ خیال ظاہر کر کے کہ

"اول کسے کہ طرزِ ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ اسحالِ پسند خاطر عوام و خواص وقت گزیدہ (رواج داد) ... مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر است"

(ورق ۱۷۶، الف)

مجملاً یہی بات کہنا چاہی ہے کہ مرزا صاحب اس طرزِ جدید کے بانی ہیں اور ان کے ساتھ شامل کیے جانے والے دوسرے شاعر ان کے رفقا یا متبعین کے ذیل میں آتے ہیں۔ طبقہ چہارم کی ترتیب بھی مولف کی ذہانت اور بالغ نظری کی آئینہ دار ہے۔ اس طبقے کے تحت سب سے پہلے "تازہ گویانِ سرآمد روزگار" کے عنوان سے ان شاعروں کا ذکر ہے جو اس وقت تک شہرت و کمال کے نقطۂ عروج تک پہنچ چکے تھے اس کے بعد کے مقالات علی الترتیب اس زمانے کے سلاطین و وزرا اور ان کے مصاحبین داعیانِ سلطنت، امرائے اور قرب و جوار کے اعیان امراء اور ان کے متعلقین و متوسلین، مولف کے خاص اشخاص عزیز و دلی اور درشتوں اور نومشق و کم پایہ احباب و معاصرین کے علٰحدہ علٰحدہ ذکر پر مشتمل ہیں۔

یہ تفریق اس غیر جانبدارانہ رائے زنی سے احتراز کا جواز پیدا کرتی ہے جسکی راہ میں پاس وادب، خاندانی تعلقات، ذاتی مراسم، حوصلہ شکنی کے اندیشے اور اسی قسم کے دوسرے عوامل ہر قدم پر مولف کی آزمائش کے لئے آگے آتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود شوق کے یہاں جا بجا انفرادی تنقید کے ایسے نمونے موجود ہیں جن کی روشنی میں متعلقہ شاعروں کے کلام کی بعض نمایاں خصوصیات پوری طرح سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً:

سجاد، اکبر آبادی۔

"بسیار خوش گو، نزاکت بند۔۔۔۔ سلیقه اش درست درسا داشتوار از ہر فردش رتبۂ شاعری نمودار۔ سخنان دلفریبش لبس شیریں و خوش گوار" (اوراق ۱۰ الف)

شاہ حاتم۔

"دیوانِ قدیم او از نظر ایں مولف گزشتہ بہ طرزِ آبرو و ناجی حرف می زند۔ اکثر اشعارش از لطف شاعری خالی یافتم۔"

(ورق ۲۱ الف)

محمد حسین۔ کلیم۔

"فکرہائش ہمہ تلاشی و الفاظش فرین نجش تماشی طرزش بطرز کے نایاب (ما نا نیست)" (ورق ۷۶ الف)

میر تقی میر۔

"متلاشی مضامینِ رنگین۔ متجس الفاظِ چرب و شیریں ہر چند سادہ گو ست اما در سادہ گوی نہ داری دربکاری ظاہر د نمودار است!" (ورق ۷۸ الف)

انعام اللہ خاں یقین۔

"مشقِ سخن او بپایۂ استادی رسیدہ بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر قدر کہ دیوانش مرتب است ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست" (ورق ۳۴ الف)

بعض شعرا کے حالات میں ان کے کلام کے متعلق اختصار کے ساتھ ایسی رائیں ظاہر کر دی ہیں جن سے ان کی مجموعی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"عبدالولی عزلت سورتی" "سخن او خالی از دردمندی نیست۔"
(ورق ۹ الف)

سراج اورنگ آبادی۔ "سخن او خالی از درد نیست"۔ (ورق ۱۱ ب)

مصطفےٰ خاں یکرنگ۔" ہر چند پرگو نا بیار پوچ گو نیست"۔
(ورق ۱۷ الف)

سعادت امروہوی:۔ "اشعارش از لطف شاعری خالی نیست"
(ورق ۱۷ ب)

مراد علی حیرت۔" ہر چند کم گو و کم مشق بود۔ نا مذاق سخنش کم از رتبہ استادان نیست" (ورق ۱۰۶ ب)

امیر الدین امیر بدایونی۔" اگرچہ کم گو ست نا بیار خوش گو۔ مشق سخن او بدرجۂ استادان رسیدہ"
(ورق ۱۱۵ الف)

تنقید کے اسی سلسلے میں شوق نے کہیں کہیں اشعار کے لفظی و معنوی نقائص کی بھی گرفت کی ہے اور بعض جگہ متبادل اور مناسب تر الفاظ

بھی تجویز کیے ہیں لیکن اس قسم کی تنقید میں ان کی نظر فن کی ان باریکیوں اور بلندیوں تک رسائی میں ناکام رہتی ہے، جہاں میر کی نگاہِ نکتہ رس اپنا جادو جگاتی ہے اور جہاں ایک فن کار اور فن پرست یا محض دلدادہ و معتقد کے مرتبہ و مقام کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ درج ذیل مثالوں سے انکے اعتراضات اور اصلاحوں کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔

(الف) ولی دکنی کا ایک شعر ہے

شب تیری زلف سیتی مطول کی بحث تھی
تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر گیا

شوق لکھتے ہیں:۔

"ہر چند دریں فرد تناسب شاعری بوجہ احسن جمع نمودہ خاما از زل سیتی زلف پریشانیِ تمام روی دہد پس ازینجاست کہ الانسان مرکب من السہو والنسیان شاید کہ از پریشانی خاطر چنیں خطا کہ بروئے آں تا بہ خلق رسیدہ از خاطرِ پریشان او راہ یافتہ والا ایں قدر غلطی ناشی از چنیں اشخاص چہ معنی دارد" (ورق ۵ ب)

(ب) قائم چاندپوری کی ایک غزل کا مقطع ہے:۔

قائم کو اس طرح سے تو دیتا ہے گالیاں
جس کو کسی نے آج تلک تو نہیں کیا

شوق کہتے ہیں کہ:۔

"بزعم ایں نافہم اگر بجائے لفظ "کیا" کہ ردیف است لفظ "کہا" باشد موافق محاورہ درست می نشست والا غلطی است چراکہ (کیا) فعل و کلمہ "تو" قول (امرست) و فعل را بر قول

اطلاق نمی کنند" (ورق ۸۰ ب)

(ج) جعفر علی حسرت کا ایک مطلع ہے۔

تجھ کو ہے گر قتل کی چاہ
حاضر ہوں میں بسم اللہ

شوق کا خیال ہے کہ

"برائے رعایت "بسم اللہ" لفظ "ذبح" بجائے "قتل" بہتر است" (ورق ۱۲۵)

(د) مرزا رفیع سودا کا ایک مطلع ہے۔

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم

شوق لکھتے ہیں کہ۔

"اگرچہ قافیۂ مصرعۂ اخیر در حاضر مائل بہ نقصان است چرا کہ مدارِ قافیہ در تمام غزل بر کافِ بیانیہ است در یں مصرعہ کاف مرکب بیاست اما در تلفظ یکساں است شاید کہ شاعرند کور ہمیں لحاظ جائز داشت" (ورق ۱۵ ب)

جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے شوق کے یہاں تنقیدی شعور کے معاملہ میں اس خود اعتمادی اور وثوق کی کمی محسوس ہوتی ہے جو کسی غلط بات کو بلا خوفِ تردید غلط کہنے کی جرأت عطا کرتا ہے ورنہ وہ سودا کے منقولہ بالا شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے تاویل کا انداز اختیار نہ کرتے۔

انتخابِ کلام میں شوق نے تنوع اور رنگا رنگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ اگرچہ ان کے قبل کے تذکرہ نگار بھی کسی ایسے اصول کے پابند نہیں

کے نمونہ کلام کے تحت صرف غزلوں ہی کے اشعار پیش کیے جائیں بھجے، بھی ان کے یہاں دوسری اصنافِ سخن کو صرف بصورت مجبوری برائے نام نمایندگی کا حق ملا ہے۔ اس کے برخلاف "طبقات الشعرا" میں اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں خصوصیت کے ساتھ ان اصناف کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں جو بطورِ خاص کسی شاعر کی طبع آزمائی کا مرکز رہی ہیں۔ مثال کے طور پر سودا کے کلام میں ان کے سولہ قصیدوں اور تین مثنویوں کے منتخب اشعار اور قائم چاندپوری کے ذکر میں ان کی آٹھ مثنویوں کے انتخابات بھی شامل ہیں۔ مشہور مرثیہ گو یان مسکین کے نمونہ کلام کے ذیل میں صرف ایک مرثیہ کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں اور اس کے ساتھ یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ

"از معاصرین او دیگر مرثیہ گو مثل گدا و سکندر وغیرہ بسیار اند چوں در شاعری مرثیہ غلطیٔ الفاظ بسیار یافتم لہذا دریں مختصر درج ننمودم۔" (ورق ۱۴ الف)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شوق نے شاعر کی خصوصی دلچسپی کے پہلو بہ پہلو تخلیقات کے فنی معیار کو بھی مدِ نظر رکھا ہے البتہ بعض ایسے شاعروں کے ذکر میں جنھوں نے ہجونگاری اور ہزل گوئی کو اپنا شعار بنایا اور تہذیب و شائستگی کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر ان اصناف کے مطالبے پورے کیے، انھوں نے وہ اشعار بھی نقل کر دیے ہیں جن کا ایک ایک لفظ رکاکت و ابتذال میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن یہ بے راہ روی اس زمانے کے ادبی مذاق کے خلاف نہ تھی اس لیے شوق کے اس انتخاب پر حرف گیری کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔

"طبقات الشعرا" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وسعت و جامعیت کے باوجود اس میں اتفاقی و اکتسابی غلطیاں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں، تاہم چند ایسے مقامات کی طرف جہاں مولف کی لغزش قلم قابلِ گرفت بن گئی ہے اشارہ ضروری ہے۔

(الف) میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی (نسخہ راقم ص۔ ۵۹) اور میر ضیاؔ استاد میر حسن (ایضاً نسخہ راقم ص ۱۱۲) کو اس تذکرے میں دو مختلف شاعروں کی حیثیت سے روشناس کرایا گیا ہے، حالانکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔[1]

(ب) امان اللہ نثارؔ دہلوی کے حالات و اشعار بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دو جگہ نقل کئے گئے ہیں (ورق ۶۱ ا ب و ۶۹ ا ب)

(ج) میر محمدی بیدار کو "متوطن بدایوں" قرار دیا گیا ہے۔ (ورق ۷۴ الف) عام طور پر تذکرہ نگار انھیں دہلوی یا اکبر آبادی لکھتے ہیں۔[2]

(د) حزیں کو شوقؔ نے محمد علی کے نام سے یاد کیا ہے (ورق ۳۹ الف) جبکہ در اصل ان کا نام میر محمد باقر ہے۔[3]

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی ص ۱۰۰ اور "دو تذکرے" جلد دوم ص ۴۰ و ۴۱

[2] مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۱۰، گلشن بے خار طبع اول ص ۵۰ اور گلشن سخن مطبوعہ ص ۴۰،

[3] "طبقات الشعرا" طبع ثانی ص ۱۰۶۔ مخزن نکات ص ۱۵ تذکرہ شورش "دو تذکرے" جلد اول ص ۲۲۱

دو تین مقامات پر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شاعر کا کلام غلطی سے دوسرے شاعر سے منسوب کر دیا گیا ہے مثلاً مرزا عظیم بیگ عظیم کے یہ اشعار گنا بیگم کے نام سے منقول ہیں۔[1]

آکر ہماری خاک پہ کیا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

جاتے تو ہو بھرے ہوئے گرد و غبار میں
تعمیر کس کے دل کی یہ مسمار کر چلے

(ورق ۷۴ الف)

کہیں کہیں "طبقات الشعرا" کی لسانی و بیانی خامیاں بھی حرف گیری کا تقاضا کرتی ہیں لیکن اس خیال کے پیشِ نظر کہ فارسی شوق کی مادری زبان نہ تھی اور کسی غیر ملکی زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل کر لینا ہر صاحبِ قلم کے بس کی بات نہیں، ثانوی اہمیت کی دوسری خامیوں کے ساتھ تحریر کے اس نقص کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شوق نے یہ تذکرہ ترتیب دے کر اس صنف کے سرمایے میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ کیا ہے جس سے شمالی ہند میں ایک نئے دور کی ابتدا بھی ہوئی ہے اور پہلی بار اُردو شاعری کے ہمہ گیر اور ترقی پذیر نفوذ و اثر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

---

[1] عظیم کی ملکیت کے لئے دیکھئے مجموعۂ نغز، جلد دوم ص ۱۰ و تذکرہ شعرائے اُردو ص ۱۰۹ و ۱۱۰

تذکرہ شعرائے اُردو

شعرائے اُردو کے ان تذکروں میں جن کے مولفین اُردو کے ممتاز سخنوروں میں شمار کیے جاتے ہیں میر حسن (متوفی محرم ۱۲۰۱ھ، نومبر ۱۷۸۶ء) کا تذکرہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تذکرہ جس میں تین سو چار (۳۰۴) ریختہ گویوں کے حالات و اشعار شامل ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں اور دوبارہ ۱۹۴۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے شائع ہو چکا ہے پہلے ایڈیشن کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں لیکن دوسرے ایڈیشن کے ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں ہوئی ہے[1] مولانا حبیب الرحمٰن اپنے مقدمے میں اسے ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) اور ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) کے درمیانی عرصے کی تالیف قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ

"تذکرۂ ہذا میں میر صاحب (میر حسن) نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی "رموز العارفین" ہے "گلزار ارم" نہیں ہے۔ "رموز العارفین" کا سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور "گلزار ارم" کا ۱۱۹۲ھ "رموز العارفین" کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا

[1] در تاریخ یک ہزار و یک صد و نود و یک بہ اہتمام رسید طبع ثانی ص ۲۰۸

گیا ہے[1]۔

لیکن میر حسن نے مرزا احسن علی احسن (طبع ثانی ص ۱۶) اور مرزا محمد رفیع سودا (ایضاً ص ۸۳) کے ذکر میں انھیں نواب شجاع الدولہ متوفی ذی قعد ۱۱۸۸ھ (جنوری ۱۷۷۵ء) کی سرکار سے متوسل بتایا ہے گویا وہ انکے حالات شجاع الدولہ کی وفات سے قبل لکھ چکے تھے۔ نواب محمد یار خاں امیر کے متعلق یہ دعائیہ جملہ بھی کہ "خدا (ش) قایم دارد" (ص ۱۳) اسی زمانے کی تحریر ہے کیونکہ امیر کا انتقال بھی ذی قعد ۱۱۸۸ھ/ جنوری ۱۷۷۵ء ہی میں ہوا ہے[2]۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے کی ابتدا ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/ جنوری ۱۷۷۵ء سے قبل ہو چکی تھی۔ اسی طرح شاہ فصیح کے بارے میں مولف کا یہ بیان کہ "در سالِ یک ہزار" دیک صد و نود و یک برحمتِ حق پیوست" (ص ۱۲۶) اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں اتمام کے باوجود ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء کے کچھ بعد تک اضافہ و ترمیم کا سلسلہ قائم رہا ہے۔

ان دلائل سے ہٹ کر قاضی عبدالودود صاحب کے کتب خانے کے ایک قلمی نسخے سے جس کے آخر میں سالِ اتمام وغیرہ درج ہے، یہ حقیقت دریافت ہوتی ہے کہ تذکرے کی کتابی صورت دراصل ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء میں اختیار کرلی تھی[3]۔ اور ۱۱۹۱ھ/ ۱۷۷۷ء میں یا اس کے بعد صرف چند ترمیمیں اور کچھ اضافے کئے گئے ہیں جن میں شاہ فصیح کی وفات سے متعلق منقولہ بالا عبارت بھی شامل

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو مقدمہ مرتب ص ۲

[2] اخبار الصنادید جلد اول ص ۵۶، تذکرہ کاملانِ رام پور۔ ص ۳۲۸

[3] معیار نشان ص ۳۶ و مکتوب بنام راقم مورخہ ۵ مارچ ۱۹۶۶ء

ہے۔ دوسری طرف مولف کے بعض بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کام کی ابتدا ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء سے کئی سال پہلے کر چکے تھے۔ اس قسم کے چند بیانات کی تفصیل یہ ہے۔

(الف) نعیم اللہ نعیم کی نسبت رقم طراز ہیں کہ

"مردیست متوطن شاہجہاں آباد، می گویند کہ بسیار برخود غلط است بندہ اورا ندیدہ است" (ص ۱۸۱)

ان جملوں سے نعیم کے بقید حیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مصحفی ان کی وفات کو جنگ سکر تال (یکم شوال ۱۱۸۵ھ/جنوری ۱۷۷۲ء) کے چند دن بعد کا واقعہ قرار دیتے ہیں[1] مولوی قدرت اللہ شوق نے بھی ان کا سال وفات ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۲ء) ہی تحریر کیا ہے[2]۔ لہذا ان کے حالات ۱۱۸۵ھ کے اوائل (۱۷۷۱ء) میں یا اس سے کچھ قبل لکھے گئے ہوں گے۔

(ب) میر شمس الدین فقیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"دریں ولا بطرف کربلائے معلی تشریف بردہ بود، ہماں جا بجوار رحمت ایزدی پیوست" (ص ۱۱۴)

حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی نے فقیر کے اس سفر کی تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی ہیں۔

"در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و یک شوق زیارت عتبات عالیات دامن گیر حال او گردیدہ کشاں کشاں براہ سعادت بود چنانچہ ــــــ بہ بقعات طیبات رسیدہ و حصول مرام

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۵۹

[2] تکملۃ الشعرا (قلمی رامپور) بحوالہ دستور الفصاحت دیباچہ مرتب ص ۲۷

بودہ پس از انقضائے دو سال در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و سہ روانۂ ہندوستان شدہ تا بصرہ آمد و چوں از انجا روانہ ایں طرف گشت، ناگاہ از بادِ مخالف کشتی سواری او بہ تباہی آمد و او غریق رحمتِ الٰہی گردید[1]"

اس بیان کے مطابق فقیر کا انتقال ۱۱۸۳ھ/ ۷۰-۱۷۶۹ء میں ہوا ہے اور میر حسن اسے زمانہ قریب کا واقع بتاتے ہیں۔ اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے فقیر کے حالات ۱۱۸۴ھ/ ۷۱-۱۷۷۰ء یا ۱۱۸۵ھ/ ۷۲-۱۷۷۱ء میں قلم بند کئے ہوں گے۔

تذکرے کے ان اندراجات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر حسن اسکی ترتیب کا کام ۱۱۸۳ھ/ ۷۰-۱۷۶۹ء میں فقیر کے انتقال کے بعد اور ۱۱۸۵ھ/ ۷۲-۱۷۷۱ء میں نعیم کی وفات سے قبل شروع کر چکے تھے۔ اس صورت حال کے مطابق قیاسی طور پر ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰ء کو سالِ آغاز کہا جا سکتا ہے۔

اس تذکرے کی ترتیب سے قبل شعرائے اُردو کے کئی تذکرے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں سے میر حسن کے یہاں میر اور قائم کے تذکروں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ آنند رام مخلص اور غنی بیگ قبول کے حالات میں انھوں نے "تذکرۂ خان آرزو" (مجمع النفائس، تذکرہ شعرائے فارسی) کے حوالے بھی دئیے ہیں لیکن یہ تذکرہ غالباً انکی نظر سے نہیں گذرا تھا کیونکہ یہ دونوں مقامات وہ ہیں جہاں انھوں نے میر کے بیانات سے استفادہ کیا ہے۔ ان تذکروں کے علاوہ سید امام الدین مظلوم کے حال میں ان کے "تذکرۂ مختصر سامرین" کا بھی

---

[1] نسخہ عشق مخطوطہ رضا لائبریری رامپور ورق ۵۲۶

ذکر ملتا ہے (ص ۱۷۹) یہ تذکرہ چونکہ نایاب ہے اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ میر حسن نے اس سے کس قدر مدد لی ہے لیکن میر اور قائم کے تذکرے قدم قدم پر ان کے لئے چراغ راہ کا کام دیتے رہے ہیں۔ خاص طور سے وہ قائم کے تذکرے سے بے حد متاثر ہیں۔ غالباً اسی تذکرے کے طرز ترتیب کی تقلید میں انھوں نے اپنے یہاں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کئے ہیں لیکن قائم کے برخلاف ان کے یہاں شعرا کی یہ گروہ بندی حروف تہجی کے مطابق ترتیب کی تابع ہے۔ یعنی اولاً تمام شاعروں کو تخلص کے حرف اوّل کی رعایت سے مختلف گروہوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر ردیف کے تحت متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے حالات و اشعار علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔ طبقہ اوّل میں زیادہ تر کنی شعرا کا ذکر ہے۔ دوسرا طبقہ "شعرائے اواخر عہد فرخ سیر و ابتدائے سلطنتِ محمد شاہ" سے متعلق ہے۔ تیسرے طبقے کے ذیل میں معاصرین کے حالات و کلام کو جگہ دی گئی ہے۔

تذکرے کے آخر میں میر حسن نے تمام شعرا کے حالات کا احاطہ کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"پوشیدہ نماند کہ احاطہ نمودنِ کلام جمیع شعرا از قبیل دریا بہ کوزہ کردن است۔ چراکہ ہیچ جائے نیست کہ درد صاحب، سخنے نخواہد بود۔ پس ایں بے استعداد را چہ یارا کہ از ملک بہ ملک یا از شہر بہ شہر احوال ہر کس را تفتیش نماید و اشعار ہر صاحب سخن را درج کند مگر احوال بعضے اشخاص کہ شنیدہ شد، یا در تذکرہ ہائے متقدمین دیدہ شد یا خود ملاقات نمودہ شد،

بارۂ دریں جا ہجرت نمود۔" (ص ۲۰۸)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں صرف ان شاعروں کو شامل کیا گیا ہے جن سے میر حسن ذاتی واقفیت رکھتے تھے یا جن کے بارے میں انھیں دوسرے ذرائع سے حصولِ معلومات کے مواقع حاصل تھے۔ اپنے کام کو اس طرح کسی مخصوص دائرے تک محدود رکھنے والے دوسرے تذکرہ نگاروں نے شعرا کے سوانح حیات کے سلسلے میں بعض اوقات بڑی کارآمد معلومات فراہم کی ہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ میر حسن نے حالات کی دریافت و تحقیق کے وسیع امکانات کے باوجود شعرا کے تعارف میں سوانحی پہلو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیرت و شخصیت کے بارے میں اظہار خیال اور کلام کے متعلق رائے زنی سے سروکار رکھا ہے چنانچہ اس تذکرے میں نہ تو شاہ نصیح کے سالِ وفات کے علاوہ کسی دوسرے واقعے کا سنہ مذکور ہے اور نہ عام طور پر معلوم و مشہور باتوں کے سوا کسی شاعر کی داستانِ حیات سے متعلق کوئی خاص مواد ملتا ہے۔ حتیٰ کہ ان شاعروں کے ذکر میں بھی جو مولف کے معاصرین اور احباب میں شامل ہیں اور جن کے بارے میں ضروری معلومات کی فراہمی زیادہ دشوار نہ تھی۔ انھوں نے تعارف کی جو روش اختیار کی ہے اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

رسوا۔ "آفتاب رائے رسوا تخلص از سلکِ متوسطین، ہند دیگرے بود، در توپ خانہ نوکری داشت، از چندے ترکِ روزگار نمودہ بر یک پیر کنبوہ متوّنام تعشق پیدا کردہ بود۔ در بانش به لفظ میاں بسیار آشنا بود۔ با ہر کہ سخن می گفت میاں می

گفت و می گریست ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عریاں می گشت، آخر بہ ہماں حالت مرد۔" (ص ۷۲)

زار ۔ "میر مظہر علی زار تخلص از متاخرین است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ استفادۂ سخن از شاہ حفیظ اللہ صاحب دام افضالہ کہ در دربار حضرت عالم و فاضل و مثنوی داں مشہور اند، حاصل نمودہ، اصلش از شاہجہاں آباد است ۔ الحال در فیض آباد در رفاقت نواب مرزا علی خاں بہادر بسر می برد۔" (ص ۷۶)

سجاد ۔ "میر محمد سجاد متخلص بہ سجاد خلف الصدق میر محمد عظیم ابن محمد اکرم خاں مرحوم ۔ سر نشانئے منشیانِ بادشاہی، فرامین شاہنشاہی، ہم راشی یحییٰ خاں میر منشی ۔ وطن آبا و اجداد ایشاں بعد آمدن از ولایت آذربائیجان اکبر آباد بود و معاشرت ایشاں شاہجہاں آباد ۔ در ہر امور کہ دخل نمودہ، آن را بکمال رسانیدہ ۔ علم طب ہم حاصل نمودہ در اکبر آباد بساکن قدیم استقامت دارند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از شاگردانِ میاں آبرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۸۰)

ندوی ۔ "مرزا بھچو المتخلص بہ ندوی ۔ ۔ ۔ ۔ اصلش از شاہجہاں آباد، از شاگردانِ شاہ عشق دام افضالہ دیوان اوائل را بہ آب شستہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرہ از علم موسیقی و ستار نوازی قدرے نیز حاصل کردہ ۔ ۔ ۔ ۔ در یک جا قرار نمی گیرد گاہے در عظیم آباد، گاہے بہ مرشد آباد، گاہے بہ فیض آباد ۔ ۔ ۔ می ماند الحال شنیدہ ام کہ در بنگالہ پیش جگت سیٹھ

بسر می برد۔ با نیقر حاضر و غائب دوستی دارد"

(ص۔ ۱۲۱ - ۱۲۲)

تایم ۔ "شیخ محمد تایم ۔۔ ۔۔۔۔ در اوائل مدتے داخل جرگہ خواجہ میر درد ماندہ، آخر بہ شاگردی میرزا محمد رفیع سودا تایم گردید۔ متوطن چاندپور بدیہہ (نگینہ) ۔۔ از ابتدائے جوانی در شاہجہاں آباد آمدہ ۔۔۔ ۔۔۔۔ الحال در سنبھل مراد آباد است"

(ص ۱۲۸ - ۱۲۹)

کلیم ۔ "میر محمد حسین کلیم ۔ جوان محمد شاہی ۔ گندم گون و دراز قد بود۔ با خان آرزو مرحوم و میر محمد تقی قرابت قریبہ داشت ۔۔ ۔۔۔۔ رسالہ در عروض و قافیہ ہندی تصنیف نمودہ مخصوص راکہ کتاب عربی است بہ زبانِ ریختہ ترجمہ کردہ کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ در شاہجہاں آباد بہ رحمت الٰہی پیوست" (ص ۱۲۸)

میر حسن سے قبل شفیق اورنگ آبادی اور مولوی قدرت اللہ شوق اپنے تذکروں میں حالات نویسی کا جو معیار پیش کر چکے ہیں، یہ اقتباسات اس پر پورے نہیں اترتے۔ کیفیت کے اس فرق سے قطع نظر میر حسن کے یہاں تعداد کے لحاظ سے ان شعرا کا تناسب بھی جن کی زندگی کے بعض پہلو اسی انداز میں زیر بحث آ گئے ہیں، بہت کم ہے اس لئے سوانحی نقطۂ نظر سے اس دور کے تذکروں میں یہ تذکرہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔

سیرت نگاری اور شخصیت کی مرقع کشی میں بھی اگرچہ میر حسن کے یہاں سادگی و پرکاری کا وہ امتزاج نظر نہیں آتا جو ان کے پیش رووں میں میر کا طرۂ امتیاز ہے پھر بھی اس باب میں وہ اپنے عہد کے اکثر تذکرہ نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر دہلی و لکھنؤ کے نامور اساتذہ اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کے ذکر میں انھوں نے ان کی سیرت و شخصیت کے امتیازی پہلوؤں کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اُجاگر کیا ہے .... چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خواجہ میر درد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"از عالمانِ خوش ذات و درویشانِ نیکو صفات طنطنۂ فضل و کمال و دبدبۂ جاہ و جلال او بہ فلک رسیدہ و طنابۂ خیمۂ فکر عالیش چوں شعاعِ مہر از شرق تا بہ مغرب کشیدہ .... مرشد بہ وادی طریقت و رہبر بہ میدانِ شریعت دلِ آگاہ و سے مخزنِ اسرارِ خدائی، صفائے باطنش محرمِ کعبۂ کبریائی۔ خسرو اقلیم حال و قال، جامعِ صفاتِ جلال و جمال ....
اکثرے از دستِ عسرت پریشان شدہ بہ طرف رفتند لیکن آں ثابت قدم تکیہ بر توکل نمودہ قدم از جا نہ برداشت" (ص ۶۶)

میر حسن کو فیض آباد اور لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں اپنے عہد کے سب سے عظیم شاعر کی صحبت سے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض کا موقع ملا وہ مرزا سودا ہیں۔ تذکرہ کی تالیف کے وقت ان سے تعلقات قائم ہوئے دو ڈھائی سال سے زیادہ ہوئے ہوں گے۔ اس عرصے میں میر حسن کے ذہن پر ان کی شخصیت کا جو نقش قائم ہو چکا تھا اسے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"اوستادِ استادانِ کامل و نقادِ سرآمد شعرائے زمان .... استادِ شعرائے عصر و مقتدائے بلغائے دہر ...... بہ سپاہِ دانش شاہ و بہ آسمان بینش ماہ ...... مردیست از مغتنمات روزگار خوش خلق و نیک خو یار باش ...... در علم موسیقی نیز ماہر است .... تا حال مثل او در ہندوستان جنت نشاں کسے برنخاستہ۔ اکثر فقیر در خدمت آن بزرگوار می رسد بسیار کرم می فرماید .... حق تعالیٰ سلامت باکرامت دارد کہ زندگی سخن وابستہ ذات اوست۔" (ص ۸۲ - ۸۳)

میر سوز کے ذکر میں بھی اپنے تاثرات کو جو ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں۔ خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

"فقیہ بے مثال و درویش باکمال، منشی بے نظیر و خوش نویسِ دل پذیر ...... مجلس نشین دانش مندی قصبہ نظر تیغ در غایت بلندی ...... فضائلش چوں حسن خوباں عالمگیر و خصائلش چوں خمیازۂ ناز محبوبان دل پذیر معجز قلم و شیریں رقم ...... چوں کمال از بد رنگی آفاق بہ گوشہ نشینی ساختہ ...... خواندن اشعارش از زبان او ...... چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید۔ مردیست بسیار متواضع و متوکل تابل دوست و جوہر شناس۔" (ص ۸۷ - ۸۸)

اپنے استاد میر ضیا دہلوی کی نسبت رقم طراز ہیں کہ

"بدریست از سپہر کمال و صدریست از مجلس جلال شمعے است پر ضیا و عاشقیست باصفا طبع عالیش بلند و دل و

جانش گداز دردمند ...... چنیں آشنائے درست در
آشنائے ندیدہ و نشنیدہ۔ متواضع، مودب، اہل دل، منصف
مزاج، دردمند از ہر کہ شعرِ پُر درد فہمیدند، محظوظ ناشدند و گریستند (ص ۱۰)

ان تحریروں میں اگرچہ نفسِ مضمون پر رنگینیٔ بیان غالب ہے تاہم ان کے مطالعے سے زیرِ بحث شاعروں کے فن اور سیرت کی عظمت و دلکشی کا جو نقش ابھرتا ہے اس کی پائیداری میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول میر حسن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ "اعتدال اور میانہ روی کی صفت سے متصف ہیں"[1] چنانچہ انھوں نے کسی شاعر کے اوصاف ذاتی و صفاتی کی تعریف یا اس کی کوتاہیوں کے بیان میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے اگر کسی شخص کی ذات میں انھیں کچھ برائیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی کے ساتھ ہی وہ اس کی خوبیوں کے اعتراف کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ...... اس کی بہترین مثال معین بدایونی شاگردِ سودا کے متعلق ان کی اس تحریر میں ملتی ہے۔

"طبعِ دقت پسندش برنکتہ چینی دیوانہ اکثر با شعرائے معاصرین پیچش دارد۔ چنانچہ یک بار بر شعرِ فقیر اعتراض بیجا نمود ہر چند نمانیدم، نفہمید سند مرزا رفیع دادم قبول نہ کرد گفت دیوان مرزا من صحیح دارم درو ایں طور نیست۔ غرض ہر جا کہ ہمچنیں لفظ می یابد، دیوانِ استادِ خود را موافقِ طبع خود درست می کند و سخن خود را ہم سبزی نماید ...... لیکن باوجود ایں ہمہ خود آرائی و خود پسندی خلق او ہم صاحب طبع پیدا نیست (ص ۱۶۵)

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے ص ۴۴

سیرت و شخصیت کے جائزے کی طرح تنقید سخن کے معاملے میں بھی میر حسن نے بڑی خوش سلیقگی اور صائب نظری کا ثبوت دیا ہے۔ مولوی عبدالحق کے بقول "وہ شعرا کے کلام پر رائے کے اظہار میں (بھی) اعتدال اور انصاف کو مد نظر رکھتے ہیں اور کبھی دل آزاری کا پہلو اختیار نہیں کرتے"[1] ان کی رائیں بالعموم مجمل تاثرات پر مشتمل یا ایک دو مختصر جملوں میں محدود ہوتی ہیں۔ لیکن ان سے شاعر کی فنی استعداد، رجحانِ طبیعت اور ادبی مرتبے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مرزا سودا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"در میدانِ نزاکتِ بیان فکرش چوں مہر گرم تاز است و در عرصۂ لطافت و ندرت و متانتِ سخن بازوئے فطرتِ او چوں تیر راست انداز است ...... میدانِ بیانِ او وسیع و طرزِ معانی او بدیع ...... در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد قصاید عذب او دلاویز و بیانِ ہجو بلند فطرتش طرب انگیز است۔"

(ص - ۸۲ - ۸۳)

سودا قصیدہ نگاری اور ہجو گوئی کے امام ہیں اور میر سفینۂ غزل کے ناخدا حسن کی نگاہِ نکتہ رس اس فرق سے بخوبی واقف ہے چنانچہ میر صاحب کے کمالاتِ شعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"شعرش چوں دُرِ خوش آب و اندازِ سخنش بے حساب ... از استادانِ صاحبِ قدرت است طرزش ماتا بطرز مشفقائی رباعی و غزل و قصیدہ و ہجو و مدح ہمہ می گوید لیکن آنچہ گوید از غزلیات کہ بسیار بہ انداز و طرز از دمی تراود (کذا) بلکہ

---

[1] انتخاب ماہِ نو ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۲ء ص ۲۸

گرم بازاری او ہمیں است۔" (ص ۱۵۱-۱۵۲)

مشہور مرثیہ گو میاں سکندر کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

"از مرثیہ گویانِ متاخرین است۔ اکثر زبانِ پوربی و پنجابی و بنگالی دارد و از نہی مرثیہ گفتہ و بسیار مربوط گفتہ ...... قصہ ملاح و ماہی و بادشاہ دل خوار بسیار بہ آب و تاب نظم نمودہ است۔ اگرچہ علم ندارد و لیکن بر کلام او جائے انگشت نیست ......

بطرزِ قدیم شعری گوید طبعش مائل ایہام بسیار است" (ص ۹۲)

میر ضیاء الدین طوسی کی شاعری پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

"شعر دردش بر جگر عاشقاں نشتر زنی است و برائے سوختگانِ عشق شرارے۔ اکثر غزل در زمینِ سنگلاخ گفتن و الفاظ نامقبول را در بندش مقبول نمودن کار او ست ...... قصیدہ و ہجو و مثنوی و رباعی کم گفتہ۔ بیشتر غزلیات ازاں مشہور است۔" (ص ۱۰۰)

بعض شعرا کے ذکر میں میر حسن نے ان کے طرزِ سخن کو فارسی کے ایسے اساتذہ کے انداز سے نسبت دی ہے جن کے انفرادی رنگ اور استادانہ حیثیت سے اس زمانے کے اہلِ ذوق عام طور پر واقف تھے تنقید میں اس قسم کا تقابل بظاہر بہت سہل معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کے لئے وسعتِ مطالعہ اور اصابت رائے دونوں کی بے حد ضرورت ہے۔ میر حسن کے یہاں یہ دونوں عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں گذشتہ سطور میں میر کی شاعری پر تبصرے کے ذیل میں اس سلسلے کی ایک مثال گزر چکی ہے۔ دوسری مثالیں یہ ہیں:-

۱. خواجہ میر درد۔ "دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ
سراپا انتخاب۔" (ص ۶۶)

۲. قائم چاند پوری۔ "طرزش بطرزِ طالب آملی می ماند۔" (ص ۱۲۸)

۳. میر محمدی ثمرت۔ "بیشتر بطورِ ناصر علی و مرزا جلال اسیر ریختہ می
گوید۔" (ص ۔ ۹۷)

۴. شاہ واقف۔ "طرزِ کلامش مانا بطرزِ ناصر علی و جلال اسیر
است۔" (ص ۔ ۱۹۰)

ناقد کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ زیرِ بحث شاعر کے کلام کے ہر پہلو پر
پوری دیانت داری اور آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال کرے۔ اس
ضمن میں بیجا تنقیص کی طرح معائب کی پردہ پوشی بھی اصولِ تنقید سے
انحراف کی حیثیت رکھتی ہے۔ میر حسن اس رمز سے آشنا ہیں چنانچہ وہ
صرف محاسن کی نشان دہی پر اکتفا نہیں کرتے فنی اور استعدادی نقائص
کی طرف بھی حسب ضرورت اشارے کرتے چلتے ہیں مثلاً محمد حسین کلیم
کے ذکر میں ان کی استادی اور ہمہ گیری لیاقت و صلاحیت کا اعتراف
کرتے ہوئے آخر میں یہ رائے دیتے ہیں کہ۔

"باوجود ایں زور و قوت شاعری نمک در کلام نیافتہ۔"
(ص ۱۳۰)

اسی قسم کی آزادانہ رائے زنی کے کچھ اور نمونے درجِ ذیل بیانات
میں ملتے ہیں۔

۱. آشوب۔ "قدم در سخن گزاشتہ است پوچ و بے معنی و
ناموزوں می گوید۔" (ص ۔ ۲۳)

۲۔ فرحت مرشد آبادی: "رطب و یابس لبیار دارد"۔ (ص ۱۲۱)

۳۔ شاہ مجنوں۔ "خود را از شاگردان میر تقی می شمارد۔ لیکن ہمانی مثیل است کہ خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود۔ باز آید ہنوز خر باشد (کذا) (ص ۱۲۶)

۴۔ نعیم دہلوی۔ "از کلام او چنیں معلوم می شود کہ فکرش سرسری است۔ بہ عالم اعلیٰ نرسیدہ است مگر بعضے جستہ جستہ خوب می گوید"۔ (ص ۱۰۲)

میر حسن کی صاف گوئی اور آزادیٔ رائے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ وہ میر جیسے مسلم الثبوت استاد کی اصلاح کو بھی بلا تامل تسلیم کر لینے کے لئے تیار نہیں۔ میر صاحب نے میر محمد یار خاکسار کے اس شعر پر کہ۔

خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو

مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں "بیمار کیا" کی بجائے "گرفتار کیا" ہونا چاہیئے[1] میر حسن اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"در عقل فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں ایں جا چشم معشوق است، بیماری صحت دارد"۔

(ص ۶۱)

کہیں کہیں حسن نے زبان اور فن کے نقطۂ نظر سے اشعار کی قابلِ گرفت خامیوں پر بھی تنقید کی ہے۔ مثلاً بندرابن راقم کا ایک شعر ہے۔

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

---

[1] نکات الشعرا۔ طبع ثانی۔ ص ۱۶

میر حسن اس شعر کے پہلے مصرعے میں اسقاطِ عین پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد چراکہ از افتادن عین ناموزوں می شود و دریںجا عین می افتد۔ عین خطاست در دانستِ فقیر چناں بہتر می شود"

"میر انو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں" (ص ۴۷)

ایسا ہی اعتراض معین بدایونی کے اس شعر پر بھی کیا ہے۔

خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں برنگِ بوئے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

لکھتے ہیں کہ

"خوش ہم عریانی ناموزوں است چراکہ میم بار را چناں چسپیدہ است کہ عین چوں چشم غزال از میان رم کردہ است و ایں سخت عیب است" (ص ۱۶۵-۱۶۶)

لختِ دل نہیں ہے جو لے نکلے ہے نت قاصد اشک
پرزے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم

میر حسن کا خیال ہے کہ۔

"ایں مضمون بسیار خوب است لیکن بندش درست نیست ہر کہ محاورہ داں است می داند" (ص ۱۶۵)

معین ہی کے ایک اور شعر میں "دوپہری ڈھلی" کے استعمال کو روزمرّہ کے خلاف قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ۔

"ایں محاورہ درست نیست مردم شاہجہاں آباد" دوپہر ڈھلی"

می گویند نہ "دو بہری" مگر مردم بیرو نجات۔" (ص ۱۶۶)

پروفیسر کلیم الدین احمد نے میر حسن کی ان رایوں کو سطحی تنقید سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق زبان و محاورے اور عروض سے ہے[1]۔ یہ اعتراض فی نفسہٖ بالکل درست ہے لیکن اس سے ان کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ان تنقیدی اشارات سے کلام کے حسن و قبح اور بلند و پست کا بہر حال اندازہ ہو جاتا ہے اور دو سو سال پہلے کے فنی تصورات اور معیار فکر و نظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایک تذکرہ نگار سے اس سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس تذکرے سے ہمیں عشق بازی اور شاہد پرستی سے اس زمانے کے شعرا کی عام دلچسپیوں کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہے۔ وارفتگانِ شوق کے اس زمرے میں صاحب تذکرہ خود بھی شامل ہیں اور ان کے استاد میر ضیا بھی۔ تفصیل کے لئے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(الف) عبد الحئی تاباںؔ :- "سید زادہ بود بہ کمال حسن و وجاہت تمام عالم فریفتۂ حسن او بود بلکہ گرم بازاری ریختہ از ال شعلہ رو دو بالا شد اکثر اشخاص ایں فن را وسیلہ ساختہ دخیلِ صحبت او می شدند۔ - - - - - عاشقِ معشوق مزاج۔ بیک طفلے سلیمان نام تعشق داشت۔" (ص - ۲۵)

(ب) میر مستقیم جرأت۔ "بندہ او را در صغر سن بہ شاہجہاں آباد

---

[1] اُردو تنقید پر ایک نظر۔ ص

دیدہ ام بسیار خوش رو بود کہ بے اختیار
دل رامی ربود" (ص ۴۳)

(ج) فضائل علی خاں بیقید ۔ " بایکے از تبانِ ہند تعشق پیدا کردہ بود
. . . . . . از فراقِ محبوب چوں ماہیِ
بے آب و آہوئے بے صحرا می تپید و وحشت
می نمود" (ص ۱۱۰)

(د) میاں صلاح الدین پاکباز ۔ " در لکھنؤ بر سوہنا و لکھن کہ قوال بچہ
مشہور اند، نظر الفتے داشت" (ص ۱۴۰)

(ہ) مرزا انوار اللہ دہلوی : ۔ " بر یک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ آوارہ
می گشت یعنی کارش بہ سودا کشیدہ بود"
(ص ۱۷۹)

(ز) میر احمد یار دہلوی : ۔ "محبوب روزگار و یار طرح دار . . . . . .
جوانے بود بجمال و وجاہت و ملاحت کہ
یوسف ثانی تواں گفت ۔ دراں زمانِ
عالم عالم فریفتۂ رخِ نیکو و آشفتۂ زلف
او بود ۔ در وقت احمد شاہ ہنگامۂ حسن
او گرم بود ۔ ایں ہمہ شعرائے متوسطین
مانند پروانہ دلِ خود را بر شعلۂ حسنش می
سوختند او نیز بہ اینہا صحبت می داشت
. . . . . . میر ضیا سلمہ اللہ بہ او نظر الفت
داشتند چنانچہ تا حال ہر وقت کہ یادِ او

می گفتند می گویند" ......" (ص ۲۰۰۔۲۰۱)

اس تذکرے سے ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں لوگ ہجو کو اپنی شہرت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی نظموں میں جس شخص کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا تھا، اس کے دل میں ندامت وشرمندگی اور ذلت و رسوائی کے بجائے بزرگی کا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ میر حسن اس رجحان کو بے حسی اور فقدانِ غیرت کی دلیل قرار دیتے ہوئے میر جعفر زٹلی کے حال میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بسکہ دراں زمانہ عالم غیرت داشت چیزے می دارند و زبانش بند می کردند۔ الحال اگر کسے در ہجو کسے بگوید مدح خود می شمارند"
(طبع اول ص ۷۲)

میر محمد حسین کلیم کے ذکر میں میر حسن نے شاعری میں ان کی مہارت تامہ کی تعریف کے بعد لکھا ہے کہ "کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ" (ص ۱۳۸) اور اس کتاب کے کچھ جملے بھی جو انھیں یاد رہ گئے تھے بطور نمونہ نقل کیے ہیں۔ یہ جملے اس دور کے اسلوبِ نگارش کی نمائندگی کرتے ہیں اس اعتبار سے ان کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور یہاں ان کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ احمد شاہ (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء۔ ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء) کے مکحول کئے جانے کے واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر۔ ایسی دولت سے زنہار زنہار! عتبروا یا اولی الابصار
(ص ۱۳۸)

جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے میر حسن نے اس تذکرے کی ترتیب میں میر اور قائم کے تذکروں سے کافی مدد لی ہے اور بحیثیت مجموعی وہ قائم سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں چنانچہ قائم کے مقابلے میں وہ میر کے بیانات کو زیادہ مستند اور قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے۔ قائم نے "مخزنِ نکات" کی ابتدا السعدی کے ذکر سے کی ہے اور انھیں شیخ شیراز قرار دیا ہے۔[1] اس کے برخلاف میر صاحب کا قول یہ ہے کہ:

"آنچہ بعض ایں سعدی دکنی را شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ گمان بردہ اند، خطا است"[2]

میر حسن ان دونوں روایتوں کا حوالہ دیتے ہوئے دبے لفظوں میں قائم کے خیال کی تائید کرتے ہیں۔

"بعضے ایں را سعدی شیرازی قرار دادہ اند و بعضے سعدی دیگر یعنی دکھنی۔ واللہ اعلم۔۔۔۔۔۔ چوں زبانِ فارسی دریں اندر ریختہ اش شامل است اغلب کہ سعدی شیرازی است" ص ۸۰

عام تذکرہ نگاروں کی طرح میر حسن کے یہاں بھی کہیں کہیں ایسے بیانات ملتے ہیں جو حقیقتِ حال سے مطابقت نہیں رکھتے مثلاً سراج اورنگ آبادی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"در وقتِ عالمگیر اول بود" ص ۷۸

عالمگیر اول یعنی محی الدین اورنگ زیب کا سال وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء ہے اور سراج اورنگ آبادی اس کے نو سال بعد ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں پیدا

---

[1] مخزنِ نکات۔ ص ۱

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۰۲

ہوئے اور ۱۱۷۷ھ/۶۴-۱۷۶۳ء تک زندہ رہے[۱]۔ اس لیے انھیں عالمگیر
کا ہم عصر قرار دینا غلط ہے۔

میر کو وہ برادر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو کہتے ہیں (ص ۱۵۱)
حالانکہ ان دونوں کے درمیان اس اضافی رشتے کے سوا کوئی رشتہ
نہ تھا کہ میر صاحب کی والدہ سے قبل ان کے والد کو آرزو کی بہن منسوب
تھیں[۲]۔ اس حقیقت سے میر حسن کی بے خبری حیرت انگیز ہے۔

عزلت سورتی کو میر حسن نے عبدالواسع کے نام سے یاد کرتے ہوئے
محمد شاہ کے عہد میں تازہ واردِ ہندوستان بتایا ہے (ص ۱۰۷) لیکن
علامہ غلام علی آزاد بگرامی اور دوسرے تذکرہ نگاروں کی تحریر کے مطابق
ان کا نام عبدالولی تھا اور وہ محمد شاہ کی وفات (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے
تین برس بعد ۲۰ر جمادی الاول ۱۱۶۴ھ مطابق ۵ر اپریل ۱۷۵۰ء کو دہلی
میں وارد ہوئے تھے[۳]۔

معلومات کے ان نقائص سے بھی بڑھ کر "تذکرہ شعرائے اردو" کی جو
خامی نظر میں کھٹکتی ہے وہ اس کی زبان کی صنعت آمیزی اور انداز بیان کا
الجھاؤ ہے۔ میر حسن سادگی اور سلاست کو انشا پردازی اور ادبیت کے منافی
سمجھتے ہیں۔ وہ رنگین بیانی اور مرصع نگاری کے دلدادہ ہیں اور ان کے خیالات
اکثر مقفیٰ اور مسجع فقروں کی صورت میں نوکِ قلم تک آتے ہیں۔ مثلاً انھوں
نے شعرا کے تعارف کا آغاز عام طور پر اس انداز میں کیا ہے۔

۱؎ کلیات سراج مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۲۱ و ۵۵

۲؎ دلی کالج میگزین میر نمبر ص ۲۰

۳؎ سرو آزاد ص ۲۳۶۔ نکات الشعرا طبع ثانی ص ۹۲۔ گلشن گفتار ص ۶۵ و چمنستان شعرا ص ۴۴۵

(الف) " آب جوئبار شرافت و سرو بوستانِ سیادت، گلِ گلزارِ ہاشمی میر برہان الدین آتشیؔ " (ص ۴۸)

(ب) " چراغِ بزم آشنائی و شمع انجمن آرائی، تیغ شجاعت را جوہر دکانِ مروت را گوہر مرزا احمد علی المتخلص بہ جوہرؔ " (ص ۴۲)

(ج) " سالکِ مسالکِ مکاشفاتِ دینی و ناہجِ مناہجِ مجاہداتِ یقینی، از عرفائے عالی مقام و فقہائے ذوی الاحترام، بر آسمانِ سخن مانند خورشید فرد۔ حضرت خواجہ میر المتخلص بہ دردؔ...... " (ص ۶۶)

(د) " سلالۂ دودمانِ مصطفوی و نقاوۂ خاندانِ مرتضوی موصوف بہ اوصافِ حمیدہ، مخلوق بہ اخلاقِ سنجیدہ، شہرۂ انفس و آفاق، در لطیفہ گویان و ایہام بندان طاق، سیادت و شرافت نہاد نیک نیت و خوش اعتقاد میر محمد سجاد متخلص بہ سجادؔ....... " (ص ۸۰)

ایک تاریخی و تنقیدی نوعیت کی کتاب کے لیے یہ اسلوبِ نگارش مناسب نہیں کیونکہ اس طرح اکثر نفسِ مضمون قافیوں کے خارزار یا الفاظ کی رنگینیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر مصنف ایہام، رعایتِ لفظی اور ضلع جگت کے استعمال سے بھی دلچسپی رکھتا ہو تو بجز سخن طرازی و عبارت آرائی کے کام کی بات کم ہی نکل پاتی ہے میر حسن کے بعض بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی رعایتوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے پھر بھی جس طرح انھوں نے اپنے کلام میں ان صنعتوں کو

کس حد تک روا رکھا ہے اسی طرح کبھی کبھی نثر میں بھی ان کی مدد سے اپنے اسلوب کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے یہاں صرف ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ حجام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

"دکان سخن را گرم داشتہ مضمون تراشی می نماید لیکن ....

کلامش بے اصلاح است۔ در خوشگانی معانی تصور دارد" (ص ۵۰)

انتخاب اشعار کے لحاظ سے یہ تذکرہ شعرائے اردو کے چند بہترین تذکروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے حتیٰ کہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے تجربے کے مطابق بعض اوقات میر حسن کا انتخاب میر کے انتخاب سے بھی بہتر معلوم ہوتا ہے[1]۔ غزلوں کے علاوہ میر حسن نے کہیں کہیں قصائد اور مثنویات کے اقتباس بھی بطور نمونہ پیش کئے ہیں اس طرح اس تذکرے کے حصۂ نظم میں نفاست اور تنوع دونوں ہی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ تذکرہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود کئی پہلوؤں سے اردو ادب کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی ادبی فضا اور ارتقائے شعری کی رفتار کے مطالعے میں اس سے کافی مدد ملتی ہے۔ میر حسن نے شخصیات کی خاکہ کشی اور تنقید کلام کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان کی انفرادیت نے بھی ان کے مقام کو ہم عصر تذکرہ نگاروں کی صف میں کافی بلند کر دیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ "تذکرہ شعرائے اردو" ص ۱۷ تا ۱۹

رموز الشعراء یا تذکرۂ شورش

بارھویں صدی ہجری کے اواخر میں عظیم آباد میں اردو شاعری کی روز افزوں مقبولیت کے زیر اثر تذکرہ نگاری کا جو رجحان پیدا ہوا، اس کی نمائندگی میں "تذکرہ شورش" کا نام سرفہرست ہے۔ یہ تذکرہ میر غلام حسین شورش عظیم آبادی (متوفی ۱۱۹۵ھ، ۱۷۸۰ء) نے مرتب کیا ہے۔ شورش میر محمد باقر حزیں اور مرزا گھسیٹا عشق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ اگرچہ بحیثیت شاعر وہ اس مقام کے مستحق نہیں جو اس دور کے عظیم آبادی شعرا میں محمد عابد دل، محمد روشن جوشش اور ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ کو حاصل ہے لیکن تصنیفی و تالیفی شغف اور زبان و ادب کی خدمت میں غیر معمولی انہماک کے لحاظ سے وہ اپنے تمام ہم وطن معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ تذکرے کی ترتیب سے چند سال قبل تقریباً ایک برس تک ان کے یہاں باقاعدگی کے ساتھ ہر جمعہ کو محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوتی رہی تھی۔ اس مشاعرے میں عظیم آباد کے تمام اردو شعرا اور ادب دوست پابندی سے شرکت کرتے تھے۔

تذکرۂ شورش پروفیسر کلیم الدین احمد کی کوشش سے ابھی چند برس پہلے مطبوعہ صورت میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا ہے۔ انھوں نے اسے "تذکرۂ عشقی کے ساتھ دو تذکرے" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں اور دوسری ۱۹۶۳ء میں لیبل لیتھو پریس راسنہ روڈ۔ پٹنہ سے چھپ کر

شائع ہوئی ہے۔ یہ اشاعت بوڈلین لائبریری آکسفورڈ کے قلمی نسخے پر مبنی ہے جس کا آغاز شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے اور اختتام کاتب کی مختصر مبہم تحریر "تمام شد تذکرۂ میر غلام حسین شورش" پر ہوتا ہے۔ اس نسخے میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تین سو چوبیس شاعروں کا ذکر ہے[1]۔ اس کی اشاعت منظر عام پر آنے کے بعد خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانے میں تذکرۂ شورش کا ایک اور قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں لیکن ابتدا میں ایک طویل اور مبسوط خطبۂ افتتاحیہ شامل ہے[2]۔ نسخۂ آکسفورڈ کی طرح اس کا آغاز بھی شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے اور اختتام انعام اللہ خاں یقین کے اشعار پر ہوتا ہے لیکن شعرا کی تعداد، ان کی سلسلہ وار ترتیب اور ان سے متعلق بیانات کے لحاظ سے دونوں نسخے کافی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ موخرالذکر نسخے میں دو سو اکسٹھ شاعروں کے حالات و اشعار منقول ہیں جن میں بعض ایسے شعرا بھی شامل ہیں جن کے نام بوڈلین لائبریری کے نسخے میں نہیں ملتے۔ یہ نسخہ بظاہر بوڈلین لائبریری کے نسخے سے قدیم تر معلوم ہوتا ہے۔

افتتاحیہ خطبے کی شمولیت و عدم شمولیت اور شعرا کی تعداد کے فرق جیسے بین اختلافات سے قطع نظر دونوں نسخوں کی مشترک تعارفی عبارات کے [illegible]

۱؎ سلسلہ وار نمبرات کے غلط اندراج سے دھوکا کھا کر اسپرنگر، ڈتاسی اور بعض دوسرے مصنفین [illegible] اس تذکرے میں شامل شعرا کی تعداد تین سو چودہ بتائی ہے لیکن درحقیقت نسخۂ آکسفورڈ [illegible] جو ان حضرات کا ماخذ ہے، تین سو چوبیس شاعروں کا ذکر ہے۔

۲؎ انعام اللہ خاں یقین کے حال میں شورش نے تذکرے کے اس پیش لفظ کو "خطبہ" کا نام [illegible] مرقعے کی مناسبت سے افتتاحیہ ہمارا اضافہ ہے۔

مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نسخۂ جونپور مولف کی کاوشِ قلم کا اصل مرقع ہو جبکہ نسخۂ آکسفورڈ میں کسی نامعلوم شخص نے جا بجا اپنے طور پر ترمیم و تحریف کی ہے۔ دستِ غیر کے اس تصرف کا سب سے بڑا ثبوت خود مولف تذکرہ کا تعارف ہے۔ نسخہ جونپور میں شورش نے اپنی ادبی زندگی کے نشیب و فراز اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ خطبۂ افتتاحیہ کا ایک حصہ ہے۔ ابتدا میں خود کو اس طرح قارئین سے متعارف کرا دینے کے بعد تذکرے میں دوسرے شعرا کے پہلو بہ پہلو انھوں نے اس سلسلۂ بیان کی تکرار کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے صرف "غلام حسین شورش" کا عنوان قائم کرکے اپنے اشعار نقل کر دیے ہیں۔ اس کے برخلاف نسخہ آکسفورڈ میں ان کا حال ان الفاظ میں درج ہے۔

"سید غلام حسین عرف میر بھیکنا شورش تخلص، از نجبایانِ عظیم آباد است۔ علم و فضل و ریاست از بزرگان میراث دارد۔۔ ۔۔۔ در ابتدائے مشقِ سخن از خدمت میر باقر حزیں کہ جو یہی در ظہور تخلص بود، بہرہ وافی برداشتہ۔ آخر دیوان خود را از نظر مرزا لٹھیسا عشق تخلص گزرانیدہ، فوائد کافی حاصل نمودہ۔ شعر بفصاحت و سلاست تمام می گوید۔ غزل را بطرز استاد الملین انجام می نماید قصیدہ و مثنوی و رباعی بشستگی و درستگی الاکلام رقم پذیر می سازد۔ مذاقِ صوفیہ دارد۔ اکثر شعر ہم بمذاقِ صوفیہ می فرماید۔ کلیاتش قریب چہار ہزار شعر بنظر در آمدہ۔۔۔۔"

(ورق ۱۴۸ ب)

قطع نظر اس سے کہ کوئی بھی ذی شعور و معقول انسان اس طرح نثر میں

اپنی زبان سے اپنے فضل و کمال، شرافت و نجابت اور فنی مہارت و مشاقی کی شان میں قصیدہ سرائی نہیں کر سکتا، منقولہ عبارت میں شروع سے آخر تک صیغہ غایب کا استعمال اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ مولف تذکرہ کی بجائے کسی دوسرے شخص کی تحریر ہے۔ تذکرے کے مختلف اوراق سے اس قسم کے الحاق و تصرف کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ایک طرف تو مولف کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے حالات میں اس یقین اور قطعیت کے ساتھ تحریف کی نشان دہی اور اس کے حدود کا تعین دشوار ہے اور دوسری جانب ایک واضح مثال کی موجودگی میں متصرف کی جرات سے مولف کے بیانات کی قطع و برید اور ان میں بیجا اضافہ و حذف کے امکانات کو کسی جگہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر ہم تذکرے کے اس نسخے کو شورش کے خیالات و بیانات سے ان کی مسخ شدہ شکل میں واقفیت حاصل کرنے کی حد تک ناقابل اعتبار قرار دیتے ہوئے اپنے مطالعے کے لئے نسخۂ جونپور کا انتخاب کرتے ہیں۔

نسخۂ جونپور کی ظاہری حالت بہت سقیم ہے۔ اس کے اوراق کی ایک خاصی تعداد بوسیدہ و کرم خوردہ ہے۔ مزید براں ان میں کوئی تنظیم و ترتیب بھی موجود نہیں لیکن بجز ابتدائی ایک دو صفحات کے درمیان سے کوئی ورق غائب نہیں معلوم ہوتا۔ اس نسخہ کے ابتدا میں جو مقدمہ شامل ہے اس میں تذکرے کا نام "رموز الشعرا" بتایا گیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اگر اسے "تذکرۂ شورش" کہا جائے تب بھی کوئی مضائقہ

لے ہر تصنیف را نام لازم است لہذا نام ایں تذکرہ "رموز الشعرا" داشتہ و اگر تذکرۂ شورش" ہم گویند، مضائقہ ندارد۔"

نہیں یہ محض اتفاق ہے کہ تذکرے کو اس دوسرے نام ہی سے شہرت حاصل ہوئی اور اصل نام زیرِ نظر نسخے کی دریافت تک معرضِ خفا میں رہا۔ شورش کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں صرف ابو الحسن امر اللہ الہ آبادی نے اپنے یہاں کسی قدر تفصیل سے اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ بھی اس نام سے ناواقف ہیں بلکہ اس کے برخلاف ان کا بیان یہ ہے کہ۔

"نامش یادگارِ دوستاں" مقرر نمودہ ہم ازیں مصرع تاریخ تالیفش برآوردہ

یادگارِ دوستانِ روزگار ... ... [1]"

موجودہ نسخوں کی کسی تحریر سے اس روایت کی تائید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کسی دوسرے نسخے میں اس قسم کی کوئی صراحت موجود ہو کیونکہ اس سلسلے میں امر اللہ کا بغیر کسی بنیاد کے اپنی طرف سے کچھ لکھ دینا بالکل بے ضرورت اور بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے امر اللہ کی تحریر کے دوسرے جز یعنی مصرعۂ تاریخِ تالیف کا بھی ان نسخوں میں کوئی ذکر نہیں لیکن اس مصرعے سے جو سنہ (۱۱۹۱ھ) برآمد ہوتا ہے وہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے۔ شورش نے اگرچہ علٰحدہ سے زمانۂ تالیف کے سلسلے میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے لیکن نسخۂ جون پور میں غلام علی اظہر کے حال میں ان کا یہ جملۂ معترضہ کہ

"قبل ازیں ارادۂ تحریرِ تذکرہ نمود ... ... الحال در ۱۱۹۱ھ مزاجِ احقر بایں طرف مائل شدہ"

اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں مرتب ہوا ہے اس لئے اس مصرعے کو تاریخِ تالیف تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں۔ ۱۱۹۱ھ، ۷۷ء

---

[1] تذکرہ مسرت افزا، شائع کردہ قاضی عبدالودود ص ۱۱۲

کے بعد تذکرے کے ابتدائی متن میں کسی ترمیم و تغیر کے متعلق زیر بحث نسخے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

خطبۂ افتتاحیہ میں، جس کا کم از کم ایک ابتدائی صفحہ ضائع ہو چکا ہے۔ شورش نے عظیم آباد کے ادبی ماحول، تخلیقی و تصنیفی کاموں سے اپنی دلچسپی تذکرے کی تالیف کے اسباب و اغراض فن شعر کی عظمت و اہمیت اور ریختہ کے مختلف اقسام کے مختلف ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ عظیم آباد کے شعری ماحول کی تعمیر و تشکیل کو وہ براہِ راست شعرائے دہلی کے فیضان کا رہینِ منت قرار دیتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق عظیم آباد میں اردو شعر و سخن کی بنا ئش دہلی کے بعض اساتذہ کی تخلیقات کے وہاں تک پہنچنے اور ادبی حلقوں میں قبول عام حاصل کرنے کے بعد ہی استوار ہوئیں۔ مرزا مظہر جانِ جاناں میر محمد باقر حزیں، انعام اللہ خاں یقین، محمد نقیہ دردمند اور منشی لسان لال بیدار کے کلام کی شہرت و مقبولیت وہاں نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء) سے قبل ہی عام ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کی ادبی فضا اور اس کے دامن میں اپنے ذوقِ سخن کی تہذیب و تربیت کا حال انھوں نے ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا ہے۔

"بعد نادر شاہی میر باقر موصوف از شاہجہاں آباد تشریف بہ عظیم آباد آوردہ بندہ نفقگوئے شعر شاہی بطور مرزا موصوف (مرزا مظہر) رواج یافتہ۔ بہ تفضل برادر گرامی قدر میر محمد رضائے جرأت کہ فاضلِ جید بودند و در نثر و نظم مہارتِ کمال داشتند بگاہے غزل فارسی بمشورۂ نقیہ صاحب تدبور می فرمودند۔ میلانِ طبیعتِ احقر طرفِ ریختہ آمدہ غزل گفتہ۔ بعد ازاں برادر مسطور این

عاصی را بمیر باقر مذکور سپرده فرموده تا بیست غزل اصلاح از میر باقر موصوف گرفته بعده مزاجِ احقر مائل طرف مثنوی شد مثنوی "درد و الم" و "باغ و بہار" گفته - بعده میر باقر حزیں و میر محمد رضائے جرأت رحلت از عالم فانی بعالم جاودانی نمودند[1]۔ صحبت شعر و شاعری برہم خورده و زندگی بے حلاوت گردیده بعد یک سال چوں قدرے مزاج درست و بحال شده مثنوی سوم در تعریف عالم باغ مشتمل در مدح حضرت مولوی محمد وحید قدس سرہٗ و زائر حسین صاحب غفر له باتمام رسانیده و گاہے غزل ہم می گفت و دیوان خود درست نمی ساخت - دریں ضمن خمسہ مرزا محمد رفیع سودا سلمہ اللہ تعالیٰ کہ ایں مصرعہ لقیق غفر له ع کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے، مصرعۂ پنجم او بود شہرت دریں شہر یافته - بعده غزل مرزا اشعار خواجہ میر درد وغیرہ از دہلی رسیده و شہرت یافته و طرز سخن بطور دیگر گردیده۔

حسب اتفاق در صوبہ داری میر محمد کاظم خان بہادر احترام الدوله برصلاح دوستان و آشنایان محفلِ مشاعره بروز جمعه قرار یافته بود و دراں وقت اکثر صاحبانِ ہر بان فکر اشعار فارسی و ریختہ می فرمودند و دریں عرصه شاه ساکن از محمد آباد بنارس و خواجہ عبد اللہ آگاه سلمہ اللہ از مرشد آباد تشریف آوردند و میر غلام علی اظہر گفتند کہ حضرت شاه رکن الدین عشق عرف حضرت مرزا گھسیٹا صاحب

---

[1] جرأت نے ۴ محرم ۱۲۲۰ھ کو وفات پائی سالِ رحلت میر ابی کے مصرعہ مادہ تاریخ "سید محمد رضا" سے نکلتا ہے - تذکرہ شورش مخطوطہ آکسفورڈ ورق ۱۶۳ الف۔

مدظلہ العالی از مرشد آباد ترکِ روزگار نمودہ بہ عظیم آباد تشریف آوردہ
اند لہ اگر دریں محفلِ مشاعرہ تشریف آرند احسن است، احقر ہمراہ میر ندکو
رفتہ ملازمت نمودہ مستدعی (مصدع) خدمت گرامی شد از راہ
نوازش قبول فرمودند، تا محفلِ مشاعرہ کہ کم از یکسالی نماندہ، تشریف
مع میر محمد امین صاحب دیوانہ غزلہ - ارزانی می فرمودند"
ماہ رمضان کے آغاز کے ساتھ یہ محفلِ سخن برہم ہو گئی۔ لیکن شورش کو اس عرصے میں مرزا گھسیٹا عشق سے جو نیازمندانہ وابستگی پیدا ہو گئی تھی اس کی بنا پر وہ برابر ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان کے ارشاداتِ گرامی سے مستفید ہوتے رہے۔ لکھتے ہیں کہ

"دراں وقت اکثر مردم بہ خدمت عالی مثنوی حضرت مولوی روم
قدس سرہٗ و لمعات و شرح رباعیات مولوی جامی نور اللہ مرقدہٗ می خواندند
ایں عاصی ہم از دور سماعت می نمود سوائے ازیں ہر چہ ارشاد
فرمودند، آں را بطور ملفوظ قلم بند می ساخت۔"

ان جلسوں میں دو ایک بار شعرائے اردو کے تذکروں کا بھی ذکر آیا۔ حتیٰ کہ ایک روز مرزا صاحب نے ان کے بعض اہم نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شورش سے ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فرمائش کی۔

"روزے ارشاد شد کہ شخصے در تذکرۂ خود یک شعر از قصیدۂ مرزا

لہ آگے چل کر عشق کے حالات میں شورش نے یہ بتایا ہے کہ "از بست و دو سالی در عظیم آباد تشریف آوردہ ... ... استقامت فرمودہ" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ۱۱۶۹ یا ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶-۵۷ء) میں عظیم آباد پہنچے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے جمادی الاولیٰ ۱۱۷۰ھ جنوری ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد مرشد آباد کی سکونت ترک کی ہوگی۔

محمد رفیع سودا نوشتہ است دیگر خیر۔[1] ..... روزے بار ......

ارشاد فرمود: تذکرہ مردمان کاہ را کوہ و کوہ را کاہ می نمایند اشعار ہر یک

بقید ہر یک نمی نویسند، اگر شما تذکرہ بنویسید، خوب است ...

امر عالی را سعادت دارین تصور نمودہ تحریر می نماید و الا نہ، این

ہیچمدان را درین فن چہ شعور و چہ مقدور کہ دم زند۔"

تذکرے کی ترتیب کے اس پس منظر پر روشنی ڈالنے کے بعد شورش نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ فن شعر کی عظمت و اہمیت کے بارے میں اپنے تاثرات و خیالات قلمبند کیے ہیں۔ خطبے کا یہ حصہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کی تشریح و تفسیر ہے۔ شورش کے نزدیک وحی الہیٰ اور کلام موزوں ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کا مبدا ایک ہے اور الہامی و القائی کیفیت ان دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیا کی طرح شعرا بھی براہ راست فیضان الہیٰ سے مستفید ہوتے ہیں ان کا یہ امتیاز انھیں عوام الناس پر برتری عطا کرتا ہے۔ شعر کی عظمت اور برتری کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن حکیم کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتی ہے جو نثر کی بجائے نظم کا ایک ٹکڑا اور ایک مکمل مصرعہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی کلام موزوں کی مثالیں قرآن حکیم میں جا بجا موجود ہیں۔

اقسام ریختہ سے متعلق شورش کے بیانات "نکات الشعرا" سے ماخوذ ہیں ڈاکٹر محمود الہیٰ اپنے ایک مضمون میں اس حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

---

[1] میر صاحب کی جانب اشارہ ہے جنھوں نے اپنے تذکرے میں قصیدہ تضحیک روزگار کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "نکات الشعرا" طبع ثانی ص ۲۱۔

"شورش نے میر کے بیانات پر گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ میر
نے شعر کی چھ قسمیں بتائی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہیں پیش کی ہیں
شورش اس کی دو قسمیں بتاتے ہیں اور فارسی دار اردو اشعار سے
ان کی مثالیں پیش کرتے ہیں[1]"
اس تبصرے میں کئی باتیں قابل اعتراض ہیں۔ اول تو یہ کہ ڈاکٹر صاحب
کے بیان کے برخلاف میر صاحب نے ریختہ کی چھ اقسام میں سے کم سے کم
قسموں کی مثالیں ضرور پیش کی ہیں۔ دوسرے یہ بحث اقسام ریختہ کی ہے اس
فارسی اشعار سے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تیسری چیز جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ
ڈاکٹر صاحب اقسام ریختہ کی جس بڑھی ہوئی تعداد کو گرانقدر اضافے سے تعبیر کرتے ہیں
دراصل میر صاحب کے بیانات کی بیجا قطع و برید اور ان میں لایعنی تصرف کا نتیجہ ہے۔ جس
کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ میر صاحب کی تقسیم کے مطابق ریختہ کی چوتھی
قسم کی تفصیل یہ ہے کہ۔
"ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آن
جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند۔ ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب
است دانستن ایں نیز موقوف بر سلیقہ شاعری است۔ اگر ترکیب فارسی
موافق گفتگوئے ریختہ بود، مضائقہ ندارد[2]"
شورش نے میر صاحب کے اس بیان کو بالکل غیر ضروری طور پر دو حصوں میں تقسیم کر
کے ایک قسم کے اضافے کی گنجائش نکالی ہے۔ سلسلے وار ترتیب کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ اکثر قسمیں یہ ہیں:
"پنجم اکثر ترکیب فارسی کہ مناسب زبان ریختہ افتد، آن جائز است
چنانچہ گفتہ میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک۔"

---

[1] بازیافت ص ۱۹۳

[2] نکات الشعرا طبع ثانی۔ ص ۱۷۹

پنجم۔ ترکیبے کہ ناملائمِ زبانِ ریختہ باشد ایں است: دل دادہ ام زلف ورخ دل برندیدہ ہیں۔ یہ با مضاف فارسی باشد و مضاف الیہ ہندی با ترد مضمونہ است، زیا بستہ انار کہ اد تیر شی ہندی (لاگو) ناموس زبان ریختہ باشد درست است ۔۔۔

میر صاحب نے ریختہ کی چھٹی اور آخری قسم کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعت ہاست تجنیس ترصیع تشبیہ صفائے گفتگو فصاحت، بلاغت، ادا بندی خیال وغیرہ ایں ہمہ در ضمن ہمیں است[1]۔"

یہاں میر صاحب کا موضوعِ گفتگو وہ اندازِ سخن ہے جو انھوں نے اور ان کے معاصرین نے اختیار کیا تھا اور جس میں تمام محاسنِ شعری سے حسبِ ضرورت آرائشِ کلام کے امکانات موجود تھے۔ شورش غور و فکر کی کمی کی وجہ سے گفتگو کے اس مرکزی خیال تک پہنچنے سے قاصر رہے۔ چنانچہ انھوں نے بزعمِ خود اس جامع اور ہمہ گیر تصور کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور ہر صفت کو شاعری کی ایک علیحدہ قسم سے تعبیر کرتے ہوئے میر صاحب کی بیان کردہ قسم ششم کی بجائے حسبِ ذیل اقسام گنائی ہیں۔

"ہفتم۔ شعر تشبیہ چنانچہ گفتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہشتم شعر توشیح۔ توشیح آں را گویند کہ از حرفِ اول ہر مصرعہ نام خود یا دیگرے بر آرند و از آخر مصرعہ ہم حرف می گیرند و از مصرعہ ثانی ہم حرفِ اول و آخر می گیرند۔ نہم از صنائع شعر لف و نشر مرتب است چنانچہ مولوی باقر گفتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دہم تجنیس است چنانچہ محمد حسین آشوب گفتہ"

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۸۰۔

اول تو یہ صنعتیں صرف اردو شاعری کے ساتھ مخصوص نہیں اسی لیے اقسامِ ریختہ کے ضمن میں ان کا تذکرہ قطعاً بے معنی ہے۔ دوسرے اگر میر صاحب کے فرمودات میں ترمیم کی گنجائش کا عذر تلاش کر کے عشق کی اس تقسیم کو قابلِ قبول تصور کر لیا جائے تو صنائع لفظی و معنوی کی کثرتِ تعداد کے پیشِ نظر اقسامِ ریختہ کی کوئی حد متعین نہ کی جا سکے گی۔

اقسامِ ریختہ کی اس بحث کے ذیل میں عشق نے اپنے قارئین کو مختصراً علمِ عروض کے مبادیات سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور ہیئت کے لحاظ سے اصنافِ سخن کے حدود کا بھی تعین کیا ہے ہم یہاں بنظرِ اختصار ان مباحث کی تفصیل سے کنارہ کرتے ہوئے غزل کی ہیئتِ ترکیبی کے متعلق انکا بیان بطورِ نمونہ نقل کرتے ہیں۔

"غزل را تا سہ بیت گفتہ اند یکے مطلع، دوم مقطع سوم بیت الغزل و بعضے پنج بیت فرمودہ اند۔ یکے مطلع دوم حسن مطلع و بیت الغزل و حسن مقطع و مقطع۔ ازیں کمتر غزل نمی تواند بود تا نوزدہ بیت بلکہ بیست و پنج بیت زیادہ شد"

بحث کے خاتمے پر عشق کے یہاں ایک بار پھر درج ذیل ہدایات کی شکل میں میر کے "تذکرے" کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

"شاعر را باید کہ نصرت در مشق سخن و صحت لفظ فارسی و عربی و ہندی کہ داخل محاورہ فصحائے اردو شدہ معلی است نگاہ دارد و در پئے تلاش ایں باشد ہرگز تغافل نہ کند و برائے تلاش نقطہ فصاحت و بلاغت را از دست ندہد و اگر ہر دو میسر آید اولیٰ۔ بہترین شعر انداز است کہ آن مجید ہمہ صنعت است ہر صنعت کہ

فرض کنند داخل اندازہ است خارج نیست۔"

مقدمے کے آخر میں شورش نے تذکرے کی ترتیب کے لیے اپنی آمادگی کی ایک خاص وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"در ہندوستاں اکثر بزرگانِ تذکرہ نوشتہ اند و اشعار شاعرانِ قدیم و جدید بقید قلم آوردہ اند مگر دریں شہر گاہے کسے تذکرہ فارسی ہم نہ نوشتہ، بہ ہندی چہ رسد بنا برایں محنت را بر خود اختیار نمودہ کہ احوال و اشعار شاعران ایں جامعہ اشعار شاعرانِ ہندوستان بقید قلم آرد کہ در زمانہ حال و استقبال یادگار گردد۔"

شورش کے ابتدائی بیانات کے اس تفصیلی جائزے کے بعد تذکرے کی تالیف کے اسباب اور مقاصد و محرکات کے سلسلے میں جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں

(الف) عظیم آباد میں اردو شاعری کی روز افزوں مقبولیت نے تذکرہ نویسوں کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔

(ب) زیر بحث تذکرے کی تالیف مرزا گھسیٹا عشق کے ایما پر عمل میں آئی۔

(ج) تذکرے کی ترتیب کا مقصد دوسرے تذکرہ نگاروں کی روش کے برخلاف ہر شاعر کے صحیح مرتبے کے مطابق اس کے کلام کا انتخاب پیش کرنا اور

(د) عظیم آباد کے شعرا کو شائقینِ شعر و ادب سے روشناس کرانا ہے۔

تذکرے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب سے پہلے

[illegible] شورش ان میں سے صرف تیر

اور گردیزی کے تذکروں سے واقف ہیں۔ انھوں نے شعرا کے حالات و اشعار
کی فراہمی میں ان دونوں تذکروں سے کافی مدد لی ہے۔ لیکن شفیق اورنگ آبادی
کی طرح میر کے تذکرے سے وہ بھی پوری طرح مطمئن نہیں[1]۔ چنانچہ چمنستان
شعرا کی مانند یہ تذکرہ بھی دراصل "نکات الشعرا" کے خلاف ردعمل کے سلسلے
کی ایک کڑی ہے۔ مرزا گھسیٹا عشق کے یہ اعتراضات کہ ایک تذکرہ نگار
نے سودا کے قصیدے کا صرف ایک شعر اپنے یہاں نقل کیا ہے اور عام
طور پر تذکرہ نگار انتخاب کلام میں فرق مراتب کا خیال نہیں رکھتے جن میں
بلاشک و شبہ یہی تذکرہ مورد تنقید ہے، اس جانب واضح اشارہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر
محمود الٰہی کے بقول، "نکات الشعرا" کے مقابلے میں "رموز الشعرا" نام رکھنا
بھی اسی رجحان کی توثیق کرتا ہے[2]۔ اگرچہ بظاہر اس ردعمل کی خاص وجہ یقین
کی موزوں طبعی کے بارے میں میر کے شکوک و شبہات معلوم ہوتے ہیں
جن کی تردید پر شورش نے کافی زور قلم صرف کیا ہے لیکن نکات الشعرا سے
مرزا گھسیٹا عشق کی بے اطمینانی اور ان کے ایما سے شورش کی ترتیب تذکرہ کے لیے
آمادگی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشق کا ذکر اس تذکرے میں شامل نہیں
جہاں تک عام شعرا کے تعارف کے سلسلے میں "نکات الشعرا" اور تذکرہ گردیزی
کی خامیوں کے ازالے یا ان کی سطح سے بلند تر ہو کر کچھ لکھنے کا تعلق ہے۔ شورش
توازن پسندی اور مرتبہ شناسی کو اپنا مطمح نظر بنا کر کام شروع کرنے کے باوجود
بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ میر اور گردیزی

---

[1] میر صاحب کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "وہ تذکرہ خود بمعصران خود را در پایۂ انزجار کشیدہ و اکثر
را ہجو نمودہ مگر بعضے اعزہ کہ از ربط بودند آن را محفوظ داشتہ"۔

[2] بازیافت ص ۱۹۲-۱۹۳

کی معلومات پر بالعموم کوئی اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اکثر انھیں کے بیانات بجنسہ انھیں الفاظ میں یا چند لفظوں کے ناقابلِ لحاظ ردوبدل کے ساتھ یہاں نقل کر لئے ہیں۔ اس اخذ و اقتباس کی مثالیں بعض اوقات یکے بعد دیگرے اس تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ اس تذکرے کی انفرادی حیثیت ہی کالعدم معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہم یہاں کسی خاص ترتیب اور تسلسل کا خیال رکھے بغیر ان میں سے چند مثالیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

(الف) شاہ ولی اللہ اشتیاق:۔ "از ابنائے شیخ مجدد الف ثانی است و طبعش موجدِ معانی۔ باوصف ذکر و فکر دینی گاہے شغلِ شعر ہم می کرد۔۔۔۔ (ماخوذ از تذکرہ گردیزی) ۔۔۔۔۔ در تذکرہ میر مرقوم است نبیرۂ شاہ محمد گل مولد او سرہند است در کوٹلہ فیروز شاہ سکونت داشت فکر ریختہ می نمود۔"

(ب) محمد اسمٰعیل بیتاب:۔ "در تذکرہ میر مرقوم است کہ مردِ درویش بود شاگرد میاں یکرنگ بسیار مربوط و مضبوط الاحوال دریں ایام بجانہ جعفر علی خاں می رفت کہ از پشت اسپ بر افتادہ استخوانش شکست بیماری دو سہ ماہ کشید آخر از ہماں آزار راہِ فنا گرفت۔ خدا مغفرت کند۔"

(ج) میاں صلاح الدین عرف مکھن پاکباز تخلص۔ "در تذکرۂ تقی میر مرقوم است کہ شخصے است گوشہ نشین شاگرد میاں یکرنگ بسیار کم اختلاط گویا آشنا شدن را نمی داند۔ پسر میاں شاہ کمال نبیرۂ شاہ جلال قدس سرہ است اکثر بورد و وظائف مشغول می باشد در جمع شاعرانِ ریختہ کہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ قرار یافتہ است اگر

دماغ دخامی کند، تشریف می آرد۔ مزاجش خالی از وحشت نیست۔"

(د) میر شیر علی جرأت۔ "در تذکرہ سید فتح علی ...... مرقوم است کہ دلی بستہ صحیح قدان بود، تحصیلِ کتبِ متداولہ می نمود۔ شعر را کم می گفت، و اگر احیاناً می گفت کمتر می خواند۔ از اں روزے کہ از شاہجہاں آباد متوجہ طرف ملکِ دکن شدہ، باز بر حالش اطلاع نہ گردیدہ۔"

عظیم آباد اور اس کے اطراف و نواح سے تعلق رکھنے والے شعرا کے بارے میں شورش کے بیانات البتہ کسی قدر مفصل اور معلومات افزا ہیں۔ یہاں بھی اگرچہ انھوں نے بجز ایک دو مقامات کے کسی جگہ سنین و تواریخ کے تعین سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے پھر بھی ان کے بیانات سے بعض شاعروں کے متعلق کچھ ایسی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں جن کا ذکر دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباسات میں پیش کی ہوئی معلومات سے ہماری واقفیت کا واحد ذریعہ صرف یہی تذکرہ ہے:

(الف) محمد روشن جوشش۔ "ساکن محلہ لودی کٹرہ من محلات بلدۂ عظیم آباد ......"

(ب) ہیبت قلی خاں حسرت۔ "...... اول بنائے ریختہ در عظیم آباد ایشاں ریختہ ......"

(ج) محمد عابد دل۔ "...... در جنگِ شاہ عالم بادشاہ[1] ہمراہ راجہ رام نرائن صوبہ دارِ عظیم آباد بود و زخمی شدہ در میدان افتاد۔ میاں محمد روشن (جوشش) ہمراہ بودند۔ آخر بخانۂ خود آمدہ ہر چند تدبیرات نمود لیکن یک دست و یک چشم از کار رفتہ و دست

---

[1] جنگ بہجر کی طرف اشارہ ہے جو ۲۸ ربیع الثانی ۱۱۷۴ھ ۲۶ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو وقوع پذیر ہوئی تھی۔

دیگر ہم مجروح است۔"

(۴) شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا عشق "۔۔۔۔۔۔۔ از بست و دو سال در عظیم آباد تشریف آوردہ ترک روزگار نمودہ استقامت ورزیدہ۔۔۔۔"

(۵) اشرف علی خاں فغاں۔ "در عشرۂ محرم قبل از۔۔۔۔ در عظیم آباد تشریف آوردہ۔۔۔۔ چند روز نگذشتہ بود کہ بموجب طلب احمد شاہ بہادر بادشاہ روانۂ طرفِ دہلی گردیدہ۔ درانجا کوکہ خاں خطاب یافتہ۔ بعد تخلل سلطنتِ شاہ موصوف باز تشریف بہ عظیم آباد آوردہ بجلوت مہاراجہ شتاب رائے دوستی پیدا نمودہ و بوسیلۂ ظرافت۔۔۔۔۔ التمغا بہم رسانیدہ خطابِ ظریف الملک مصاحب الدولہ۔۔۔۔ یکہ تاز جنگ یافتہ۔۔۔۔۔"

جن شاعروں کے تعارف پر شورش نے خاص توجہ صرف کی ہے ان سے متعلق واقعات کے بیان میں ان کے یہاں ایسے قرائن از حوالے خاصی تعداد میں موجود ہیں جن سے ان کے زمانۂ وقوع کی دریافت میں مدد ملتی ہے اور کسی حد تک اس کمی کا ازالہ ہو جاتا ہے جو تواریخ و سنین کے التزام سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ مدرج ذیل مثالوں سے اس خصوصیت کا اندازہ ہوگا۔

(الف) غلام علی اظہر۔ "خلف الرشید میر محمد جعفر۔ میر غلام علی اظہر سلمہ اللہ تعالیٰ۔ روزے می فرمود بر سبیل حکایت کہ جد من ہمراہ رکاب امیر تیمور آمدہ در دہلی سکن اختیار نمودہ۔ تا وقت محمد شاہ بادشاہ فردوس آرام گاہ نمط نوکری از خداوندی بجا بود۔ باعث تخلل سلطنت تفرقہ در نمود۔ ہمراہ شاہ عالم بادشاہ غازی احقر بہ

عظیم آباد آمدہ بعد صلح راجہ رام نارائن صوبہ دار بسبب عدم حصول زر بموضع بیلانہ اندک فرصت گرفتہ بعدہ بشہر آمدہ۔ ذوقِ شعر و شاعری از صبحِ شعور بود۔ شاگردیٔ میر شمس الدین فقیر غفرلہ اختیار نمودہ ادبرائے استحکام ایں فکر از میزان تا مطول خواندہ گاہے ہیئت گاہے ہندسہ وغیرہ بمطالعہ آوردہ۔ بہر حال ایں دولت علم عربی در عظیم آباد بہم رسانیدہ۔ الحق درفن شعر فارسی الحال دریں شہر ذات والاصفات ایشان (اظہر) غنیمت است ۔ از لوازم ایں اطلاع کلی دارد۔ در محفلِ مشاعرۂ فقیر (شورش) غزل طرحی بوجہ احسن سر انجام نمودہ بہ پاس خاطر دوستان دو سہ غزل ریختہ نیز گفتہ۔ بعد چندے باعث صحبت و اتحاد قدیم حضرت عشق مدظلہ العالی قریب پنجاہ غزل ریختہ طرح نمودہ۔"

(ب) "منشی لبادن لعل بیدار" کاتب روزنگار منشی لبادن لعل بیدار صاحبِ دیوان فارسی شاگرد حضرت مرزا مظہر مدظلہ العالی بر رفاقت غلام حسن خاں خلف نواب اعظم خان دیوانِ بادشاہی پیش از نادر شاہی تشریف آوردہ تا بودنِ خدمتِ دیوانی خاں صاحب موصوف بعظیم آباد ماندہ باز تشریف بہ شاہجہاں آباد بردو ازاں روز یکہ غلام حسن خاں صاحب موصوف ہمراہ نواب صفدر جنگ وزیر برآمدہ در مرشد آباد استقامت ورزیدہ۔ منشی صاحب را بخدمت نواب شہامت جنگ سپرد نمودہ۔ بعد انتقال نواب شہامت جنگ غفرلہ، منشی صاحب دست از روزگار برداشتہ بہ عظیم آباد تشریف آوردہ بطریق سیر بخدمت شیخ عبدالشکور صاحب غفرلہ رفتہ۔ چندے روزی گار ترہت و چندے

و در سرکار چنپاران تشریف داشت اکثر مردم از فیض صحبت تربیت یافته
چنانچه ایں احقر قدرے دیوان حضرت مرزا موصوف (مظہر)
خوانده ... ... قریب چهار سال است که بطرف محمد آباد بنارس
رفته۔ الحال معلوم گشته که در کاشی قیام نموده در یاد مولی که از همه
انکار اولی است لیل و نہار مشغول می باشد"

(ج) ہیبت قلی خاں حسرت :۔ "شاعر صاحب جرأت، ہیبت قلی خاں
حسرت عرف میر محمد حیات سلمہ اللہ تعالی که اوّل بنائے ریختہ در
عظیم آباد الشان ریختہ۔ حسب اتفاق بعد نادر شاہی میر باقر
موصوف غفرلہ، از شاہجہاں آباد به عظیم آباد تشریف آورده۔ میر
محمد حیات مذکور شاگردی میر مسطور اختیار نموده همراه ایشان
به پرنیه تشریف بوده آنجا داروغه دیوان خانه نواب شوکت جنگ
شہید شده۔ بعد ازاں از همشیره میر باقر مذکور منسوب گشته داروغه
دیوان خانه نواب سراج الدوله گشته و در رفاقت آں کار رانموده
واز فضل الہی بعزت و حرمت مانده بلکه خطاب خانی و جاگیر
یافت ... ... دریں روزہا نوکر نواب مبارک الدوله اند و در
مرشد آباد بدستور قیام می دارند"

(د) میر محمد باقر ظہور :۔ "خلف فخر اللہ خاں ساکن عظیم آباد بعد
شہادت خاں موصوف تشریف به شاہجہاں آباد برده بخدمت برادر
نسبتی خواجه محمدی خاں صاحب غفرلہ رسیده و شاگرد حضرت
مرزا مظہر گردیده، حزیں تخلص یافته چنانچه مشهور و معروف است
که صاحب دیوان است آخر در وقت حکومت نواب زین الدین احمد

خاں مہابت جنگ از دہلی مراجعت نمودہ در سرکار نواب موصوف نوکر گشتہ بسیار بعزت و حرمت اوقات بسر می برد۔ دیوان دیگر در ڈھاکہ درست فرمودہ و تخلص ظہور قرار دادہ۔ چوں باز در عظیم آباد آمدہ ساقی نامہ و ترجیع بند تصنیف نمودہ۔ آخر ہمراہ نواب صولت جنگ بوسیلہ میر محمد وحید صاحب و قبلہ مغفور در پورنیہ رفت و جان بجاناں داد۔ در روضہ حضرت شاہ مصطفےٰ اجمال الحق قدس سرہٗ زیر چبوترہ جائے مدفن یافت۔"

عام شاعروں کے تعارف میں مختصر نگاری یا میر اور گردیزی کے بیانات پر اکتفا کے علاوہ "تذکرۂ شورش" کا ایک نمایاں نقص یہ بھی ہے کہ اس کے مؤلف نے سیرت اور شخصیت کے مطالعے کی ضرورت و اہمیت کو بالکل محسوس نہیں کیا ہے۔ اخلاق و عادات، مزاج و طبیعت اور علمی و ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اظہار خیال سے صرف نظر کی یہ کیفیت شورش کے یہاں اس قدر عام ہے کہ نادیدہ معاصرین و متقدمین کے پہلو بہ پہلو ان کے احباب و اعزہ اور ہم وطن معاصرین بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکے ہیں۔ چنانچہ سرسری اندازے کے مطابق دو سو آٹھ میں سے تقریباً دو سو چالیس شاعروں کے ترجمے شخصیت کے ان عناصر ترکیبی کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔ باقی شعرا کے حالات میں اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی کیفیت ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے۔

(الف) منشی بساون لعل بیدار۔ "حشمش مائل طرف حسن پرستی و دلش مادرکِ بلند و پستی۔"

(ب) علی ابراہیم خاں خلیل: "آنچہ انسان را می باید ہمہ چیز می دارند۔"

(ج) محمد عابد دل۔ "مردیست مزاج گرفتہ و شوخ طبع متصدی ...

"سپاہی ناملح"۔

(د) شاہ رکن الدین عشق۔ "آنچہ انسان کامل را می باید، ہمہ می دارند"

(ہ) میر زین الدین عشق۔ "مرد یست مجسم بعجز و انکسار از نوادرۂ روزگار"

(و) اشرف علی خاں فغاں۔ "بسیار گرم جوش و صاحب اختلاط بنظر آمدہ است"

تنقید کلام کے نقطۂ نظر سے بھی شورش کا تذکرہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ان کے بعض پیشرو اور ہم عصر تذکرہ نویسوں نے پیش کیا ہے۔ اس تذکرے میں تنقیدی مواد کیفیت کے لحاظ سے ہی کم از نہیں، کمیت کے اعتبار سے بھی ناقابل اعتنا ہے۔ شورش اس ناقدانہ شعور اور فنی بصیرت سے تقریباً محروم نظر آتے ہیں جس کے بغیر کسی تذکرہ نگار کے اندر خود اعتمادی اور اظہار خیال کی جرأت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لئے وہ ان شعرا کے کلام کے متعلق بھی جن کے دواوین ان کے زیر مطالعہ رہے ہیں کسی قسم کی رائے ظاہر کئے بغیر اشعار نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس معمول کے برخلاف اگر اتفاقاً کسی شاعر کی فنکارانہ حیثیت یا اس کی تخلیقات کے محاسن خصوصی کے بارے میں انھوں نے اپنے تاثرات سپرد قلم کئے بھی ہیں تو وہ اس طرح کے مختصر جملوں سے آگے نہیں بڑھتے

(الف) شاہ نجم الدین آبرو:۔ "اشعار مثنوی ذو ایہام در درستی جو خوب گفتہ"۔

(ب) منشی ابالعل بیدار در سخن او نغمے است دلپذیر و در ترسل و نثر نیز بے نظیر۔

(ج) محمود روشن جوشش:۔ "در فکر شعر است ... مثل خود در ین شہر در فکر سخن ندارد مگر برادر خورد"۔

(د) محمد عابد دل: "در فن شعر در شہر نظیرے ندارد مگر میاں محمود روشن برادر خورد"۔

(۵) مرزا بجو ندوی :۔ "شاعر لیست شیریں کلام .... غزل بوضع درست می گوید۔"

(۶) فرحت اللہ فرحت :۔ "شعرش از فصاحت و بلاغت خالی نیست۔"

کلام کی نمایاں خصوصیات اور فنی و لسانی معیار کے متعلق جامع و مانع انداز میں رائے زنی کی بہ نسبت شورش نے اشعار کے لفظی و معنوی اسقام کی گرفت پر کسی قدر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بعض اعتراضات مدلل بھی ہیں اور معقول بھی۔ مثلاً خواجہ امین الدین امین کا ایک شعر ہے۔

کیا فائدہ ہے رونے سے اے اہلِ دہر پھر
آیا ہے بعد مرنے کے یاں کوئی مر کر پھر

شورش کا اعتراض ہے کہ۔

"ایں مرد شعر را بے معنی کردہ است تخصیص لفظ دہر بے جاست کہ کسے باز نہ آمدہ است۔"

میر ضیا دہلوی کے اس شعر پر کہ۔

خم ہی میں بیٹھی بیٹھی ادھلی پڑے ہے باہر
دخترِ مغاں نے اپنی کتنی ذلیل کی ہے

شورش یہ اعتراض کرتے ہیں کہ۔

"در اول مصرع لفظ" ادھلی" گاہے بسمع احقر مولف نہ آمدہ ودر آخر مصرع شراب را دخترِ مغان قرار دادہ است۔ اگرچہ دخترِ رز و دختر تاک و بنت العنب شراب را می گویند لیکن دخترِ مغان گاہے نشنیدہ۔"

مصطفےٰ خاں یکرنگ کی ایک غزل کا مقطع ہے

محبت کا عجب یکرنگ ہے رنگ کبھی عاشق، کبھی معشوق ہیں ہم

شورش کا خیال ہے کہ

"دریں شعر تخلص لطف نمی دہد۔ مصرع ثانی مشتمل بر یک رنگی است یکرنگی نائدہ نمی کند"

ڈاکٹر محمود الہٰی نے تذکرہ شورش پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"شورش کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرا کے کلام پر بڑے اعتماد کے ساتھ آزادانہ اور بے باک رائے دیتے ہیں۔ تنقید کا یہ فن انھوں نے حضرت رکن الدین عشق سے سیکھا ہے جو بلاشبہ عظیم آباد کے عالموں، صوفیوں اور شاعروں میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے[1]"

نسخہ جونپور کے واسطے سے تنقید کلام کی جتنی مثالیں ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں اعتماد اور آزادی رائے کی جھلک کسی جگہ بھی نظر نہیں آتی البتہ اگر کلام پر اظہار رائے کی تخصیص کو ختم کر کے میر صاحب کے تذکرے کی حریفانہ خردگیری کو بھی تنقید ہی کے زمرے میں شامل کر لیا جائے تو کسی حد تک ڈاکٹر صاحب کے قول سے اتفاق کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ شورش نے میر کی شخصیت، ان کے کلام، دوسروں کے اشعار پر ان کی اصلاحات اور انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں ان کے خیالات کی تنقیص و تکذیب میں جس زور قلم اور جوش بیان کا مظاہرہ کیا ہے اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی عظیم طغیانی کے اثر سے یک بیک کسی رُکے ہوئے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ "نکات الشعرا" کے متعلق شورش کی رائے کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا

---

[1] بازیافت۔ ص ۱۹۳

ہے اس لئے یہاں دوبارہ اس کا ذکر غیر ضروری ہے۔ باقی امور کے سلسلے میں ان کی تحریروں کے چند اقتباس ضروری توضیحات کے ساتھ سطور ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

(الف) دعویٰ سیادت کی تردید :- شورش میر کے دعویٰ سیادت کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ انھوں نے انھیں ہر جگہ میر تقی کے بجائے تقی میر کے نام سے یاد کیا ہے۔ ردیف میم کے ذیل میں ان کا مفصل تعارف سپرد قلم کرتے ہوئے اپنے اس موقف کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

"خود را سید نوشتہ اند۔ مردمان می گویند کہ شیخ است چنانچہ مرزا محمد رفیع سودا می فرماید۔ دلّی کا ایک شیخ زادہ گنجفے کا میر ہے! یعنی در حقیقت میر نیست خاطر نیگر می گویند ع

شیخ تقی نام ہو اور میر کہا رہے

شاید ایں حدیث شریف بگوش ایشان نرسیدہ۔ لعنت اللہ علی داخل النسب وعلی خارج النسب و برائے ازیں سید شیخ علی . . . . . .

در تذکرہ خود تقی میر را سید نوشتہ است، پس ایشان برائے استحکام سیادت کاذبہ خود میر تخلص نمودہ اند۔ وجہ تخلص میر اکثر حالی معلوم گشتہ"

(ب) کلام پر اعتراضات :- شورش نے میر کے اشعار میں الفاظ کے محض استعمال پر اعتراض اور ان کے معنوی اسقام کی گرفت کا بھی حتی الامکان کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان اعتراض کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا تعلق صرف ان اشعار سے ہے جو میر نے خود ہی اپنے منتخب کلام کے طور پر

"نکات الشعرا" میں نقل کئے ہیں۔ ہم ان میں سے چند کی مثالیں یہاں پیش کرتے ہیں جن سے ان کی فنی حیثیت کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ شعر۔ سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

اعتراض:۔ "در مصرعِ اول اضافت طرفِ صد پارہ می باید یعنی " دل صد پارہ " ایں جا قطعِ اضافت درست دانستہ اند۔ دیگر اینست کہ کاتب نوشتہ است " اس نخچیر کا " ایں درست نمی شود می باید " اُس نخچیر کا "۔ تا از مصرعِ ثانی التزام یابد و معنی پیدا کند۔ والّا، شعر بے معنی می شود"۔

۲۔ شعر۔ جو ترے کوچے میں آیا پھر نہیں کاڑھا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامنگیر کا

اعتراض۔ " در مصرعِ اول لفظ " کاڑھا " آوردہ اند برائے بابان سند است لیکن در عظیم آباد مردمانِ فصیح نمی گویند مگر اراذل می گویند " کھانا کاڑھا گیا "۔ بہر حال اگر شعر من می بود ایں طور می گفتم "۔ ع

جو ترے کوچے میں آیا پھر نہیں چھوڑا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامنگیر کا

۳۔ شعر۔ کو گل و لالہ، کہاں سنبل سمن اور نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

اعتراض۔ " دریں شعر ہم تامل است لفظ " کو " فہمیدہ نمی شود کہ ایں جا چہ کار می کند"۔

(ج) اصلاحات سے اختلاف: میر نے نکات الشعرا میں مختلف شعرا کے اشعار پر جو اصلاحیں دی ہیں، شورش کے نزدیک ان میں سے بھی اکثر قابلِ قبول نہیں۔ مثال کے طور پر مصطفےٰ خاں یک رنگ کے اس شعر میں کہ

سچ کہے جو سو کوئی مارا جائے — راستی ہے گی دار کی صورت

میر صاحب "سچ" کی بجائے "حق" کو ترجیح طلب تصور کرتے ہیں۔[1]

شورش کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے کہ

"سچ ہندی و راست فارسی و حق عربی، ہر سہ یک معنی دارد۔ غالب است کہ شاعر از حرفِ حق غافل نباشد لیکن مثل مشہور ہمیں طور است "سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے"! "حق کہے جو کوئی سو مارا جائے"۔ مشہور نیست و در مثل دخل نمودن درست نیست و حق برائے دار خوب است اگر مثل نمی بود مضائقہ نہ داشت۔ سوائے ازیں حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ می فرمایند۔ لفظ جہاں گشتہ دمعنی غریب در شعر می باید، درین مقام لفظ جہاں گشتہ لفظ "سچ" است انصاف شرط است احقر حرف نمی کند"!

انعام اللہ خاں یقین کا ایک شعر ہے۔

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو

کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانے پن میں

میر صاحب کا خیال ہے کہ اگر بجائے "خوش نصیبی" "خوش معاشی"

---

1 - باعتقاد فقیر بجائے "سچ" حرف "حق" اولیٰ است"۔۔۔۔ نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۲

می گفت ایں شعر بسیار بامزہ می شد[1]" شورش صرف اس تجویز سے ہی اختلاف نہیں کرتے بلکہ اس کی تنقیص کے ساتھ میر کی سخن فہمی اور فنی شعور پر چوٹ کا بھی ایک موقع نکال لیتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ

"ہمہ چیز اس نصیب تعلق دارد چنانچہ گفتہ اند، آنچہ نصیب نیست بتو می رسد کسے کہ چیزے در ظاہر بہ تدبیر بہم رساند و بیجا خرچ می نماید آنرا خوش معاشی می گویند دیوانہ پن محض از نصیب بوست می آید بنابر "خوش نصیبی" گفتہ ، خوش معاشی از تعلق دارد و "دیوانہ پن" از بے عقلی۔ پس بے عقل را خوش معاش نباید گفت ایں جا رائے میر غلطی کردہ است لہذا ازماں می گویند کہ شعور کلی دریں فن ندارد۔ خان آرزو، دیوان درست کردہ دادہ است چنانچہ کسے گفتہ است

ہر ذرق پر ہے میر کے اصلاح
لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے"

(د) یقین سے متعلق بیانات کا تجزیہ ۔ میر نے اپنے تذکرے کے ذریعہ قارئین کو انعام اللہ خاں یقین کی شخصیت اور شاعری کے خلاف جو تاثر دینا چاہا تھا، شورش اسے حریفانہ چشمک کی ایک کرشمہ کاری سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ انھوں نے اس سلسلے میں حتی الامکان اپنی طرف سے کوئی صفائی پیش کرنے کی بجائے اس روایت کو درایت کے معیار پر پرکھنے کا طریقہ کار اپنایا ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ میر صاحب کی پیش کی ہوئی شہادتوں کے تناقص اور داخلی کمزوریوں

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۰

کو اجاگر کیا ہے۔ وہ ہر بیان کے تمام پہلوؤں پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان میں کس حد تک ثقاہت اور صداقت کا عنصر موجود ہے۔ مثال کے طور پر میر صاحب فرماتے ہیں۔

"میاں یقین را مردمان می گفتند کہ مرزا مظہر از راہ شعر گفتہ می دہند و وارث شعرہائے ریختہ خود گردانیدہ[1]"

شورش نے اس بیان کے رد میں جو دلائل پیش کئے ہیں منجملہ ان کے ایک دلیل یہ ہے کہ۔

"اگر مرزا یقین را دیوان گفتہ می داد، میر باقر حزیں جواب دیوان میاں یقین نمی گفتند چراکہ میر باقر حزیں بے ادب نبودند کہ جواب دیوان استاد می گفتند (لہٰذا) ایں غلط است کہ مرزا گفتہ دیوان بنام یقین رواج دادہ و آن دیوان الحال موجود است کہ میر باقر حزیں در جواب گفتہ اند۔"

میر صاحب کی معلومات کے مطابق یقین کے دل میں اپنے استاد مرزا مظہر کی کوئی خاص قدر و منزلت نہ تھی۔ یہ بات وہ سر دل تک پہنچانے کے لئے انھوں نے ایک مجہول الاسم راوی کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

"سبحانہٗ عطیۃ اللہ خاں پسر نواب عنایت اللہ خاں مرحوم یقین نشستہ بود می گفت از اول روزے کہ مرزا دست استادی از سر من برداشتہ است، شعر من ترقی کردہ۔ شخص مذکور ایں مصرعہ نظامی بآواز بلند و پیش حضار مجلس خواند۔ شد ان مرغ کو خایہ زریں

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۸

نہاد، حاصل او را بیضہ در کلاہ شکست[1]"

خوشؔ اس الزام کے جواب میں میر صاحب ہی کے ایک سابقہ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"درد ہر چہ گویا حافظہ نمی باشد گاہے می گوید یقین فہم و فراست شاعری نمی دارد گاہے می نویسد کہ استادیٔ مرزا را انحطاط نمی آرد۔ ازیں معلوم می شود کہ ہمہ غلط است۔۔۔۔ سوائے ازیں میر صاحب انصاف فرمایند کہ یقین در دیوان خود گفتہ رفتہ است"

چوں نماز اپنے پہ تمام صبح لازم کر یقیں
حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

ثنائے میرزا مظہر ازیں تحریر باثبات می رسد و ندامت از گفتۂ مخالف بیشِ تحریر تقریر بکار نمی آید۔"

میر صاحب یقین کی موزونیٔ طبعی پر شبہے کی تائید میں ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"میاں شہاب الدین ۔۔۔ ثاقب نقل می کرد کہ من محض برائے امتحان بخانہ او (یقین) رفتم و یک غزل طرح کردم۔ من غزل باتمام رسانیدم و از و مصرعے موزوں نشدہ۔ اللہ اعلم[2]"

خوشؔ کے خیال میں یہ واقعہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا

---

[1] نکات الشعرا کے مطبوعہ نسخے میں اس عبارت میں "از مرمن برداشتہ است" کی بجائے "در مرمن داشتہ است" تحریر ہے (طبع ثانی ص ۶۲) لیکن سیاق و سباق کے پیش نظر "تذکرہ خوشؔ کی روایت قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

[2] نکات الشعرا طبع ثانی ۶۲

ہے وہ لازماً درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ

"تقی میر در تذکرۂ خود در حق میاں ثاقب نوشتہ اند کہ ہمہ چیز می دانند و ہیچ نمی دانند[1]

پس شخصے کہ ہیچ ندانستہ باشد چگونہ مثلِ یقین شاعر ہم طرح او شود اگر ہم چشم خود دانست چیزے نمی فرمود و ایں ہم احتمال دارد کہ آں غزل میاں ثاقب بیشتر گفتہ باشند و بسبع میاں یقین رسیدہ باشد از راہِ ستاری چیزے نگفتہ باشند"

"تذکرۂ شورش" کی تنقیدی کائنات انھیں معارضانہ بحثوں تک محدود ہے اور ان میں بھی چونکہ "نکات الشعرا" کی تنقیص کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد مولف کے پیش نظر نہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی اس رائے پر قائم رہنے میں کوئی عذر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ یہ تذکرہ تنقیدِ فن کے نقطۂ نظر سے اس معیار کی تالیف نہیں جو شورش سے قبل اور ان کے زمانے میں بھی بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔

انتخاب کلام کے معاملے میں بھی شورش کے یہاں کوئی ندرت اور انفرادیت نظر نہیں آتی۔ انھیں دوسرے تذکرہ نگاروں سے تو یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اشعار کے نقل کرنے میں توازن و تناسب کی نگہداری اور پاسِ مراتب سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے لیکن خود ان کے یہاں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں انھوں نے محض تساہل اور سہل انگاری کی بنا پر دواوین کی تلاش و جستجو اور براہِ راست انتخاب کی زحمت سے بچنے کے لئے دوسروں کے نقل کئے ہوئے یا سُنے سنائے چند اشعار نقل کر دئے ہیں یا پھر شاعر کے

---

[1] در ہمہ چیز دست دارد و ہیچ نمی داند۔" نکات الشعرا طبع ثانی ص ۸۹

مرتبے کا خیال رکھے بغیر بالکل غیر شعوری طور پر یا ذاتی وہ وطنی تعلق اور اسی قسم کے دوسرے محرکات کے زیر اثر ضرورت سے زیادہ کلام انتخاب کر لیا ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اس تذکرے میں بعض نمایاں خامیاں نظر آتی ہیں۔ خورشؔ کی عبارت میں نہ پختگی ہے اور نہ دلکشی بلکہ بعض اوقات ان کی تحریر کا انداز بالکل مبتدیانہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "احقر دریں کلام ہرگز ارادۂ انشا نہ کردہ است۔۔۔۔۔۔ صاف مطلب نوشتہ است و خواہد نوشت" لیکن وہ جس چیز کو صفائی بیان سے تعبیر کرتے ہیں وہ سادگی و سلاست کی بہ نسبت سپاٹ پن سے زیادہ قریب ہے۔

مسرّت افزا

تذکرہ "مسرت افزا" ابوالحسن امیرالدین احمد معروف بہ امراللہ الٰہ آبادی کی تالیف ہے۔ اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں اور دوسرا آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ موخرالذکر نسخے کا متن قاضی عبدالودود صاحب نے سہ ماہی معاصر پٹنہ کے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ کے بعض شماروں میں بالاقساط شائع کر دیا ہے۔ یہی مطبوعہ اقساط اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ مولف تذکرہ کا بیان ہے کہ وہ ماہ صفر ۱۱۹۲ھ (مارچ ۱۷۷۸ء) میں دیار شرق کی سیر و سیاحت کے ارادے سے اپنے بڑے بھائی خیرالدین محمد کے ہمراہ وطن سے نکلے اور عظیم آباد پہنچے۔ وہاں مختلف معروف اور غیر معروف شاعروں سے ملنے اور ان کا کلام سننے کے بعد ان کے حالات کی ترتیب و تحریر کا خیال پیدا ہوا لیکن یہ خیال ابھی محتاج عمل تھا کہ انھیں عظیم آباد سے کلکتے کی طرف چل دینا پڑا چونکہ مستقبل قریب میں اطمینان و سکون میسر آنے کی کوئی یقینی صورت نہ تھی اس لئے دوران مسافرت ہی میں کام شروع کر دیا گیا اور سوم ماہ جمادی الآخری ۱۱۹۲ھ (۱۸ جون ۱۷۷۸ء) کو اس کی تکمیل ہو گئی جیساکہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے ؎

از ہجرت افضل البشر بود | تسعین و ہزار و صد سہ افزود
بود زمہ جماد دوم | تاریخ سوم ز جیش نے کم
کیں تذکرۂ مسرت افزا | ایں خامۂ من نمود املا

لیکن تذکرے میں بعض ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ

۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کچھ اضافے کیے جاتے رہے ہیں۔ خاتمے کی عبارت میں امر اللہ نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ۔

"چوں در سنہ نود و چہارم باز اتفاقِ مراجعت دو (بر) بلدۂ لکھنؤ رو داد، بر احوالِ اکثر سخنہ پردازانِ ایں زماں اطلاع دست داد، تذکارِ شانِ دریں تذکرہ کہ سیارِ احوالِ ایں گروہ است مناسب دید۔"

۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں جو شاعروں کو اس محفل میں شریک کیا گیا ہے ان میں سے بعض کے ذکر میں زمانۂ شمولیت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے مثلاً شاہ عالم آفتاب کے حالات اس جملے پر ختم ہوتے ہیں کہ۔

"از سالِ جلوس تا امسال کہ سنہ یک ہزار و یک صد نود و چہارم است زمانہ دای و عدالت گستری وے در تزاید است۔" (ص ۲)

سنینِ تحریر کی تحقیق اور تعین کے اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباسات بھی قابلِ غور ہیں۔

(الف) میرزا مظہر جانِ جاناں۔ "بعد تحریرِ تذکرہ امسال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم است، یکے از اوباشانِ دہلی دے را بتاریخ ہفتم یا نہم ماہِ محرم بضرب گولی بندوق بدرجہ شہادت رسانیدہ خود را تا ابد ہدفِ سہام نفرت گردانیدہ" (ص ۱۰۳)

(ب) خورشش عظیم آبادی۔ "بعد اتمام ایں تذکرہ در عشرۂ اولیٰ ماہِ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری جہانِ پرشور را بدرود کرد۔" (ص ۱۱۲)

(ج) سید امام تصور نارنولی۔ "بعد تحریرِ تذکرہ تصور بہ رفاقتِ مولف

از الہ آباد بہ رام نگر بنارس آمدہ۔ زمانے در معیت من فارغ البال گذرانیدہ۔ آخر بمرض تپ محرقہ گرفتار شدہ۔ خسر پورہ اش کہ ملازم راجہ چیت سنگھ بود، بہ استماع بیماری وے آمدہ بخواہش تمام بخانہ بردہ۔ آخر الامر در آخر ماہ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم کہ سانحۂ فرار برراجہ ممتو سلالش افتادہ، تصور را طاقت گریختن و ہمراہ رفتن مقدور نبود، ناچار او را در مرزا پور کہ مسافت دو کردہ از رام نگر باشد، بتصور آں کہ دو آنجا بہ آرام خواہد بود، گذاشتند قضا کار بہمون روز قضا دامن گیر او شدہ در عین ہنگامہ گیر و دار و گریز و فرار راہ دار القرار گرفت!! (ص ۴۱)

ان عبارتوں کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء کے آخری ایام میں یا اس سال کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اور اس طرح یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ "سرت افزا" کی تسوید و ترتیب کا سلسلہ کم سے کم ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء کے اواخر تک جاری رہا ہے۔

یہ تذکرہ دو سو پچپن شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے، جن میں سے بیشتر کے متعلق مولف کے بیانات ذاتی علم و آگاہی اور معتبر و مستند زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ جا بجا سرو آزاد، نکات الشعرا، تذکرہ گردیزی اور تذکرہ میر حسن کے حوالے ملتے ہیں۔ میر قطب الدین علی خاں خادم، غازی پوری اور شیخ احمد وارث احمدی کے اشعار موخر الذکر (احمدی) کے تذکرے سے ماخوذ ہیں۔ علی ابراہیم کے تذکرے کے بارے میں بھی انھیں اپنے بعض احباب سے معلومات حاصل ہوئی تھیں لیکن کوشش کے باوجود

اس کے مطالعے سے محروم رہے۔ اس سلسلے میں اپنے اشتیاق اور علی ابراہیم کی بے رخی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"فقیر از دوستانِ آں دیار (عظیم آباد) شنیدہ کہ وے در ضمن تالیف تذکرۂ محافل الشعراء تذکرۂ شعرائے ریختہ نیز ترتیب دادہ و اشعار اساتذہ چیدہ و پسندیدہ دراں از درج لالی آبدار درج نمودہ۔ حالات وے نیز مشرح با شوریش دراں مندرج است بہ خواہش تمام در خدمت وے استدعائے آں تذکرہ نمودتا از آں حالات اساتذہ کہ از حالاتِ شان بما خبر نہ رسیدہ خصوصاً احوال وے از تالیف وے استخراج نمایم لیکن خدا داند بخاطرش چہ خطور کردہ ہمت رسایش چرا قصور نمود کہ اباء و انکار نمود۔ مکرر ارشاد فرمود کہ بعد ترتیب پریشان ساختم۔" (ص ۷۲)

میر غلام حسین شورش عظیم آبادی کے تذکرے سے استفادے کے متعلق اگرچہ کوئی واضح شہادت موجود نہیں پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کی نظر سے گذر چکا ہے۔ شورش کے حال میں لکھتے ہیں۔

"از مدتے در فکر جمع کردن تذکرۂ شعرائے ریختہ ہمت خود گماشتہ و آب در رنگ ترتیب بودتے اشعار پراگندہ اساتذہ ایں فن ریختہ صفحہ کاغذ را آراستہ آغازش را بہ انجام رسانیدہ نامش یادگار دوستان مقرر نمودہ و ہم ازیں مصرعہ تاریخ تالیفش برآوردہ، یادگار دوستانِ روزگار" (ص ۱۱۲)

"نکات الشعرا" کے بارے میں اثر اللہ کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انھوں نے اس تذکرے کو تذکرہ شاعروں کے خلاف زہرافشانی اور انکی

تحقیر و تنقیص کی ایک نازیبا کوشش قرار دیتے ہوئے اپنے تذکرے کی تالیف کو
اس کے ردِّ عمل سے تعبیر کیا ہے۔ میر صاحب کے حالات میں رقم طراز ہیں۔

"تذکرہ نکات الشعرا" تالیف اوست دراں عجب نکتہ چینی در
کلام شعرائے ریختہ نمودہ ہر کرا یاد نمودہ بہ تحقیر و بے ادائی آوردہ اشعار
ایشاں را بے رتبہ و ناپسندیدہ چیدہ ذکر کردہ۔ اگر راست بگویم سبب
تالیف ایں تذکرہ مسرت افزا ہمیں بود کہ من برغم حاسدان عیب
بیں و خردہ گیرانِ نکتہ چیں حالات ہر یکے کماہی در سلک تحریر کشیدم
لیکن چوں دریں غربت دیوانِ احدے با خود نبود کہ اتفاق انتخاب
شعر ہم می شدہ از اشعار ایشاں آنچہ یاد بود، نوشتم طرفہ تر کہ میر چوں
ہمت خود بہ انتخاب اشعار ناپسندیدۂ شعرا گماشتہ بود، طبعش ہمیں
مرغوب گشتہ ازیں جہت از اشعارِ خود ہم ہر چہ دراں تذکرہ نوشتہ، اکثرے
ازاں بے رتبہ و ناپسندیدہ است در دیوانش بہتر ازیں اشعار بنظر فقیر
در آمدہ۔" (ص ۱۹۹-۲۰۰)

اس بیان کے ذریعہ میر صاحب کے خلاف جو فردِ جرم عائد کی گئی ہے اس پر
تفصیل کے ساتھ بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ
انتخابِ کلام سے متعلق آخری اعتراض میں نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن
خاں شیروانی بھی امراللہ کے ہم خیال ہیں۔ چنانچہ تذکرۂ میر حسن کے دیباچے
میں مولف کے حسنِ انتخاب کی داد دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"آخریں میر حسن کے انتخاب کو کہ میر کے کلام کا انتخاب خود میر
سے بہتر کیا۔ ... جن غزلوں کے اشعار خود میر صاحب نے منتخب
کرکے لکھے ہیں ان ہی غزلوں سے بعض ایسے نادر اشعار میر حسن نے

انتخاب کر لیے ہیں جو خود میر کے انتخاب سے زیادہ نادر ہیں اور یہ ایک انسانی کمزوری کا پہلو ہے کہ بعض اوقات خود اپنے کمال پر دہ قلم پھیر دیتا ہے۔"

ان تمام تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ مسرت افزا کے مولف نے حصول معلومات کے لئے ہر ممکن ذریعے سے مدد لی ہے اور خوردہ گیری و عیب جوئی سے حتی الامکان اپنا دامن بچائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میر کے برخلاف وہ "ہمہ را بہ نیکی یاد کردن" کے اصول پر عمل پیرا ہیں اور کسی شخص کی ذات یا فن کے نقائص کو بلاضرورت منظر عام پر لانا معیوب اور نامناسب خیال کرتے ہیں۔ میر صاحب ہی کے ذکر میں انھوں نے ایک جگہ اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے یہ شعر بھی نقل کیا ہے ؎

عیب مردم فاش کردن بدترین عیب ہاست
عیب جو اول کند بے پردہ عیب خویش را

اس تذکرے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بنارس، لکھنؤ، الہ آباد، عظیم آباد، مرشد آباد اور کلکتہ کے بہت سے ایسے شاعروں کے مفصل حالات درج ہیں، جن کا ذکر دوسرے تذکرہ نگاروں نے شاذ و نادر ہی کیا ہے یا جن کے بارے میں عام لوگوں کی معلومات کا دائرہ بہت محدود ہے۔ مثال کے طور پر یہ پہلا تذکرہ ہے جس کی فہرست میں "نوطرز مرصع" کے مصنف میر حسین عطا خاں تحسین کا نام بھی شامل ہے اور ان کے متعلق یہ تفصیلات فراہم کی گئی ہیں:

"حسین عطا خاں تحسین تخلص مخاطب بہ خطاب مرصع رقم خان خلف میر محمد باقر خاں شوق۔ سید گردیزی است بزرگان وے در وقت بابر بادشاہ از گردیز بہ ہندوستان آمدہ در کڑہ مانک پور قیام ورزیدہ و

پدرم از عہد طفولیت در دہلی بہ خدمت اورنگ زیب عالمگیر بہ
منصب سہ ہزاری و جاگیر سرفرازی یافتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہرگاہ فرخ سیر
بادشاہ بدست سادات بارہ گرفتار شدہ، از ضعف سلطنت و برہمی
سررشتہ داب خاندان تیموریہ خانہ نشین شدہ ۔ در سن نود و پنج سالگی
آخر سلطنت محمد شاہ در شاہجہان آباد بجوار رحمت ایزدی پیوست
و ے سلمہ اللہ تعالیٰ از عطائے الٰہی در عنوان شباب بہ کمالات
ظاہری و باطنی سعادت اندوز شدہ بہ سبب انقلاب زمانہ از دہلی
بر آمدہ مدت ہا در خدمت ناظمان بنگالہ بعزت و اعتبار تمام نشو
و نما یافتہ ۔ در ابتدائے عمل انگریز از مردم ہندوستان اول از
ملازمان کمپنی انگریز کہ بخدمت بادشاہ ہند امتیاز منصب و جاگیر
حاصل کردہ، او بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوانح قابلی و انشائے تحسین و ضوابط
انگریزی جملہ نتائج طبع وے محل تحسین سخنوران است و موقع آفرین
زبان آوران ۔ سوائے کتب فارسی نسخہ "نو طرز مرصع" مشتمل
بر قصہ چار درویش بعبارت ہندی تالیف نمودہ" (ص ۴۲)

علی ابراہیم خاں خلیل کے مفصل حالات زندگی ۔ بھی پہلی مرتبہ اسی تذکرے
میں پیش کئے گئے ہیں ۔ سابقہ تعارف کے علاوہ مولف کو عظیم آباد میں
قیام کے دوران تقریباً ایک سال تک ان کے تقرب کا شرف حاصل رہا
تھا اس قربت و ہم نشینی کو انھوں نے غریب الوطنی کے عالم میں اپنے لئے
انبساط خاطر محزون و پریشاں" اور" انشراح طبیعت افسردہ و حیراں" کا سبب
قرار دیا ہے ۔ چونکہ اس وقت "مسرت افزا" کے سوانحی پہلو کا جائزہ مقصود
ہے ۔ اس لیئے دوسری تفصیلات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اسی پہلو سے

متعلق عبارتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

"مولدش موضع شیخ پورہ نواحی بلدۂ عظیم آباد است و نشو ونمائش مرشد آباد۔ در وقتِ نواب مہابت جنگ بہادر بہ مرشد آباد آمدہ سالہا اے از ثروت و جاہ بہم رسانید۔ در ایام حکومت نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں بہ اعلیٰ مراتب حشمت و جاہ رسیدہ و سرآمدِ سرداران سرکارش گردید چوں نیر طالعش در عروج بود روز بروز بمدارج دولت صعود می نمود تا در خانۂ نواب مظفر جنگ نائب ناظم بنگالہ مختار و مدار المہام گردید لیکن از بدرہی اطوارِ روزگار جفاکار مدتیست کہ خانہ نشیں گشتہ ... ... ۔ بعد تحریر تذکرہ در رجب المرجب سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری کہ نواب عماد الدولہ گورنر جنرل مسٹر ہسٹنگز بہادر جلادت جنگ بہ عزم تسخیر ممالک مغرب زمیں از کلکتہ نہضت فرمودہ وقت جلوہ افروز شدن بلدۂ مرشد آباد خانِ موصوف را بہ صد اکرام و اعزاز بہ ہمراہی خود سرفراز نمودہ چوں راجہ چیت سنگھ از شامت کردار و اعمالِ خویش از ملک خود اخراج شدہ، عدالتِ دیوانی آں ملک بجہ عدالت فوجداری بوے تفویض نمودہ بہ عنایتِ خلعتِ فاخرۂ مختاری و حکمرانی بلدہ بنارس وے را مباہی ساختہ۔ اکنون دراں ضلع مرجع خاص و عام و ملجائے انام آں مقام است" (ص ۳۰۲،۳)

شیخ معین الدین معین بدایونی سودا کے ممتاز شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ میر حسن پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے ایک ہم عصر شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے بیانات بھی معین کے سوانح حیات کی تلاش میں

زیادہ دور تک ہمارے ذوقِ جستجو کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس کے برخلاف سرت افزا کے مندرجات سے اس راہ کی دشواریاں حل کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"زاد گاہش بداؤنست، اما نشوونما در دہلی یافتہ۔ وقتے کہ بلدۂ الہ آباد مخیم سرادقاتِ سلطانی بود، برفاقتِ بعضے امرا بسر می برد و از جانبِ وے اعانتِ ضروریات می شد۔ چوں ابداً فیض الٰہی معینِ حالِ او بود، در ایامے کہ نواب عنایت خاں پسر حافظ رحمت خاں جہتِ ملاقاتِ وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم آمدہ، وے مخمس در تعریف اسپ و اظہار بے اسپی خود بنظم نمودہ بوسیلہ بعضے رفقایش بہ خان مذکور گذرانیدہ، خان قدردان حکم خواندن نمود۔ چوں تمام کرد اسپے خاص مع ساز بہ وے عنایت نمود ۔۔۔۔۔۔۔ بعد ازاں کہ حضرت جہاں پناہ بسمتِ دہلی نہضت فرمود وے در رفاقت نواب منیر الدولہ ناظم الہ آباد درآمد چندے روزگار گذشتہ بود کہ نواب برحمتِ حق پیوستہ، صوبہ الہ آباد در عمل نواب شجاع الدولہ مرحوم آمدہ از برہمیِ روزگار پریشان و مفلوک شدہ در لکھنؤ رسیدہ لیکن باایں ہمہ لیاقت و قابلیت خود قدردانیِ اہلِ آں دیار ہیچ ترقی بہ وے نشد۔ بہرحال زمانہ را بناخوشی بسر می برد۔"

(ص ۲۰۲-۲۰۳-۲۰۵)

میر ماشاء اللہ خاں مصدر، ایک اوسط درجے کے شاعر تھے لیکن انشا جیسے جلیل القدر نگار سے نسبتِ پدری کی بنا پر انھوں نے اپنے

حیاتِ جاوداں کی سند حاصل کرتی ہے۔ چنانچہ انشا کے خانگی ماحول اور حالات
زندگی کا علم حاصل کرنے نیز ان کی ہمہ جہت شخصیت کے تعمیری عوامل کو پوری
طرح سمجھنے کے لئے مصدر کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کسی قدر ضروری
ہوجاتی ہے۔ اس سلسلے میں جب ہم تذکروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں
عام طور پر چند مجمل و مختصر جملوں کے علاوہ کوئی کام کی بات نظر نہیں آتی۔
مسرت افزا اس روشِ عام سے مستثنیٰ ہے۔ اس تذکرے میں ان کے حالات
جس تفصیل سے لکھے گئے ہیں اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا
جاسکتا ہے۔

"مصدرِ فضائلِ پسندیدہ و معدنِ خصائلِ سنجیدہ در نکتہ فہمی
و حاضر جوابی یگانۂ زمانہ ۔۔۔۔۔۔ چہرۂ استعداداش بہ زیورِ علم و
ہنر پیراستہ، در علمِ طبابت مہارتِ کلی دارد ۔۔۔۔۔۔
جرعہ کشِ مصطبۂ زبان آوری ست و بادہ نوشِ محفلِ لسانی و سخنوری لیکن
حیف غبارِ زیادہ گوئیش آئینۂ جمالِ کمالش را مکدر ساختہ و از
خودنمائی کہ دارد مخفیش از پایۂ ایقانِ اعتقاد افتادہ ۔۔۔۔
اکثر از جودتِ طبیعت اشعارِ نامربوط منتظم می سازد و بیت ہزاری
و دو ہزاری و چہار و پنج و علیٰ ہذا القیاس نام می گزارد ۔۔۔۔۔
مدتے در بنگالہ در سرکارِ ناظمانِ آن جا بکمالِ عمدگی می بود۔
بعد برہمی وضعِ بنگالہ بہ طرف ہندوستان رفت و در سرکارِ نواب
وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم اقتدارِ کلی و تقرب بحدے بہم
رسانید مدتِ حیاتِ نواب مرحوم باوے بکمالِ تقرب بسر می برد۔
بعد وفاتِ نواب چندے در سرکارِ خلف وے نواب آصف الدولہ

بہادر مرحوم نیز زمانہ را گذرانید۔ آخر الامر امسال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چار ہجری است کشیدہ خاطر شدہ رو بہ لشکر نواب ذو الفقار الدولہ مرزا نجف خاں بہادر کہ قدر شناس اہلِ فضل و کمال است آوردہ۔"

(ص ۲۱۱ - ۲۱۲)

ان اقتباسات میں جو "تشبیہ" نمونہ از خروارے کا حکم رکھتے ہیں متعلقہ سنین کی نشان دہی صرف دو جگہ کی گئی ہے لیکن ایسے قرائن بکثرت موجود ہیں جن کی مدد سے بہ آسانی زمانے کا تعین کیا جاسکتا ہے اس کے باوجود امر اللہ کے منفرد انداز سوانح نگاری کی نمائندگی ایسی کچھ مثالیں پیش کئے بغیر مکمل نہ ہوگی جن میں وضاحت کے ساتھ اہم واقعات کے سنہ متعین کئے گئے ہیں۔ تذکرے کے بالکل ابتدائی اوراق سے کچھ مفصل بیانات اور اہم جملے ملاحظہ کیجئے۔

امیر خاں انجام:- "در سال ہزار و صد و پنجاہ و نہ طلوعے از طلازمانش بیدخل نمودہ در صحنِ دولت خانۂ بادشاہ بہ زخم کٹار شربت شہادت بچشانیدہ رانجامش بخیر گردید۔ شخصے تاریخ شہادت وے "غم عمدہ" یافتہ و چوں بہ دفع زنان مشہور بود، ظریفے تاریخ دیگر بطرز وے "ادہ! گو امیر خاں موا" گفتہ و دادِ سخنوری دادہ۔"

خان آرزو:- "ولادت او در سنہ یک ہزار و یک صد و یک ہجری واقع شدہ ۔۔۔۔۔۔ در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و چہار تذکرۃ الشعرا المسمیٰ بہ "مجمع النفائس" تالیف نمودہ ۔۔۔۔۔۔ در سنہ یک ہزار و یک صد

وسی نوردراز گوالیار بدار الخلافت شاہجہاں آباد آمدہ
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در اواخر محرم سنہ یک ہزار و
یک صد و شصت و ہشت ہجری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ بلدۂ اودھ
کہ وطن اصلیِ جد او شیخ کمال الدین است رسید ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوں وقت انتقال قریب رسیدہ در بلدۂ لکھنؤ
آمدہ بست و سوم ربیع الآخر سنہ یک ہزار و یک صد و
شصت و نہ بجوار رحمتِ حق پیوست"۔ (ص ۱۰-۱۱)

اجمل الہ آبادی:" سنِ شریفش امروز در سال پنجاہ و نہ کردہ چنانچہ
روزے یکے از دوستانش تفحص تاریخ تولد وے
می کرد۔ از طریق انبساط فرمود "خورشیدم" چوں حساب
کردند ہمیں تاریخ تولدش بود"۔ (ص ۱۲)

قزلباش خاں امید:" در سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ و نہ ہجری جہانِ
فانی را بدرود نمود"۔ (ص ۱۷)

غلام یحییٰ انصاف:" در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و ہفت در
گذشت"۔ (ص ۱۹)

غلام علی اختر:" در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و دو برحمتِ حق پیوست"
(ص ۲۲)

یہ مثالیں جو صرف ردیف الف سے ماخوذ ہیں، شعرائے اردو کے تذکروں
کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں اور اس خیال کی تائید و توثیق
کے لئے کافی ہیں کہ امراللہ تذکرہ نگاری کے اولیں تقاضے اور بنیادی مطالبات
سے کتنی واقف تھے انھوں نے جس روایت کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر عام طور

... پر اس کی اہمیت کا احساس کیا گیا ہوتا تو آج تاریخ ادب کے بہت سے
بے ربط سلسلوں کو جوڑنے میں وہ دشواریاں پیش نہ آتیں جن سے بصورت
موجودہ قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔

بعض شعرا کے ذکر میں امراللہ نے عام حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ
ان کے معاملاتِ عشق و محبت کی تفصیلات بھی سپردِ قلم کر دی ہیں متعلقہ افراد
کی افتادِ طبع، مزاج کی ساخت، ذہنی و فکری میلانات اور ان کے زمانے
کے تہذیبی و معاشرتی ماحول کو سمجھنے کے لئے اس قسم کے واقعات کی اہمیت
مسلم ہے۔ اس لحاظ سے "مسرت افزا" کے اوراق پر ان کی موجودگی اس کے
سوانحی پہلو کی وقعت میں کچھ اور اضافہ کر دیتی ہے۔ ذیل کی مثالوں سے ان
واقعات کی نوعیت کا اندازہ ہوگا۔

رستم علی رستم الہ آبادی کے ذکر میں عشقِ خانہ خراب کے ہاتھوں ان کی خانماں
ویرانی کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"جہتِ تلاشِ روزگار عزیمت دکھن نمود۔ در آں جا در سرکار
یکے از راجہ ہا نوکر شد۔ چندیں روز گذشتہ بود کہ از بد [illegible]
روزگار ہوائے عشق پسرے کہ بہ حسنِ صورت یکتائے زماں بود
در سرش جا گرفت و فریفتہ حسن و جمال و شیفتہ خد و خالِ او شد۔
بفحوائے ایں کلام کہ "عشق و مشک را نتواں نہفتن" طشت بدنامی
از بام افتادہ صدائے عشق وے بگوشِ خاص و عام در داد۔ چوں
پدرش ازیں خبر مطلع گشت و در صددِ قتلِ آں آوارۂ دشتِ جنوں
کمرِ سعی بر بست، آں عاشقِ رستم دل نظر بر ستمیٔ خود نمودہ با معشوق
ہم عناں از انجا بر آمد پدرش چوں ازیں خبرِ وحشت اثر خبر یافت

چندیں از جوانانِ دلاور را بہ تعاقب آن ناعاقبت اندیش گماشت. تا آن فلک زدہ را چوں زالِ ضعیف گرفتہ آوردند و در قیدِ شدید گرفتار کردند۔"

(ص ۸۴-۸۵)

شیخ برکت اللہ فریں بنارسی کی سرگزشتِ عشق خود انھیں کے حوالے سے اور انھیں کے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"در دہلی ناگاہ شعلۂ عشق شمع فروزش خرمن صبر و توانِ حزیں سوخت و پروانہ نمط آتش بیقراری در دل و جانِ من افروخت۔ در تکے چوں شمع می سوختم و بسانِ موم می گداختم سرم باعثِ سرگرانیم بود و تنم سرتا پا از گرمی ہوائے محبت آن شمع در گداز می شد۔ ہر شب سوز دلشی شعارم بود و ہر سحر بہ خاکستر شدن امید دار۔ در عین شب ہائے وصال کہ پروانہ وار بر سرش نثار بودم آن شمعِ محفل دل ربائی از صرصر اجل خاموش شد و من چوں پروانہ نیم سوختہ بہ نیم جانے کہ داشتم از وصل او مایوس شدم۔"

(ص ۱۷۵)

ہندوستان کے مختلف ادبی مراکز اور بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کے دوران امراللہ کو جن ارباب کمال سے ملنے کے مواقع حاصل ہوئے ان میں ہر حیثیت اور ہر پایہ کے لوگ شامل ہیں۔ کچھ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں ہیں جن کے قدموں سے اس وقت بھی شہرت و مقبولیت آنکھیں مل رہی تھی اور آج بھی اس وابستگی کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتی ہے اور کچھ ایسے غیر معروف فنکار ہیں جنھوں نے پردۂ گمنامی میں زندگیاں گذاریں اور انکے فنی کمالات کو قبولِ عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ اس فرقِ مراتب کے باوجود ان لوگوں کے اخلاق و عادات، سیرت و کردار، فضل و کمال اور وجاہت

وثقاہت نے ابراللہ کے دماغ پر جو نقوش چھوڑے ان کے اظہار واعتراف میں انھوں نے کسی تفریق وامتیاز اور بخل سے کام نہیں لیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے کہ الفاظ کے بے جان مرقعے بول اُٹھنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ میر درد کے صاحبزادے میاں صاحب میر الم کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

"اخلاقِ پسندیدہ و اوصافِ حمیدہ دارد۔ از جودتِ طبع خود علم استادی برپا ساختہ و سابقانِ میدانِ سخنوری را در الم انداختہ۔ طبع ظریف و مزاجِ لطیف دارد۔ خاکساری و انکسار را شعار خود ساختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دہلی را بہجت سیر دیار شرقی گذاختہ۔ چندے در عظیم آباد بود از مولف در ہماں دیار تلاقی جسمانی رو دادہ بارہا در نقیر خانہ تشریف می آورد۔" (ص ۱۷)

جواں سال انشا کی ذات میں انھیں ایک اچھے انسان کے اوصاف اور بڑے فن کار کی خوبیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان اوصاف کو ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں۔

"جوانیست بسیار خوش خلق و خوش ظاہر از حلاوتِ شیریں زبانی آشنا و بہ لذتِ زباں دانی طبعش رسا۔ انشائے کلام وے مربوط و طور ادائے او بسیار مضبوط۔ انشاء اللہ تعالیٰ روز بروز نکہت وے دراز دیاد خواہد بود۔" (ص ۲۳)

حسین عطا خاں تحسین کی شخصیت کے جاذب نظر اور دلآویز پہلو پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"شیریں زبانی او غنچہ ہائے افسردہ خاطرہائے پریشاں را بہ شگفتگی

می آرد و خوش بیانی او از دل ہائے مغموم و حیراں آشفتگی و شیفتگی
می رباید در لطیفہ گوئی و حاضر جوابی عدیم المثال است و در گرم
اختلاطی و یار باشی مثلش دریں عصر ناممکن بلکہ محال ۔" (ص ۴۳)

صدر روشن جوشش اور محمد عابد دل عظیم آبادی کے حسنِ اخلاق اور
شرافتِ نفس سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

"حق تعالیٰ ہر دو برادر را توفیق تحصیل حسنات رفیق گردانیدہ
و چراغ وجود ایشان را از روغنِ انکسار و تواضع روشن کردہ و آب
و گل ایشاں بجوشش و دلداری مجبول گشتہ ۔ از عجز و خاکساری
مقبولِ خاطر ہائے وضیع و شریف شدہ ۔" (ص ۵۴)

جعفر خاں راغب کے حال میں ان کی ہر دل عزیزی کے متعلق لکھتے ہیں ۔

"بہ قدر دانیٔ فقرا و قدر شناسی علماء مخلوق است و بہ حسن
خلق و یار باشی مجبول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ ہدایت لطف الہٰی در
پیشہ صداقت و محبت یک رنگ و در پیشہ یک جہتی و یک رنگی
شیر افگن است ۔ حق تعالیٰ او را عزیزِ دلہا ساختہ و عزتش در
چشم و دلِ یار و اغیار جا دادہ ۔" (ص ۸۹)

مرزا سودا کی شخصیت کا خاکہ اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ اس کے
مطالعے سے نظم و ادب میں ان کے اعتبار و اقتدار کی کیفیت پوری طرح
نمایاں ہو جاتی ہے ۔ مؤلف کو ان کی خدمت میں باریابی کا شرف ۱۱۹۱ھ
(۱۷۷۶ء) میں حاصل ہوا تھا جبکہ وہ تحصیلِ علم اور سیر و تفریح کی غرض سے
لکھنؤ میں قیام پذیر تھے ۔ لکھتے ہیں کہ :

"شاعریست رفیع الشان ۔ خوش فکر، شیریں زبان، یار باش

سخن شناس، ظریف الطبع، حریف وضع۔ سوادِ شورش سوادِ ہندوستان را منور گرد انیدہ و علمائے استادیش سخنوران را در رشتۂ بہ تحریر انداختہ۔ طالبانِ ایں فن را نگر ہمسری از در زنجیر سودائے خام آویختہ و در دماغ مدعیانِ سخن طراز ریختہ اش خلطِ سودا ریختہ
...... زبان آوران کامل او را بہ استادی یاد می
کنند و شعرائے ہند بہ آئینِ خود ملک الشعرا تراز دادہ اند...
...... آتشِ دیدنش پیوستہ در کانونِ سینہ مشتعل می شد
آخر چوں تلافی جسمانی بہم رسیدہ زیادہ از شنیدہ دیدم غرض از
مغتنمات روزگار است۔" (ص ۹۶، ۹۷)

جو پنجوہر کے ایک غیر معروف شاعر مولوی جان محمد ناتواں کو جن سے عظیم آباد میں ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ مولف نے درج ذیل اوصاف سے متصف پایا ہے۔

"او تعالیٰ خاکِ او را از آلائشِ مکر و فساد میرا آفریدہ با سخن دنیا داری شناسائی ندارد بجز خداپرستی و خداشناسی مرکوزِ خاطرش نیست خود را بہ کمالِ فروتنی بے حد سے عاجز و ناتواں می داند و از غایتِ انکسار و نفس شکنی کمترین خلائق می داند...... ......
اوقاتِ عزیز خود را در عبادت و ریاضت بسر می برد۔" (ص ۲۰۸)

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ امراللہ سوانح نگاری کی طرح شخصیت کی نقاشی اور سیرت نگاری میں بھی بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں اور اس اعتبار سے بھی ان کا تذکرہ معاصر تذکروں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ البتہ تنقید کلام کے معاملے میں ان کی یہ امتیازی اور انفرادی روش برقرار

نہیں رہ گئی ہے۔ اس میدان میں ان سے پہلے میر حسن اور بعض دوسرے تذکرہ نگار جو روایات قائم کر چکے تھے امراللہ ان کی اتباع سے تام لیے ہیں۔ غالباً انھیں اس اصول کی پابندی کہ "مردم چشم ایں خاکسار در اشعار عیب جوئی را شعار ندارند" قدم قدم پر واضح اور فیصلہ کن انداز میں اظہار خیال سے روکتی رہی ہے، جس کے نتیجے میں انھوں نے اکثر شاعروں کے حال میں کلام کے متعلق کسی قسم کی رائے زنی کے بجائے خاموش رہنا بہتر و مناسب خیال کیا ہے اور اگر اتفاقاً کبھی اس طلسم سکوت کے ٹوٹنے کی نوبت آئی بھی ہے تو بات چند توصیفی کلمات اور سرسری جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے مثلاً۔

سراج اورنگ آبادی :- "سخن او خالی از چاشنی نیست" (ص ۱۰۱)

میر فتح علی شیدا :- "از کلامش بوئے دل سوزی و شیدائی می آید" (ص ۱۱۵)

شاہ محمد صلاح الہ آبادی :- "سخن بہ طرز زبان رنگینی کہ نیچے دل چسپ و حلاوت انگیز است، می آمد است" (ص ۱۲۲)

عبدالولی عزلت سورتی :- "مضامین تازہ در سلک نظم منتظم می ساخت" (۱۳۸)

شمس الدین طالع :- "معانی نازک و مضامین تازہ در قالب اشعار آورد" (ص ۲۰۸)

شاہ واقف :- "کلامش ناخن بدل می زند" (ص ۲۲۵)

بعض شاعروں کے متعلق ان کی رائیں اس عام اور رسمی انداز سے کسی

قدر ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے تاہم ان میں سے چند بطور مثال پیش کی جاتی ہیں:۔

کرم اللہ خاں درد:۔ "کلامش از چاشنئ دردخالی نیست بسیار خوش فکر عاشق مزاج بود سخن را از آغاز تا بہ انجام بہ آئین عمدہ می آراست"۔
(ص ۸۰)

فضل علی دانا:۔ "فکر مضمون تازہ می کند و خیالِ ۔۔ مطالب رنگین را بہ آئینِ رنگین در دوام تسطیر می کشد"۔ (ص ۸۱)

میر سوز:۔ "اشعار ریختہ را بسوز و گداز می گوید و مضامین تر و تازہ می جوید ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لطافتِ طبع و شوخئ مزاجش از اشعار ظاہر می شود"۔ (ص ۱۰۲)

کہیں کہیں کسی خاص محرک کے تحت معمولی سی بات کو غیر ضروری طول دے کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً انعام اللہ خاں یقین کی موزونئ طبعی کے متعلق میر کے شکوک و شبہات کے رد میں ان کی رسائیِ فکر اور نزاکتِ خیال پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

"شہباز فکر وے بہ صید معانی چناں بلند پروازی کردے کہ طائرِ خیالِ ساحران بہ دریافتِ کنہ آں در نیم راہ ماندے و ہمائے اندیشہ وے بر قلۂ کوہِ سخن بطورے پر فشانی نمودے کہ طبع رسائے سخنوران بہ امید رسائی در پرتو سایہ اش ہر

۱؎ تذکرہ گلزار (ص ۵)

چند روزے دولے از تیز پردازیش بجائے رسیدہے"

(ص ۲۴۱)

تنقید کے یہ نمونے کسی خاص انداز فکر کی نمایندگی نہیں کرتے اور یہ "مسرت افزا" کی ایک ایسی خامی ہے جس نے اس تذکرے کو اس میدان میں میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو پر سبقت و فوقیت سے محروم کر دیا ہے۔

یہاں "مسرت افزا" کے بعض ایسے اندراجات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اپنی ضمنی حیثیت کے باوجود تذکرے کی افادیت و اہمیت میں اضافے کا سبب بنے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نگاہ احمد شاہ درانی کے حملوں اور اس زمانے کے عام سیاسی انتشار اور سماجی بے اطمینانی کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال سے متعلق اشارات کی طرف جاتی ہے یہ حشر سامان حالات و حادثات مصائب اور تباہیوں کے متعدد قافلے اپنے جلو میں لے کر آئے تھے۔ مغلیہ سلطنت کی رہی سہی شان و شوکت بڑی تیزی کے ساتھ زوال کی داستانیں دوہرا رہی تھی اعیانِ مملکت اور امراء و رؤسا جن کی فیاضیوں کے سایہ تلے ادب اور شاعری نے ترقی کی منزلیں طے کی تھیں، دوسروں کے دست نگر ہو چکے تھے اور ان تبدیلیوں نے ارباب کمال کو نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ درج ذیل بیانات اس انقلاب عظیم اور عام آشفتہ حالی و پریشاں روزگاری کا پتہ دیتے ہیں۔

حمزہ علی رند :- "از بہی اطوار آں دیار (شاہجہاں آباد) ترک خانماں نمودہ بتلاش روزگار بطرف بنگالہ رفت

در تے در لباس سپہ گری بسر برد" (ص ۸۸)

جعفر خاں راغب۔ " تا سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد ہجری ... ...
(در شاہجہاں آباد) استقامت داشت۔ از غلغلۂ احمد
شاہ درانی ترک خانماں نمودہ با عشائر خود از ان
جا بر آمدہ در بلدۂ عظیم آباد کہ بہ نسبت دیگر بلاد ما من
شہر ناست، توطن اختیار نمودہ" (ص ۸۹)

ہدایت علی خاں عاشق :- " تا آخر سلطنت فردوس آرام گاہ در شاہجہاں آباد
سکونت داشت۔ بعد تاراجیٔ شہر از آمدن احمد شاہ
درانی از زادگاہ خود آوارہ شدہ وارد ملک بنگالہ
گردید" (ص ۱۴۰)

اشرف علی خاں فغاں " از حادثۂ معزول شدن احمد شاہ کہ بہ سبب ناحق شناسی
امرائے ناعاقبت اندیش رو دادہ و کفر قہ زادکہ
بر اہل آن دیار از آمد آمد شاہ درانی افتادہ ترک
خانماں نمودہ در بلدہ عظیم آباد رسیدہ" (ص ۱۵۲)

قدرت اللہ قدرت :- " وطن اصلی وے دہلی است از برہمی روزگار و
(قدر) ناشناسیٔ امرائے آں دیار ترک زاد و
بوم نمودہ در مرشد آباد وطن اختیار کردہ" (ص ۱۷۳)

میر مہدی مہدی :- " بعد خرابی دہلی بجہۂ اطفال و اعیال وارد الہ آباد
شدہ دست بہ دامن تقوی زدہ خانہ توکل را از
آلائش دنیای پاک رفتہ در مامن رضا بقضا ازو
گزیدہ" (ص ۲۲۵)

"مسرت افزا" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مولف نے انتخاب کلام میں دوسرے تذکرہ نگاروں کی بہ نسبت تنوع اور ہمہ گیری کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ جن شاعروں نے غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف میں زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے ان کے حالات میں اس صنف کے نمونے بھی پیش کر دئیے گئے ہیں۔ مثلاً سودا کے ذکر میں جن کا معیار کمال متفقہ طور پر ان کی قصیدہ گوئی قرار پائی ہے، بعض قصائد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قصیدہ در مدح سالگرہ نواب احمد خاں بہادر منظم آوردہ صنعتہا بکار بردہ کہ کلام را بحد اعجاز رسانیدہ۔ مطلعش ایں است۔

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی خوشی نے وہیں آکر در دل پر دستک

وقصیدہ کہ در ہجو اسپ گفتہ داد سخنوری دادہ، بر السنہ و افواہ عالم شہور۔ آغازش۔ اینست۔

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

قصیدہ در مدح مہربان خاں رند گفتہ بود۔ دراں ایں بیت آوردہ

مہرباں خاں جو نہ ہوتی تری خلقت پیدا
ہوتے عنصر نہ کبھو مل کے بہم چاروں ایک

و ستائش زبانِ شماتت کشادند و گفتند، کہ ایں چنیں مضمون را در چنیں مقام آراستن کمال بے حمیتی است۔ در خود فہمیدہ آں قصیدہ را در مدح سرور انبیا علیہ السلام تزئین دادہ و گفتہ

شاہِ مرداں جو نہ ہوتی تری خلقت پیدا
ہوتے عنصر نہ کبھو مل کے بہم چاروں ایک"

(ص ۹۶-۹۷)

میر حیدر علی حیراںؔ کے انتخاب کلام میں قصیدہ در مدح "آصف الدولہ
کے سات اشعار محمد نقیبہ دردمند کے ذکر میں ان کے ساقی نامہ کے چند شعر
فضائل علی خاں فضائل دہلوی کے نام سے ان کی عشقیہ مثنوی کے کچھ حصّے
اور مبین بدایونی کے حالات کے تحت ان کے دو مخمس نقل ہوئے ہیں۔
حسین عطا خاں تحسین کی تخلیقات کے نمونوں میں ایک غزل اور قصیدہ
در مدح نواب وزیر الملک سے ماخوذ اشعار کے علاوہ "نوطرز مرصّع" کا ایک
طویل اقتباس بھی شامل ہے۔ اُردو کی اس مشہور اور اہم نثری تصنیف
کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

"نسخہ نوطرز مرصّع مشتمل بر قصۂ چار درویش بہ عبارت ہندی
تالیف نمودہ۔ بابا تصنیع سحر کردہ۔ موجد ایں ایجاد نادرہ غیر وے
از وقتِ آدم تا ایں دم احدے نشدہ۔ واقع کہ ہندی را با فارسی
بچہ خوبی ترصیع نمودہ۔" (ص ۴۲)

امراللہ کا یہ اقدام بھی قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اشعار کے اندراج میں
بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان کوئی
انتہائی غلطی سرزد نہ ہو۔ خاتمے کے ذیل میں اس التزام کی وضاحت کرتے ہوئے
رقم طراز ہیں کہ۔

"در تصحیح اشعار و ترمیم آں تحت احوال ناظمانش اہتمام عظیم بکار
بردم و لے چوں اتفاق تطبیق از دواوین شاں نیفتاد، اگر شعرے

در ذیلِ شیرِ دیگرے مذکور شود، تصور نا قل است بتقصیر مؤلف"۔

(ص - ۲۴۷)

پھر بھی اس قسم کی لغزشوں سے یہ تذکرہ پوری طرح محفوظ نہیں مثلاً قائم چاندپوری کے یہ اشعار میر سے منسوب کئے گئے ہیں۔

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رو گیا
درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

قسمت یہ جا کے دیکھو کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ سرِ بام رہ گیا[1]

مندرجہ ذیل شعر جو دراصل میر کی تخلیق ہے[2] خواجہ بخش منتظر الہ آبادی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

منفعل رو تے ہی رہئے تو مجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں (ص ۲۰۸)

درج ذیل مطلع جسے تمام تذکرہ نگار عمدة الملک امیر خاں انجام سے منسوب کرتے رہے ہیں[3] صفحہ دس پر انجام کے کلام میں اور صفحہ ۱۰۸ پر مرزا مظہر کے اشعار کے تحت نقل ہوا ہے۔

---

[1] قائم کے دیوان اور تذکرے میں یہ شعر ادنیٰ تغیرِ الفاظ اس طرح درج ہے۔
قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند — کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
دیوانِ قائم مطبوعہ ص ۲ و مخزنِ نکات ص ۷۰)

[2] انتخاب کلام میر مرتبہ عبدالحق ص ۱۱۱

[3] تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن طبع اول ص ۵۴ ؛ گلشن ہند طبع ثانی ص ۱۴ و تذکرہ عشقی دو تذکرے جلد اول ص ۶

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

مطلع ذیل بھی اعادے کی ایسی ہی مثال پیش کرتا ہے۔

الٰہی مت کسی کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

اس مطلع کو سب سے پہلے میر حسن[1] نے اور ان کے بعد غالباً انھیں کی تقلید میں دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے ایک مجہول الاحوال شاعر محمد تقی غریب سے منسوب کیا ہے۔[2] امراللہ نے بھی اولاً اس روایت کی پیروی کی ہے۔ اس کے بعد اسے بعینہٖ مرزا مظہر کے کلام میں شامل کر دیا ہے۔ چونکہ غریب اور مظہر دونوں ہی ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کی تصدیق کے معتبر ذرائع مفقود ہیں اس لئے اس سلسلے میں کسی صحیح فیصلے تک پہنچنا ممکن نہیں۔

اعادے کی ایک اور مثال مندرجہ ذیل مطلع کے معاملے میں سامنے آتی ہو۔

بولے ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
اپنا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے

یہ مطلع مرزا محمد رفیع سودا اور اشرف علی خاں فغاں کے کلام میں مشترک ہے۔ لیکن در اصل سودا کی تخلیق ہے اور ان کے کلیات میں غزلیات کے علاوہ مخمسات کے ذیل میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[3]

گنا بیگم منت زوجہ نواب وزیرالممالک غازی الدین خان بہادر کے

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو طبع اول ص ۱۴۱

[2] قائم اس شعر کو اس تیسرے شاعر محمد فقیہ دردمند سے منسوب کرتے ہیں (مخزن نکات ص ۴۶)

[3] چمنستان شعرا کے ذیل میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہو۔

حال میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"گویند روزے عماد الملک در خواب بود بر بالیں بیگم آمد چوں غافل دید برگشت ناگاہ نواب بیدار شد ایں مصرع بدیہہ خواند۔ آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے۔ بیگم فی الفور گفت۔ خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے۔ بعد ازیں ریختہ را اتمام کرد۔

میرے دل حزیں کو جو انگار کر چلے
اے واہ وا میاں یہ بھلا پیار کر چلے

کیا سحر تھا نہ جانیے گلشن میں آن کر
بلبل کو گل کی شکل سے بیزار کر چلے

آباد رہیو پیر مغاں اب یہ مے کدہ
ہم بھی لبوں کو یاں تراب اکبار کر چلے

جانتے ہو جو بھرے ہوئے گرد غبار سے
تعمیر کس کے دل کی یہ مسمار کر چلے

(ص ۲۲۰ - ۲۲۱)

یہ واقعہ کسی افسانہ طراز کی طباعی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہمارے سامنے ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ان کی عدم صداقت واضح ہو جاتی ہے۔ اس غزل کا مطلع اول رجسے باقی اشعار کی تخلیق کا سبب قرار دیا گیا ہے) اور تیسرا شعر میر حسن نے مرزا عظیم بیگ کے نام سے پیش کیا ہے[۱] چوتھا شعر انھیں کے کلام میں حکیم قدرت اللہ قاسم کے یہاں موجود ہے[۲]۔ ایسی صورت میں یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مطلع ثانی اور آخری شعر بھی عظیم ہی کی

---

[۱] تذکرہ شعرائے اردو طبع اول ص ۲۰ [۲] مجموعہ نغز جلد دوم ص ۱۰

تخلیق ہو" "تذکرہ شعرائے اردو" اور "مجموعہ نغز" کے انتخابات میں ان اشعار کے علاوہ یہ شعر بھی شامل ہے۔

خواہی پیالہ خواہ سبو کھینچو کلالی
ہم تجھ کو اپنی خاک پہ مختار کر چلے

چونکہ میر حسن عظیم کے ہم عصر اور قاسم ان کے دوست ہیں۔ اس لئے بظاہر اس انتخاب کی صحت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، میر حسن کی تحریر کے مطابق تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں "نہ جانئے گلشن میں آن کر" اور قاسم کی روایت کے بموجب چوتھے شعر کے مصرع ثانی میں "یاں تراب اک بار کر چلے" کی جگہ "یاں سے تراک بار کر چلے" ہونا چاہئے ریختہ گوئی میں ولی کی اولیت کے متعلق مولف کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ

"اصل ریختہ از دکن است و دراں دربار ولی موجد ایں طرز تازہ شدہ۔ بعد از آں سخنوران ہندوستان گفتہ بایں روش آراستہ" (تذکرہ ولی صفحہ ۲۲۲)

تحقیق جدید سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دکن میں ولی سے پہلے مقامی زبان میں طبع آزمائی کا آغاز ہو چکا تھا اور شمالی ہند میں بھی ایسے دہلی میں ولی سے قبل اس میدان کے کتنے ہی شہسوار موجود تھے۔

آخر میں امراللہ کے طرز نگارش کے متعلق چند باتیں عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا جیسا کہ سطور سابقہ میں مختلف عنوانات کے تحت پیش کئے گئے اقتباس سے ظاہر ہے انھوں نے اظہار مطالب کے لئے بالعموم زبان و بیان کی سلاست و سادگی کو پیش نظر رکھا ہے جس کی بدولت ان کی تحریر ابہام اور

اغلاق و پیچیدگی کے عیوب سے مبرّا رہی ہے۔ تاہم کبھی کبھی ان کے قلم نے اس محتاط و مستحسن روش سے ہٹ کر انشاپردازی و عبارت آرائی کی راہ اختیار کرلی ہے اور نتیجے کے طور پر نفسِ مطلب، ضلع جگت صنائع اور تلازمات کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا ہے

سید ہدایت علی خاں عاشق کے حالات سے جو فنِ طبابت اور تجربہ معالجات میں یگانہ و ممتاز تھے ایک مثال ملاحظہ ہو۔ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"مضامینِ رنگیں اشعارش مفرحِ یاران و صاحبین خوشش آئینِ بیانش مصححِ بیماران۔ نسخۂ دیوانش دل پذیر و مجرباتِ طبعش جودتِ مشاقانِ علیمِ تدبیر۔" (ص۔ ۱۴۰)

لیکن اس قسم کی مثالیں شاذ و نادر کا حکم رکھتی ہیں اور ان سے تذکرے کی مجموعی فضا متاثر نہیں ہوتی۔ امراللہ کے کام کی زبان میں کام کی باتیں لکھ کر اور خاص طور پر التزامِ سنین کے ساتھ اہم واقعاتِ زندگی کے انضباط کی صورت میں تذکرہ نگاری کے فن کو جس نئی روایت سے آشنا کیا ہے وہ "مسرت افزا" کو معاصر تذکروں سے ممتاز کرتے ہوئے اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک مفید و معتبر ماخذ کا درجہ عطا کرتی ہے۔

گل عجائب

"گل عجائب" اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی (متوفی ۱۲۰۴ھ/۹۰-۱۷۸۹ء) کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ جسے انھوں نے اپنے ایک دوست محمد کرم بخش سالم کی فرمائش پر ترتیب دیا ہے[1] اکیاون شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ مطبوعہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے واحد قلمی نسخے پر مبنی ہے۔ اصل کتاب میں اردو اشعار کے ساتھ ساتھ جابجا فارسی کلام کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں لیکن فاضل مرتب نے انھیں غیر ضروری سمجھتے ہوئے قلم انداز کر دیا ہے۔ حیدرآباد کے قلمی نسخے کے ورقِ اول کی پیشانی پر اس تذکرے کا نام "رنگ دوم گل عجائب من مقالات الغرائب" لکھا ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

"تمنا کی کوئی تالیف "مقالات الغرائب" نام کی تھی جو کئی مقالوں پر مشتمل تھی ہر مقالے کو اس نے "گل" سے موسوم کیا اور "گل" کے ذیلی باب کو "رنگ" کا نام دیا ہے یہ تذکرہ گل عجائب کا رنگِ دوم" ہے[2]"

۱؎ گل عجائب مطبوعہ ص ۶۱ ۲؎ گل عجائب مقدمہ مرتب ص ۵

ہمارا خیال یہ ہے کہ "گل عجائب" کا رنگ اول شعرائے فارسی سے متعلق تھا۔ خانِ آرزو کے سلسلے میں ان کے استاد میر (عبدالصمد) سخن کے بارے میں تمنا کا یہ بیان کہ ان کا ذکر رنگ اول میں کیا جا چکا ہے[1]۔ اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ سخن چونکہ فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے اس لئے ان کا ذکر شعرائے فارسی کے ساتھ ہی کیا گیا ہوگا۔ لیکن چونکہ تمنا نے اس رنگ دوم میں صرف اپنے معاصرین کا ذکر کیا ہے اس لحاظ سے یہ بھی ممکن ہے کہ رنگ اول شعرائے متقدمین کے لئے مخصوص رہا ہو۔ بہرصورت ہمیں بہ حالت موجودہ اپنا دائرۂ بحث رنگ دوم تک محدود رکھنا ہے۔

تذکرے کے اولین صفحے پر "تاریخ آغازِ تذکرہ" کے عنوان سے ایک قطعہ اور آخر میں "تاریخ اختتامِ تذکرہ" کے عنوان سے دو قطعے درج ہیں یہ تینوں قطعات مولف ہی کے طبع زاد ہیں۔ پہلے قطعے کے مادۂ تاریخ "آغازِ صفحہ" سے ۱۱۹۲ھ برآمد ہوتا ہے جو بظاہر اس بات کی دلیل ہے کہ تمنا نے تذکرے کی ترتیب کا کام ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں شروع کیا تھا لیکن اصل قلمی نسخے کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغاز و اختتام کے یہ قطعات تذکرے کی کتابت کے بعد اضافہ کئے گئے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ان سے جو سنین برآمد ہوتے ہیں وہ حقیقتِ حال کے عین مطابق ہوں کم سے کم آغازِ کار کے زمانے کے سلسلے میں تو یہی صورت نظر آتی ہے۔ ثبوت کے لئے اولاً محمد خاں ذکا برادر زادہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے دوبارہ دکن میں وُرود اور مستقل قیام کے متعلق تمنا کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"با نبیرۂ میر صاحب آزاد سید امیر حیدر نام عزیمت دکن

---

[1] گل عجائب ص ۱

اختیار کرد۔ دو نہم رجب ۱۱۷۹ھ قدم بوسی عم از سمتِ برلیش گذاشت

این بار نواب والا شان ۔۔۔۔۔۔ میر عبدالحئی خاں ۔۔

۔۔۔ بہ قدر دانیِ او پرداختند و بخطاب خانی اعزاز بر نام

و جاگیر مبلغ پنجہزار روپیہ از جناب رئیسِ دکن او را مسرور

ساختند۔ چہار سالی می شود کہ در حیدرآباد دکن اقامت

ورزیدہ بدوام حاضر باشِ خدمتِ نواب صاحب موصوف است۔"

(نسخہ مطبوعہ ص ۵۲-۵۳)

اس بیان کی رو سے تمنا کے دکن میں قیام کی چار سالہ مدت ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۶۹ء پر منتہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا حال اسی سال لکھا گیا ہے۔ ایک اور شاعر ضیا برہانپوری کے متعلق تمنا کا یہ بیان بھی اسی سنہ کی تائید میں ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ۔

"چوں ہنوز بچہل سالگی رسیدہ و امید عمر طبعی دارد انشاء اللہ تعالیٰ معانی بسیار از طبعِ دثارِ او سر می زند۔" (ص ۶۹)

خود تمنا کے بیان کے مطابق ضیا، شوال ۱۱۴۳ھ (۱۴ر اپریل ۱۷۳۲ء) کو پیدا ہوئے تھے[1]۔ اس حساب سے ان کی عمر کے چالیس سال ۱۱۸۳ھ/ ۱۷۷۰ء میں پورے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ ان کے حالات بھی ۱۱۸۳/ ۱۷۷۰ء میں لکھے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی تذکرے کی ترتیب کے آغاز کا سال ہے۔

قطعات تاریخ اختتام میں سے ایک قطعے سے ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) اور

---

[1] گل عجائب ص ۶۸۔ شفیق نے بھی تذکرۂ گل رعنا میں یہی تاریخ ولادت بیان کی ہے۔ تین تذکرے ص ۲۴۴

دوسرے میں ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) برآمد ہوتا ہے[1]۔ اس اختلافِ سنین کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ ۱۱۹۴ھ اختتام کار کا سال ہے اور ۱۱۹۶ھ میں نقشِ اولی پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے بعد کسی اضافے یا ترمیم کے متعلق کوئی واضح اشارہ تذکرہ میں موجود نہیں۔ البتہ ضیا برہانپوری کے ذکر میں ایک جگہ علامہ آزاد بلگرامی کو جن کی تاریخ رحلت ۱۲ر ذی قعدہ ۱۲۰۰ھ (۵ار ستمبر ۱۷۸۶ء[2]) ہے۔ حضرت آزاد مغفور لکھا گیا ہے[3]۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۶ء کے بعد بھی کچھ اضافے کئے گئے ہیں لیکن چونکہ اس تحریر کے علاوہ کسی دوسرے بیان سے اس قیاس کی تائید نہیں ہوتی اور ضیا کے حالات بہ گمانِ غالب ۱۱۸۳ھ/۱۷۷۰ء میں لکھے گئے ہیں، اس لئے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء کے بعد علامہ آزاد کے نام کے ساتھ لفظ "مغفور" کے اضافے کے سوا کوئی اور ترمیم عمل میں نہ آئی ہو یا یہ اضافہ بھی مولف کی بجائے کاتب یا کسی دوسرے شخص کے تصرف کا نتیجہ ہو۔

تمنا نے اس تذکرے میں جن شاعروں کو شامل کیا ہے وہ جہاں ان کے ہم عصر تھے وہیں ان میں سے بیشتر ان کے ہم وطن بھی تھے یا پھر کسب معاش کے سلسلے میں دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قرب زمانی

---

[1] مطبوعہ نسخے میں آخری مصرعے کے نیچے ۱۱۹۶ھ - ۲ = ۱۱۹۴ تحریر ہے۔ (ص ۱۶۶) لیکن پچھلے مصرعوں میں تخرجے کا کوئی قرینہ موجود نہیں اور قلمی نسخے میں بھی ۱۱۹۶ ہی لکھا ہوا ہے۔

[2] شجرۂ خار از وجیہ الدین اشرف۔ مخطوطہ برٹش میوزیم ص ۳۱۵

[3] گل عجائب مطبوعہ ص ۶۸

وبکانی سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور اکثر شعرا کے بارے میں نہایت مفصل اور اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ولادت و وفات اور دوسرے سوانح زندگی کی تاریخ اور سنین کے حوالے بھی ان کے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر موسوی خاں جرآت کو اس طرح متعارف کرایا ہے۔

"نام اصلی او میر محمد ہاشم است وسلسلۂ نسبش بہ بیست و اسطہ بسابع ائمہ ہدیٰ علیہم التحیۃ والثنا میرسد۔ پدرش میر محمد شفیع و جدش میر سید علی کہ از گیلان بہندشتافتہ، در اورنگ آباد رنگِ اقامت ریختہ بود۔ ولادت خاں جرآت در ثمہ ثمان وسمانین و والف (۱۰۸۸) در شہر مذکور رو اتفاق گردید و نخل قابلیتش در ظلِ تربیت والدِ خود برومند شدہ۔ ثمر مراد از علوم برگرفت۔ اوائل در دریاکت سازاتِ بارہ قلعہ وار دہارور (دھاڑواڑ) من مضافات خجستہ بنیاد دکن بود۔ در عہد نواب آصف جاہ طاب ثراہ بمنصب دو ہزار و پانصدی و خدمت منشی گریٔ سرکار عزّ امتیاز یافت و در زمانِ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید بمنصب چہار ہزاری و خطاب معز الدولہ علم افتخار برافراخت بتاریخ ششم شعبان سنہ خمس و سبعین و مائۃ الف (۱۱۷۵ھ) در اورنگ آباد عندلیب حیاتش بغزل خوانی سمات مائل گردید۔ میر غلام علی آزاد . . . . . . تاریخ وفاتش چنیں یافتہ بسیر جاودانی کرد جرآت"

(ص ۴۷)

درگاہ قلی خاں بہادر درگاہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"خلف الصدق خاندان قلی خاں۔ لسبت و نہم رجب سنہ

اثنین و عشرین و مایۃ الف (۱۱۲۲ھ) متولد شدہ و در عمر چہاردہ سالگی نواب آصف جاہ غفران پناہ بمنصب و جاگیر سرفراز فرمودہ چونکہ بہ بست سالگی رسید، ہمراہ رکاب بودہ اکثر خدماتِ لائقہ حضور داشت۔ تا حینِ حیاتِ نواب مورد عنایات بودہ در وقت نظام الدولہ ناصر جنگ بانواع مراحم و خدماتِ لائقہ مامور بودہ در زمانِ امیر الممالک صلابت جنگ بہ منصبِ شش ہزاری و خطاب مؤتمن الدولہ و صوبہ داری خجستہ بنیاد مفتخر گردید۔ در عصر نواب آصف جاہ ثانی دام اقبالہٗ بمنصبِ ہفت ہزاری و ماہی مراتب و خطاب مؤتمن الملک ممتاز گردید و پس از چندے بخطاب خانِ دورانِ میر افتخار برافراخت و تا چہاردہ سال بہ صوبہ داری اورنگ آباد پرداخت۔ غرۂ رجب ۱۱۹۷ھ از صوبہ داری معزول شدہ پنجم ذی الحجہ سنہ الیہ از آنجا (بہ) پرگنہ نظام آباد کہ مسی کرہی خجستہ بنیاد واقعست و جاگیر او بود، رفت و ہژدہم جمادی الاول ۱۲۰۰ھ بمرضِ سرسام بجنت شتافت۔ جنازہ نعش او را از نظام آباد آوردہ در مقبرۂ پدرش دفن کردند۔ عجب قیامت بود ایں مصرع تاریخش میر غلام علی آزاد گفتند۔۔۔۔

اہلِ عالم سینہ چاک از ماتم سالار جنگ!! (ص ۵۰-۵۱)

آزاد نے محمد خاں زکا کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ۔

"بہ بست و ہفتم شہر رجب المرجب ۱۱۵۱ھ در مقام بلگرام۔۔۔۔۔ تانیث را بخلوتِ حسنی آراست و در ظلِ تربیت بزرگانِ خود سواد را روشن ساخت۔۔۔۔ در ۱۱۷۲ھ حسب الطلب

عم مکرم خود میر صاحب آزاد از وطن بر مین اورنگ آباد دکن رسید
و باستفادہ ملازمت کثیر الافاضت میر صاحب مذکور مباہاتش
دست داد .... تا پنج سال کاملے در حضورِ عم مکرم ماندہ۔
ناگاہ بر مزاجِ اعلیش محبت وطن غالب آمد، رخصت گرفتہ روانہ منزلِ
مقصود شد۔ میانِ الٰہ آباد و لکھنؤ و غیرہ امکنہ صاحبِ کمالان (و)
سخنورانِ بسیار باو ملاقات کردند۔ یکسالِ کامل و چند ماہ با عزیزان
وطن محشور ماند۔ آخر در ۱۱۷۹ھ نامۂ طلب از بارِ دوم از پیشِ
گاہ عمش عزِ صدور یافت و در ہمان ایام با نبیرۂ میر صاحب آزاد
سید امیر حیدر نام عزیمت دکن اختیار کردہ نہم رجب ۱۱۷۹ھ
قدمبوسِ عم از منت بر لیش گذاشت۔ ایں بار نواب والا شان
فیض رسان صمصام الملک بہادر میر عبد الحئی خان خلف الصدق
نواب صمصام الدولہ شاہنواز خان مرحوم بقدردانی او پرداختند
بہر خطابِ خانی اضافہ بر نام و جاگیر مبلغ پنج ہزار روپیہ از جنابِ
رئیسِ دکن او را مسرور ساختند چہار دہم سال می شود کہ در حیدر آباد دکن اقامت
در زیدہ و دوام حاضر باشی خدمت نواب صاحب موصوف است با محرر سطور
ربط کمال دارد و اکثر بمجالست باہم اوقات خوش می گردد... (ص - ۵۲ - ۵۲)

نور العین واقف بٹالوی کے ذکر میں ان کے اور حاکم لاہوری کے ایک مشترک
سفر کی تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"بسبب قرب وطن میانِ شاہ عبد الحکیم حاکم و نور العین واقف
ارتباطے بود چونکہ ارادۂ زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً
داشتند ہر دو بالاتفاق ازیں جانب روانہ گشتہ بست و نہم رجب

۱۱۶۴ھ در خجستہ بنیاد آمدند دیک ہفتہ در انجام مقام پرداختہ سر بے بسمت سورت کشیدند۔ از انجام حاکم سواری جہاز را درست کردہ روانۂ نیل مقصود گردیدہ ووا قف بجہت علوئے امراض ہمانجا سکونت ورزید تا آنکہ حاکم حصولِ سعادت کردہ بازگردید و ہر دو اتفاق از سورت برآمدہ پانزدہم جمادی الاوّل ۱۱۶۵ھ بخجستہ بنیاد وارد گردیدند و در تکیہ شاہ محمود فرود آمدند۔ حاکم نوزدہم شوالِ سنہ الیہ بفرخندہ بنیاد (حیدرآباد) شتافت و وا قف ہمانجا توقف نمودہ تا آنکہ نوزدہم صفر ۱۱۶۶ھ حاکم باز بہ اورنگ آباد رسید۔ چنانچہ دوم ربیع الآخر سنہ مذکور ہر دو بار! دۂ ہندوستان رخت سفر بستند و بعد صعوبت چند بہ اوطانِ خود رسیدہ شادکام گردیدند" (ص ۱۵۹)

ان اقتباسات سے مؤلف کے معمر خانہ شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں انھوں نے اس تفصیل کے برخلاف اجمالی یا اختصار سے کام لیا ہے، وہاں تساہل یا بے اعتنائی کے بجائے بالعموم حالات کی نامساعدت اور حصولِ معلومات کی دشواریاں دخیل ہیں۔ اندازِ عبارت کا فرق خاص طور پر شمالی ہند کے شعرا کے ذکر میں جن کی تعداد محض برائے نام ہے، بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ دکن کے شاعروں میں سے صرف سراج اور نگ آبادی کے بارے میں انکی فراہم کردہ معلومات تحقیق و دریافت سے پہلو تہی کی غمازی کرتی ہے۔ اپنے وطن کے اس نامور اور ممتاز فن کار کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں ان کی بے توجہی اور مختصر بیانی کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے علاوہ تذکرے

میں چند مقامات ایسے بھی آئے ہیں جہاں انھوں نے صرف اشعار کے انتخاب پر اکتفا کیا ہے اور شاعر کے متعلق کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر دی ہے مثلاً۔

(الف) میر محمدی بیدار۔ کے بارے میں جن کے نمونۂ کلام کے طور پر ردیف وار ترتیب کے ساتھ ڈیڑھ سو اشعار نقل کئے ہیں لکھتے ہیں۔

"معنی یاب خوش گفتار بیدار۔ احوالش تفصیلاً معلوم نشدہ ظاہراً از ہند است۔" (ص ۲۴)

(ب) شاہ پنچھی متخلص بہ پنچھی کا منتخب کلام ایک سو دو اشعار پر مشتمل ہے لیکن تعارف کے ذیل میں بجز نام اور تخلص کے کچھ اور درج نہیں۔

(ج) کاظم کے کلام کا انتخاب بھی کافی طویل ہے۔ ان کی مختلف غزلوں سے ردیف وار ایک سو اٹھ اشعار نقل کئے گئے ہیں مگر ان اشعار سے قبل حالاتِ زندگی کے بجائے صرف ایک فقرہ "اقلیم سخن را ناظم صوفی شاہ کاظم ملتا ہے۔ (ص ۱۲۹)

ان چند شاعروں کے حالات کی کمی کی وجہ سے تذکرے میں ایک قسم کی ناہمواری ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن جیسا کہ گزشتہ مثالوں سے واضح ہے۔ تمنا کے یہاں تعارف نویسی کا عام معیار بہت بلند ہے۔ وہ شعرائے اردو کے ان تذکرہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کی سلیقہ مندی کسی بھی صائب نظر نقاد سے خراجِ تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتی انھوں نے تذکرہ نگاری کے فن کو اس مقام تک لے آنے کی کوشش کی ہے جہاں اس کی دین

ادب کے مورخ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

سوانح کے علاوہ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے "گل عجائب" کو کوئی خاص درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تمنا جن لوگوں سے قریبی واقفیت رکھتے تھے ان کے حالات زندگی تو انھوں نے کافی تفصیل کے ساتھ بیان کر دئے ہیں لیکن سیرت و شخصیت اور کلام کے بارے میں اظہار خیال سے عام طور پر دامن بچایا ہے۔ تاہم سات آٹھ شاعروں کے ذکر میں انھوں نے جس طرح ان کے اخلاق و عادات اور مزاج و طبیعت کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، اس سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ وہ جوہر شناسی اور تحسین مکارم کی صلاحیت سے محروم نہ تھے۔ درج ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا۔

(الف) باقر علی خاں افسرؔ: "جوانیست بغایت رنگین و مرد لیست شائستۂ تحسین۔ زبانہ شتاب گرم جوشیہا و بیرونچیاں اختلاطیہا" (ص ۱۰)

(ب) سیف اللہ انور، "در عالم دوستیہا آشنائے یگانہ است درجہان آشنائیہا مفتخر۔ زمانہ مردیست مودت پیشہ و جوانے محبت اندیشہ" (ص ۱۴)

(ج) ابو طالب خاں آشفتہ: "جوان صالح بزیور قابلیت پیراستہ و بجوہر آدمیت آراستہ۔ دانائے مدارج علم مجلس و پاسداری و شناسائے متعارف یار باشی و غم گساری۔ با فقیر یگانگت تمام می دارد و از گرم جوشی ہائے شبا روزی سرد مہری یاران ناسزا زنگ می مازند ..... " (ص ۱۷)

(د) میر انوار الدین دلؔ۔ "جوانیست سرگرم اختلاط، مردیست چسپانِ ارتباط اشفاقِ عالیش مبذولِ ایں نفیر است و در مکارم اخلاق ممتاز و بے نظیر۔۔۔۔" (ص۔ ۵۱)

(ہ) نصیر اورنگ آبادی۔ "جوانیست سرگرم اختلاط رنگین مزاج زیار باش و مردیست چسپانِ ارتباط۔۔۔۔۔۔۔ آثار خوبی از ناصیہ او ہویدا و لمعاتِ نور از پیشانی او پیدا۔ با مخلص اخلاص درستے می دارد و در پاس آشنائی ہمارہ بستے!" (ص ۱۵۶)

تنقیدِ کلام کا تمنا نے سیرت و شخصیت کے تجزیے سے بھی کم اہمیت دی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایسے بیانات جن سے شاعر کے سرمایۂ فکر کی قدر و قیمت کا تعین مقصود ہو بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں ان کا معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں۔ بطور مثال درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(الف) نقد علی خان ایجاد۔ "غزل فارسیش چوں زلفِ خوباں مسلسل و مضامین تازہ ہایشں از خانۂ محبوباں بدل۔ ریختہ اگرچہ زبانش نیست اما آبرو طبیعتِ دقیقہ شناس بحسنِ کیفیت سرانجام می دہد۔" (ص ۴)

(ب) افسر۔ "غزل فارسی را بہ بہترین آئین سرانجام می دہد و ریختۂ ہندی را بخوش ترین مضامین می گوید۔ گفتگویش بطرز اہلِ ہند مانوس است۔" (ص ۱۰)

(ج) تاراج اورنگ آبادی۔ "فکرِ عالی و طبع رسامی دارد و در معنی

تلاشی علم استادی می افراشت۔" (ص۔ ۶۰)

ان تاثرات کو تنقید کے دائرے سے خارج تو نہیں کیا جاسکتا لیکن ان میں کوئی ایسی خوبی بھی نہیں جسے مولف کے انداز نظر کی انفرادیت یا فن کے محاسن و معائب کے عالمانہ تجزیہ سے تعبیر کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ پورے تذکرے میں اس قسم کے اظہار تاثر کی بمشکل دو تین مثالیں ہی اور ملیں گی۔ اس لئے تنقیدِ فن کے نقطۂ نظر سے "گل عجائب" شعرائے اردو کے تذکروں میں کسی اہمیت کا مستحق نظر نہیں آتا۔

سیرت اور شخصیت اور کلام کے بارے میں تنقیدی مواد کی کمی کے باوجود "گل عجائب" کے تاریخی و سوانحی پہلو کی اہمیت اسے ممتاز تذکروں کی فہرست میں شامل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس تذکرے سے دکنی شاعروں کے حالات زندگی کے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ایسے واقعات وحقائق تک ہماری رسائی ہوتی ہے جن سے تاریخ ادب کی ترتیب میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

گلزارِ ابراہیم

گلزارِ ابراہیم ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ عروج کی مشہور و معروف تاریخی و ادبی شخصیت علی ابراہیم خاں خلیل (متوفی ۲۳ محرم ۱۲۰۸ھ / ۲۱ اگست ۱۷۹۳ء) کی تالیف ہے۔ اس تذکرے کے متعدد نسخے ہند و بیرونِ ہند کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں جن میں تعداد کے معمولی اختلاف کے ساتھ مجموعی طور پر تین سو چھبیس (۳۲۶) شاعروں کے حالات و اشعار ملتے ہیں۔ مطبوعہ نسخہ جو ڈاکٹر زور کا مرتبہ ہے اور ۱۹۳۴ء میں گلشنِ ہند کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے شائع ہوا ہے صرف ان شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے جن کے ترجمے گلشنِ ہند میں شامل نہیں۔ اس لئے سطورِ ذیل کی تحریر کے وقت اس نسخے کے علاوہ رضا لائبریری رام پور اور خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری پٹنہ کے دو قلمی نسخے راقم الحروف کے پیش نظر رہے ہیں۔ رام پور کا مخطوطہ دو کاتبوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جن میں سے ایک نے جسارتِ بیجا کا ارتکاب کرتے ہوئے حواشی کی صورت میں اپنی طرف سے کچھ اضافے بھی کئے ہیں جو اپنی انا دیت کے باوجود اصل مولف سے عدم تعلق کی بنا پر ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔

مرزا علی لطف مترجم گلزارِ ابراہیم کی تحریر کے مطابق اس تذکرے کی ترتیب پر بارہ سال کی مدت صرف ہوئی ہے لیکن علی ابراہیم نے اس سلسلے میں کوئی

وضاحت سے کام نہ لیتے ہوئے دیباچے میں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ "بسالِ یک ہزار و ہفت صد و ہشتاد و چہار عیسوی و یک ہزار و یک صد و نود و ہشت ہجری از تسویدِ آن فراغ حاصل شدہ" البتہ مختلف اندراجات و بیانات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لطف کا بیان بے بنیاد و بے حقیقت نہیں۔ سطورِ ذیل میں کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس طویل زمانۂ ترتیب کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

میر سوز "الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و دو ہجری است در لکھنؤ می گزرانند" (نسخہ رام پور ورق ۱۳۲ الف)

محمد عابد دل عظیم آبادی۔ "ہنگام تالیف این مجموعہ مشار الیہا خلاصہ دیوان خود را در مرشد آباد (در) ۱۱۹۲ ہجریہ فرستادند" (ورق ۷۷ الف)

فضل علی دانا۔ "الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری باشد .... در بنگالہ بسر می برد" (ورق ۷۲ الف)

صلابت خاں ثابت۔ "درینولا کہ ۱۱۹۵ ہجریہ باشد باستصواب مرزا محمد علی فدوی تخلص فکرِ اشعار می نماید" (ورق ۲۹ ب)

میر قدرت اللہ رخصت:۔ "الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجریست در لکھنؤ می گزرانند" (ورق ۸۹ الف)

قلندر بخش جرأت۔ "درینولا کہ ۱۱۹۷ ہجریست مشار الیہ در لکھنؤ و فیض آباد می گزرانند" (ورق ۳۰ ب)

شاہ عالم آفتاب۔ "تا حال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت ہجری است زینت آرائے سریرِ سلطنت اند" (ورق ۱۴ الف)

خلیق دہلوی۔ "تا حالیکہ ۱۱۹۹ ہجریہ باشد، در سرکار نظامت بنگالہ

منسلک دبا راقم آشنا ست!!   (ورق ۵۶ الف)

ان بیانات کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ علی ابراہیم ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء سے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء تک پورے انہماک اور تسلسل کے ساتھ اس کام میں مصروف رہے ہیں۔ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء کا حوالہ خلیق کے علاوہ رام جس محیط کے حال میں بھی ملتا ہے جن سے اسی سال بنارس میں مولف کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مرشد زادۂ آفاق مرزا جہاندار شاہ جہاندار کے متعلق درج ذیل بیان بھی اس سلسلے میں مزید تحقیق و تلاش کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ۔

"ہنگامے کہ از ناموافقت امرائے دولت نوائے آن نقش از دار الخلافہ دہلی بہ حرکت آمدہ در ۱۱۹۸ھ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت ہجری زینت بخش لکھنؤ گردید ایں خاکسار باستصواب نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن ہسٹن جلادت جنگ بہادر شرف ملازمت حاصل نمودہ در اواخر سالی مذکور آں جناب ظلِ حمایت بر ساکنانِ بلدۂ بنارس ارزانی داشت۔ راقم آثم کہ بہ حکومت بلدۂ مذکور مامور بود بسا اوقات بشرفِ تقبیل سدۂ علیا مشرف می شد و مورد تفقد و الطاف و انفضال و اعطاف بے اندازمی گردید"

(ورق ۳۰ الف)

جیسا کہ اس عبارت سے ترشح ہوتا ہے اس کی تحریر کے وقت متعلقہ واقعات کو گزرے ہوئے کافی دن بیت چکے تھے اور مولف بلدہ بنارس سے جہاں ۱۱۹۹ھ تک ان کے قیام کا پتہ چلتا ہے کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے

اس درمیانی عرصہ کو اگر دو یا تین سال کی کم سے کم مدت تک بھی محدود رکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خلیق تقریباً ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء تک برابر اضافے کرتے رہے ہیں اور اس طرح بارہ سال میں اتمام کے متعلق لطف کی صراحت پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے۔

"گلزار ابراہیم" کی تکمیل سے قبل شعرائے اردو کے جو تذکرے منظر عام پر آچکے تھے، گمان غالب یہ ہے کہ بارہ سال کے اس طویل عرصے میں اور اس سے پہلے ان میں سے بیشتر خلیل کی نظر سے گذر چکے ہوں گے اور انھوں نے حسبِ ضرورت ان کے مواد سے استفادہ بھی کیا ہوگا۔ اگرچہ انھوں نے بذاتِ خود اس اکتسابِ فیض کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے لیکن بعض اہم اور مشہور تذکروں کے اندراجات سے ان کے بیانات کی لفظی و معنوی مماثلت ہمارے اس قیاس کو تقویت بخشتی ہے۔ بسطور ذیل میں صرف میر حسن کے "تذکرۂ شعرائے اردو" کو سامنے رکھ کر اس قسم کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

تذکرۂ شعرائے اردو	گلزار ابراہیم
احمد گجراتی	
"در زبانِ سنسکرت و بھاکا نی گویند کہ تصانیف بسیار دارد چوں معاصر شاہ ولی اللہ دکنی بود و ہو سہ ریختہ نیز گفتہ	"معاصر ولی دکنی۔ مہارت بزبان سہنس کرت و بھاکا داشت وگاہے ریختہ نیز می گفت، ازوست
احمد تنہا میں کیا کرو دل اب راہِ عشق میں سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے	احمد تنہا میں کیا کرو دل اب راہِ عشق میں سر پر تو سانجھ پڑ گئی اور پاؤں تھک گئے
	(ورق ۵ الف)

(ص ۴۴ طبع دوم)

سکندر، مرثیہ گو

"میاں سکندر عرف گھسیا از
مرثیہ گویانِ متاخرین است اکثر در
زبان پوربی و پنجابی و بنگالی و مارواڑی
مرثیہ گفتہ و در قصہ خوانی و عرق
کشی نیز ماہر است یک قصہ ملاح
و ماہی و بادشاہِ دل خوار بسیار
بہ آب و تاب منظوم نمودہ است
اگرچہ علم ندارد لیکن بر کلام او جائے
انگشت نیست ——— از شاگردان
محمد شاکر ناجی است۔"

(ص ۹۲ طبع دوم)

"مشہور بہ خلیفہ سکندر در مرثیہ
گفتن کمالِ اقتدار و سلیقہ درستے
دارد۔ اکثر در زبان پوربی و
مارواڑی و پنجابی مرثیہ گفتہ و
قصہ ملاح و ماہی و بادشاہ دل
خوار منظوم ساختہ۔ اگرچہ استعداد
علمی ندارد، اما مرثیہ او مقبول
خواص و عام است و در قصہ
خوانی و عرق کشی واقف و خود را
از شاگردانِ ناجی می شمارد۔"

(ورق ۱۴۰)

ندرتی لاہوری

"مردے بود بر خود غلط۔ برائے
مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش میرزا
محمد رفیع سلمہ اللہ آمدہ، ہنگامہ برپا نمودہ
بعد از ذلتِ بسیار بوطنِ خود برگشت
یوسف زلیخا بزبانِ ریختہ گفتہ ۔۔۔۔
میر فتح علی شیدا ہجوِ او خوب کردہ است
قصہ بقالی و بدم حسب حال درج نمودہ"

"مردے بود بر خود غلط برائے
مباحثہ از مرزا محمد رفیع سودا بہ فرخ
آباد آمدہ و ذلت کشیدہ بوطنِ
خود برگشت۔ یوسف زلیخا بزبانِ
ریختہ گفتہ و میر فتح علی شیدا
در ہجو او قصۂ بدم و بقالی [illegible]
نمودہ۔"

(ورق ۱۲۰ الف)

است " (ص ۱۲۰ طبع دوم)

"مختلف کتابوں سے ماخوذ عبارات میں مواد، پیرایۂ بیان اور الفاظ کی اس یکا نگت کو محض اتفاق یا توارد سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس قسم کی مثالیں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ہر چند کہ اخذ و اکتساب کی یہ روش تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک مستقل روایت کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے مذموم قرار دینا مناسب نہیں تاہم یہ بات ضرور قابل گرفت ہے کہ خلیل نے اپنے ایک پیشرو تذکرہ نگاروں کے ان بالواسطہ احسانات کا اعتراف نہیں کیا۔

معاصر تذکروں کے علاوہ خلیل نے مواد کی فراہمی میں حسب موقع دوسرے ذرائع و وسائل سے بھی کام لیا ہے ان کا حلقۂ احباب و تعلقات کافی وسیع تھا۔ مرشد آباد، عظیم آباد، بنارس، لکھنؤ اور الہ آباد کے اکثر شاعروں سے جن کا اس تذکرے میں ذکر کیا گیا ہے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ کچھ لوگ سرکاری ملازمین کی حیثیت سے ان کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے یا کر رہے تھے۔ اور کچھ لوگوں کے مقدمات بہ غرضِ تصفیہ ان کی عدالت میں آ چکے تھے۔ ایسے شاعروں کے حالات میں انھوں نے اس ربطِ باہمی کی بھی وضاحت کر دی ہے مثلاً:

میر مظفر علی آزاد۔ "راقم حقیر میر مذکور را مکرر در مرشد آباد دیدہ۔ در بنگالہ کہ بر نزاکت نام کنیزے عاشق و متنازعہ با مینا بیگم داشت، معاملہ اش مرجوع بہ احقر بود۔"

(ورق ۵ ب)

ہیبت اور لیا۔ " از ہوتے در مرشد آباد اقامت ورزیدہ با راقم

نیز آشناست"۔ (ورق ۱۳ الف)

غلام یحییٰ حضور:" از احباب مولف حقیر است ہنگام تدوین ایں تذکرۂ منتخب کلام خود مرا داده که دریں صحیفه که انضمام باید"۔ (ورق ۴۸ الف)

خلیق دہلوی۔" در سرکار نظامت بنگالہ منسلک و با راقم آشنا است" (ورق ۵۶ الف)

خادم عظیم آبادی:" از منصب داران و عم زادگانِ مولف اوراق است"۔ (ورق ۵۶)

شہید غازی پوری:" در زمرۂ افاضل عالی مقدار که در بنارس با ایں خاکسار در عدالت مامور به اشتغال دارد" (ورق ۱۴۳ الف)

غلام محمد دوست بہاری۔" با راقم حقیر در مرشد آباد ملاقات کرده!! اشعار خود قریب صد بیت وانمود"۔ (ورق ۸۶ ب)

میر علی نقی کافر۔" مولف اوراق مکرر او را در مرشد آباد دیده و اشعارش شنیده است"۔ (نسخہ مطبوعہ ص ۲۰۷)

جو لوگ خلیل کے وطن اور مستقر سے دور کسی دوسرے شہر میں بسے ہوئے تھے یا جن سے کبھی ملاقات کا اتفاق نہ ہوا تھا ان کا کلام حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ اپنایا گیا ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

خواجہ برہان الدین آشی:" چند بیت از میر حاجی خلف خواجہ مذکور بدست آمده"۔ (ورق ۶ الف)

مرزا کاظم علی جوان:" اشعار ایشان از لکھنؤ به بنارس طلبیده تحریر

پذیرفت۔" (ورق ۳۳ ب)

میر حسن ۔ "ابیات خود را از لکھنؤ در بنارس براقم آثم فرستادہ"
(ورق ۵۲ الف)

بھکاری داس عزیز ۔" احوال و پارۂ اشعار خود از الہ آباد باین خاکسار فرستادہ۔" (ورق ۵۰ ب)

قناعت لاہوری ۔ "مشار الیہ در لکھنؤ می گذراند۔ ایں ابیات از آنجا طلبیدہ تحریر نمودہ شد" (ورق ۱۲۴ الف)

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل نے تذکرے کی ترتیب کا کام بڑی سنجیدگی اور تندہی کے ساتھ انجام دیا ہے لیکن یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی کوششیں احوال کی بہ نسبت اشعار کی فراہمی پر زیادہ مبذول رہی ہیں جس کے نتیجے میں بہ اختلافِ نسخ سو تین سو شاعروں میں سے بہت سے شعرا کے حالات روایتی قسم کے چند تعارفی جملوں سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں، حتیٰ کہ بعض جگہ "تا حینِ تحریر ایں اوراق احوالش معلوم نشد" یا "تا تحریر اوراق معلوم نشد کہ کیست و کجا ئست" جیسی معذرتیں میر اور قائم وغیرہ کے تذکروں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے غیر ضروری عبارت آرائی اور انشا پردازی کے سہارے اپنے نقص معلومات پر پردہ ڈالنے کے مقابلہ میں اختصار اور اظہارِ لاعلمی کو ترجیح دی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی زبان تمام ظاہری و معنوی نقائص سے پاک ہے اور کہیں ایسی فضا پیدا نہیں ہونے پائی ہے جو زیر تبصرہ شاعر کی شخصیت کی بجائے تبصرہ نگار کے زورِ قلم اور قدرتِ بیان کی آئینہ دار ہو۔ اس وصفِ خاص

کی بنا پر مختصر نویسی کی مثالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تذکرے کے نسبتاً طویل اور تفصیلی اندراجات سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے مولف کے عام طرز تحارت کا اندازہ ہوگا ملاحظہ ہوں۔

احمدی :۔ "اسمش شیخ احمد است وطنش قصبۂ زمانیہ و نسب آبائش بہ حضرت قاضی شمس الدین ہروی کہ از خلفائے سلطان السالکین شاہ شرف الدین بہاری بود می پیوندد۔ آما شارالیہ از اسلاف خود بہ مشیخۂ الگزاری پرگنۂ زمانیہ و رسالہ داری انعامات داشتہ از تربیت یافتگان نواب فضل علی خان غازی پوری است" (ورق ۱۲ الف ب)

انتظار :۔ "دہلوی اسمش علی نقی خان خلف علی اکبر خان مرحوم بنگبا شی است در زمان امیر با فرہنگ نواب علی وردی خان مہابت جنگ وارد مرشد آباد شدہ دراں بلدہ سکنے اختیار نمودہ باحکام انجام بکام دل می گزراند۔ جوان فہمیدہ و خوش تقریر و با راقم حقیر آشنا ست طبعش در ریختہ سلیقہ نیکو انگیختہ است۔"

(ورق ۱۳ اب)

حیدر دکھنی :۔ "اسمش میر حیدر علی شاہ۔ در شمشیر زنی ہنر ور بہانکہ در زبان آوری بود اما در لاور نبود۔ در حکومت نواب شجاع الدین محمد خان شجاع الدولہ مرحوم از دہلی وارد بنگالہ شدہ با نواب علاؤ الدولہ سرفراز خان

خلف نواب مذکور بسر می برد و اشعار بطور ندامی گفت
و بطرز خاص که موجب تماشائے مردم بود، اشعار می
خواند۔ تمام دیوان ولی دکنی را مخمس کردہ و غزلیات
دیوان حافظ را تضمین نمودہ۔ امّا جھولنا را نیکو می
گفت۔ عمرش قریب بصد سال رسیدہ در عہد احمد شاہ
ابن محمد شاہ فردوس آرام گاہ در صوبۂ بنگلہ ارتحال
نمود۔"

(ورق ۳۴ الف ب)

رند ۔ دہلوی :۔ "اسمش شاہ حمزہ علی جوان خوش رو بود۔ مدّتے
علی نقی خاں انتظار تخلص و محمد تقی خاں پسران
علی اکبر خاں مینگباشی مرحوم در زمرۂ سپاہیان معاش
کردہ بعدیں لباس برآمدہ آخر بہ جذبۂ باطن ترکِ
علائق ظاہر نمودہ در مرشد آباد سر و پا برہنہ با لنگ و
گلیم می گشت و در مجمع و معرکہ حاضر شدہ بر زمین پاک
پایش می نشست و اشعار می خواند و زار زار می گریست
راقم آثم را کہ بران آزادہ حال نظر افتادہ۔ خالی از
حالتے و استغنا منے نبود۔ الحال کہ سال یک ہزار و یک
صد و نود و چہار ہجری است شنیدہ شدہ نہایت دارگی
در عظیم آباد بر دھنہ شاہ ارزانی و بنگال در درویشان
دیگر با تعیین زندگانی می کند۔"

(ورق ۷۹ ب۔ ۸۰ الف)

زکی دہلوی :۔ "جعفر علی خاں ابن مرزا مومن بیگ بر منصب سہ ہزاری
از منصب داران محمد شاہ مرحوم سرفراز بود و در

بقربان نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم امتیاز داشت
گویند بر راجہ رام سوائی عاشق بود آخر حالی بعد انتقال
نواب امیر خاں مرحوم بناکامی گذرانیدہ ازیں جہاں
گذشت۔" (ورق ۸۹ ب)

موزوں عظیم آبادی: "مشہور و موسوم بہ مہاراجہ رام نراین از جانب حکام
بنگالہ نائب صوبہ عظیم آباد بود و نسبت شاگردی بہ جناب
شیخ محمد علی حزیں داشت۔ اشعار فارسی می گفت و نثر
را رنگین می نوشت بہ عہد دولت نواب عالی جاہ میر
محمد قاسم خاں مرحوم مورد تقصیر شدہ معزول و در گنگا
غرق گردید۔ گاہے ریختہ می گفت۔" (ورق ۸۴ ب)

یہ تعارف نامکمل اور تشنہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے واسطے سے
بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کے ذکر سے دوسرے تذکرے خالی
ہیں۔ خلیل نے جن شاعروں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے ان کے بارے میں
بالعموم اسی قسم کی معلومات فراہم کی ہیں۔ ولدیت، وطن، جائے سکونت اور سلسلہ
معاش وغیرہ سے متعلق ان کی صراحتیں اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہیں علاوہ
ازیں اکثر و بیشتر شعرا کے ذکر میں تذکرے میں ان کے حالات کی شمولیت کا زمانہ
اور دوسرے اہم واقعات کے سنین متعین کر کے انھوں نے ایک ایسا قابل قدر
کارنامہ انجام دیا ہے جس سے تاریخ ادب کے طالب علموں اور وادیٔ تحقیق
کے رہ نوردوں کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کوہ کنی و خارا شگافی کے
مراحل طے کرنے میں مدد بھی ملتی ہے اور حوصلہ بھی۔ اگرچہ اس سلسلے میں ڈاکٹر
زور کا یہ ارشاد کہ "علی ابراہیم اردو کے واحد تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے تذکروں کی

کے حالات اور ان کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں"[1]
اس بنا پر نا قابلِ قبول ہے کہ گلزار ابراہیم کے منظرِ عام پر آنے سے قبل شفیق
اورنگ آبادی، شورش عظیم آبادی اور راز اللہ آبادی اپنے تذکروں کے
ذریعہ اس حسنِ التزام کی روایت قائم کر چکے تھے تاہم علی ابراہیم کی مساعیٔ جمیلہ
کا اعتراف ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کی نمایندگی کے لئے تذکرے
کے مختلف اوراق سے کچھ مثالیں سپردِ قلم کی جاتی ہیں۔

میر آفاقی :۔ "در عین تحریر ۱۱۸۰ھ بیہوش گشتہ بروضۂ رضوان
خرامید" (ورق ۱۱ الف)

اشرف علی خاں فغاں :۔ "در سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و شش
ہجری رحلت نمودہ در عظیم آباد مدفون شد"۔
(ورق ۱۵ اب)

میر ضاحک دہلوی۔ "الحال کہ ۱۱۹۶ ہجری باشد۔ شنیدہ شد در
فیض آباد بہ آوارگی می گزراند" (ورق ۱۴۶ الف)

فیض، فرزند میر۔ "بہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری
اشعارش در بلدۂ بنارس از لکھنؤ طلبیدہ تحریر شد"۔
(ورق ۶۰ اب)

قائم چاندپوری۔ "الحال کہ سال یک ہزار و یک صد نود و چہار
ہجریست در ناحیہ موطن خویش بسر می بود"۔
(ورق ۱۶۱ الف)

میر تقی میر۔ "ہنگام تحریر کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و

[1] دیباچہ گلزار ابراہیم ص ۳۲

ششش ہجریست شنیدہ شد کہ در شاہجہاں آباد بدلالت

استقامت دارد" (ورق ۹۷ ب)

مبتین بدایونی :- "الحال کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش

ہجریست شنیدہ شد در لکھنؤ بسر می برد" (ورق ۱۹۳)

میر قمر الدین منت :- "الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و شش

ہجریست با ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر بسر می بود"

(ورق ۱۹۶ ب)

یہ بیانات بظاہر سرسری معلوم ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ جب ایسے ہی کسی بیان کے سہارے ہمیں کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کی جامعیت و معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۱ء) میں میر کے دہلی میں قیام اور فیض کے اشعار لکھنؤ سے طلب کرنے کے بارے میں مندرجہ بالا اطلاعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فیض اپنے والد (میر صاحب) سے پہلے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ اس دریافت کے بعد (۱۱۹۷ھ/۸۳-۱۷۸۲ء) میں میر صاحب کے لکھنؤ پہنچکر سرائے میں ٹھہرنے کے متعلق آب حیات کی روایت محل نظر قرار پاتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ باہمی تعلقات میں خرابی کا کوئی ثبوت موجود نہیں، باپ کا ایک اجنبی شہر میں بیٹے کے گھر کے بجائے کسی دوسری جگہ قیام کرنا فطری و جبلی اور اخلاقی و انسانی تقاضوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح میر غلام حسین ضاحک کے متعلق جن کے صحیح سنین ولادت و وفات اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ یہ اطلاع کہ ۱۱۹۶ (۸۲-۱۷۸۱ء) میں بمقام فیض آباد آزادانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس سال تک ان کے بقید حیات ہونے

کا پتہ دیتی ہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے میر حسن کی قیام گاہ پر تعزیت کی غرض سے سودا (متوفی ۱۱۹۵/ ۱۷۸۱ء) کی حاضری اور دوسرے واقعات کے بارے میں پروفیسر آزاد کے بیانات کی تردید کرتی ہے۔

خلیل جس زمانے میں گلزار ابراہیم کی ترتیب میں مصروف تھے اس وقت ایک عرصہ دراز سے تمام ملک اور خصوصاً شمالی ہندوستان بری طرح انتشار و بدامنی کی آگ میں جل رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں نے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اقتصادی زبوں حالی اور سیاسی و سماجی بے اطمینانی کی ایک عام فضا پیدا کر کے ارباب کمال کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا چنانچہ اہلِ علم اور اہلِ ہنر منتجیان روزگار کے اس مامن سے برسوں پرانے روابط توڑ کر نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں مصروف و سرگرداں تھے۔ خلیل نے کہیں کہیں ترکِ وطن اور غربت نصیبی کے ان واقعات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں مثلاً

صاحب میر الکم :- "الحال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجریست، وارد مرشد آباد شدہ از دوستی راجہ دولت رام قیام دارند" (ورق ۹ ب)

اشرف علی خاں فغاں :- "از دہلی پیش عم خویش موسوم بہ محمد ایرج خاں وارد مرشد آباد شدہ باز بدہلی رفت و بعدِ چند سال مراجعت کردہ در عظیم آباد برفاقت مہاراجہ شتاب رائے اقامت ورزید مشارٌ الیہ کوکۂ احمد شاہ بادشاہ بود" (ورق ۱۵۱ ب)

غلام علی حیدر دہلوی :- "بہ سبب برہمیٔ اطوار روزگار ترکِ وطن قدیم

ساختہ طرح، اقامت در عظیم آباد انداختہ۔"

(ورق ۴۵ ب)

میر شاہ علی خاں دہلوی:۔ "پریشان حال وارد مرشد آباد گشتہ با حصول مراد مدتے بہ شادمانی گذرانید و بعدِ انقراض دولت نواب سراج الدولہ آوارۂ از مرشد آباد شدہ بہ سمت لکھنؤ افتاد و بہ عہدِ دولتِ نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں بعظیم آباد آمدہ در زمرۂ ملازمان نواب مذکور انسلاک یافت و از انجا بدکھن رفتہ"۔ (ورق ۱۴۰ ب)

حسن رضا نجات دہلوی:۔ "بعدِ ویرانیٔ شاہجہاں آباد کہ بردست احمد شاہ درانی اتفاق افتادہ، واردِ عظیم آباد گردیدہ"۔

(ورق ۲۹۹ ب)

حالات زندگی کے ضمن میں اگرچہ خلیل نے سیرت و شخصیت کے متعلق بہت کم اظہار رائے کیا ہے پھر بھی بعض جگہ ان کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں جنکی روشنی میں زیر بحث شعرا کے اخلاق و عادات لیاقت و صلاحیت اور مخصوص رجحانات و میلانات کے بارے میں ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے ذاتی جملوں سے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر رائے زنی، افراط و تفریط سے احتراز اور صداقت و صاف گوئی کی جھلک نمایاں ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

میر اثر دہلوی:۔ "دانائے علم تصوف و ماہر فن شعر است برویۂ اسلاف تفرد از دا اختیار کردہ از براز بر خویش اکتساب کمالی می نماید"۔ (ورق ۸ ب)

احسن اللہ احسن:۔ "بہ وارستگی و حسن پرستی اتصاف داشت"۔ (ورق ۶ ب)

میر ضاحک :- "در ہزالی و بذلہ گوئی اقتدار و در فہم موسیقی مناسبتے دارد۔" (ورق ۱۴۶)

عزت سورتی :- "باوصف فضیلت اطوار و اقوالش خالی از سبکی و ہزالی نبود۔" (ورق ۶۳ ب)

نواب اسد اللہ غالب دہلوی :- "در فتوت و مروت یگانۂ دہر و در اخلاق و استقامت ممتاز عصر اند۔" (ورق ۱۵۱ الف)

قدر دہلوی :- "از دامِ ننگ و نام رستہ دل بہ اوباشی و بلے قدری بستہ بود۔" (ورق ۶۴ ب)

مرزا مظہر جانجاناں :- "در حسن بیان و انداز گفتگو نادرۂ زمان خود بود۔ .... در قناعت و استقامت طبع و است و بہ عادت علم شہرت و بحسن پرستی رغبت تمام داشت۔" (ورق ۸۴ ب)

میر قمر الدین منت :- "طبعش مائل۔ بہ عشق افتادہ رغبتے وافر بحسن صوت و حسن صورت دارد۔" (ورق ۱۹۶ ب)

جن لوگوں کے سرمایۂ تخلیقات میں غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف سخن کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، ان کے حالات میں خلیل نے اس کے تذکرے کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بیانات ایک طرف تو مختلف اصناف کی ارتقائی تاریخ کو مرتب کرنے میں مفید و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور دوسری جانب ڈاکٹر زور کے الفاظ میں ان کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "سنہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) سے قبل شمال میں اُردو شاعری کہاں تک ترقی حاصل کر چکی تھی اس میں کون کون سی اصنافِ شاعری کس

حد تک رائج تھیں اور شاعروں کا خزانہ کہاں تک وسیع ہو گیا تھا[1]" زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں صرف چند مرثیہ گو شاعروں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

آتش دہلوی :- " از مشاہیر مرثیہ گویانِ دہلی است"۔ (ورق ۱۶ الف)

اسدیار خاں انسان :- " بیشتر بہ مرثیہ گفتن رغبت داشت"۔ (ورق ۶ ب)

میر محمد علی صبر فیض آبادی۔ " بیشتر مرثیہ می گفت" (ورق ۴۲ ب)

علی قلی ندیم دہلوی۔ " مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام اکثر می گفت" (ورق ۲۹۷ ب)

حسن رضا نجات دہلوی :- " مرثیہ سید الشہدا بیشتر و ... دیگر اقسام نظم را کمتر می گوید۔ بریں جہت فکرش مرتبہ تمامی حاصل نہ کردہ"۔ (ورق ۲۹۸ ب)

مرزا اسحاق وصل لکھنوی :- " اکثر مرثیہ می گوید گاہے بہ غزل ریختہ می پردازد"۔ (ورق ۳۰۲ ب)

میر محمد اعظم ہویدا دہلوی :- " اکثر مرثیۂ امام حسین علیہ السلام می گوید بسبب ذوقشی کمتر فکر ریختہ می کند" (ورق ۳۰۵ ب)

نجات اور ہویدا کے بارے میں مندرجہ بالا بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں مرثیہ گوئی اردو شاعری کی تاریخ میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہ کر پائی تھی۔ اس صنف میں طبع آزمائی کو خامکاری اور عجز طبیعت کی دلیل سمجھا جاتا تھا اور قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے لئے غزل اور دوسری

---

[1] دیباچہ گلزار ابراہیم صفحہ ۳۹

فکر آزما اصنافِ سخن میں مظاہرۂ کمال ضروری تھا۔ یہی وہ تصور تھا جس کی بنیاد پر مرثیہ نگار بگڑے ہوئے شاعروں کے زمرے میں شمار کیے جاتے تھے اور جس نے مولف کو مرثیے کے اشعار شاملِ انتخاب کرنے سے باز رکھا جبکہ غزلیات کے پہلو بہ پہلو رباعیات اور قصاید کے اقتباسات بکثرت نقل کیے گئے ہیں۔

اب تک "گلزارِ ابراہیم" کے جن پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے، انکی روشنی میں خلیل ایک ایسے تذکرہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جو اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل میں پوری طرح سرگرم رہے ہیں جنھوں نے اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اس کے برخلاف تنقیدِ شعر و ادب کے میدان میں ان کی کوششیں نسبتاً محدود اور مایوس کن ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دیدہ وری و ژرف نگاہی کے ان اوصاف سے محروم تھے جو ایک ناقد کے لئے بدرجۂ اولیٰ ناگزیر ہیں یا انھیں معاصرین و متقدمین کے کلام پر حسبِ ضرورت عبور حاصل نہ تھا البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں بخل سے کام لیا ہے۔ یہ بخل ایجاز و اختصار کی اس فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ جو تذکرے کے ایک بڑے حصے پر محیط ہے عام صورتِ حال کی اس وضاحت کے بعد خلیل کے بعض ایسے بیانات نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں کسی حد تک تنقید کا عنصر موجود ہے اور جن کی وجہ سے اس اندازِ نظر کا احاطہ کیا جا سکتا ہے جو پوری طرح بروئے کار نہ آ سکا۔ ملاحظہ ہوں۔

سید فضائل علی جیقیدہ :- مثنوی بزبانِ قدما در بیانِ عشق خود بایکے

از ادبا بیطرب گفته ابلے نمک واقع است"

(ورق ۱۹ ب)

جوشش عظیم آبادی:- "از کلامش ظاہر می توان گفت که خواجه شیوۂ میر درد را بخوبی ورزیده۔ فقیر را سلوک بیان ایشان نهایت مرغوب و پسندیده است" (ورق ۲۳ ب)

حیدر دہلوی:- "خوشفکر است اما طرز گفتارش روانی دارد" (ورق ۲۷ ب)

جعفر علی خاں زکی:- "طبعش در فکر ریخته رسا۔ نظم کلامش بطرز قدما است۔ مثنوی او که اکثر رعایت ایہام کرده شہرت تمام دارد" (ورق ۹۸ ب)

سجاد اکبر آبادی:- "ایہام در کلامش بسیار است" (ورق ۳۸ ب)

سکندر مرثیہ گو:- "در مرثیہ گفتن کمالِ اقتدار و سلیقہ درست دارد ۔۔۔۔۔ اگرچہ استعداد علمی ندارد اما مرثیہ او مقبولِ خاص و عام است" (ورق ۴۰ ب)

میر محمدی شرف:- "در ریختہ گوئی متتبع طرز نازک خیالان است" (ورق ۴۳ الف)

علی نقی کافر:- "آں قدر مایہ سخنوری نداشت کہ تعریفش توان نگاشت" (نسخہ مطبوعہ ص ۲۰۷)

بعض شاعروں کے کلام پر اس روشِ عام سے ہٹ کر کسی قدر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے لیکن اول تو ایسے شاعروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں خلیل سے قبل

دوسرے تذکرہ نگار بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس لئے بنظر اختصار صرف سودا اور میر کے حالات سے دو اقتباس بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ۔

سودا :۔ "تشبیہات تازہ و مضامین غریب و معنی بیگانہ۔۔۔۔۔۔۔ در دیوانش بسیار است و در جمیع اقسام نظم خاصہ قصائد داد تلاش معنوی دادہ از میان اقرانِ خود تازہ گوئی را در طاقِ بلند سے نہادہ کہ دستِ دیگراں بہ آن نمی رسد۔ آتش را بہ گرمی زبانش از ہجوم شرار جوشِ قطراتِ عرق انفعال است و آب را از شرم طبع روانش بہ خاک فرو رفتن در خیال۔ از انجا کہ رتبۂ معانی شاعر مذکور بس بلند افتادہ است تلفظ بہ محاوراتِ ہندی قدر و شانِ آن را پست ساختہ چہ نزد جمہور مقرر است کہ تار پودِ الفاظ معانی را بمنزلہ لباس و پیرایہ است" (ورق ۹۱ ب)

میر :۔ "درستی سلیقہ نظم و استقامتِ ذہن و صافیٔ فکر از کلامش ظاہر است۔۔۔۔۔۔ میر مذکور را با ریختہ گویانِ اقرانِ خود فرقِ بعید درمیان است۔۔۔۔۔۔ سحر کاریٔ سخن در طلسم سازیٔ خیالِ و جادو طرازیٔ بیان در شیوۂ مقال او دست اگرچہ در ہمہ اقسام نظم ناطقہ ساز است لیکن بہ اتفاق او استادان نغمہ دیگر بہ آہنگ غزل ہایش سامعہ نواز نیست"۔ (ورق ۶۹ ب)

ان سرسری اور وضاحت طلب اشاروں کی بنیاد پر اگر خلیل کو ناقدین شعر و ادب کے درمیان کوئی نمایاں مقام نہیں دیا جا سکتا تو انھیں اس صف سے خارج کر دینا بھی ناممکن ہے۔ کم سے کم اتنا ضرور ہے کہ

انھوں نے بے بنیاد اور بعید از کار لفاظی و عبارت آرائی سے اجتناب کر کے تذکرے کو غیر ضروری اور لایعنی طوالت سے محفوظ رکھا ہے۔

بنیادی مباحث و مسائل کے اس جائزے کے بعد "گلزارِ ابراہیم" کے بعض ایسے ضمنی و ذیلی اندراجات کی طرف نظر جاتی ہے جو اہم بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان میں میر حسن اور میر سوز کے خطوط کے وہ اقتباسات بھی شامل ہیں جو ان لوگوں کے حالات میں نقل ہوئے ہیں۔ یہ خطوط حالات اور کلام کی فراہمی کے متعلق مولف کی درخواست کے جواب میں لکھنؤ سے لکھے گئے تھے۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ۔

"از سائر اقسام اشعار ابیاتِ مدونۂ من قریب ہزار بیت است و تذکرہ در ریختہ نوشتہ و اصلاحِ سخن از میر ضیا گرفتہ ام و بد تبیت از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و خلفِ ایشان الملقب بہ مرزا نوازش علی خاں سردار جنگ می گذرانم"۔ (ورق ۷۶ الف)

اس تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن ۱۱۹۶ھ/ ۸۲-۱۷۸۱ء کے قریب تک مختلف اصناف میں تقریباً آٹھ ہزار اشعار کہہ چکے تھے اور انھوں نے اپنے کلام پر صرف میر ضیا سے اصلاح لی تھی۔ اس طرح یہ خط سودا سے استفادے کے متعلق تحریرِ شیفتہ، مصحفی، قاسم، ذکا اور شمس العلماء آزاد وغیرہ کے بیانات کی تردید میں "تذکرۂ شعرائے اردو" کے بعد دوسری معتبر شہادت فراہم کرتا ہے۔ میر سوز کی تحریر ان کی شخصیت کے ایک اہم رُخ کو بے نقاب کرتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

"میر سوز شخصے است کہ ہیچ کس را از وحلاوتِ جز سکوت داکرام حاصل نہ شود ایں نیز از قدرتِ کمالِ الٰہی است کہ ہر کیسے بلکہ خار و

شخصے نیست کہ بکارِ چند نیاید پس اگر منکر سوال کند کہ ناکارۂ محض نیفتادہ است ایں است کہ ناشش سوختنی ہست!"

(ورق ۲۲ الف)

دلی کی وطنیت اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ خلیل اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو انھیں گجراتی الاصل اور گجرات کو دکن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ ولی دکنی کے نام سے ابتدائی تعارف کے بعد رقم طراز ہیں کہ:

"اصلش گجرات در شعرائے دکن مشہور و ممتاز است ......
اول کسے است کہ دیوانش در دکن مشتہر و مدون گشتہ"

(نسخہ مطبوعہ ص ۲۴۶)

مرزا مظہر جانجاناں کے حال میں ان کے سانحۂ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بہ سبب تعصب مذہب منع تعزیہ سید الشہدا علیہ السلام می نمود بدیں جہت بر دست یکے از ساکنانِ دہلی در سنہ یک ہزار و یک صد و دو و چہار ہجری کہ عمرش قریب بصد رسیدہ بود مقتول شد!"

(ورق ۸۴ اب)

اس بیان کو پیش نظر رکھ کر مولف کے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک قرینِ صحت رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ مرزا صاحب کے زمانۂ شہادت کے متعلق منقولۂ بالا اطلاع صحیح نہیں۔ یہ حادثہ ۱۱۹۴ھ کے بجائے محرم ۱۱۹۵ھ کے عشرۂ اول میں پیش آیا تھا، جیسا کہ مشہور مادۂ تاریخ "عاش حمیداً مات شہیداً" اور مصحفی کے درج ذیل شعر

سے ظاہر ہے۔

شب ہفتم ماہ عاشورہ بود آں۔ کہ از خون شد شش سرزمین کربلائی۔

اس تذکرے کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے زمانے کی ایک ایسی وقیع ادبی دستاویز ہے جس کے اوراق بارہویں ہجری صدی کے اختتام تک مشرقی ہندوستان میں اردو شاعری کی مقبولیت اور ترقی کی مکمل داستان اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں اسی لئے زور صاحب نے اسے پہلی بار منظر عام پر لاتے ہوئے فرمایا تھا کہ "عظیم آباد اور مرشد آباد کے علم و فضل اور شعر و سخن پر جو کچھ بھی آئندہ لکھا جائے گا اس کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکے گی جب تک گلزار ابراہیم کے مواد سے مدد نہ لی جائے[1]۔ دور جدید کی کئی تحقیقی تصانیف اور ادبی تاریخوں نے اس پیش گوئی کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ انھیں متنوع محاسن کی موجودگی خلیل کی اس قابل قدر کوشش کو نقش دوام کی حیثیت عطا کرتی ہے۔

۱۔ دیباچہ گلزار ابراہیم ص ۱۲

گلشن سخن

گلشن سخن مرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی کی تالیف ہے اس تذکرے کو پہلی بار پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے ماہنامہ "ہمایوں" لاہور کے دسمبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں ایک مضمون کے ذریعے روشناس کرایا تھا اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں موصوف ہی کی ترتیب و تصحیح اور مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ کی جانب سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ یہ اشاعت دو قلمی نسخوں پر مبنی ہے جن میں سے ایک رضوی صاحب کے ذاتی کتب خانے میں اور دوسرا رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے پہلا نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ یہ میر آثر کے انتخاب کلام سے شروع ہو کر میر حمایت علی مجنوں کے اشعار پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا مخطوطہ بظاہر مکمل ہوتے ہوئے بھی اس اعتبار سے ناقص ہے کہ اس کے کاتب نے کتاب کے ثلث آخر میں بڑی آزادی اور بیباکی کے ساتھ جا بجا تحریف کرکے مولف کی اصل عبارات کو ممکن حد تک مختصر کر دیا ہے چنانچہ اس نسخے میں قائم چاندپوری، میر تقی میر، مرزا مظہر جانجاناں اور مصحفی جیسے نامور شعرا کے تراجم صرف نام اور تخلص یا ایک ایک جملے تک محدود ہیں جبکہ رضوی صاحب کے نسخے میں ان میں سے بعض لوگوں کے متعلق کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس صورتحال کی بنا پر رضوی صاحب کے نسخے سے غیر حاضر آخری اسی (۸۰) شاعروں سے متعلق تذکرے کا متن استناد و اعتبار کے لحاظ سے مشکوک ہو گیا ہے

تذکرے کے مولف میرزا کاظم مبتلا کو بقول خود شعر و ادب اور تصنیف و تالیف کے کام سے گہری دل چسپی تھی "گلشن سخن" کی تالیف سے قبل وہ اپنے کلام فارسی کا ایک انتخاب اور شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ "گلدستہ معانی" مرتب کر چکے تھے۔ زیر بحث تذکرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

"مولف از آغاز شباب .... اوقات گرامی خود را .. بگفتن و خواندن کلام فارسی .. صرف نمودہ، ہنگامیکہ سنین عمر از بست تجاوز کردہ، نوبادہ ہائے معنے از گلزار فکر چیدہ دیوان منظم ساخت وہم دراں ایام تذکرہ مسمیٰ بہ "گلدستہ معانی" کہ مشتمل بر انتخاب اشعار فارسی سخن پردازان قدیم و جدید و اختصار احوال آنہاست ترتیب دادہ معہذا اکنوں چناں بخاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویان سابق و حال کہ دریں زمانہ کمال اشتہار در قلمرو ہندوستان دارند۔ .. صحیفہ جمع نماید تا از مطالعہ آں شیفتگان محبوبانِ معانی حظِ وافر بردارند۔ الحمد لواہب العطایا کہ در اندک زماں کامیاب گردیدہ و بمقصد رسیدہ۔ چوں عقدہ خاطر را بناخن حسن انجام تالیف کشود، مسمیٰ بہ "گلشن سخن" نمود۔"

(ص ۴۹ : ۵۰)

اس عبارت کے فوراً بعد مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ درج ہے جس کے آخری مصرعے سے اس تذکرے کا سال ترتیب (۱۱۹۴ھ) برآمد ہوتا ہے۔

آب و رنگ اس کا ہی یوں باغ ارم | نہیں اس کے متقابل گلشن
سال تاریخ میں پوچھا ان سے | جو تھے اس فن کے سخن سنج کہن

سب لگے کہنے کہ اک عمر کے بعد   آج پھولا ہے سخن کا گلشن

اس قطعے کے علاوہ تذکرے کے دوسرے متعدد اندراجات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مبتلا (۱۱۹۴ھ۔ ۱۷۸۰ء) کے دوران اسکی ترتیب میں مصروف تھے۔ مندرجہ ذیل مثالوں میں "تاحال"، "الحال"، "تا... این زمان" اور "تا حالت تحریر" کے ساتھ ۱۱۹۴ھ کے حوالے اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) مرزا جعفر علی حسرت :۔ "تا حال کہ ۱۱۹۴ ہجری نبوی است، در قید حیات است" (ص ۱۱۳)

(۲) میر حمزہ علی زند :۔ "الحال کہ سنہ یکہزار و یک صد و نو دو... چار است، در عظیم آباد بوارستگی... زندگی می کند" (ص ۱۳۲)

(۳) شاہ رکن الدین عشق :۔ "تا این زمان کہ سال ہزار و یکصد و نود و چہار ہجری است... بشغل وجد و حال اکثر می باشد" (ص ۱۷۴)

(۴) میر تقی میر :۔ "در شاہجہان آباد تا حالت تحریر این گلشن سخن کہ سنہ یکہزار و یکصد و نود و چہار ہجری است، بہ سلامت استقامت دارد" (ص ۲۰۵)

عرشی صاحب نے "دستور الفصاحت" کے مقدمے میں اسی قسم کے مسلسل بیانات کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے کہ مبتلا سال مذکور کے اندر ہی کار تالیف سے فارغ ہو گئے تھے[۱]۔ رضوی صاحب نے بھی اپنے

---

[۱] دیباچہ دستور الفصاحت، ص ۴۳

مقدمے میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسی خیال سے اتفاق کیا ہے۔ چنانچہ عرشی صاحب کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ تذکرہ تین سو اکیس (۳۲۱) شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب اشعار پر مشتمل ہے[1]۔ اتنے شاعروں کے حالات، خواہ مختصر ہی سہی فراہم کرنے اور ان کے کئی ہزار اشعار منتخب کرنے میں ایک سال سے زیادہ صرف ہوا ہوگا مواد فراہم کرنے کے بعد اس کو مرتب کرنا ایک سال کے اندر ممکن ہے۔ گمان غالب ہے کہ ۱۱۹۵ھ مواد کی فراہمی کا نہیں اس کی ترتیب کا سال ہے" (ص ۱۶)

قطع نظر اس سے کہ رضوی صاحب کی یہ تاویل مبتلا کے اس واضح بیان کے بعد کہ "در اندک زماں کامیاب گردیدہ و بمقصد رسیدہ" بالکل بے معنی ہو جاتی ہے تذکرے کے بعض اندراجات اس سے بالکل مختلف صورت حال کا پتہ دیتے ہیں اور ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں نہیں بلکہ اس کے بعد لکھا گیا ہے۔ مثلاً

---

[1] رضوی صاحب کی مرتب کردہ اس ۳۲۱ رکنی فہرست میں تحسین کا نام زاید ہے جس کا متن میں ذکر نہیں اور میر عبداللہ کا نام غلطی سے دو جگہ لکھا گیا ہے اس کے علاوہ میر محمد باقر کا ذکر حزیں اور ظہیر تخلص کے تحت پاکباز کا ترجمہ شاہ بھکھو اور میر صلاح الدین کے نام سے اور تموز کا حال میر سید محمد تموز اور خواجہ محمد میر تیر کے زیر عنوان مکرر شامل تذکرہ کیا گیا ہے۔ نور خاں آگاہ کا ترجمہ آگاہ کے تعارف اور الف خاں افغان کے نمونہ کلام کا مجموعہ ہے میر محمدی مائل کے بعد میر ہدایت علی مائل کا تعارف قلم انداز ہو گیا ہے لیکن انکے پانچ اشعار اول الذکر مائل کے دو شعروں کے فوراً بعد شامل تذکرہ ہیں۔ یک چند بہار کے انتخاب کلام میں آخری دو شعر دلاور خاں بیرنگ کے ہیں۔ یہاں بھی سہو کتابت کے نتیجے میں بیرنگ کا تعارف قلم انداز ہو گیا ہے انھیں بیرنگ کا ذکر آگے چل کر نیرنگ تخلص کے تحت کیا گیا ہے جو درست نہیں ان مکررات و متروکات کو نظر میں رکھتے ہوئے شعرا کی صحیح تعداد ۳۱۸ قرار پاتی ہے۔

(۱) مرزا مظہر جانجاناں کے ذکر میں جن کی شہادت قطعی طور پر محرم ۱۱۹۵ھ (جنوری ۱۷۸۱ء) کا واقعہ ہے لکھتے ہیں۔

"قبل ازیں مسموع شد کہ یکے از ساکنان دہلی وے را کشت بسزائے کردارش رسانید" (ص ۲۱۹)

(۲) صاحب بیر آلم کے متعلق جن کے بارے میں صاحب "گلزار ابراہیم" کا بیان ہے کہ "الحال کہ سنہ یکہزار و یکصد و نود و چہار است، وارد مرشد آباد شدہ از دوستی راجہ دولت رام قیام دارند" مبتلا لکھتے ہیں کہ

"از چند سال در مرشد آباد بہ سبب دوستی راجہ دولت رام استقامت دارد" (ص ۶۳)

(۳) صاحب مسرت افزا کے مطابق شورش کا انتقال عشرہ اولیٰ ماہ شعبان ۱۱۹۵ھ (جولائی اگست ۱۷۸۱ء) میں ہوا ہے[۱]۔ مبتلا ان کا ذکر صیغۂ ماضی (بود) کے تحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خواہرزادۂ ملا وحید و شاگرد میر باقر حزیں ظہور تخلص می کرد بود" (ص ۱۶۰)

۱۱۹۴ھ کے بعد ان واقعات کی موجودگی کے باوجود جا بجا سال رواں کے طور پر صرف ۱۱۹۴ھ کا تذکرہ اور اس سے قبل یا بعد کے کسی سنہ کے حوالوں کا فقدان اخفائے حال کی اس سوچی سمجھی کوشش کا غماز ہے جو قارئین کو تذکرے کے اصل ماخذ کی طرف سے بے توجہ رکھنے کے لیے کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تذکرہ "گلزار ابراہیم" کا نہایت ہوشیاری اور سارقانہ مہارت کے ساتھ تیار کیا ہوا چربہ ہے۔ ۱۱۹۴ھ

---

[۱] مسرت افزا ص ۱۱۶

کے حوالے خاص طور پر اس لیے دیئے گئے ہیں کہ "گلزار ابراہیم" اس زمانے میں ترتیب و تسوید کے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کے مولف علی ابراہیم خاں مرشد آباد میں مقیم تھے جبکہ مبتلا کا قیام بنارس میں تھا۔ صاحب "مسرت افزا" کے بیان کے مطابق اس کے اگلے سال یعنی ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء میں علی ابراہیم بنارس آچکے تھے، اور ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء میں "گلزار ابراہیم" کی تکمیل کے وقت علی ابراہیم اور مبتلا دونوں بیک وقت بنارس میں موجود تھے۔ مبتلا نے خود کو سرقے کے الزام سے محفوظ رکھنے کے لیے نہ صرف سنین کے غلط حوالے دے کر "گلزار ابراہیم" پر اپنے تذکرے کا تقدم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے اس کے مولف کے وجود کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ان کے روشناس خلق ہونے کا ثبوت خود اس تذکرے کے اوراق میں خادم حسین خادم کے حالات (ص ۱۱۸) میں موجود ہے جنھیں "از منصبداران و عم زادگان علی ابراہیم خاں" کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف "گلزار ابراہیم" کے ایک نسخے میں جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مبتلا کا ترجمہ ان الفاظ میں موجود ہے[1]:

"مبتلا تخلص موسوم بہ مردان علی خاں خلف نواب محمد علی خاں ہندوستانی، از اصل اجداد و حوالی مقدار شہد مقدس است نواب مذکور در سرکار نواب برہان الملک مغفور نواب وزیر الممالک صفدر جنگ میر و اقتدار بسیار داشت۔ اما مبتلائے مذکور

[1] اس اقتباس کے لیے میں جناب مشفق خواجہ کا ممنون ہوں جنھوں نے اسے سہ ماہی اردو کراچی شمارہ جولائی ۱۹۶۷ء میں "گلشن سخن" پر اپنے تبصرے میں نقل کیا ہے۔

بعد انقلاب روزگار در بنارس سکنی اختیار نمود۔ الحال کہ سال یکہزار و یکصد و نود و ہشت ہجریست اجانمودار (بانزدہ) بسر می برد متانت و لطافت و حسن سلیقہ انصاف دارد۔"

"گلزار ابراہیم" اور "گلشن سخن" میں سے کسی ایک کے مولف نے دوسرے کی معلومات سے سرقے کی حد تک استفادہ کیا ہے' یہ بات دونوں تذکروں کے سرسری تقابلی مطالعے ہی سے سامنے آجاتی ہے۔ بظاہر اس کا مرتکب علی ابراہیم کو قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کا "تذکرہ" گلشن سخن کے بلبیہ سال ترتیب (۱۱۶۵ھ) سے چار برس بعد ۱۱۹۸ھ میں مرتب ہوا ہے لیکن حقیقت حال جو اس کے برخلاف ہے۔ مندرجہ ذیل شواہد سے ظاہر ہوتی ہے۔

(۱) شاہ اجمل اور مرزا الف بیگ فرحت نے الہ آباد سے اور شاہ احمد وارث احمدی' نے زمانیہ ضلع غازی پور سے ۱۱۹۶ھ (۸۲-۱۷۸۲ء) میں اپنا منتخب کلام تذکرے میں شامل کرنے کے لیے بھیجا تھا، مبتلا نے ان تینوں شاعروں کے انتخاب کلام میں جو اشعار نقل کیے ہیں وہ انھیں انتخابات سے ماخوذ ہیں۔

(۲) مرزا کاظم علی جوان، مرزا جعفر علی حسرت، میر حسن، موتی لال حیقت میر قدرت اللہ رخصت، میر فیض علی فیض، صاحب رائے فریاد، مرزا احمد بیگ قناعت، نواب محبت خاں محبت، شاہ مجنوں اور مرزا اسحاق وصل کے تراجم میں علی ابراہیم نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کا کلام ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ سے طلب کرکے شامل تذکرہ کیا جا رہا ہے، "گلشن سخن" میں ان شعرا کے انتخابات میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو گلزار ابراہیم میں موجود نہ ہو۔

(۳) مرزا جہاندار شاہ جواں بخت سے علی ابراہیم نے اولاً ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء

میں لکھنؤ میں ملاقات کی تھی۔ اسکے بعد اسی سال کے آخر میں جب وہ بنارس میں وارد ہوئے تو اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اندازہ یہ ہے کہ "گلزار ابراہیم" میں ان کے جو اشعار منقول ہیں، وہ انھیں ملاقاتوں میں سنے گئے ہوں گے۔ مبتلا نے انھیں میں سے چار شعر اپنے یہاں نقل کیے ہیں۔

(۴) مرزا ظہور علی خلیق کے بارے میں علی ابراہیم کا بیان ہے کہ۔

"اسمش مرزا ظہور علی خلف مرزا ہوشدار۔ در موسیقی ہندی و مرثیہ خواندن بغایت مہارت دارد۔۔ ۔۔ ۔۔ از عہد محمد شاہ۔ حسب الطلب نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ وارد مرشد آباد درآں بلدہ سکنی اختیار کردہ۔ تاحال کہ ۱۱۹۹ھ ہجریہ باشد، در سرکار نظامت بنگالہ منسلک و باراقم آشناست" نسخہ رام پور ورق ۵۵ ب ر ۵۶ الف)

مبتلا نے یہی معلومات اس طرح اپنے تذکرے میں منتقل کی ہے۔

"نامش مرزا ظہور علی خلف مرزا ہوشدار۔ در علم موسیقی و مرثیہ خواندن دستگاہ تمام دارد۔ در عہد محمد شاہ مغفور حسب الطلب شہامت جنگ وارد بنگالہ شدہ بالفعل در سرکار نظامت مرشد آباد منسلک" (ص ۱۱۷)

(۵) راجس محرم کے بارے میں علی ابراہیم لکھتے ہیں کہ

"از برشتگان سموم عشق و منسلکان سرکار ممتاز الدولہ مسٹر جانسن بہادر است در یکہزار و یکصد و نود و نہ ہجری باراقم آثم در بنارس ملاقی شدہ اشعار خود را بیادگار آوردتا در تذکرہ اثبات یابد" (نسخہ مطبوعہ ص ۴۰۲)

مبتلا نے علی ابراہیم کے بیان کے آخری حصے کو جس کا تعلق زمانۂ تحریر کے تعین سے ہے، نظر انداز کر کے ابتدائی ایک جملہ الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ اس طرح اپنے یہاں نقل کر لیا ہے۔

"از منسلکان مستر جانسین و جگر سوختگان آتش عشق است..."

(ص ۲۳۰)

یہ شہادتیں واضح طور پر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ "گلشن سخن" گلزار ابراہیم کے ۱۱۹۹ھ/۸۵-۱۷۸۴ء یا اس کے بعد کے ایک دو برسوں میں نظر ثانی شدہ نسخے کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "گلشن سخن" پر "گلزار ابراہیم" کا تقدم ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن مبتلا کے استفادے کی کیا نوعیت ہے یہ واضح کرنے کے لیے دونوں تذکروں سے کچھ اقتباسات پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مثالیں قابل غور ہیں۔

گلزار ابراہیم	گلشن سخن
(۱) حیدری دہلوی	
"اسمش شیخ غلام علی۔ پدر بزرگوارش در پیشۂ عالمی مصروف و بصلاح و سداد موصوف بود۔ بہ سبب برہمی اطوار روزگار ترک وطن قدیم ساختہ اقامت در عظیم آباد انداختہ نو مشق است اما طرز گفتارش روانی دارد۔" (نسخہ مطبوعہ ص ۱۰۰)	"اسمش شیخ غلام علی۔ پدرش مدام در پیشۂ عالمی مالوف و بہ تقویٰ و صلاح موصوف بود۔ بہ سبب گردش زمانہ جلائے وطن اختیار نمودہ در عظیم آباد مقیم شد ہر چند نو مشق سخن است، اما روشِ کلامش روانی دارد۔" (ص ۱۱۴)

(۲) شیخ فضل علی دانا

"اسمش شیخ فضل علی از معتقدان شاہ برہان الدین و از شاگردان میاں مضمون دہلوی است ... الحال کہ سنہ یکہزار و یکصد و نود و چہار ہجری باشد، در لباس فقر بوارستگی مسکنت در بنگالہ بسر می برد ... گفتارش باطوار مضمون مذکور بطرز ایہام است"

(ص ۱۱۹)

"اسمش شیخ فضل علی از معتقدان شاہ برہان الدین و از شاگردانِ مضمون دہلوی است۔ دریں دلا بلباس فقر و وارستگی در بنگالہ بسر می برد۔ گفتار بیشتر بطرز ایہام است"

(ص ۱۲۹)

(۳) حمزہ علی رند

"اسمش شاہ حمزہ علی۔ جوان خوش روئے بود۔ مدتے با علی نقی خاں انتظار تخلص و محمد تقی خاں پسران علی اکبر خاں بینکباشی مرحوم در زمرۂ سپاہیاں معاش کردہ۔ بچندیں لباس برآمدہ۔ آخر بجذبۂ باطن ترک علائق ظاہر نمودہ در مرشد آباد سر و پا برہنہ با لنگ گلیم می گشت و در مجمع و معرکہ حاضر شدہ بر زمیں یا صف پائیں می نشست و اشعار خود می خواند و می گریست ... راقم آثم را بکرر بداں آزادہ حال نظر افتادہ ..."

"اسمش میر حمزہ علی (کذا) ترک علائق دنیوی نمودہ در مرشد آباد چندے سر و پا برہنہ می گشت و اشعار خود می خواند می گریست۔ الحال کہ در ۱۱۹۴ھ یکہزار و یکصد و نود و چار است، در عظیم آباد بوارستگی تمام بلا تعین مکان زندگانی می کند (ص ۱۲۲)

اسحال کہ سال یکہزار دیکصد و نود و چہار ہجری است، شنیدہ شد کہ بنہایت وارستگی در عظیم آباد بر وضعِ شاہ ارزانی ہمکان درویشانِ دیگر بلا تعین زندگانی می کند..... (ص ۱۳۵)

(۴) شاہ رکن الدین عشقؔ دہلوی

"موسوم بشاہ رکن الدین معروف بشاہ گھسیٹا نوادۂ شاہ فرہاد۔ از عمدہ مشائخ شاہجہان آباد است۔ بعالم شباب از دہلی بہ مرشد آباد افتادہ در لباس دنیا با خواجہ محمدی خاں مرحوم روزگارے باحترام داشت بعد ازاں بر طریقۂ آبائے خود لباس فقیری دربر کردہ رحل اقامت در عظیم آباد انداخت تا حال کہ سال یکہزار و یکصد و نود و پنج ہجریست آں صاحبِ حال بہ ارشاد طالباں اشتغال دارد" (نسخہ رامپور ورق ۱۴۷ الف)

"شاہ رکن الدین متخلص بہ عشق دہلوی مشہور بشاہ گھسیٹا نوادۂ شاہ فرہاد نقشبندیست۔ از دہلی بہ مرشد آباد رسیدہ در لباس دنیا با خواجہ محمدی خاں روزگار بعزت و حرمت گذرانید و بعد ازاں بطریق آبائے خود لباس درویشی در بر نمودہ رحل اقامت در عظیم آباد انداخت تا ایں زماں کہ سال یکہزار و یکصد و نود و چہار ہجری است، در بلدۂ مذکور بشغل وجد و حال اکثر می باشد (ص ۱۷۳ و ۱۷۴)

(۵) میر جیون قرباںؔ

"نامش میر جیون از شاگردان مرزا محمد رفیع سوداؔ نوجوانے بود در زمرۂ سپاہیانِ معاش می کرد۔ ناگاہ

"نامش میر جیون نوجوانے بود از شاگردان مرزا محمد رفیع سوداؔ در زمرۂ سپاہیاں معاش می نمود۔ گویند در

در فیض آباد میانِ فوجِ انگریزی افتاد	فیض آباد میانِ فوجِ انگریزی افتاد
از بدعت آں جماعہ غیر از جاں دادن	از بدعت آں قوم غیر از جاں دادن
چارہ ندانستہ مردانہ خود را بکشتن دارد	چارہ ندیدہ بہ دلاوری کشتہ شد۔
(ص ۱۹۷)	(ص ۱۹۸)

(۶) حسن رضا نجات — دہلوی

"نامش شیخ حسن رضا بعدہ ویرانی شاہجہاں آباد کہ بر دست احمد شاہ درانی اتفاق افتادہ، وارد عظیم آباد گردید۔ مدتے در جوار عاطفت اعمی حاجی احمد علی قیامت تخلص بسر بردہ والحال از چند سال در دہے از دہات سرکار سارن مضافِ صوبہ بہار سکنی اختیار کردہ نہایت سلیم الطبع و سنجیدہ اطوار و از دوستانِ ایں خاکسار است مرثیہ سید الشہداء علیہ السلام بیشتر و دیگر اقسام نظم را کمتر می گوید" (ص ۲۴۵)	"نامش شیخ حسن رضا بعد ویرانی شاہجہاں آباد وارد عظیم آباد گشت و مدتے با حاجی احمد علی قیامت تخلص بسر بردہ۔ از چند سال الحال در دہے از دہات سرکار سارن سکنی اختیار نمودہ مرثیہ سید الشہداء علیہ السلام بیشتر می گوید (۲۴۵)

"گلشن سخن" اور "گلزار ابراہیم" میں ۲۸۶ شاعر مشترک ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات کسی خاص ردیف کے تحت دونوں تذکروں میں شعرا کی سلسلہ وار ترتیب بھی تقریباً یکساں ہے۔ ان میں سے معدودے چند شاعروں کو چھوڑ کر باقی سبھی کے تعارف میں "گلزار ابراہیم" سے اخذ و اقتباس کی تقریباً یہی نوعیت نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں "گلزار ابراہیم" میں درج کردہ تمام خلاف واقعہ بیانات بھی جو مولف کی غلط فہمی، سہو قلم

یا نقص معلومات کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں، بعینہٖ اس تذکرے میں سبھی موجود ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں میرزا مظہر جانجاناں کی وفات سے متعلق وہ بیان ہے جس کا حوالہ گذشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔ علی ابراہیم نے کسی غلط فہمی کی بنا پر اس واقعے کو ۱۱۹۴ھ سے متعلق قرار دیا تھا۔ مبتلا نے حسب معمول اس روایت کو صحیح تصور کرتے ہوئے "قبل ازیں مسموع شد" کے ساتھ اپنے یہاں نقل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس احساس سے قطعی بیگانہ تھے کہ کسی دوسرے کی متاع قلم کو بے دریغ اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی یہ کوشش کسی وقت سارق کے کف دست کا چراغ بن سکتی ہے۔

"گلزار ابراہیم" کے بعد "تذکرۂ شورش" دوسرا اہم ماخذ ہے جس سے مبتلا نے دل کھول کر استفادہ کیا ہے چنانچہ ان بتیس شاعروں میں سے جو "گلزار ابراہیم" سے غیر حاضر اور "گلشن سخن" میں موجود ہیں، چند کے علاوہ سبھی کے حالات میں اور بعض دوسرے شعرا کے تراجم میں بھی اس استفادے کے نقوش واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں تذکروں کے ان مترادف اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تذکرۂ شورش	گلشن سخن
(۱) شاہ مبارک آبرو	
"نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو تخلص از فرزندانِ محمد غوث گوالیاری است۔ در شاہجہان آباد آمدہ شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو شدہ... در شعر و شاعری	"شیخ نجم الدین آبرو مشہور بہ شاہ مبارک از فرزندانِ شاہ غوث گوالیاری در اوائلِ سلطنت محمد شاہ غفران پناہ بہ شاہجہاں آباد آمدہ سکونت ورزید۔ در شیوۂ شاعری طرز

"طور خاصے دارد، در رعایتِ لفظی بسیار می نماید... کلیاتش قریب یکہزار وسہ صد شعر بنظر درآمدہ این چند شعر از انجملہ است" (دو تذکرے جلد ا ص ۹)

"خاصے دارد در رعایتِ لفظی و ایہام بسیار می نماید۔ کلیاتش یکہزار و پانصد بیت دیدہ شدہ۔ از وست" (ص ۱۰۱)

شورش نے آبرو کے انتخاب کلام میں کل اڑسٹھ شعر نقل کئے ہیں جبکہ مبتلا کے نقل کردہ اشعار کی تعداد تیس ہے۔ ان میں سے پچیس شعر بالیقین "تذکرۂ شورش" سے منقول ہیں باقی پانچ اشعار میں سے دو شعر "گلزار ابراہیم" سے نقل کئے گئے تین اشعار کا ماخذ نامعلوم ہے ممکن ہے کہ یہ اشعار "گلزار ابراہیم" یا "تذکرۂ شورش" کے کسی ایسے نسخے میں موجود ہوں جو مبتلا کے پیش نظر تھا اور فی الوقت ہماری دسترس سے بعید ہے۔

(۲) مفتی غلام مخدوم ثروت

"مفتی غلام مخدوم ثروت تخلص متوطن قصبہ پھلواری، شاگرد مولوی آیت اللہ جوہری است، از چندے بخدمت افتائے عظیم آباد مفوض گشتہ۔ قوت ذہنی و استعداد قابلِ تحسین و آفریں دارد۔" (دو تذکرے ج ۱ ص ۱۰۹)

"ثروت (کذا)، اسمش مفتی غلام مخدوم متوطن قصبہ پھلواری، شاگرد مولوی آیت اللہ جوہری تخلص۔ از چندے بخدمت افتائے عظیم آباد مفوض گشتہ۔ ذہن درستے دارد۔" (ص ۱۵۸)

(۳) میر منو حیران

"وطنش عظیم آباد ... ... از مغتنماتِ روزگار بودہ در سنِ سی سالگی ودیعتِ حیات نمودہ داغ

"وطنش عظیم آباد۔ از مغتنمانِ روزگار بودہ۔ در سن سی سالگی ودیعت حیات نمود۔ در مرثیہ

بر دل دوستاں گماشتہ در فن مرثیہ گوئی
مہارت تمام داشت و مظلوم تخلص می نمود
اشعارش اگرچہ کم است لیکن فصاحت
و بلاغت تمام دارد ... از زادہائے
طبعش قریب سی صد شعر بدست آمدہ"
(دو تذکرے ج ۱ ص ۱۹۹)

مہارت خوب داشت مظلوم تخلص می
کرد۔ اشعارش با وصف کم بودن (فصاحت)
زیادہ و بلاغت بے اندازہ دارد۔
سہ صد شعر از دیدہ شدہ"
(ص ۱۱۲)

شورش نے ان کے کلام میں ردیف وار ترتیب کا خیال رکھے بغیر اٹھتر [۷۸]
اشعار اور دو رباعیاں نقل کی ہیں۔ مبتلا کے یہاں ان میں سے اکتیس [۳۱] اشعار
اور ایک رباعی بقید ترتیب منقول ہے۔

(۴) مرزا علی رضا تمنّا

"مولدش عظیم آباد، جوانے
است اہلِ استغناء وارستہ مزاج
بسوئے اختلاطِ مردم دنیا نمی آرد
کلامش خیلے آبدار و انداز گفتارش
بسیار مزہ دار ... بسبب بیماری
خفقان طبع نازکش تاب ہجوم فکر نمی
دارد۔ بنا برآں گاہ گاہ بطریق تفنن شعر
می گوید۔ سہ صد شعر دیدہ شدہ"
(دو تذکرے ج ۱ ص ۹۵)

"مولدش عظیم آباد، وارستگیٔ
مزاج و استغنا از اہل دنیا بسیار
دارد۔ طرز گفتارش بفصاحت تمام
است۔ بسبب بیماری خفقان۔ طبع
نزاکتِ شعارش تاب ہجوم فکر نمی آرد
گاہے گاہے غزلے انشا می کند ...
متفرق اشعارش دیدہ شدہ"
(ص ۴۸)

شورش کے یہاں ان کا انتخاب کلام ستر [۷۰] اشعار پر مشتمل ہے جو بلا قید ترتیب
نقل کیے گئے ہیں۔ مبتلا نے انھیں میں سے تینتیس ۳۳ شعر ردیف وار ترتیب کے

مطابق اپنے یہاں نقل کرلیے ہیں۔

شورش کا ترجمہ "گلشن سخن" میں موجود ہے لیکن اس سے ان کے تذکرے
سے مبتلا کی واقفیت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے وجود سے
بالکل بے خبر تھے۔ جبکہ اوپر کی مثالوں سے قطع نظر اس ترجمے کے ذیل میں
بھی "دیوانش چہار ہزار بیت از قصیدہ و مثنوی و غزل است... از
خلاصۂ دیوان اوست" لکھ کر جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، وہ سب کے سب
ترتیب کے معمولی سے فرق کے ساتھ "تذکرۂ شورش" ہی سے ماخوذ ہیں۔ "گلزار ابراہیم"
اور "تذکرۂ شورش" کے سلسلے میں اپنے اس رویے کے برخلاف جنوں دہلوی
کے ذکر میں ان کے اشعار کے متعلق یہ لکھ کر "ایں ابیات از تذکرۂ میر محمد تقی نقل
نمودہ بہ تحریر می آرد" مبتلا نے "نکات الشعرا" سے استفادے کا پوری وضاحت
کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ بظاہر اس بیان کو غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نظر
نہیں آتی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تذکرہ ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا اور
انھوں نے اس کا ذکر محض ماخذ کی نشاندہی کے سلسلے میں اپنی دیانت اور
ایمانداری کا نقش بٹھانے کے لیے کیا ہے، کیونکہ اول تو جنوں کا ذکر "نکات الشعرا"
کے چار دریافت شدہ نسخوں میں سے کسی میں موجود نہیں اور دوسرے ان کے
نمونہ کلام میں جو اشعار نقل کئے گئے ہیں، ان میں سے آخری دو شعر ایک
دوسرے ہم تخلص شاعر غلام مرتضیٰ جنوں سہسرامی کے ہیں۔ باقی تین اشعار
میں سے دوسرا شعر "گلشن سخن" اور "گلزار ابراہیم" دونوں میں مشترک ہے
اور دو اشعار، دونوں تذکروں میں مختلف فیہ ہیں لیکن ان کا تعلق ایک ہی غزل
سے ہے جو ممکن ہے اس زمانے میں زبان زد خلائق ہو "گلشن سخن" کی تالیف
کے وقت "نکات الشعراء" کے پیش نظر نہ ہونے کا ثبوت مبتلا کے ایک اور

بیان سے بھی مل جاتا ہے۔ جو میر متعدد ذہین سے متعلق ہے۔ ذہین کے حالات کا اولیں ماخذ گردیزی کا "تذکرہ ریختہ گویاں" ہے جس میں انھیں "از دوستان مولف" کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے (ص ۶۳)۔ علی ابراہیم نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر اسی حوالے کے ساتھ کیا ہے لیکن وہ مولف کا نام سہواً میر فتح علی کے بجائے میر محمد علی لکھ گئے ہیں۔ مبتلا نے اسے از روئے قیاس میر محمد تقی کی تصحیف سمجھ کر اپنے یہاں اس کی تصحیح کر دی ہے، لیکن اگر وہ نکات الشعرا ان کے پیش نظر ہوتا تو وہ یہ غلطی ہرگز نہ کرتے کیونکہ جنون دہلوی کی طرح ذہین کا ذکر بھی اس تذکرے کے کسی دریافت شدہ نسخے میں شامل نہیں۔

"گلزار ابراہیم" اور "تذکرہ شورش" سے استفادے کی جو مثالیں اوپر کی سطور میں پیش کی گئی ہیں وہ اس تذکرے کے انفرادی کردار کی نفی کرتی ہیں گویا تذکرہ شاعروں کے متعلق قارئین کے ذخیرہ معلومات میں اضافے کے نقطہ نظر سے اس کا وجود و عدم وجود برابر ہے حتیٰ کہ جن شاعروں سے مبتلا کے دوستانہ مراسم تھے اور جنھیں دہلی، مرشد آباد، عظیم آباد اور بنارس میں قیام کے دوران قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا، ان کے بارے میں بھی انھوں نے ایسی باتیں شاذ و نادر ہی لکھی ہیں جو انکشافات کی حیثیت رکھتی ہوں۔ تاہم ان کی جن تحریروں کو اس قسم کے مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) محمد روشن جوشش، "... از فرزندان جسونت رائے ناگر است ... مشار الیہ از صغر سن رغبت بہ اسلام داشت چوں بحد تمیز رسید، بشرف دین احمدی مشرف گشت۔ نقیر احوال ایشاں مفصل از بھگونت رائے خلف جسونت رائے کہ فیما بین خصوصیت و دوستی ہاست، معلوم نمود۔ مرد یست قابل ... در نظم

و نثر صاحب استعداد" (ص ۸۷)

(۲) میر حسین دوست ذاکر:۔ ابن میر علی دوست متوطن مراد آباد سنبھل۔ چند سال در شاہجہاں آباد میر مسطور ملازم خسر پور ہائے راقم مرزا محمد رفیع خاں و بدیع الزماں خان بود۔ مرد ظریف و شعر فہم خوب در صرف و نحو فی الجملہ مہارت داشت"
(ص ۱۳۱)

(۳) اشرف علی خاں فغاں:۔ در اواخر سلطنت احمد شاہ از دہلی برآمدہ بصوبۂ اودھ رسید و چندے دراں دیار توقف ورزیدہ در اوائل عشرۂ سابعہ بعد مائۃ والف بہ عظیم آباد وارد شد رؤساد آں شہر اورا گرامی داشتند و خان مذکور جاگیر و آل تمغا حاصل نمودہ بفراغت می گذرانید و در مزاج راجہ شتاب رائے ناظم عظیم آباد دخل تمام داشت و بوساطت راجہ مسطور خطاب ظریف الملک بنام خود گرفت۔ و در سنہ یکہزار و یکصد و ہشتاد و شش رحلت نمود و در عظیم آباد مدفون گردید۔ کلیات ریختہ اش دو ہزار بیت دیدہ شد۔۔۔" (ص ۱۸۹)

(۴) میر غلام نبی بلگرامی:۔ در علم سنسکرت بے مثل وقت خود بود۔ دو ہزار پانصد دوہرہ و کبت تصنیف کرد در آں لین تخلص داشت با مولف رابطۂ دوستی بدرجہ اتم بود دہرہ از در دہلی اتفاق ملاقات می شد در جنگ احمد خاں افغاں بہ رفاقت والا (والد) مغفور بدلاوری کشتہ شد" (ص ۳۴۲ و ۳۴۲)

(۵) علی قلی ندیم:۔ اکثر مرثیہ و سلام سید الشہدا زبان ریختہ می گفت

و دریں فن خود را از شاگردان میر عبداللہ مسکین می شمرد۔ راقم در دہلی ایشاں را اکثر دیدہ بود۔" (ص ۲۴۴)

(۴) شاہ واقف:۔ "نامش میاں عاشوری۔ از صغر سن با مادر خود از منسلکان خیر پور ایں مولف بدیع الزماں خاں و ہم مکتب ایشاں بود و در ہماں خانہ پرورش یافت بحسن تربیت میر حسین دوست مراد آبادی کہ معلم خان مذکور بود، بہرہ از علوم رسمیہ برداشتہ در فیض آباد دخترے پیدا کرد۔ و ترک لباس نمود لیکن شب و روز نزد بدیع الزماں خاں می بود۔"

(ص ۲۷۵)

ان چند بیانات کے پہلو بہ پہلو ایک اور اہم اور قابل لحاظ اضافہ آبرو اور ناجی وغیرہ کے ہم عصر ایہام گو شاعر احسن اللہ احسنؔ کے کلام کا ہے جن کے انتخاب میں بتلانے یہ بتانے کے بعد کہ "در دیوانش شعرے یافتہ نمی شود کہ خالی از ایہام باشد۔ دریں صنف دستگاہِ تمام داشت۔ (ص ۵۳) انچاس اشعار نقل کیے ہیں جبکہ ان کا دیوان نایاب ہے اور دوسرے تذکروں میں متفرق طور پر ان کے کل چھ سات شعر ملتے ہیں۔

اوپر کی سطور میں مختلف شاعروں کے حالات سے جو مثالیں پیش کی گئی ہیں انھیں "گلشن سخن" کی کل کائنات کہا جا سکتا ہے۔ انتخاب کلام کے سلسلے میں چند قابل ذکر اضافوں سے قطع نظر کرکے اگر انتہائی رعایت اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس قسم کے متفرق و منتشر جملوں کو یکجا کر دیا جائے تو ان کے لیے مطبوعہ نسخے کے زیادہ سے زیادہ دو صفحات کافی ہوں گے۔ اس اجمالی تبصرے کے بعد اس تذکرے کی اہمیت و افادیت پر مزید اظہار خیال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا اور معاصر تذکرے

اس باب کے تحت ہم نے تذکرہ ہندی۔ ریاض الفصحا، گلشن ہند تذکرہ عشقی۔ طبقات سخن اور تذکرۂ بے جگر کو اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ تذکرے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء اور ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء کی درمیانی مدت میں مرتب ہوئے ہیں۔ "تذکرہ ہندی" ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء اور ۱۲۰۹ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء کے مابین ریاض الفصحا ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کے درمیان اور گلشنِ ہند ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا گیا ہے۔ تذکرۂ عشقی کی تالیف کا زمانہ قطعی طور پر متعین نہیں۔ قراین سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا آغاز ۱۱۸۸ھ/۷۵-۱۷۷۴ء کے قریب ہوا اور کم سے کم ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء تک اس میں وقتاً فوقتاً اضافے اور ترمیمیں کی جاتی رہیں لیکن اس کا نقش اول یقیناً ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء سے قبل تیار ہو چکا تھا۔ طبقاتِ سخن اپنے نام سے حاصل شدہ اعداد کے بموجب ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷) کی تالیف ہے تذکرۂ بے جگر کی ترتیب کا زمانہ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء اور ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء کے درمیان قرار پاتا ہے۔ سنینِ ترتیب سے متعلق اس تفصیل کی روشنی میں ریاض الفصحا کا ذکر اصولاً "طبقاتِ سخن" کے بعد کیا جانا چاہیئے۔ لیکن چونکہ "تذکرہ ہندی" اور یہ تذکرہ دونوں ایک ہی شخص (مصحفی) کی تالیف ہیں اور مختلف خوبیوں اور خامیوں کے لحاظ سے دونوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے اس لیے

مطالعے کی آسانی کی غرض سے ان دونوں تذکروں کو یکے بعد دیگرے جگہ دی گئی ہے۔ اس زمانے کے کچھ اور اہم تذکروں پر جو اپنی ضخامت اور جامعیت کی وجہ سے زیادہ تفصیلی مطالعے کے مستحق ہیں آئندہ اوراق میں ایک علیحدہ باب کے تحت بحث کی جائے گی۔

تذکرۂ ہندی

"تذکرہ ہندی" تذکرہ نویسی کے میدان میں مصحفی (متوفی ۱۲۴۰ھ/ ۲۵-۱۸۲۴ء) کی کوششوں کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سے قبل ۱۱۹۹ھ/۸۵-۱۷۸۴ء میں وہ "عقد ثریا" کے نام سے فارسی گو شعرا کا ایک مختصر تذکرہ مرتب کر چکے تھے۔ "عقد ثریا" کی ابتدا دہلی کے زمانہ قیام میں اور تکمیل لکھنؤ پہنچنے کے بعد ہوئی لیکن تذکرہ ہندی شروع سے آخر تک لکھنؤ میں لکھا گیا ہے۔ یہ تذکرہ ایک سو اٹھاسی (۱۸۸) شعرا اور پانچ شاعرات کے علیحدہ علیحدہ ذکر پر مشتمل ہے اور ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے سلسلہ مطبوعات کے تحت شائع ہو چکا ہے۔ مصحفی نے اس کی ترتیب کا کام میر حسن کے فرزند رشید اور اپنے عزیز شاگرد میر مستحسن خلیق کی فرمائش پر شروع کیا تھا چنانچہ ان کا بیان ہے کہ

"چوں ایں فقیر حقیر، از تالیف تذکرۂ فارسی فراغت حاصل کردہ، بہم تالیف تذکرۂ ہندی در پیش آمد۔ اگرچہ از علو ہمت خداداد سر بہ دماغ آن نبود کہ اوقات عزیز خود را باشتغال چنیں امر لاطائل کہ دیگراں بفنح بگردن خوش بستہ اند، مصروف

سازد، امّا بہ تکلیف میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کہ باشارۂ پدرِ بزرگوار خود کلام خود را از نظر فقیر محمد گزراند و شوقِ شعرِ ہندی دامن دلش را محکم فرا گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں بادیۂ پرخار گذاشت و بقید حروفِ تہجی (بر تحریر) اسامی قدیم شعرائے عہد فردوس آرام گاہ تا شعرائے زمانہ شاہ عالم بہادر شاہ بادشاہ غازی ہمت گماشت۔" (ص ۴۰۳)

"عقد ثریا" کی تالیف کے فوراً بعد کا یہ زمانہ جبکہ اس تحریر کے مطابق تذکرہ ہندی کی ابتدا ہوئی، مصحفی کے لیے بڑا سخت اور آزمائش کا دور تھا۔ وہ لکھنؤ میں تازہ وارد تھے۔ ایک طرف دہلی سے ترکِ تعلق کا غم تھا تو دوسری طرف نئے ماحول سے مزاج کی ہم آہنگی، معاشی وسائل کی تلاش اور استحکام اور زندگی اور فن کے متعلق مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے لوگوں کے درمیان اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کا سوال تھا۔ ان صبر آزما حالات میں انھوں نے خلیق کے اصرار پر تذکرے کی ابتدا تو کر دی لیکن اس کی ترتیب کا کام زیادہ عرصے تک جاری نہ رکھ سکے۔ چنانچہ کئی برس کے تعطل کے بعد صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے وابستگی کے زمانے میں اس کے تکملے کی نوبت آئی۔ مصحفی نے اپنے دلی نعمت کی قدر شناسی اور اس کے نتیجے میں حاصل شدہ فارغ البالی کو غنیمت تصور کرتے ہوئے مسودے پر نظر ثانی کی اور ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء میں اسے ایک مکمل کتاب کی شکل دے کر ان کے حضور میں بطور نذر پیش کیا۔ تذکرے کے آخر میں یہ تمام تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں:

"مولف ایں تذکرہ ..... از تشتّتِ حواس د

پریشانی خاطر و نامساعدئی زمانہ کجا فرصتِ آن داشت کہ بہ تصحیح
احوال و اشعار شعرائے سابق و حال پرداختہ نقشہ ایں جریدہ
بروئے کار آوردا اکنون کہ بہ رہبری بخت سعید در حضور پرنور
مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر ... باریافتہ
ہمیشہ موردِ گوناگوں مہربانی آں مہر سپہر خلافت و جہانداری می
باشد، فرصت را غنیمت شمردہ، مسودۂ تذکرہ را کہ از چند سال
بر طاق نسیاں افتادہ بود، صاف نمودہ و درست ساختہ ...
امید کہ بہ نظر قبول آن والا جناب درآمدہ مقبول دلہا گردد۔ تاریخ
چونکہ از فضل خدا ساختہ شد   جلد ایں تذکرہ مانند بہشت
سال او چوں ز خرد پرسیدم   یک ہزار و دو صد و نہ بنوشت

(ص ۲۸۲)

اس قطعے کے آخری مصرعے سے اور اس کے علاوہ مولف ہی کے نظم کئے ہوئے ایک دوسرے قطعے کے مادۂ تاریخ "جلد بے نظیر" سے بھی یہ بات کو واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ تذکرے کی تکمیل ۱۲۰۹ھ ۹۵-۱۷۹۴ء میں ہوئی ہے لیکن سال آغاز کے متعلق اس قسم کی کوئی صریح اور فیصلہ کن شہادت اس تذکرے میں موجود نہیں۔ مصحفی صرف اس قدر بتاتے ہیں کہ انھوں نے (۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء میں) تذکرہ فارسی کی تالیف سے فراغت کے بعد اس کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا۔[1] اس بیان کو بنیاد بنا کر ان کے بعض دوسرے بیانات کی روشنی میں جو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

---

[1] تذکرۂ فارسی کی تاریخ اتمام "زہے باغ باصفا" سے نکلتی ہے۔

(الف) شاہ عالم آفتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"پس از فراغت اوقات معہود تلاوت قرآن و نوشتن آن اشہب فکر را در میدان شعر ہندی و فارسی و کبت و دوہرہ وغیرہ نیز جولان می دہند" (ص ۳)

شاہ عالم کو غلام قادر روہیلہ نے ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ (اگست ۱۷۸۸ء) میں بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے بعد کلام اللہ کی کتابت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے حالات اس واقعے سے قبل لکھے گئے ہیں۔

(ب) مرزا جواد علی احقر (ص ۲۱) اور میر محمد یار خاکسار (ص ۸۸) کے حالات میں ضمناً میر حسن کا ذکر بھی آیا ہے۔ ان دونوں مقامات پر انھیں "سلمہ اللہ تعالیٰ" کے دعائیہ کلمے کے ساتھ یاد کیا گیا ہے اس کے علاوہ میر احسن خلق کے ترجمے میں (ص ۸۹) جس انداز سے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے بھی ان کا بقیدِ حیات ہونا ظاہر ہوتا ہے اور میر حسن نے خود مصحفی کے قول کے مطابق محرم ۱۲۰۱ھ کے عشرۂ اولیٰ (نومبر ۱۷۸۶ء) میں وفات پائی ہے (ص ۶۵) لہٰذا یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ احقر، خاکسار اور خلق کے حالات محرم ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) سے قبل لکھے جا چکے تھے۔

(ج) شاہ حاتم کے متعلق مصحفی کا بیان ہے کہ

"سہ سال است کہ در شاہجہاں آباد ودیعت حیات سپردہ" (ص ۸۱)

لہ نادرات شاہی مقدمہ مرتب ص ۲۷۔

اس سے پہلے شعرائے فارسی کے تذکرے میں وہ ان کے متعلق یہ لکھ چکے ہیں کہ:

" در یک ہزار و یک صد و نود و ہفت در ماہِ مبارک رمضان رحلت کردہ فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ .. .. .. آہ صد حیف شاہ حاتم مرد"[1]

اس بیان کی رو سے انتقال کے بعد تین سال کی مدت رمضان ۱۲۰۰ھ/ جولائی ۱۷۸۶ء میں پوری ہوتی ہے "تذکرہ ہندی" میں شاہ حاتم کے حالات تقریباً اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں۔

(د) خواجہ میر درد کی نسبت رقم طراز ہیں کہ:

"یک سال است کہ در دِ مہجوریش شفا یافتہ و بہ دستانی علی الاطلاق واصل گشتہ" (ص ۹۳)

درد کے تمام سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا انتقال یوم جمعہ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ/ ۷ جنوری ۱۷۸۵ء کو ہوا ہے۔[2] مصحفی بھی یقیناً اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے اور چونکہ ان کی اس عبارت کا زمانہ تحریر اور خواجہ صاحب کے انتقال میں صرف ایک سال کا فرق ہے اس لیے بظاہر اندازے کی کسی بڑی غلطی کا بھی امکان نہیں۔ ایسی صورت میں یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ اس تذکرے کے لیے خواجہ صاحب کا تعارف صفر ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۵ء کے قریب سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

ان شواہد کی بنیاد پر ہمارا یہ خیال ہے کہ "تذکرۂ ہندی" کی تالیف

---

[1] عقدِ ثریا ۲۳ و ۲۴۔

[2] نشترِ عشق مخطوط رام پور ورق ۲۵۴ ب۔ تذکرہ بے جگر ورق ۶۶ ب۔

کا کام ۱۲۰۰ ہجری میں صفر اور رمضان (دسمبر ۱۷۸۵ء اور جولائی ۱۷۸۶ء) کے مہینوں کے درمیان کسی وقت شروع ہوا۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی یقینی ہے کہ آلام و افکار کے ہجوم اور حالات کی ناساعدت کے باعث اس سال کے اندر ہی اس سے دست کشی اختیار کر لی گئی اور تقریباً ۸ برس تک ابتدائی مسودہ طاق نسیاں کی زینت بنا رہا۔ کیونکہ ۱۲۰۱ھ/ ۸۶-۱۷۸۵ء یا اس کے بعد آنے والے سات برسوں میں کسی شاعر کا تعارف قلم بند کیے جانے یا سابقہ عبارات میں جزوی ترمیم و تغیر کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ۱۲۰۹ھ/ ۹۵-۱۷۹۴ء میں بعض شعرا کے حالات میں حسب ضرورت رد و بدل کیا گیا اور بعض ایسے شعرا کے ترجمے اضافہ کیے گئے جن کا ذکر پہلے نہ کیا جا سکا تھا۔ ان میں سے کم از کم انشاء اللہ خاں انشاء، میر اکبر علی اختر، جسونت سنگھ پروانہ، نعیم بیگ جوان، میر حسن، عنایت اللہ حجام، شاہ حسین حقیقت سعادت یار خاں رنگین، مرزا زین العابدین سر سبز، مرشد زادہ آفاق، مرزا سلیمان شکوہ، میر صادق علی صادق، طالب حسین طالب، قائم چاند پوری شمس الدولہ قسمت، میر محمد حسین کلیم، کرپا دیال عرف کنور سین منظر، میر قمر الدین منت، ولی اللہ محب، نور الاسلام منتظر، میر نظام الدین ممنون علی نقی محشر اور الٰہی بخش معروف کے تراجم کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ جزوی یا کلی طور پر بعد کے اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ حسب ذیل دلائل پر مبنی ہے۔

(الف) انشا کی شاعری پر تبصرے کے ذیل میں "مثنوی شیر و برنج" در جواب دان حلوا از بہاء الدین آملی، کی تعریف کی گئی ہے (ص ۱۴۴) یہ مثنوی ۱۲۰۵ھ کی تصنیف ہے۔ سالِ اتمام

° خروش موجِ یم" سے برآمد ہوتا ہے۔[1]

(ب) اکبر علی اختر کے ذکر میں مصحفی نے چند سال قبل کے واقعے کے طور پر اپنی پریشان روزگاری، وحشت مزاج، شعر و شاعری سے نفرت کی حد تک بے تعلقی اور اصلاح سے گریز کی کیفیت کا حوالہ دیا ہے یہ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار تک رسائی سے قبل کی بات ہے۔[2]

(ج) جسونت سنگھ پروانہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "درروزہائے کہ مولف از شاہجہاں آباد بہ لکھنؤ رسید .. .. .. از ہماں ایام عطف عنانِ فکر شعر فارسی بطرفِ ریختہ کردہ .. .. .. تا الی الیوم کہ عرصۂ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او بسیار رسا در ریختہ گردیدہ" (ص ۴۶) مصحفی ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں لکھنؤ پہونچے تھے۔[3] اس لحاظ سے بارہ سال کی تخمینی مدت ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء پر مختتم ہوتی ہے۔

(د) میر حسن کے سانحۂ وفات اور ان سے اپنے رابطۂ دوستی کا ذکر مصحفی نے اس انداز سے کیا ہے جیسے ماضی کی کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہوگئی ہو (ص ۶۵)

(ہ) عنایت اللہ حجام کے انتقال کو چھ برس قبل کا واقعہ قرار دیا ہے (ص ۸۰)، خیراتی لعل بے جگر کے بیان کے مطابق ان کا سالِ رحلت ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۹ء) ہے۔[4]

---

[1] کلیات انشا۔ ص ۱۸۲ [2] تذکرہ ہندی .. .. خاتمہ کتاب۔ ص ۲۸۲

[3] عقد ثریا۔ ص ۱۴۔

[4] تذکرہ بے جگر، مخطوطہ لندن ورق ۶۲ ب، ۶۲ الف۔

(د) میر شاہ حسین حقیقت کے ذکر میں امام بخش خاں کشمیری کے بڑی منت اور سماجت کے ساتھ "تذکرہ ہندی" کا مسودۂ خام مستعار لے جانے اور اس سے نیز صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ (متوفی شعبان ۱۲۰۲ھ/ مئی ۱۷۸۸ء) کی بیاض سے جو موصوف کی وفات کے بعد ان کے پاس رہ گئی تھی، اشعار و احوال نقل کر کے حقیقت سے خفیہ طور پر ایک تذکرۂ شعرا مرتب کرانے کا واقعہ بالتفصیل بیان کیا ہے (ص ۸۶، ۸۷) اس بیان میں تذکرے کے "مسودہ خام" کے حوالے جہاندار شاہ کے زمرۂ مرحومین میں شمار اور امام بخش اور حقیقت کی مشترکہ سازش کے متعلق اظہار خیال کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت کا ترجمہ نظر ثانی کے زمانے کی تحریر ہے۔

(ز) زین العابدین خاں عرف مرزا مینڈھو سر سبز کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ "فقیر پیش ازیں مدت چار سال بصیغۂ شاعری ملازم و رفیق ایں شان ماندہ" (ص ۱۱۸) ظاہری اندازے کے مطابق یہ چار سال کی مدت ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں مرزا سلیمان شکوہ کے لکھنؤ میں ورود سے قبل کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے

(ح) مرزا سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں لکھنؤ میں وارد ہوئے تھے[۱] مصحفی نے ان کا تعارف اس سنہ کے بعد ان کے دربار سے اپنی وابستگی کے ایام میں سپرد قلم کیا ہے۔ نعیم بیگ جوان، سعادت یار خاں رنگین۔ میر

---

[۱] سوانحیات سلاطین اودھ جلد اول ص ۲۸-۲۸۲

صادق علی صادق، طالب حسین طالب، میر محمد حسین منشی، اور ولی اللہ محب کے حالات بھی اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں کیونکہ ان سب شاعروں کو مصحفی نے مرشد زادۂ آفاق کی سرکار سے متوسل بتایا ہے۔ ولی اللہ محب کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے دو سال پہلے "مرض مزمنِ ناسورپا" میں وفات پائی۔ (ص۔ ۲۳۱)

(ط) قائم چاند پوری کے حال میں لکھتے ہیں "اجلش در رام پور رسید و خبرِ وفاتش شہر بہ شہر انتشار یافت (ص۔ ۱۸۰) قائم کا انتقال ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء میں ہوا ہے[1]

(ی) نواب شمس الدولہ تمکنت کو جعفر علی حسرت کے انتقال کے بعد سے اپنے زمرۂ تلامذہ میں شامل بتاتے ہیں۔ حسرت کا سال وفات ۱۲۰۶ھ/ ۹۲-۱۷۹۱ء ہے[2]

(ک) کرپا دیال مضطر مخطوط رام پور کے مطابق تذکرے کی تالیف کے وقت اندازاً عمر کی بیسویں منزل سے گزر رہے تھے۔ (حاشیہ ن ۲۳۶) عقد ثریا میں مصحفی نے انھیں ۱۲۱۳ھ میں جوان بست و پنج سالہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہو[3] اس لحاظ سے یہ بیان ۱۲۰۵ھ کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(ل) میر قمر الدین منت کے ذکر میں ان کی وفات کو دو سال پہلے

---

[1] مجمع الانتخاب مخطوط علی گڑھ ورق ۲۲ ب و مخزن نکات دیباچہ مرتب ص ۱۳

[2] تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔

[3] عقد ثریا حاشیہ ص ۵۷

کا واقعہ قرار دیتے ہوئے اپنا نظم کیا ہوا قطعہ تاریخ نقل کیا ہے جس کے
آخری مصرعے سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے (ص ۲۳۰)

(م) نورالاسلام منتظر کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "از ہشت سال برائے
مشورۂ کلام خویش پیش فقیر آمد و شد دارد ... عمرش تا
امروز بست و پنج سالہ باشد" (ص ۲۳۴) ۸ سال سے مشورہ سخن
کی اس مدت کے حدود ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۵ھ کے درمیان ہی متعین
کیے جا سکتے ہیں۔

(ن) نظام الدین ممنون کے تعارف میں ان کے والد میر قمرالدین منت
کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اس سے ان کا بقید حیات ہونا ظاہر نہیں
ہوتا (ص ۲۳۸) اور منت کا سال وفات اس سے قبل اسی
تذکرے میں ۱۲۰۷ھ بتایا جا چکا ہے (ص ۲۳۰)

(س) مرزا علی نقی محشر کے حال میں عشرہ محرم ۱۲۰۸ھ (اگست ۱۷۹۳ء)
میں ان کے قتل کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔
(ص ۲۴۴) ظاہر ہے کہ یہ سنہ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء
ہی کی تحریر ہو سکتی ہے۔

(ع) الٰہی بخش معروف کے متعلق لکھتے ہیں کہ "در ایامیکہ فقیر تذکرہ با تمام
رسانیدہ از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ گزر انگندہ ... بعد یک
دو ماہ باز بہ شہر (خود) عود کرد" (۲۴۵) اتمام تذکرہ کسی طرح
۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء سے قبل کی بات نہیں۔

عرشی صاحب نے ان میں سے بعض شہادتوں کی روشنی میں یہ رائے قائم
کی ہے کہ مصحفی نے ۱۲۰۵ھ کے بعد بھی اس تذکرے میں کچھ اضافے کیے ہیں

موصوف نے اس سلسلے میں سب سے پہلے جسونت سنگھ پروانہ کے بارہ سال سے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کے متعلق ان کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اگر ان (مصحفی) کے (لکھنؤ میں) سال آمد ۱۱۹۸ھ (۸۴-

۱۷۸۳) پر ۱۲ برس بڑھائے جائیں تو ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء)

حاصل جمع ہوگا۔"[۱]

لیکن تخمینے میں غلطی کے احتمال کے پیش نظر وہ اپنے اخذ کئے ہوئے اس نتیجے کی صحت پر زیادہ زور نہیں دیتے اور شمس الدولہ قسرت کے ترجمے سے جعفر علی حسرت کے انتقال کے بعد اصلاح کلام کے لیے مصحفی کی طرف ان کے رجوع سے متعلق عبارت نقل کرکے اس استدلال کے ساتھ سلسلۂ بحث کو آگے بڑھاتے ہیں کہ:-

"حسرت نے ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) میں رحلت کی ہو لہٰذا اس حصّے کو اس سنہ یا اس کے کچھ بعد کا ہونا لازم ہے۔"[۱]

اس کے بعد عرشی صاحب نے اپنے مدعا کے اثبات کے لیے آخری اور فیصلہ کن دلیل کے طور پر مصحفی کا وہ بیان نقل کیا ہے جس سے الٰہی بخش معروف کے حالات و اشعار "اتمام تذکرہ" کے بعد تحریر کئے جانے کا پتہ چلتا ہے۔

ان دلائل میں سے پہلی دلیل تو خود عرشی صاحب ہی کی نگاہ میں کمزور ہے اس لیے اس پر کسی بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسری دلیل کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد جس واقعہ پر رکھی گئی ہے ۱۲۱۰ھ کے بجائے ۱۲۰۷ھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری مراد حسرت کے سانحۂ وفات سے ہے جس کی تاریخ

---

[۱] دستور الفصاحت مقدمۂ مرتب ص ۸۶۔

جرأت نے اس طرح نظم کی ہے۔

خلاقِ مضامین جو رحلت فرمائے ہر اہلِ سخن کو کیوں نہ حسرت رہ جائے
جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخِ وفات یوں جاوے جہاں سے حسرت ارماں ہو ہائے

اس قطعے کے آخری مصرعے سے ۱۲۰۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ شاہ کمال کی تحریر کے مطابق بھی یہی حسرت کا صحیح سال وفات ہے۔ ۱۲۱۸ھ/ ۰۴-۱۸۰۳ء میں وہ اپنے تذکرے کے لیے ان کے حالات قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عرصۂ دوازدہ سال می شود کہ از قضائے الٰہی انتقال فرمودہ"[1]۔

عرشی صاحب کی تیسری دلیل البتہ کسی حد تک قابل لحاظ ہے لیکن چونکہ یہ بات ہمارے علم میں نہیں کہ مصحفی ۱۲۰۵ھ کے کس حصے میں تذکرے کی ترتیب سے فارغ ہوئے اس لیے معروف کے ترجمے کو قطعی طور پر ۱۲۱۰ھ یا بعد کے کسی سال کی تحریر نہیں کہا جا سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ انھوں نے سال کے آغاز یا وسط میں اپنا کام مکمل کر لیا ہو اور یہ چند سطریں آخر کے کسی مہینے میں اضافہ کی گئی ہوں۔ بہر صورت معروف کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے حالات سے کوئی ایسی واقعی یا ظنی شہادت پیش کرنا دشوار ہے جس سے ختم کتاب کے بعد اضافہ و ترمیم کے عمل پر استدلال کیا جا سکے۔

تذکرے کی ترتیب میں مصحفی کو سب سے زیادہ مدد اپنی یادداشت اور مشاہدے سے ملی ہے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر ایسے زمانے میں ہوئی جس کو

---

[1] مجمع الانتخاب۔ مخطوطہ علی گڑھ ورق ۲۰۶ الف

دو مختلف ادوار کا نقطۂ اتصال کہا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اس دور کی آخری یادگار ہیں جسے مرزا مظہر، شاہ حاتم، مرزا سودا، خواجہ میر درد اور میر تقی میر جیسے کاملین فن کی خدمات سے شرف امتیاز حاصل ہے اور دوسری طرف ان کا سلسلہ ارباب سخن کے اس کارواں سے ملتا ہے جس کی قیادت آتش و ناسخ جیسے اساتذہ کے ہاتھ میں تھی۔[۱] پھر ان کا بچپن امروہے میں[۲] عنفوان شباب کا کچھ زمانہ آنولے اور ٹانڈے میں، پھر جوانی کے تقریباً بارہ برس (۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء تا ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء) دلی میں۔ اور عمر کے باقی بیالیس سال (۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء تا ۱۲۴۰ھ/۲۵-۱۸۲۴ء) لکھنؤ میں بسر ہوئے۔ جہاں بینی و جہاں پیمائی کی اس خاص طویل مدت میں انھوں نے بہت سے بزرگ اساتذہ کی صحبتوں سے فیض اٹھایا، متعدد نامور معاصرین کی خلوت جلوت کے شریک رہے۔ سو کے قریب شاگردوں کو زبان و فن کے رموز و نکات اور فصاحت و بلاغت کے تقاضوں سے آشنا کیا[۳] اور بے شمار شاعروں کی ترتیب و تنظیم کے فرائض انجام دیے۔ اپنی شخصیت،

---

۱ مصحفی نے دیوان ششم کے دیباچے میں آتش، ناسخ اور ان کے ایک نسبتاً غیر معروف معاصر طالب علی عیشی کے "روئیہ شعر گوئی" کی تقلید کا خود اعتراف کیا ہے۔

۲ مصحفی جمادی الثانی ۱۱۶۰ھ (مارچ ۱۷۵۰ء) میں ملبھ گڑھ میں پیدا ہوئے (تفصیل کیلئے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون "مصحفی کا سنہ ولادت" مطبوعہ ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ شمارہ ۸ اپریل سنہ ۱۹۶۲ء) اور کم سنی ہی میں اپنے والدین کے ساتھ امروہہ چلے آئے۔ ۱۱۸۶ھ سے قبل ان کا دہلی پہنچنا کسی مستند ذریعہ سے ثابت نہیں۔

۳ "در زبان اردوئے ریختہ قریب صد کس امیر زادہ و غریب زادہ بحلقۂ شاگردی من آمدہ با تقید و فصاحت و بلاغت را از من آموختہ" ریاض الفصحا، ص ۲۸۷۔

کی اس ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی بنا پر انھیں تذکرہ نویسی کیلئے جتنے بہترین مواقع حاصل تھے وہ کم ہی لوگوں کو میسّر آسکے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنی لیاقت اور استعداد کے مطابق ان مواقع سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا ان کے تصنیفی و تالیفی کارناموں کی فہرست میں تین تذکروں کی موجودگی اس حقیقت پر شاہد ہے۔ ان تذکروں میں انھوں نے زیادہ تر انھیں شعرا کا ذکر کیا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے "تذکرہ ہندی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"بیشتر دراں ذکر معاصرین است کہ احوال ہر یکے بچشم خود دیدہ و بہ حسن و قبح مراتب سخن ہر کس دا رسیدہ و کم کم احوال بعضے متقدمین نیز بطریق تیمن صورت اندراج یافتہ" (ص ۴)

تعارف میں تفصیل یا اختصار کا انحصار انھوں نے بھی ذاتی واقفیت یا عدم واقفیت پر رکھا ہے۔ چنانچہ خاتمے کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ۔

"احوال اکثرے ازیں بہ شرح و بسط مسطور است و احوال بعضے از متقدمین کہ کما ینبغی آگاہی بر اوقات آنہا نبود، بطور بیاض سمت تحریر یافتہ" (ص ۲۴۷)

مصحفی کی بیان کردہ اس صورت حال کی وضاحت کے بعد یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کس حد تک گردیزی، قائم چاندپوری اور میر حسن کے تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے[1]۔ گردیزی کے

---

[1] میر کے تذکرے سے بھی مصحفی یقیناً ناواقف نہ ہوں گے لیکن نہ تو ان کے یہاں کوئی حوالہ ملتا ہے اور نہ کہیں انھوں نے اس سے اپنی واقفیت ظاہر کی ہے۔

تذکرے کا حوالہ بقاء اللہ بقا کے حال میں[۱] (ص ۴۳) قائم کے تذکرے کا ذکر محمد حسین کلیم (ص ۱۹۷) اور میر قمر الدین منت (ص ۲۳۰) کے ترجموں میں اور میر حسن کے تذکرے کے حوالے محمد یار خاکسار (ص ۸۸)۔ عبد الرسول نثار (ص ۲۵۵) اور عسکری نالاں (۲۶۰) کے حالات میں موجود ہیں۔ مولوی قدرت اللہ قدرت (و شوق) کو بھی انھوں نے مولف "تذکرۂ ہندی گویان" کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے (ص ۱۷۵) لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تذکرہ (طبقات الشعرا) ان کی نظر سے گذرا بھی تھا یا نہیں۔

دریافت احوال کی ان تمام سہولتوں کے باوجود جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے مصحفی نے شعرا کے سوانح حیات کی تفصیل کو بہت کم اہمیت دی ہے۔ انھوں نے اپنے لیے مورخ یا سوانح نگار کی بجائے نقاد سخن کا منصب پسند کیا ہے۔ اس مناسبت سے اسکی بحث ایک مخصوص دائرے میں محدود ہوتی ہے۔ ان کی توجہات زیادہ تر اس پس منظر اور ماحول کی بازآفرینی اور ان واقعات و واردات کے بیان پر مرکوز رہتی ہیں جن کے زیر اثر فن کار کی شخصیت نشو و نما پاتی ہو اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ وہ ایسے تمام واقعات کو جن کا شاعر کے فن سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا، یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ سالہائے ولادت و وفات کی تحقیق پر وہ سنین عمر کے اندازے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے طریق کار کی روشنی میں شعور

---

[۱] مصحفی کا بیان ہے کہ "شیخ مذکور در تذکرۂ فتح علی خاں حسینی ... بطوع و رغبت خود، خود را شاگرد میر درد نویسانیدہ" لیکن اس تذکرے کے مطبوعہ نسخے میں بقا کا ذکر نہیں۔

کی بالیدگی اور فن کی پختگی کے باہمی رشتے کی تلاش کے لیے یہی کافی ہے مثال کے طور پر اپنے بعض تلامذہ کے متعلق ان کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں۔

(الف) تنہا: "محمد عیسیٰ نام دارد۔ وطن بزرگانش شاہجہاں آباد و خودش در لکھنؤ تولد یافتہ۔ عمرش قریب بست و ہفت رسیدہ جوانِ صلاحیت شعار خوش اطوار۔ از ابتدائے عمر بسبب موزونیٔ طبع چیزے موزوں می کرد۔ حالا آنچہ گفتہ می گوید از نظر فقیر می گزراند۔۔۔ شوق مرثیہ خوانی و گفتن سلام ہم دارد و در روزگار در فرقہ سپاہ گری بسر نماید۔" (ص ۵۱)

(ب) تسلی: "لالہ ٹیکا رام پسر گوپال رائے بخشی برادر خورد لالہ بھولا ناتھ کہ خدمت دیوانی کچہری و بخشی گری فوج نواب وزیر بکلی تعلق بایشان دارد۔ جوانے است مہذب الاخلاق خصوصاً اہلِ کمال ہر فن بہ تواضع و تعظیم پیش می آید۔ وطن بزرگانش موضع کرہل قریب بہ اٹاوہ و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ چوں از ابتدائے عمر ذوق موزونیٔ شعر لعنیس خاطر بود حالا کہ بفضل الٰہی سن عمرش از بست و پنج تجاوز خواہد بود شعر ہندی و فارسی بہ سلیقۂ تمام می گوید اما در بند شہرت نیست اکثر مثنوی ہا و دواوین اساتذہ جمع ساختہ و انتخاب زدہ نویسانیدہ۔ چنانچہ فقیر ہم یک دیوان فارسی و دو دیوان ہندی خود مع تذکرۂ فارسی حسب الارشاد نوشتہ دادہ و دیوان اول فقیر را در عالم مکتب نشینی کہ فقیر دراں روزہا نو وارد ایں شہر بود، از کمال اشتیاق آدم فرستادہ

طلبیدہ بدست خود در عرصہ قلیل نقل گرفتہ اگرچہ ذہانتِ طبعش چنداں محتاج مشورہ نیست اما احتیاطاً اشعار فارسی را از نظر مرزا محمد فاخر مکین می گزراند و دہ پانزدہ غزل ہندی کہ گفتہ مناسبگی آں موقوف بر رائے فقیر داشتہ "

(ج) خلیق "میر مستحسن خلیق برادر خورد میر احسن (خلق) از شانزدہ سالگی شوق شعر پیدا کردہ چیزے بخیال خویش موزوں می کرد و درست و نادرستش را والد بزرگوارش (میر حسن) درست کردہ می داد اما آنہم در عالم خورد ی زیادہ از ذہنش معلوم می شد۔ چوں دراں ایام فقیر تازہ وارد ایں شہر بود مشارٌ الیہ (میر حسن) بعد ملاقات چند محظوظ شدہ برائے ازدیاد بنائے خلت د دواد آں عزیز ایش من فرستاد و آموختہ کرد کہ ایشاں دریں فن نظیر ندارند اکنون کہ فرصت وقت است تمامی توانی چیزے از ایشاں بیاموز۔ مومی الیہ انقیادِ امر والد ماجد را واجب شمردہ۔ بر خصوصی شوق روز افزوں اکثر حاضر می باشد و مشورہ شعر از من می گرفت۔ بندہ مناسب شعر و مناسب طبعش بہ شعر دریافتہ در ہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ فرصت خواہد داد خوب خواہد گفت " (ص ۹۰)

(د) رنگین " سعادت یار خاں رنگین پسر طہماسپ بیگ خاں تورانی کہ مشارٌ الیہ در عہد نواب نجف خاں مرحوم اقتدار کلی داشت جوانِ فہمیدہ و سنجیدہ ۔۔۔ ہر چند چنداں بہرہ از علم

ندارد، اما ذکاوت طبعش بر صاحب علمان غالب۔ در ایام
آغاز شوق شعر تا در دہلی بود، شعر خود را از نظر شاہ حاتم علیہ الرحمہ می
گزرانید۔ حالانکہ بفضل الٰہی در نظم کلام ترقی و اتیاز تمام پیدا کردہ
از راہ انصاف دیوان خود را از اول تا آخر بہ نظر مؤلف
در آوردہ۔ کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ۔ چوں مزاجش عشق
باز افتادہ اکثر قطعہائے خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بسلک
نظم کشیدہ۔ ہمیشہ بہ حضور مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ
بہادر بہ ادام قبالہ حاضر می باشد و تقرب و اتیاز تمام دارد۔" (ص ۱۰۱)

(ہ) صبا۔ "لالہ کانجی مل صبا۔ تخلص قوم کایستھ وطن بزرگانش فیروز آباد
خود ش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ فقیر در ایامیکہ وارد ایں
شہر بود، چندے حسب اتفاق بر مکان ایشاں اقامت
داشت مشار الیہ دراں ایام بہ مقتضائے موزونی طبع شوق
شعر پیدا کردہ چیزے کہ بزبانِ خود می گفت، آنرا از نظر فقیر
باعتقاد تمام می گزرانید، تا اینکہ در عرصہ قلیل دیوان مختصرے
درست ساخت طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود۔
اگر عمرش وفا می کرد، زیادہ ازیں قدم بر جادۂ ترقی می نہاد
اما حیف کہ بعمر بست و پنج سالگی در عین جوانی مدقوق شدہ
در گزشت۔" (ص ۱۴۱ - ۱۴۲)

(د) منتظر۔ "میاں نور الاسلام منتظر تخلص، ولد شاہ فیض علی عرف پیر غلام
... جوان صلاحیت شعار ونو آراستہ مزاج و شوریدہ سر
است تحصیل عربی تا مرف و نحو دارد و اکثر کتب درسی نظم و نثر

فارسی ہم بخوبی خواندہ۔ از دہ۔ دوازدہ سالگی طبع موزوں داشت بچوں شعر و حسن توامان است در ہماں ایام شباب جائے تعلق خاطر بہم رسانیدہ تا دہ دوازدہ سال دیگر خود را بہ تقاضائے دلفریبی محبوب مصروف فکر شعر داشتہ، اوقات شبانہ روزی را مثل مجنوناں صرف می کرد۔ از ہشت سال برائے مشورۂ کلام خویش پیش فقیر آمد و شد دارد۔ ہرگز دریں عرصہ باوجود کم ملاقاتی و فصل سال و ماہ مثل دیگراں رجوع بہ طرف دیگر نہ کردہ اگرچہ بعض اشخاص ذہانت طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ او را بہ طریقے بہ حلقہ بیعت خویش کشند، ہرگز التفات نہ کردہ تا آنکہ بہ برکت راسخ الاعتقادی خویش بہ مقام والائے شاعری رسیدہ حالا برائے کلہ شکنی آنہا برابر من موجود است۔۔۔ غرض کہ از شاگردان رشید ایں خاکسار بے مقدار است عمرش تا امروز بیست و پنج سالہ باشد: (ص ۳۰۴)

ہر استاد کو اپنے لائق اور باصلاحیت شاگردوں کے ساتھ ایک قسم کی جذباتی وابستگی ہوتی ہے جس کے تقاضوں کو وہ ان سے متعلق گفتگو کے وقت نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مصحفی کے یہ بیانات بھی اس تعلق خاطر کے اثرات سے خالی نہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس خصوصی توجہ کی جھلک یہاں نظر آتی ہے وہ دوسرے مقامات پر معدوم ہے۔ مصحفی نے ان تمام لوگوں کے ذکر میں جن کے حالات سے کما حقہ' واقف اور مرتبہ سخن سے پوری طرح آگاہ تھے، اسی مفصل بیانی کا ثبوت دیا ہے۔

ہم یہاں اس قسم کی صرف تین مثالیں پیش کریں گے۔

(الف) میر حسنؔ:۔ میر غلام حسن، حسنؔ تخلص ولد میر غلام حسین ضاحک

وطن بزرگانش ہرات است و خود مش در شاہجہان آباد

تولد یافتہ و بہ عمر دوازدہ سالگی قضا او را بہ طرف پورب

انگندہ بقیہ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانیدہ۔ در سرکار

نواب سالار جنگ بہادر یعنی بہ رفاقت سردار جنگ بہادر

خلف نواب موصوف ممتاز بودہ۔ چوں از اوائل عمر طبعش

موزوں بود، اکثر خود را مشغول بایں شغل خطیر می داشت

و شعر خود از نظر میر ضیاء الدین ضیاؔ کہ در آں ایام

ایشاں از مستعدانِ زمانہ دریں دیار بودند می

گذرانید، بعد ازاں کہ دور دورۂ مرزا رفیع شدہ و

زبانِ ریختہ چنانکہ بود زیادہ براں دریں دیار رواج

یافت بحکم قوتِ ممیزہ قدم بر جادہ مستقیم اساتذہ

مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر دردؔ، مرزا رفیع سوداؔ و میر

محمد تقی میرؔ گذاشتہ .. .. دیوان ضخیم و مثنوی ہائے

متعدد در سلکِ نظم کشیدہ .. .. .. تا زندہ بود

با فقیر بسیار رابطہ دوستی درست داشت۔ در عشرۂ ماہ

محرم رحلت او ست۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد

بود۔ فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔ تاریخ

چوں حسنؔ آں بلبل خوش داستاں۔ رو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود نطقش مصحفیؔ۔ شاعر شیریں زباں تاریخ یافت

(ص ۶۸-۶۹)

(ب) شاہ حاتم: "شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد مولدش
شاہجہاں آباد است۔ تاریخ تولدش بقولے از
حرف "ظہور" بر می آید۔ ہمیشہ عمدہ معاش بودہ اوقات
بخوبی گذرانیدہ۔ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان
زادیانِ قدیم بود روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن
دوم فردوس آرام گاہ دیوانِ ولی در شاہجہاں آباد
آمدہ و اشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ
با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے
شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاش
مضمون تازہ می دادیم۔ غرضکہ از شعرائے متقدمین
است۔ در ایامے کہ فقیر در شاہجہاں آباد
طرح مشاعرہ انداختہ، اکثر بعد مغرب در مشاعرہ
قدم رنجہ می فرمود و در مجلسِ نشستہ زمانہ سابق خود
را می ستود۔ الحال کہ در دورۂ ما زبانِ ریختہ بسیار
بپاکیزگی و عمدگی رسیدہ، مشار الیہ ہم مرتبہ سخن
تازہ گویانِ فہمیدہ دیوان قدیم خود را از طاقِ دل
انگندہ دیوانِ جدید بزبانِ ریختہ گویانِ حال ترتیب
دادہ "دیوان زادہ" نامش گذاشتہ، اما بہ سبب
طوالت عمر بعض مردم دوردست را اکثر اشتباہ حاتم
دوم می افتاد برطرف کردہ بکور اشعار را ہم جدا

جدا از سرخی بر سر ہر غزل نوشتہ وایں ایجاد اوست وزینکہ درازیِ عمر و قدامتِ شعر از ہمہ پیشتر است نغمہ سنجان حال و وضیع و شریف اور ا استادِ مسلم الثبوت می دانند بلکہ او خود اسمی کسانیکہ از اول تا آخر استفادۂ شعر ازو گرفتہ اند، بر دو سہ ورق بطریق فہرست بر پشت سر لوح دیوانِ خود نوشتہ چسپائیدہ تا معلوم کساں گردد کہ حاتم ایں قدر شاگرد داشت و در آنجملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ باتفاق ہمہ یکے از سرآمد شعرائے ہندی گویان ایں دیار گذشتہ، مسطور است والحق کہ دروغ نیست قیاس استادیش ازیں جا باید کرد، ونیز برآں میر محمد تقی میر کہ شاعرے است جادو کار اکثر اورا درمشاعرہ بطریق ظرافت " دار الشعراء " می گفت چوں دو چار جزو مسودہ شعر فارسی ہم بطور صائب داشت لہذا بیشتر ازیں در تذکرۂ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ۔" (ص ۸۰۔۸۱)

(ج) قائم چاندپوری: قیام الدین علی (عرف محمد قائم)، قائم تخلص، اگرچہ وطنش قصبہ چاندپور است اما بسببِ توسل نوکری ہائے بادشاہی اکثر در شاہجہان آباد می بود و در السار زمانہ در توپ خانہ ہم اسامی داشت بمقتضائے موزونی طبع واستعداد درست، آنچہ کہ موزوں می کرد، از نظر مرزا رفیع می گزرانید و بہ خواجہ میر درد نیز اعتقاد

داشتہ، فقیر او را در ایامِ ذو موی بہ لباسِ درویشی در سرکار نواب محمد یار خاں کہ دراں روزہا تازہ وارد بود دیدہ ... ... دراں ایام باعث قصیدہ خواندو نوکر شدن مولف در سرکار نواب موصوف ایں بزرگ شدہ بود با فقیر در عرصۂ قلیل بسبب سلیم مزاجی و نسبت تام شاعری رابطۂ شدید بہم رسانیدہ۔ کاغذ ہائے مسودۂ اشعار نواب را کہ برائے اصلاح پیش او می آمد از کم دماغی بدست مشورۂ فقیر می داد چنانچہ سہ ماہ بہ ہمیں طور یکجا گزرانیدہ ایم و شام و چاشت بر یک سفرہ کردہ ... الحاصل بعد برہم خوردن آبادی کھیٹو و صورت گرفتن کار فیض اللہ خاں رامپور والا بہ سرکار نواب احمد یار خاں پسر نواب موصوف دخیل شدہ چیزے موافق زمانہ تقرر داشت۔ اما اوقاتش دراں بہ فراغت نمی گزشت۔ لہذا برائے رہا کردن دیہات قدیم ملک دیوبہ وغیرہ قصبہ مذکور در لکھنؤ گزر افگندہ وا زراجہ ٹکیت رائے بہادر شقہ جات و پروانہ جات بنام عامل آنجا درست گنانیدہ بودہ بود کہ بعد فائز شدن بر مطالب اجلش در رام پور رسید و خبر وفاتش شہر بہ شہر انتظار یافت :(ص ۱۷۹ - ۱۸۰)

پچھلے صفحات میں نقل کیے ہوئے تعارفی خاکوں کے برخلاف ان میں سے پہلے دو اقتباسات میں تواریخ و سنین کے حوالے دینے کی بھی کوشش کی

گئی ہے :"تذکرہ ہندی" میں اگرچہ اس قسم کے حوالوں کی تعداد بے انتہا
قلیل اور ناقابلِ لحاظ ہے۔ لیکن اس قلت کی بنا پر تذکرہ میں خالص تاریخی
نوعیت کی معلومات کے فقدان کا شکوہ درست نہ ہوگا، کیونکہ مصحفی کے بیانات
میں ایسے قرائن بہر حال کثرت سے موجود ہیں جن کی روشنی میں تھوڑی سی
کد و کاوش کے بعد بہ آسانی زمانہ کا تعین کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ
تاریخ صرف سنین کے التزام کے ساتھ بیان کیے ہوئے واقعات کا مجموعہ
نہیں ہوتی۔ اس فضا اور ماحول کا مطالعہ بھی جس کے جلو میں ادب و زندگی
کا تیز گام قافلہ آگے بڑھتا ہے اس کے حدود میں شامل ہے۔ اس لحاظ
سے ہماری نگاہ میں مصحفی کا وقار کچھ اور بلند ہو جاتا ہے کیونکہ انھوں نے
اپنے دور کی ادبی فضا کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے تذکروں میں سمویا
ہے اس کی مثال ان سے قبل کے تذکرہ نگاروں کے یہاں کم نظر
آتی ہے۔

مصحفی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ بعض شعرا کے بارے
میں ان کے بیانات حد درجہ مختصر اور تشنہ ہیں۔ اس خیال سے کسی حد تک
ہم کو بھی اتفاق ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر واقعہ کی وضاحت بھی
ضروری ہے کہ ان کے یہاں جا بجا جس اختصار یا تشنگی کا احساس ہوتا
ہے وہ کلیتہً بے سبب نہیں۔ یہ بات تو مصحفی پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ
انھوں نے اس تذکرے میں کچھ شاعروں کے نام محض "بطریق تین"
شامل کیے ہیں۔ اس لیے کم از کم ایسے شعرا کے سلسلے میں ہمیں ان سے
قطعاً کسی تفصیل کی توقع نہ رکھنا چاہیے۔ دوسری بات جس کا لحاظ رکھے بغیر
ہم ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے، یہ ہے کہ "تذکرہ ہندی میں ایک

خاصی تعداد ان مشہور و معروف شعرا کی بھی ہے جنھیں وہ پہلے ہی شعرائے فارسی کی حیثیت سے "تذکرۂ عقد ثریا" میں متعارف کرا چکے ہیں۔ انھوں نے ان کے متعلق ان تمام باتوں کا جو وہاں لکھی جا چکی تھیں اس تذکرے میں دوبارہ ذکر کرنا ضروری نہ سمجھا۔ شاہ حاتم، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر اور مرزا مظہر کے نام اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان چاروں اساتذہ کے بارے میں "عقد ثریا" اور "تذکرۂ ہندی" کے مندرجات کو یکجا کر لیا جائے تو صنف تذکرہ کے محدود تقاضوں کے مطابق چند بہترین خاکے مرتب ہو سکتے ہیں۔

تیسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مصحفی حسن فکر کے پرستار اور ندرت بیان کے قدر شناس تھے۔ وہ کسی ایسے شعر کو جو ان کی نگاہِ انتخاب میں جگہ پا چکا تھا محض اس کے مصنف سے ناواقفیت کی بنا پر نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بعض شعرا کے اشعار انھیں مکتب نشینی کے زمانے سے یاد تھے، بعض لوگوں کا کلام کسی مشاعرے یا نجی صحبت میں سننے کا اتفاق ہوا تھا ان تمام صورتوں میں انھیں لامحالہ اختصار سے کام لینا پڑا اور اس کے نتیجے میں ان کے تعارفی بیانات میں تشنگی باقی رہ گئی، جس کا انھیں خود بھی احساس تھا تذکرے کے آخر میں ان کا یہ بیان کہ "احوال بعضے از متقدمین کہ کما ینبغی آگاہی بر اوقات آنہا حاصل نبود، بطور بیاض سمت تحریر یافتہ"، اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد مقامات پر اپنی مختصر نگاری کے اسباب کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثال کے لیے درج ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(الف) بیتاب: نمی دانم کہ بود ایں قدر دانم کہ شاگرد محمد تائم است

مقطعش کہ از زبانِ ایشاں شنیدہ بودم بیاد ماندہ۔"

(ص ۱۴۱)

(ب) صفا :۔ "ہیچ از نام و نشانش خبر ندارم۔ مطلعے از و بسمع رسیدہ۔" (ص ۱۴۱)

(ج) عشقی مراد آبادی :۔ "فقیر اور ادر آنولہ دیدہ بود۔ شعرے از و بہ خاطر است۔" (ص ۱۵۰)

(د) محشر بدایونی :۔ "ہیچ از احوالش خبر ندارم یک غزلش بر بیاض کہنہ کہ از مدتے پیش فقیر است مسطور بود چوں اندکے در سلیقہ سخن درست می نماید، حوالہ کاغذ کردہ شد۔" (ص ۲۲۸)

(ہ) نجف :۔ "ہیچ از نام و نشانش خبر ندارم۔ دو سہ غزلش بر بیاض نوشتہ دیدم چوں رہ بہ درستی داشت نقل گرفتہ شد۔" (ص ۲۶۲)

مصحفی کی بعض تحریروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ نو مشق شاعروں کے نام محض ہمت افزائی کی غرض سے اس تذکرے میں شامل کر لیے تھے۔ درحقیقت ان کا مفصل تعارف مقصود نہ تھا اس ضمن میں ہم "ریاض الفصحا" سے صرف ایک قول کا حوالہ دیں گے جو میر سعادت علی تمکین سے متعلق ہے لکھتے ہیں :۔

"دو شعر ایشاں حسب اتفاق در تذکرہ ہندی از قلم آمدہ بودند دراں روزہا ایں قدر نشو و نما نمی داشت۔"

(ریاض الفصحا ص ۵۸)

شاعر کی افتاد طبع، اس کے عادات و خصائل اور سیرت و کردار کا اس کے فن پر اثر پڑتا ہے۔ مصحفی اس رمز سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شخصیت کے ان پہلوؤں کے مطالعے پر کافی زور دیا ہے۔ بالخصوص مزاج و طبیعت کی ان حاوی خصوصیات کے متعلق اظہار خیال میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے جن کی روشنی میں کسی خاص صنف سخن یا نئی تحریک سے شاعر کی دلچسپی کے اسباب و علل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سطور ذیل میں اس قسم کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(الف) بقا اکبرآبادی: "جوانِ سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع دیدمش طبع شوخش بطرفِ ہجو بسیار مائل افتادہ در شاہجہاں آباد با میر درد و در لکھنؤ با مرزا معرکہ گیری ہا کردہ۔"

(ص ۴۳)

(ب) محمد پناہ خاں حکیم: "جوان خوش خلق و خوش اختلاط و عاشق پیشہ و دل بدرد رسیدہ دیدمش۔" (ص ۴۸)

(ج) خواجہ میر درد: "جامع جمیع فنون عربیہ (عربیہ) بود و در فقر و توکل و استغنا نظیر نداشت۔ شمہ بیان بے پروائش این کہ روزے حضرت ظل سبحانی برائے زیارت ایشاں آمدہ بودند بعد نشستن در مجلس عذر درد پا بمیاں آوردہ اند کہ پا را دراز ساختند مشارٌ الیہ از مشاہدہ این حالت این منغض شدہ این قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پا دراز ساخت۔" (ص ۹۲-۹۳)

(د) مرزا عظیم بیگ عظیم :- " چند روز در فرخ آباد کسوت قلندری بر خود راست (کردہ بود) حالا باز در لباسِ دنیائی آمدہ فقیر او را در شاہجہاں آباد دیدہ ... اکثر در مشاعرہ ہا می آمد و بر صدرِ مجلس می نشست۔ دعویٰ شاعری خیلے ۔ در دماغش جا داشت، ہیچ کس را بخاطر نمی آورد۔ خود را از ہمہ ممتاز می دانست با آں کہ ہیچ علم و فن ندارد ... (ص ۱۴۹-۱۵۰)

(د) قدوی لاہوری :- " دعوائے شاعری خیلے در دماغش جا داشت و زیادہ از مرتبہ شاعری قدم در راہِ امرد پرستی می گزاشت۔ چند جا خانہ جنگی ہم کردہ و بہ کود کان حسین تعشق در زیدہ اکثر اعضائش دیدم کہ مجروح بودند در ایامیکہ از شاہجہاں آباد در لکھنؤ آمد در آں روز ہا فقیر در آنولہ بود کہ شورشِ او بسمع رسیدہ آخر روزے برائے دیدنش رفتم او باشش چند گرد او نشستہ دیدم ... (ص ۱۶۶-۱۶۷)

(د) نواب محبت خاں محبت :- " جوانیست بزیور فضل و کمال و حلم و حیا آراستہ و در علم آداب و طریقِ سلوک و تہذیب اخلاق بہ اعالی و ادانی ظاہر و باطنش بہ یکتائی پیراستہ ... بندہ او را در لکھنؤ دیدہ بسیار بخوبی پیش می آید ... " (ص ۲۱۳)

ان بیانات میں مصحفی کے حسن وصفِ خاص کی جھلک شروع سے

آخر تک نمایاں ہے وہ ان کی حق گوئی اور راست بازی ہے۔ انھوں نے بیجا تعریف اور بے سبب تنقیص دونوں ہی سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ وہ جہاں محاسن سیرت و اخلاق کے اعتراف میں فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں وہیں ان کے اندر شخصیت کے ناپسندیدہ پہلوؤں کے محاسبے کی جرأت بھی موجود ہے۔ لیکن نہ تو انکی ستائش قصیدہ سرائی کے حدود میں داخل ہوتی ہے اور نہ ان کے احتساب کا لہجہ میر کے انداز گفتگو کی طرح درشت اور زہرناک ہوتا ہے۔

تنقید کلام کے معاملے میں بھی مصحفی نے اپنی دیانت داری، احتیاط پسندی اور اصابت رائے کا بھرم قائم رکھا ہے۔ وہ ان لوگوں کی ... شاعری کے بارے میں جن کے سرمایہ فکر پر ان کی نگاہ پوری طرح حاوی نہ تھی بالعموم کوئی رائے ظاہر نہیں کرتے لیکن جن شاعروں کے دواوین یا دوسری منظوم تصانیف ان کی نظر سے گزر چکی تھیں یا مشاعروں یا نجی ملاقاتوں میں بار بار ان کے اشعار سننے کا موقع ملا تھا، ان کی فنی کاوشوں کے حسن و قبح اور مرتبہ و معیار سے اپنے قارئین کو ضرور آگاہ کرتے ہیں۔ فکر و نظر کی آزمائش کے اس میدان میں ان کی آمد بڑی پُراعتماد اور پُر وقار ہوتی ہے۔ وہ اساتذہ کی خدمات کا پوری وسیع القلبی کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں لیکن ان کی عظمت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ احباب اور معاصرین کے کلام کے متعلق صحیح رائے دیتے ہیں صرف دوستی کا حق نہیں نبھاتے نوجوان تلامذہ اور نومشق فن کاروں کے کمالات کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں مگر ان کی تعریف و توصیف میں مبالغے سے کام نہیں لیتے۔ مختصر یہ کہ مصحفی صرف سخن فہم ہیں، ان کی تنقید ذاتیات کی سطح سے بلند اور ان کی تحسین و تنقیص ٹھوس بنیادوں پر مبنی ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل شاعروں کی

ان خصوصیات کا اندازہ ہوگا۔

(الف) بقا اکبرآبادی :۔ "در غزل وغیرہ تلاش بسیار می کند اما در قصیدہ خیلے ید طولیٰ دارد۔ ہر چہ می گوید بسیار بتلاش و علو می گوید۔ اما در گفتن غزل بطی است ۔۔ ۔۔"

(ص ۔ ۳۴)

(ب) میر حسن :۔ "قدم بر جادۂ مستقیم اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی میر ۔۔۔ گذاشتہ کلام خود مرتبہ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوانِ ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ۔ الحق کہ کار کار اوست۔ قطع نظر از بلاغتِ شاعری زبانش بسیار با مزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ" (ص ۶۸)

(ج) سودا :۔ "در عصر خویش سر آمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ بعضے او را درین فن بہ ملک الشعرائے پرستش می کنند بعضے بسبب دریافت اغلاط صریح و تواردِ صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ نیز نسبت می دہند غرض ہر چہ بود در رواں طبع نظیر خود نداشت غزل ہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و ہجو ہا و مثنوی ہائے متعددہ وغیرہ نگاشتہ خامۂ خیالِ نقش بر صفحۂ روزگار یادگار است ۔۔ ۔۔ اگر در شمال

بندی اشعار غزل صائب و تتبعش گویم بجا است و اگر در علوم مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی دعصر) گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست۔ حالا ہر کہ گوید بیرو تتبعش خواہد بود"

(ص ۱۲۵)

(د) قائم چاند پوری:۔ "در پختگی کلام و چستی مصرعہ غزل در دیہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ روش بدوش استاد (مرزا سودا) راہ می رود بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید"۔ (ص ۱۷۹)

(ہ) مرزا مظہر:۔ "در دور ایہام گویان اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔ ۔ ۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوۂ ظہور می دہد فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ بر این وتیرہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است لجدہ تتبعش بہ دیگراں رسید"۔ (ص ۲۰۳)

(و) میر تقی میر:۔ "اگر در فن ریختہ او را در پلہ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند واکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ برو فضیلت می دہند غرض ہر چہ ہست استادی ریختہ برو مسلم است ۔ ۔ ۔ ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستغنے امی دانند و الحق کہ چنیں است (ص ۲۳۷)

(ز) کنور سین مضطر۔ "در طبعش رسائی بسیار معلوم می شود اما از بے اطلاعیٔ طرزِ شعر و محاورۂ زبان ناچار است۔ اگر چندے مشقِ سخن بہ سلیقہ شاعری خواہد کرد، البتہ بجائے خواہد رسید" (ص ۲۴۲)

(ح) صغیر علی مروت: "نگاہ گاہے کہ ذکر شعر می کنند دراں تلاشِ معنی ہائے تازہ منظور می دارد۔ اکثر غزلش قصیدہ طور است۔ یک دو قصیدہ کہ گفتہ خیال بندی را در و بطور سلیم وسعت دادہ۔ دریں کار ردیف مرزا رفیع پیش نہادِ خاطرِ اوست ... یک دو داستان (دہم) بہ دیدۂ مثنوی میر حسن در سلک نظم کشیدہ" (ص ۲۴۵)

(ط) نوا، بدایونی۔ "قصیدہ را بسیار بہ متانت و پختگی بہ سرانجام می رساند معہذا طرزِ نظم قصیدہ اش بہ سبب اندراج لغات عربی و فارسی از ابنائے زماں جدا است و بسیار فرق دارد۔ الحق کہ دریں کار ہر کہ با او درافتادہ شکستِ فاحشہ خوردہ" (ص ۲۶۳)

(ی) یقین۔ "در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ، ایں جواں بود۔ بعد ازاں تتبعش بہ دیگراں رسیدہ" (ص ۲۷۵)

تذکرۂ ہندی کی ایک اور خصوصیت جو ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر کی

ادبی ماحول کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس زمانے میں نوابین و سلاطین کے درباروں اور امرا و رؤسا کی ڈیوڑھیوں کو سیاست و حکومت کی طرح ادب و تہذیب کے میدان میں بھی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اکثر و بیشتر ادبی سرگرمیوں کا محور یہی دربار اور ڈیوڑھیاں ہوتی تھیں یہیں سے مشاق اور باصلاحیت سخنوروں کے جوہر چمکتے تھے اور یہیں تمام معاصرانہ چشمکوں اور حریفانہ معرکوں کا آتش فشاں تیار ہوتا تھا۔ ہر نواب اور رئیس کی سرکار سے چند شاعروں کی وابستگی ایک لازمی امر تھی شعراء و امراء یا ادب اور دربار کے اس قریبی تعلق کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ اہل ہنر اپنے معاشی استحکام اور سماجی اعزاز کے لیے اہل دول کی دست نگری پر مجبور تھے بلکہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صاحب اقتدار افراد شعراء کی پرورش اور سرپرستی کو شان امارت کا ایک جزو اور شہرت و بقائے نام کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ مصحفی کے یہاں درباری زندگی کے اس پہلو کی جگہ جگہ نمایاں ہے۔ نواب محمد یار خاں امیر رئیس ٹانڈہ ضلع رامپور کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ

"درایامیکہ بہ ترغیب حکیم سنبھلی شوق شعر ہندی دامن دلش رابموئے خود کشید خطے بہ طلب میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد چوں دراں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان خاں رند، تخلص بہ صیغہ شاعری عز و امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن الیشان بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود، اتفاق نیفتاد۔ آخرکار میاں محمد قائم کہ دراں ایام در بسولی بودند حسب الاشارۃ آمدہ شرف ملازمت آں والا جناب دریافت و بدر ماہی بکصد

روپیہ عزّ و امتیازش دادہ بہ استادیش برداشت و علیٰ ہذا القیاس دیگر سخن سنجان مثل فدوی لاہوری و میر محمد نعیم، نعیم تخلص و پروانہ علی شاہ پروانہ مراد آبادی و میاں عشرت ہرال و حکیم کبیر صاحب کہ از قدیم در سرکارش بودند فقیر حقیر مصحفی از حاضران مجلس او بودند ہر وقت کہ غزل طرح می فرمودند بسر انجام می رسانید۔" (ص ۱۴۳)

شہزادہ سلیمان شکوہ کے ذکر میں بھی مصحفی نے زیادہ تر زور قلم ان کی ادب نوازی اور ہنر پروری کی تعریف پر ہی صرف کیا ہے۔ مندرجہ ذیل بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس غریب الدیار شہزادے کے دربار میں مرکزِ سلطنت سے دوری اور دولت و اقتدار سے محرومی کے باوجود ارباب سخن کے لیے کس قدر سامانِ کشش موجود تھا۔ لکھتے ہیں کہ۔

"بمقتضائے موزونیِ طبع ۔ ۔ ۔ اکثر رخشِ خیال را در میدانِ فصاحت می تازند و شعرِ خوب را از ہر کہ باشد دوست می دارند در ایامیکہ حکم ترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود و اکثرے از کار دانانِ ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند، ایں فقیر حقیر ہم یاران شدہ بود چنانچہ درہمان تاریخ و بحلقہ ملازمان حضور درآمد و بعدِ چندے از کلامِ فقیر محظوظ شدہ در جائزۂ قصائد مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیتِ عیدین بودند، بہ انعام تبریک کہ سر احقر را از حضیض خاک با درجِ افلاک رسانیدند و ہم چنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعد سہ چہار ماہ دولت ملازمت حاصل نمودہ، بہ نوازشِ خسروانہ درآمدہ و

نیز نوکر شدہ و میر تحوز ... ... در اوائل شاعرہ بہ انعام یک شالہ زیکسہ ہو سر فرازی یافتہ ... و میر انشاء اللہ خاں کہ بہ نائب و مختار حضور یعنی خاں صاحب و قبلہ خان زاد (خانہ زاد) خان بہادر کہ ایشاں در شعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند، صیغۂ اخوت خواندہ اند، ہمیشہ مورد گوناگوں الطاف خسروی کامی باشند و چند بار با انعام لائقہ تبادگو شوارۂ سر جاہات برا فراختہ اند۔ حق تعالیٰ ایں قدر شناس شعرا را کہ دریں زمانہ دوں قدر سخن با خاک یکساں شدہ بر تخت سلطنت و جہاں بانی زود مسلط گرداناد ... ...

(ص ۱۲۱)

درباروں سے باہر عام ارباب ذوق اور اہل سخن کی بزم آرائیاں خدمت زبان و ادب کا ایک ذریعہ اور شعر و شاعری کی مقبولیت کا ایک نشان تھیں۔ مصحفی نے ایسی متعدد محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ دلی کے زمانہ قیام میں وہ خود اپنے مکان پر ایک مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تھے[۱]۔ ثناء اللہ خاں فراق کو بھی اس قسم کی مجلسوں کے اہتمام سے کافی دلچسپی تھی[۲]۔ لکھنؤ میں مصحفی کی آمد کے بعد سب سے پہلے مرزا رضا قلی آشفتہ نے مشاعرہ منعقد کیا۔[۳] ان مشاعروں کو جہاں بہت سے نامور اساتذہ اپنی موجودگی سے رونق بخشتے تھے وہیں ان کے شرکا میں ایک بڑی تعداد بساط سخن کے تازہ

---

[۱] مصحفی نے میر امانی اسد (ص ۱۶)، امین الدین خاں امین (ص ۱۹ و ۲۰)، غلام اشرف اشرف (ص ۲۰) اور دوسرے کئی شاعروں کے حالات میں اس مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔

[۲] اکثر بانی صحبت مشاعرہ ہا او بود (ص ۱۰۷)

[۳] در ایامیکہ فقیر از شاہجہاں آباد در لکھنؤ آمدہ اول طرح مشاعرہ او انداختہ (ص ۱۸ و ۱۹)

دار دین کی بھی ہوتی تھی۔ تہذیب، فکر و فن کے نقطہ نظر سے قدیم و جدید کا یہ
اتصال جو اہمیت رکھتا ہے وہ شرح و بیان کی محتاج نہیں۔

"تذکرہ ہندی کا یہ جائزہ نامکمل رہے گا اگر ان خامیوں اور فروگزاشتوں کا
ذکر نہ کیا جائے جو اس تذکرے میں بعض جگہ نظر آتی ہیں۔ مصحفی نے چونکہ
زیادہ تر ذاتی معلومات اور چشم دید حالات و واقعات کے بیان سے سروکار
رکھا ہے اس لیے ان سے بہت کم لغزشیں ہوئی ہیں پھر بھی کہیں کہیں ان کے
بیانات صحت اور صداقت کے معیار پر پورے نہیں اترتے، یا ان میں تحقیق
و تلاش کی کمی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے مثلاً

(الف) جوشش عظیم آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

محمد عابد جوشش تخلص ... فقیر او را ندیدہ دو شعر از و
بہم رسیدہ ایں است۔

تمھارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی
برنگِ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ رہتا ہے مدام آبدیدہ"

(ص ۶۰)

محمد عابد اور جوشش دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ اول الذکر کا تخلص دلؔ
اور ثانی الذکر کا نام محمد روشن ہے[1]۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے مصحفی نے جس
طرح کسی غلط فہمی کی بنا پر ان دونوں بھائیوں کے نام و تخلص کو باہم
مخلوط کر دیا ہے۔ اسی طرح ان سے اشعار کے انتخاب میں بھی

(۱) مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں خود بھی محمد روشن جوشش اور محمد عابد دل کو دو مختلف
شاعروں کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے (ص ۶۸، ۹۳)

لکی ہوئی ہے۔ ان کے نقل کئے ہوئے ان شعروں میں سے پہلا شعر محمد عابد دل کا ہے[۱] اور دوسرا محمد روشن جوشش کی تصنیف ہے[۲]۔

(ب) حزیں کے بارے میں مصحفی کا بیان ہے کہ۔

"از نامش خبر ندارم۔ از دورِ فردوس آرام گاہ کسے خواہد بود سہ شعرش از عالم مکتب نشینی بیادماندہ است۔

اس بے وفا کے عشق میں کچھ ہم کو جس نہیں
پاؤں تلک بھی اس کے ہیں دسترس نہیں

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہم
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

اس فصل گل میں کیوں نہ گریباں کو کیجے چاک
جاتی ہے یوں بہار حزیں ہائے بس نہیں (ص ۹۷)

یہ اشعار میر محمد باقر حزیں اکبرآبادی شاگرد مرزا مظہر کی تصنیف ہیں۔ مصحفی کی ان کے نام و نشان سے بے خبری لاعلمی سے زیادہ بے توجہی پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کا مفصل ذکر گردیزی اور میر حسن کے تذکروں میں مع ان اشعار کے موجود ہے[۳] اور یہ تذکرے "تذکرہ ہندی" کی ترتیب سے قبل مصحفی کی نظر سے گذر چکے تھے۔

(ج) شاہ حاتم کی نسبت رقم طراز ہیں کہ۔

---

[۱] تذکرہ شورش مخطوط لندن ورق ۱۰۶ الف و تذکرہ عشقی مخطوط لندن ورق ۸۰ الف

[۲] دیوان جوشش مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۸۴

[۳] گردیزی کے یہاں صرف پہلے دو اشعار شامل انتخاب ہیں (ص ۴۶) لیکن میر حسن نے ان تین شعروں کے علاوہ اس غزل کے مزید دو شعر نقل کئے ہیں (طبع ثانی ص ۸۰)

"عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود سہ سال است کہ در شاہجہاں آباد ودیعت حیات سپردہ" (ص ۸۱)

مصحفی کے اپنے بیان کے مطابق حاتم کا سال تولد لفظ "ظہور" کا ہم عدد یعنی ۱۱۱۱ھ ہے[1] اور ان کی وفات رمضان المبارک ۱۱۹۷ھ میں ہوئی ہے[2] اس حساب سے انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۶-۸۷ برس کے درمیان قرار پاتی ہے جسے "قریب بہ صد" کہنا کسی طرح درست نہیں۔

(د) فدوی لاہوری کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

"گویند بقال پسرے بود نو مسلمان شدہ و بہ غلامی مرزائے نام بر آوردہ .. .. مرزا محمد رفیع در ہجو او کہ مذکور بقال و بوم آوردہ ایں کنایہ دلیل ساطع بر مقولۂ مولف است .. .. بعد شکست ضابطہ خاں در سکرتال .. .. یا اجل طبعی در قصبہ مرادآباد درگزشت" (ص ۱۶۶-۱۶۷)

طبقاتِ سخن میں مبتلا میرٹھی نے فدوی سے اپنی ملاقات اور دوستانہ تعلق کا ذکر کرنے کے بعد ان کے بارے میں مصحفی کے اس بیان کو کہ وہ ایک بقال کے بیٹے اور کسی مغل کے غلام تھے "غلط محض" قرار دیا ہے[3] ان کی اطلاع کے مطابق وہ (فدوی) بمرزیح مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے[4] اس کے علاوہ ان کے بیان سے مصحفی کے اس

---

[1] عقد ثریا۔ ص ۲۳ و تذکرہ ہندی ص ۸۲ [2] عقد ثریا۔ ص ۲۳

[3] "آں چہ مصحفی ادراور تذکرہ خود بقال پسر و غلام مغل نوشتہ، محض غلط است۔" طبقات سخن مخطوطہ شاہجہانپور ص ۱۸۸

[4] ایضاً طبقاتِ سخن مخطوطہ شاہجہانپور ص ۱۸۸

قول کی بھی تردید ہوتی ہے کہ ندوی نے اجل طبعی سے مراد آباد میں وفات پائی لکھتے ہیں کہ

"آخر در بریلی۔ آمد برکے از افغان پسر فریفتہ شدہ از دست رقیب بہ تیغ بے دریغ شہید گشت[1]"

مولوی قدرت اللہ شوق مولف طبقات الشعرا بھی آنولہ (ضلع بریلی) میں دو ایک مرتبہ ندوی سے مل چکے تھے۔ ان کے بیانات بھی مصحفی کے کسی قول کی تائید نہیں کرتے۔ مبتلا کے برخلاف اگرچہ انھوں نے ندوی کی موت کا سبب "بیماری تپ لرزہ" کو ٹھہرایا ہے[2] لیکن جائے وفات کے سلسلے میں دونوں تذکرہ نگاروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

"مثنوی بوم و بقال" کے متعلق بھی اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ سودا کی نہیں ان کے شاگرد میر فتح علی شیدا کی تصنیف ہے[3] اس لیے سودا سے اس کے انتساب کو بھی مصحفی کے حقائق سے بے خبری پر محمول کیا جائے گا۔

(۵) قمرالدین منت کی تاریخ وفات مصحفی نے درج ذیل مصرعے سے نکالی ہے۔ ع

"منت کجا ز مزمۂ شاعری او" (ص ۲۳۰)

---

[1] ایضاً طبقات سخن مخطوطہ شاہجہاں پور ص ۱۸۸

[2] قریب دو ماہ شد کہ از بیماری تپ و لرزہ در بریلی فوت شد۔ طبقات الشعرا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ورق ۱۱۶۔

[3] مرزا محمد رفیع سودا، ص ۲۸۹-۲۹۹۔

اس مصرعے سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے لیکن مصحفی کے فرزند میر نظام الدین ممنون کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "غروب" کے مطابق ان کا سال رحلت ۱۲۰۸ھ ہے۔ ممنون نے اپنے نظم کردہ قطعۂ تاریخ میں ان کے سنین ولادت و وفات اور عمر کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔[۱]

کہا میں نے ممنوں سے اے خوش بیاں
نہ گردِ سخن تیرے پھٹکیں عیوب
ترا مطلعِ دیں پہ منت جو تھا
ضیا بخش بہرِ چراغِ قلوب
ولادت، سنِ عمر، رحلت کا سال
بیاں کر تو اس کی، وہ بولا کہ خوب
ولادت کو، "خورشید والا" سے دیکھ
"کواکب"، سنِ عمر رحلت "غروب"

یہ اور ان جیسی دوسری غلطیاں تاریخی اعتبار سے اتنی اہمیت ضرور رکھتی ہیں کہ حقائق و واقعات پر نظر رکھنے والا کوئی شخص بھی ان سے بآسانی صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود چونکہ تذکرہ ہندی میں ان کا تناسب اس قدر کم ہے کہ غائر تجربے کے بعد بھی ایسی تمام لغزشوں یا غلطیوں کی تعداد دس بارہ سے آگے نہ بڑھ پائے گی۔ اس لیے ان کی بنا پر نہ تو مصحفی کی احتیاط پسندی ہی سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ ان کے تذکرے کی مجموعی قدر و قیمت پر ہی کوئی حرف آتا ہے۔

---

[۱] کلیاتِ ممنون مملوکہ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال ورق ۲۰۴ ب

زبان کی سادگی اور انداز بیان کی صفائی کے لحاظ سے بھی مصحفی اکثر تذکرہ نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے قافیہ بندی اور تشبیہات و استعارات کے خارزار میں نہ الجھ کر نہایت سلیس و سادہ مگر دلکش زبان میں اپنے خیالات و معلومات کا اظہار کیا ہے، تذکرہ نویسی کے لیے ان کا یہ اسلوب تحریر ایک معیار اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

ریاض الفصحا

یہ مصحفی کا تیسرا اور آخری تذکرہ ہے۔ پہلے دو تذکروں کی طرح یہ تذکرہ بھی انجمن
ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام ۱۹۳۴ء میں جامع برقی پریس دہلی سے چھپ کر شائع
ہوا ہے۔ تصحیح متن اور مقدمہ نگاری کے فرائض مولوی عبدالحق صاحب نے انجام دیے
ہیں[1]۔ سبب تالیف کے سلسلے میں مصحفی کا بیان ہے کہ:-

درین ولا نظر بہ کثرت موزوں طبعان حال کردہ بخاطر گذرانیدم
کہ اگر یک تذکرہ دیگر تالیف نمائی، اغلب کہ امثال، این گروہ نیز
حروف تہجی را وفا کند۔ این بگفتم و کمیت قلم را در عرصہ تحریر احوال و
اشعار شعرا جولان دادم۔ آنانکہ در تذکرہ ہندی و فارسی من نیستند
آن ہر دو فریق را در جلد ثانی در آوردم۔ آنانکہ در تذکرہ ہندی
فارسی من نیستند آں ہر دو فریق را جلد ثانی در آوردم۔ تا جامع جمیع اسما باشد

گویا یہ تذکرہ "عقد ثریا" اور "تذکرہ ہندی" کے تکملے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصحفی
نے اس میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق تین سو بائیس (۳۲۲) شاعروں کا ذکر
کیا ہے[2]۔ جن میں سے دو سو بہتر (۲۷۲) خالصتہً ریختہ گو ہیں۔ پینتیس

---

[1] عقد ثریا، تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا تینوں کے ساتھ ایک ہی مقدمہ شامل ہے جو ۱۸ نومبر
۱۹۳۳ء کو حیدرآباد میں لکھا گیا۔

[2] مطبوعہ نسخے میں تین سو اکیس (۳۲۱) شاعروں کا ذکر ہے۔ رائے بھگوان داس ہندی کا ترجمہ
اس میں شامل نہیں لیکن خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے مخطوطے میں جس پر نسخے کا عکس مبنی ہے
ان کا مختصر حال مع ایک فارسی شعر کے موجود ہے (ملاحظہ ہو ورق نمبر ۱۳ ب)

(۳۷) شاعروں کا صرف فارسی کلام پیش کیا گیا ہے۔ اور تیرہ (۱۳) شاعروں کے انتخاب میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار شامل ہیں۔ ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر سابقہ تذکروں (عقد ثریا اور تذکرہ ہندی) میں بھی آچکا ہے۔ یہاں جن حالات کے تحت ان کے نام دہرائے گئے ہیں ان کی نوعیت لطف علی بیگ آذر اور شاہ نصیر دہلوی کے متعلق درج ذیل بیانات سے ظاہر ہوتی ہے۔ آذر کے حال میں لکھتے ہیں :-

"غالب احوال ایشاں در تذکرۂ فارسی نوشتہ باشم۔ دریں روز غزلے از مرزائے مذبور بہم رسیدہ چوں عاشق کلام اہل ولایتم، دو شعر ازو انتخاب کردہ ہم نوشتم"۔ (ص ۱۷)

شاہ نصیر کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ :-

"در تذکرہ اول (تذکرہ ہندی) بہ سبب بہم نہ رسیدن کلامش دو شعر سماعی نوشتہ بودم لہذا چوں دریں نزدیکی دو سہ بار شاہ الیہ بہ این جا آمدہ در غزل ہائے طرحی شریک مجلس یاران شدہ، آنچہ از کلامش بیاد فقیر ماندہ، آں را نوک قلم دادم"۔ (ص ۲۲۷، ۲۲۸)

"ریاض الفصحا" اس تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۲۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام مصحفی نے لالہ چینی لال حریف کے قطعے سے اخذ کیا ہے۔ حریف مصحفی کے "راسخ الاعتقاد شاگرد" تھے اور اس تذکرے کی ترتیب میں ان کی خواہش بھی شامل تھی۔ دیباچے کے آخر میں ان کا قطعۂ تاریخ نقل کرتے ہوئے مصحفی نے لکھا ہے۔

"تاریخ این تذکرۂ لالہ چینی لال حریف کہ آغازش بہ تکلیف مومی الیہ بود، چنیں یافتہ ۵

صد شکر کہ ایں ذخیرۂ اہل سخن — شد انجمن سپہر را رشک افزا
از خامہ فکر خود بر آورد حریف — سال تاریخ او "ریاض الفصحا" ۱۲۲۱ھ

تذکرے کے خاتمے پر زمانۂ تالیف سے متعلق مزید دو قطعات اس طرح پیش کیے گئے ہیں :

تاریخ خاتمہ (کہ) تازہ گفتہ شد، این است ؎

در سواد اعظم ایں تذکرہ — ماند از رفتار چوں پائے قلم
یافتم تاریخ ختمش مصحفی — یادگار خامۂ جادو رقم

قطعۂ تاریخ دیگر کہ شاگردم مرزا رمضان بیگ طپاں[1] ...... گفتہ نیز دریں فرخندہ دفتر نوشتہ شد اینست ؎

طپاں چوں از پے تاریخ ایں جلد — درِ معنی بہ سلکِ نظم سفتہ
نمودہ قطع پائے ہند ناگاہ — طلسمات خیال ہند، گفتہ
۱۲۳۶ = ۱۲۴۱ - ۵ھ
(ص - ۳۷۸)

ان دونوں قطعات کے مادہ ہائے تاریخی سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتا ہے چونکہ یہ دونوں قطعے تذکرے کے آخر میں منقول ہیں اور ان سے حاصل شدہ سنہ ابتدا میں نقل کیے ہوئے قطعے سے مستخرجہ سنہ سے مختلف ہے اس لیے عام طور پر یہ رائے قائم کرلی گئی ہے کہ "ریاض الفصحا" کا آغاز ۱۲۲۱ھ میں اور اتمام ۱۲۳۶ھ ہوا۔[2] ہمارے نزدیک یہ خیال محض

---

[1] کتب خانہ خدا بخش پٹنہ کا قلمی نسخہ انھیں رمضان بیگ طپاں کا لکھا ہوا ہے اس نسخہ کا سال کتابت ۱۲۳۶ھ ہے۔

[2] مثال کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ دستور الفصاحت از جناب امتیاز علی عرشی ص ۸۶ اور "مصحفی کے تذکرے" از جناب نثار احمد فاروقی سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ شمارہ جون ۱۹۵۵ء ص ۱۱۴)

سرسری انداز سے پر مبنی ہے۔ کم از کم تذکرے کے ان اندراجات سے جو گذشتہ سطور میں نقل کیے گئے ہیں، کسی طرح اس کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اسکے برخلاف دیباچے کے اس جملے میں کہ "آمازش بہ تکلیف مومی الیہ (لالہ چینی لال حریف) بود،" لفظ "بود" اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ دیباچہ یا اس کا زیر بحث آخری حصہ کام کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ حریف کے قطعے کے پہلے مصرعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت انھوں نے تاریخ کہی ہے یہ "ذخیرۂ اہل سخن" ایک مکمل کتاب کی صورت میں ان کے سامنے موجود تھا۔ جہاں تک آخر کے دو قطعات کا تعلق ہے ان میں سے بھی مصحفی کے اپنے قطعے کے ساتھ "تازہ گفتہ شد" کی صراحت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ نظر ثانی سے فراغت کی تاریخ ہو نقش اول کی تاریخ تکمیل نہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "ریاض الفصحا" کا ابتدائی مسودہ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء ہی میں تیار ہو گیا تھا، ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں چند شاعروں کے حالات کا اضافہ کر کے اسے آخری شکل دی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید ان قرائن سے بھی ہوتی ہے جن کی روشنی میں مختلف شاعروں کے تراجم کا زمانۂ تحریر متعین کیا جا سکتا ہے۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء اور ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کے درمیانی عرصہ میں اگر کچھ اضافے کیے بھی گئے ہیں تو وہ نمایاں نہیں۔ ہم کو کافی تلاش و جستجو کے بعد اس قسم کی صرف ایک مثال بھیروں داس تمنا کے حالات میں ملی ہے جن کے بارے میں مصحفی نے لکھا ہے کہ:

"بعد از دوازدہ سالگی خیال موزوں کردن شعر ہندی در سرش افتاد اول مشورۂ سخن بہ میاں محمد عیسیٰ تنہا کہ خداایش بیامرزد، می کرد بعد چندے بہ شاہ الیہ ایشاں از حیق حیات خود پیش فقیر حاضر

ساختہ بحلقۂ تلامذہ دیگر در آوردہ باعث فزونی اعتبار کردہ ۔ ۔ ۔

عمرش تا امروز بست و شش سالہ خواہد بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۶۲، ۶۳)

محمد عیسیٰ تنہا کا انتقال ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں ہوا ہے[1]۔ تمنا اس سے پہلے ہی مصحفی کے شاگرد ہو چکے تھے اور اس وقت ان کی عمر انیس سال سے متجاوز تھی لیکن جس زمانے میں "ریاض الفصحا" میں ان کا حال لکھا گیا ہے وہ تقریباً چھبیس برس کے تھے۔ اگر ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں تنہا کی وفات کے وقت ان کی عمر کم از کم بیس سال فرض کر لی جائے تو ان کا یہ ترجمہ ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء کی تحریر قرار پائے گا۔

مصحفی نے اس تذکرے میں اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے گمان غالب یہ ہے کہ انہیں دوسرے تذکروں سے استفادے کی ضرورت بھی کم ہی پیش آئی ہوگی کیوں کہ یہاں انھوں نے جن لوگوں کو متعارف کرایا ہے ان میں ایک بڑی تعداد ان شعرا کی ہے جو ان کے سلسلۂ تلمذ میں منسلک یا انکے احباب و معاصرین کے شاگرد تھے[2]۔ اس کے علاوہ بہت سے شاعر وہ ہیں جن کو پہلی مرتبہ کسی تذکرے کے صفحات پر جگہ ملی ہے مثال کے طور پر

---

[1] تاریخ وفات ناسخ کے اس مصرعے سے نکلتی ہے۔ ع

آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا = ۱۲۲۲ھ

کلیات مصحفی نسخۂ پنجاب یونیورسٹی میں بھی ایک قطعۂ تاریخ ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

از سر آہ ایں نخوا بکشید گنج معنی سنجا کہ پنہاں شد = ۱۲۷۸ + ۱ - ۵۷

۱۲۲۲ھ ۱۲۷۸

[2] متذکرہ شعرا میں سے سٹھ شاعر براہِ راست مصحفی کے شاگرد ہیں اور ۴۸ شاعروں کا سلسلۂ تلمذ ایک واسطے سے ان تک پہنچتا ہے۔ تقریباً اتنی ہی تعداد ان کے احباب اور معاصرین کے تلامذہ کی بھی ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش، مرزا محمد رضا برق، مظفر حسین ضمیر (مرثیہ گو) طالب علی عیشی امنور خاں غافل، ہدی علی ہدہی (ملک الشعرا ہدی علی خاں ذکی)، شیخ محمد بخش ہجور، سعادت خاں ناصر (صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبا) شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ وزیر جیسے اساتذہ سب سے پہلے اسی تذکرے کے ذریعے اردو تنقید و تاریخ کے افق پر نمودار ہوئے ہیں۔ دریافتِ احوال اور حصولِ معلومات میں دوسروں کی مدد سے بے نیازی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متذکرہ شاعروں میں سے بیشتر کسی نہ کسی اعتبار سے لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اس تذکرے کی تکمیل تک مصحفی اپنی عمر کے تقریباً اڑتیس سال (۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء - ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء) گزار چکے تھے شعر و ادب اور بزم آرائی سے انھیں جو دلچسپی تھی اس کے پیشِ نظر اپنے ان ہم مشربوں سے ان سے زیادہ اور کون واقف ہو سکتا تھا۔

شامل تذکرہ شعرا سے اتنی قریبی واقفیت کے باوجود مصحفی کی توجہات حالاتِ زندگی کے بیان سے زیادہ اشعار کے انتخاب پر مرکوز رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اگرچہ ان کا قول یہ ہے کہ

"احوال ہر یک را بقدر لیاقت ہر کس چنانکہ رسم تذکرہ نویسان است بنگاشتم"۔ (ص ۲)

لیکن عملاً انھوں نے اس اصول پر کاربند رہنے کا ثبوت کم ہی دیا ہے چنانچہ جا بجا "بقدر لیاقت ہر کس" کی شرط "بقدر خواہش خود" سے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض شاعروں کے کلام کے طویل انتخابات بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ مولف کا اصل مقصد پسندیدہ اشعار کی تدوین و ترتیب ہے اور تاریخی تفصیلات ان کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں ہم صرف تین شاعروں کے تراجم بطور مثال پیش کریں گے جن کی روشنی میں

اشعار و احوال کے درمیان اس عدم تناسب کی بنیادی وجہ یا حالات سے بے خبری کے باوجود کلام کی پیشکش کے محرکات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

(الف) میر کلو شاعر:- "... چوں کلام ایشاں دراں روزہا کہ تذکرہ اول (تذکرۂ ہندی) می نوشتم بہم نہ رسید، لہٰذا از موضوع القلم ماندند۔ حالا از جائے شعرے بہم رسیدہ برائے یادگار بہ طریق ندرت نوشتہ شد"۔ (ص ۵۴۸)

(ب) آغا محمد عاشق:- "خیلے خوش فکر گذشتہ مطلعے از وے در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام۔ غزلے دریں روزہا ہم بہم رسیدہ، بنوک قلم دادم"۔ (ص ۴۱۰)

(ج) وارفتہ:- "جوانے دیدم در مشاعرہ میاں صدر الدین از قوم کایستھ، تخمیناً عمرش سی سالہ خواہد بود۔ وارفتہ تخلص می نمود۔ کاغذ اشعارش بدست آمدہ۔ از وے چیزے نقل گرفتہ شد"۔ (ص ۷۵۳)

کلام سے عشق کی یہ کیفیت جس کا اظہار ان بیانات سے ہوتا ہے "عقد ثریا" اور "تذکرۂ ہندی" میں بھی کارفرما ہے لیکن وہاں مصحفی نے حالات اور اشعار کے درمیان جو تناسب برقرار رکھا ہے، وہ اس تذکرے میں تقریباً مفقود ہے۔ یہاں سوانح حیات سے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، وہ بالعموم تشنہ اور ناکافی ہیں: ان کے مطالعے سے نہ تو شاعر کی شخصیت کا کوئی بھرپور نقش ابھرتا ہے اور نہ اس ماحول اور پس منظر کو سمجھنے میں بقدر ضرورت مدد ملتی ہے جس کے زیر اثر فنکارانہ صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اس عمومی صورت حال سے یہ اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے کیا جا سکتا ہے:-

(الف) برق :- "مرزا محمد رضا برق تخلص خلف الصدق مرزا کاظم علی، سرآمد صلحائے فرقہ اثنا عشریہ، جوانِ شجاع و مہذب اخلاق و موزون الطبع و شائق فن و مداحِ سخن دیدمش بشاگردی شیخ امام بخش ناسخ عزّ و امتیاز دارد۔ عمرش تخمیناً قریب بسی خواہد بود"۔ (ص ۵۲)

(ب) جوآن :- "مرزا کاظم علی جوآن تخلص، سکنۂ شاہجہاں آباد جوآن بسیار خلیق است در مشاعرہ کمتر قدم گذاشتہ۔ چندے رفیق مرزا سیف علی نیز بود، چندے بہ فیض آباد بسر بردہ، حالا در کلکتہ رفتہ است"۔ (ص ۱۷)

(ج) شرف :- "میر محمدی شرف تخلص کہ حالِ درویشی بر خود درست داشت۔ شخص سنجیدہ و فہمیدہ دیدمش۔ دو بار بنائے مشاعرہ در شاہجہاں آباد گذاشتہ و یارانِ موزوں طبع را خواندہ۔ بندہ ہم مشاعرہ ایشاں رفتہ بود"۔

(ص ۱۴۵)

(د) شوق :- "مولوی قدرت اللہ مرحوم، شوق تخلص ساکن رامپور فاضل متبحر بود، بمقتضائے موزونی طبیعت فکر شعر ہم می نمود و آنجا نظیر خود نداشت۔ اکثر مردم آن نواح بحلقہ شاگردیش آمدند[1]"۔ (ص ۱۵۰)

---

[1] شوق کا اصل وطن موضع سوتی (من مضافات سنبھل ضلع مراد آباد) تھا۔ تذکرہ طبقات الشعراء مؤلفہ شوق نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد۔ ورق ۱۰۶ ب) مصحفی انھیں مولوی قدرت اللہ قدرت مولف تذکرہ ہندی گویان کے نام سے تذکرہ ہندی میں بھی متعارف کرا چکے ہیں (ص ۱۷۵) وہاں انھوں نے ٹانڈہ (ضلع رام پور) میں ان سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۵) عشرت :- "میر غلام علی عشرت تخلص، ساکن صوبۂ بریلی، جوانِ کثیر الکلام است۔ دیوان ہا، مثنوی ہائے متعدد دارد۔ عمرش تخمیناً چہل سال خواہد بود۔" (ص ۲۲۸)

(۶) غفلت :- "احمد خاں غفلت، قوم افغان یوسف زئی ساکن رام پور، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق مصنف تذکرۂ ریختہ گویانِ قدیم۔ جوانِ مہذب الاخلاق است۔ از آں شہر خود محض برائے ملاقات فقیر در لکھنؤ آمدہ بود۔ در قصائد و مثنوی داد معنی بندی می دہد۔ و در غزل (طرحی مشاعرہ اینجا کہ (کہ اینجا) گفتہ بود، انتخاب آں بنوکِ قلم می دہد ....." (ص ۲۴۲ تا ۲۴۳)

(۷) ہندی :- "ہندی علی مراد آبادی قوم شیخ سکنہ مراد آباد، جوانِ قابل و دانا ست۔ در فارسی و ہندی ہر دو زبان فکر می کند و بر شاعری خود غرور کمال دارد۔ روز ہائے کہ از شہر خود در لکھنؤ گذر افگند، بہ ملاقات فقیر ہم آمدہ بود۔ عمرش تخمیناً از سی متجاوز خواہد بود۔"[1] (ص ۲۴۳ و ۲۴۴)

یہ مثالیں تعارف نگاری کے جس معیار کی نمایندگی کرتی ہیں "ریاض الفصحا" میں اس کے نمونے غالب اکثریت کے حامل ہیں۔ اس عام روش کے خلاف اگر مصحفی نے بعض شعرا کے ذکر میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے تو

---

[1] یہ ہندی علی خاں زکی مراد آبادی کا ذکر ہو۔ ممکن ہو ابتدا میں وہ ہندی تخلص کرتے ہوں لیکن مصحفی نے جن غزلوں کے اشعار نمونۂ کلام میں نقل کیے ہیں دیوان مطبوعہ میں ان کے مقطعوں میں بطور تخلص زکی ہی تاہو۔ ملاحظہ ہو کلیاتِ زکی مرتبہ زین العابدین خاں (ص ۶ ،۱۰۷: ۲۰۹)

ان سے کہیں زیادہ تعداد ان شاعروں کی ہے جن کے بارے میں وہ کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں[1]۔ اس غیر معمولی اختصار یا حالات سے عدم واقفیت کی مثالیں بعض اوقات اس تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہیں کہ تذکرہ پر بیاضِ اشعار کا گمان ہونے لگتا ہے مثلاً ردیف جیم میں کل آٹھ شاعروں کا ذکر ہے جن میں سے پہلے پانچ شعرا کے تراجم حسب ذیل ہیں۔

(۱) جوہر:۔ "میرزا احمد علی جوہر تخلص از دست۔

شاید کہ پہنچے واں تلک واماندہ ہم سا کوئی
آوارۂ بیاباں اے گردِ کارواں ہو" (ص ۶۷)

(۲) جنوں:۔ "شاہ غلام مرتضیٰ جنوں تخلص از دست۔

آفت جاں ہو گئی آخر یہ بینائی مجھے
جو بلا کہیے سو ان آنکھوں نے دکھلائی مجھے
جنوں کا یاں تلک تھا گرم بازار کہ یوسف بھی ہوا اس کا خریدار

(ص ۶۷)

(۳) جرأت:۔ میر شیر علی جرأت تخلص، از قدماست۔ از دست۔

نہ اپنے چھٹنے کی کس طرح تدبیر میں رہیے
بہار آئی ہے کیوں کر خانۂ زنجیر میں رہیے (ص ۶۸)

(۴) جوشش:۔ "میاں محمد روشن جوشش تخلص، از قدماست۔ از دست

تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا
ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا

---

[1] ایسے شاعروں کی تعداد ۹۶ یعنی ۳۰ فی صدی کے قریب ہے۔

دل میں ہے اب تڑپ میں آئینہ سا پیدا کر دل
وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اسے دیکھا کروں

ہم چشم کیوں کہوں میں اسے لالہ زار کا
عالم ہی کچھ جدا ہے دلِ داغدار کا" (ص ۶۸)

(۴) جریح:- "جریح تخلص، شاگرد مذنب است۔ از وست۔
ہوا ہوں دیکھ کر کشتہ میں پان خوردہ دہن اس کا
مرے مرقد پہ رکھیو جائے گل لعلِ بدخشاں کو
سمجھتا ہی نہیں عاشق کو اپنا جاں فشاں ہرگز
بھلا کس طرح سمجھاوے کوئی اس طفلِ ناداں کو
کہا مجنوں نے آ دے گا ادھر گر ناقۂ لیلیٰ
مژہ سے صاف کر دوں گا میں کوسوں تک بیاباں کو
شریک حال میرے کیوں نہ ہووے رنج میں اکثر
قرابت نالۂ دل سے ہے میری آہِ سوزاں کو" (ص ۹۲)

ردیف میم سے اسی قسم کے اختصار کی کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) مشتاق:- "میر احسن مشتاق تخلص از دست۔
اپنی ہم بندگی پہ بھولے تھے
پر جو دیکھا وہاں خدائی ہے" (ص ۲۷۸)

(۲) مشتاق:- "مرزا ابراہیم بیگ مشتاق تخلص از دست۔
ہوئے دامِ محبت میں تو اپنی داد کو پہنچے
نہ کر افسوس اے صیاد ہم فریاد کو پہنچے
(ص [illegible])

(۳) منتظر :- "خواجہ منتظر تخلص[1]، از متوسطین است۔ از دست۔

تیرے تجھے میاں خواہ برے خواہ بھلے ہم
لے یار تو خوش رہ کہ ترے در سے چلے ہم

بے خود اتنا ہے نہ کچھ ایسا نہ کچھ تقریر ہے
منتظر کے ہاتھ میں شاید تری تصویر ہے" (ص ۲۷۹)

(۴) مجنوں :- "میر حمایت علی مجنوں تخلص

ڈرنا ہی مناسب تھا خونخوار کی آنکھوں سے
مارا نہ مجھے آخر کس پیار کی آنکھوں سے (ص ۲۷۹)

(۵) محسن :- "محمد محسن، محسن تخلص

عراز لگ رو اس قدر زرد ہے
کہ یاں زعفراں زار بھی گرد ہے" (ص ۲۷۹)

(۶) مخلص :- "میر باقر عرف مخلص علی خاں مخلص تخلص

آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے
دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے" (ص ۲۷۹)

(۷) مستمند :- "یار علی خاں مستمند تخلص

لگی ہے جس طرح میرے دلِ بیتاب میں آتش
نہ دیکھی ہو گی تو نے ایسی شمع خواب میں آتش (ص ۲۷۹، ۲۸۰)

(۸) ممتاز :- "حافظ علی ممتاز تخلص[2]

---

[1] منتظر کا نام خواجہ بخش تھا یہاں خواجہ کے بعد بخش غالباً سہو کتابت کی بنا پر قلم انداز ہو گیا ہے۔

[2] ممتاز کا پورا نام حافظ فضل علی ہے۔ وہ مرزا سودا کے شاگرد تھے۔ یہاں ان کے نام میں حافظ اور علی کے درمیان سے فضل غالباً سہو کتابت کی بنا پر حذف ہو گیا ہے۔

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا" (ص ۲۸۰)

(۹) مقبول :- "مقبول بنی، مقبول تخلص

پھیرے خدا قبول سے جی میرے یار کا
اتنا ہی مدعا ہے دلِ بے قرار کا" (ص ۲۸۰)

جن لوگوں کے تعارف مصحفی نے کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کیے ہیں، ان کے حالات زندگی کے بیان میں بھی ان کے یہاں کسی تاریخی نظم و ضبط کی پابندی نظر نہیں آتی کیونکہ چند مقامات کے علاوہ انھوں نے عام طور پر نہ تو واقعات کے ذکر میں سنین کے حوالے دیئے ہیں اور نہ ہر جگہ ابتدائی قسم کی تمام ضروری معلومات کی فراہمی کا اہتمام کیا ہے۔ تاہم تذکرے کے ان حصوں کو ان کی کوششوں کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند ایسے شاعروں کے بارے میں جو ان کے دامنِ فیض کے تربیت یافتہ تھے، ان کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں۔ "ریاض الفصحا" سے سوانح نگاری کی اس سے بہتر مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں۔

(الف) طپاں :- "مرزا رمضان بیگ طپاں تخلص، ولد مرزا رجب بیگ ابن مرزا داد بیگ، قوم مغل چغتہ، ساکن آسیون من مضافات صوبۂ اودھ سرکار لکھنؤ۔ جد بزرگ ایش در عہد سلاطین ماضیہ از مرو بہ ہندوستان جنت نشان شاہجہاں آباد آمدہ شرف آستاں بوس پادشاہی دریافتہ بخدمت چکلہ داری پرگنہ مذکور در معافی بعضے قریات متعلقہ آن سربراہیت برافراختہ و در آں قصبہ توطن اختیار

گردید و خود ش در بانگرمؤ بنجانۂ جد مادری خود تولد یافتہ و نشو و نما یافتہ و در آسیوں بہ سن تمیز رسیدہ۔ ... ... در ۱۲۲۸ھ از موطن خود برائے تلاش معاش وارد لکھنؤ گردیدہ چوں قوت علمی داشت، خود را بمقتضائے موزونی طبع بہ گفتن شعر فارسی و ہندی و نثر نویسی سلیس و عاشقانہ وغیرہ مصروف ساخت و رجوع برائے اصلاح بہ فقیر آوردہ و در مدت ہفت سال ہر دو زبان فارسی و ہندی را بلد شدہ۔ بالفعل در مشاعرہ ہا کلامش رونق تمام پیدا می کند و مورد تحسین و آفرین ہمسران می گردد۔ ... ... عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود۔" (ص ۱۸۲ - ۱۸۳)

(ب) عیاش :- "میر محمد یعقوب عیاش تخلص ولد میر محمد الور ... ... خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ بزرگانش متوطن شاہجہاں آباد و ہمیشہ نوکری خانۂ بادشاہی کردہ اند۔ چوں از ابتدائے جوانی بحکم موزونیٔ طبع شوق شعر گفتن در سر داشت، ملاقات، اساتذہ و صحبت ایشان غنیمت می شمرد۔ چنانچہ اکثر بخدمت میر محمد تقی صاحب فائدہ صحبت برداشتہ و شعر خود را در اوائل بمیر سوز مرحوم و در اواسط بہ میر قمر الدین منت مغفور مبرور نمودہ و درین ایام اواخر مشق بہ فقیر رجوع مشورہ آوردہ است ... ... عمرش از چہل متجاوز خواہد بود۔" (ص ۲۱۲ - ۲۱۳)

(ج) غافل :- "منور خاں غافل تخلص ولد صلابت خاں

افغان یوسف زئی، بزرگانش سکنۂ فیض آباد بودند و بہ
سرکار فیض آباد (فیض آثار) نواب شجاع الدولہ بہادر
بہ فرقۂ سوداگران عز امتیاز داشتند۔ خودش در لکھنؤ تولد
یافتہ نشوونمائے پیدا کردہ ۔۔۔ از ابتدائے موزونی
طبع در عالم مکتب نشینی چیزے بجائے (خود) موزوں
می کرد، آخر (معرفت) شاہ مظہر حق عاشق تخلص ۔۔ بحلقۂ
شاگردان جدید درآمد۔ چندے رنگ طرح مجلس شاعرہ
ہم ریختہ بجز ۔۔۔ اگر در برائے استفادہ (و) دریافت
اصلاح شعر از حضاران مجلس فقیر می باشد و بہ فقیر نسبت
دیگر شاگردان بسیار اعتقاد داشتہ بودہ است۔ عمرش
بست و پنج سالی خواہد بود[1] (ص ۲۳۲ و ۲۳۴)

(د) ناصر:- "مرزا بر علی بیگ ناصر تخلص ولد مرزا رستم بیگ
مولد و موطنش شاہجہان آباد و اصل بزرگانش سمرقند
جد ماجدش در عہد فرخ سیر وارد دہلی شدہ بہ منصب لائقہ
و بخطاب مغل خاں سرفرازی یافتہ۔ چوں مشار الیہ از
ابتدائے سن بلوغ موزونی طبع داشت و دراں ایام
چیزے کہ موزوں می کرد، آں را بہ شجاع اللہ خاں
فراق می گذرانید۔ درہنگامے کہ از دہلی بہ لکھنؤ رسید
و از افراق استاد بہ میاں آمد، بہ سبب سابقۂ معرفت و
اتحادے کہ میان من و ایشاں بود ۔۔۔ خواہش
مشورۂ کلامش بہ فقیر آورد و اعتقادے کہ بہ استاد

معاش گاہے بہ تجارت وگاہے بہ نوکری سپہگری کردہ۔ عمرش بست وپنج سالہ خواہد بود۔" (ص ۲۵۰ و ۲۵۱)

(۵) مسرور: "شیخ پیر بخش مسرور تخلص ولد حکیم حیات اللہ متوطن قصبہ کاکوری نواسۂ حکیم خیر اللہ...... پیش جد مادری خود در لکھنؤ پرورش یافتہ وفن طب آموختہ از ابتدائے سن بلوغ طبعش بہ اشعار اساتذہ بیشتر میل می نمود ودراں ایام خود ہم چیزے موزوں می کرد۔ کلام منظوم خود را بجائے خود نگاہ می داشت ودر پئے ایں بود کہ کدام استاد را بہ نظر بگذراند تا (بہ) حسن وقبح آں واقف شدم (شوم)، آخر بہ حسب اتفاق در ۱۲۲۰ھ رجوع بہ فقیر آوردہ حالا کہ مشق او براوزدہ سال رسیدہ...... ودریں فن از معاصرین خود پائے کمے نمی آرد...... عمرش تا امروز سی ویک سالہ خواہد بود۔"

(ص ۲۱۰، ۲۱۱)

یہ خاکے اپنی تکمیل کے لیے مزید رنگ آمیزی کے محتاج ہیں پھر بھی انکا مطالعہ قارئین تذکرہ کو زیر بحث شعرا کی زندگیوں کے متعدد اہم پہلوؤں سے متعارف کرا دیتا ہے، اس لیے ہم انھیں پست از معیار یا بے نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن "ریاض الفصحا" میں اس قسم کے خاکوں کی مجموعی تعداد بیس بائیس سے زیادہ نہیں۔ اس لحاظ سے ان کو بہر حال مستثنیات میں شمار کیا جائے گا۔

مختصر نگاری کے اس رجحان کے باوجود جس کے نتائج واثرات سے گزشتہ صفحات میں بحث کی گئی ہے۔ مصحفی نے جس معاملے میں کوتاہی یا بخل سے کام نہیں لیا ہے وہ سیرت وشخصیت کے اوصاف ومحاسن کی قدر شناسی

ہے۔ شرافتِ نفس، حسنِ اخلاق، تہذیب و شائستگی، متانت و سنجیدگی اور تعظیم و تواضع ان کے نزدیک وہ اعلیٰ انسانی اوصاف اور برگزیدہ قدریں ہیں، جن کی داد نہ دینا ان کی شریعت میں ناانصافی اور حق تلفی کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی اگرچہ وہ حسبِ معمول اختصار سے کام لیتے ہیں اور اپنے شاہدات و محسوسات کو خواہ مخواہ طول دینا پسند نہیں کرتے تاہم اس اختصار میں جامعیت اور مصورانہ دقتِ نظر پائی جاتی ہے۔ چند الفاظ کے ذریعے وہ اکثر ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو شاہد و مشہود کے درمیان سے زمان و مکان کے تمام پردے اٹھا دیتی ہے۔ درج ذیل مثالوں سے اس کیفیت کا اندازہ ہوگا

(الف) آتش :- "جوان وجیہ و مہذب الاخلاق است" (ص ۴)

(ب) امداد علی خاں امداد :- "جوانیست مجموعۂ قابلیت و اہلیت و معدن سخاوت و شجاعت" (ص ۳۹)

(ج) مظفر علی بریاں :- "جوانِ وجیہ و مہذب الاخلاق است ظاہر و باطنش بہ صلاح و سداد آراستہ دیدم و اخلاق کریمانہ و حالات پسندیدہ در ایام شباب از ایشاں بہ ملاحظہ در آمد۔ از بسکہ در فہم و ذکاوت طبع و قاد ایشاں بے نظیر افتادہ، گاہ گاہے کہ ارادہ بہ طرف نظم کردن شعر آوردہ، در بدایتِ کار نہایت نمودہ اند و با ایں ہمہ خود را شاعر نمی گیرند۔ ایں ہم از بلند ہمتی ایشاں است۔" (ص ۴۴ و ۴۵)

(د) عبد الرحیم زیبا :- "جوان مہذب الاخلاق و غریب با صلاح و سداد دیدمش" (ص ۱۰۴)

(ہ) میر کلو شاعر:۔ "مرد بزرگ و سنجیدہ و فہمیدہ بود .... کمال کسر نفسی در خود داشت۔" (ص ۱۴۴)

(و) صفدر علی صفدر:۔ "جوان صلاحیت شعار و مہذب الاخلاق است۔" (ص ۱۰۳)

(ز) ظہور محمد ظہور:۔ جوانے حلیم و سلیم و خود بیں و مہذب الاخلاق است۔" (ص ۱۹۳)

(ح) ناسخ:۔ "جوانِ سیمیں (سیم تن) و سپاہی وضع، حلیم الطبع و مہذب الاخلاق و درویش۔" (ص ۳۳۴)

(ط) نوازش حسین خاں نوازش:۔ "جوان مہذب الاخلاق و خود بیں و خوش اختلاط است۔" (ص ۳۳۹)

(ی) مستقیم خاں وحشت:۔ "جوانے قابل و طباع و ذہین و خلیق و متواضع است۔" (ص ۳۵۰)

سوانح زندگی سے متعلق معلومات کی طرح "ریاض الفصحا" میں کلام کی فنی و لسانی خصوصیات کے بارے میں تنقیدی مواد کی کمی بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحفی نے اس تذکرے میں زیادہ تر ان شاعروں کا ذکر کیا ہے جو سن و سال اور مشق سخن کے اعتبار سے تجربات کے بالکل ابتدائی مراحل میں تھے اور پختگی کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھیں ریاض کے کتنے ہی آتشکدوں سے گزرنا باقی تھا اس لیے ان کی کاوشوں کے معیار و منہاج کے متعلق کسی قطعی اور فیصلہ کن رائے کا اظہار نہ تو ممکن تھا اور نہ مناسب۔ البتہ بعض لوگوں کے ذوق و شوق اور ذہانت و طباعی کو دیکھتے ہوئے ان کے مستقبل سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں۔

مصحفی نے بھی ایسے معاملات میں یہی کیا ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:-

(الف) خواجہ آتش :- "در زبان نظم ریختہ ...... معاصرینش (را) سبقت بر دجستن خواہد می نماید اگر عمرش وفا کردہ و چند سالی بر ہمیں وتیرہ مشق سخن را بکار برد (؟) اعراض و انتقاص را ما کیے در پیش نیاید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد۔" (ص ۵)

(ب) الٰہی بخش الٰہی :- "شعر بیار شستہ و سادہ و عاشقانہ و عارفانہ می گوید ...... در طبعش رسائی کمال معلوم می شود اغلب ...... در چندے گوازِ معاصرین خود خواہد برد و شعر نشتر بدل زلش خول از دیدہ با خواہد ریخت۔" (ص ۶)

(ج) عبدالرؤف شہرت :- "ذہن رسا و طبع ممیزہ دارد۔ اگر چندے مشق نمود دریں فن (ریختہ گوئی) از بے نظیران روزگار خواہد شد۔" (ص ۱۶)

(د) مرزا مغل فریاد :- "از رسائی ذہنش معلوم می شود کہ اگر زمانہ فرصت داد، آخر بجائے خواہد رسید۔" (ص ۲۴۸)

کہیں کہیں شاعر کے مخصوص رنگ یا رجحانِ طبیعت اور معیارِ کلام کے بارے میں واضح اور اشگاف رائیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً :-

(الف) سیف علی خاں شگفتہ :- "در فصاحت و بلاغت و معنی بندی و سادہ گوئی از امثال زمانہ مردانہ نظیر خود ندارند۔" (ص ۱۰۵)

(ب) جینی پرشاد ظریف :- "

(ب) جینی پرشاد ظریف :- "شعر بہ متانت و فصاحت می گوید و مسدس و مخمس عاشقانہ دلکش بیار کہ بہ سلک نظم کشیدہ نا خن می

می زنند۔" (ص ۲۰۲)

(ج) عاصی دہلوی:۔ "بہ مقتضائے موزونئی طبع چیزے شکستہ بستہ موزوں می کند۔ ۔ ۔ اگرچہ زبانش درست است اما از محاورہ ریختہ بلد نیست۔" (ص ۲۲۳)

(د) منور خاں غافل:۔ "شعر بطور سادہ و پرکار می گوید و معنی تازہ نیز اگر می خواہد، می یابد، و در غزل سلامت کلامش شل سلک گوہر است۔" (ص ۲۳۲)

(ہ) مرزا علی نقی:۔ "شعرہا بہ فصاحت و بلاغت می گوید در تتبع ریختہ برابر فارسی رسانیدہ طرز عاشقانہ و معنی بند ہر دو بیاں خوب گوید۔ کلامش از غلطی پاک است۔" (ص ۳۰۰)

(و) محمد بخش واجد:۔ "ہدایت خیر بخش علی الرسم زمانہ بود۔ آخر بطور شوکت بخاری می سمند خیالش بہ طرف معنی بندی و نازک خیالی عطفِ عناں نمودہ" (۲۰۵)

شمالی ہند اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی ماحول، تہذیبی سرگرمیوں اور عوام و خواص میں اردو زبان اور اس کی شاعری کے نفوذ و اثر کی ترجمانی کے نقطۂ نظر سے اس تذکرے کا درجہ کسی طرح "تذکرۂ ہندی" سے کمتر نہیں۔ اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی نظام میں شاعروں کو جو مقام حاصل تھا اور صاحبانِ جاہ و ثروت جس طرح ان کی سرپرستی اور قدر افزائی میں فیاضی اور فراخدلی کا ثبوت دیتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے بیانات سے کیا جا سکتا ہے۔

(الف) اسد الدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی خلف

میرزا محمد امین نیشاپوری کے متعلق لکھتے ہیں:-

"از ابتدائے شوق موزوں طبعی تا الی الآن رجوع از تہِ دل به اہلِ کمال (زارد) وصاحبانِ سخن از عطیہ دست ازور بدست می آرند۔ ہر کس وناکس را محروم نمی گزارد۔" (ص ۵۴)

(ب) نواب جلال الدولہ مہدی علی خاں بہادر شجاعت جنگ متخلص بہ مہدی خلف نواب سعادت علی خاں بہادر کی نسبت رقم طراز ہیں:-

"در سرکار دولت ایشاں بعضے از صاحب کمالاں ایں فن بصیغۂ شاعری عز و امتیاز دارند۔ دراں جملہ فقیر ہم داخل است و پیش ازیں در حینِ حیات نواب (سعادت علی خاں) مغفور ہم باشرائے چند ملازم ایشاں ماندہ۔" (ص ۲۰۳)

عوام کی ادبی دلچسپی اور شعر و شاعری سے شغف کا اندازہ شعری محفلوں کے ذکر سے ہوتا ہے۔ شہر میں موقع بہ موقع مختلف لوگوں کے یہاں طرحی مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ تذکرے کی ترتیب کے آغاز سے چند سال قبل خود مصحفی نے اپنے ایک عزیز شاگرد محمد عیسیٰ تنہا (متوفی ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۷ء) کے ایما پر تلامذہ کی تربیت ذوق اور طبیعت کی جلاکاری کے لئے شہر سے باہر ایک "ویرانے" میں مشاعرے کی بنیاد ڈالی تھی[1] یہ مشاعرہ جس کی رونق تمام تر مصحفی کے شاگردوں کی رہینِ منت ہوتی تھی، دو تین برس جاری رہا۔ بالآخر میاں نور الاسلام منتظر کی ناگہانی موت (۱۲۱۷ھ/۳-۱۸۰۲ء) کے بعد اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مرزا محمد تقی ہوس بھی اکثر شاعروں کے انعقاد میں...

[1] مصحفی نے اس مشاعرے کی بعض تفصیلات تذکرے کے دیباچے میں بیان کی ہیں (ص ۲) اس کے علاوہ میر علی محمد راجح (ص ۱۰۳)، اور بندہ علی (بندہ علی) خشنود (ص ۱۰۲) کے حالات میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

بڑا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ہمدم کے ذکر میں مصحفی نے ان کے ایک شاعرے کی "شہر آشوبی" کا تذکرہ کیا ہے (ص ۳۰۳) اور اس کی طرحی غزلوں کے اشعار کئی شاعروں کے انتخاب میں نقل کیے ہیں[1]۔ مرزا محمد علی بیگ نامی کسی شخص نے ان غزلوں کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا (ص ۳۰۴) حسین علی خاں اثر، حکیم سید محمد، میر صدرالدین صدار، غلام اشرف، منور خاں غافل، مہر اللہ خاں غیور، میر مہدی کو خر، لالہ موتی رام، میرزا حاجی قمر اور مرزا محمد جان نالاں کو بھی شاعروں کے انعقاد سے دلچسپی تھی۔ تذکرے میں مختلف مقامات پر ان لوگوں کے یہاں منعقد ہونے والے شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔

شعروسخن کی متعدد محفلوں کے پہلو بہ پہلو مصحفی نے اس تذکرے میں ایک مجلسِ مناظرہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کی بنا نثر نگاری و انشا پردازی کے رجحان کو فروغ دینے کی غرض سے ڈالی گئی تھی۔ اس مجلس کی سرگرمیوں میں ہندو اہلِ قلم خاص طور پر پیش پیش رہتے تھے لیکن مصحفی اور ان کے تلامذہ کی شرکت کے نتیجے میں آہستہ آہستہ رنگ محفل بدلنا شروع ہوا اور بالآخر بات نظم کی نتحمندی پر ختم ہوئی۔ مرزا مغل فانی کے ذکر میں جو اس محفل کے بانی تھے مصحفی نے اس سلسلے کی بعض تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں:-

"اول جماعتے از ہنوداں (ہندواں) وغیرہ بہ تقریب نثر نویسی چہ در زبان اردوئے ریختہ و چہ در زبان فارسی دراں مجلس حاضر

---

[1] اس شاعرے کی طرحی غزل کے پانچ شعر مصحفی نے اپنے کلام میں بھی نقل کئے ہیں (ص ۹۳) مطلع یہ ہے:
زبانِ نالہ کش کس پر پڑی تھی تمام شیون پر — گداز موم کا عالم نظر آتا ہے آہن پر

می شدند۔ چوں حسب اتفاق روزے گذر فقیر دراں مقام افتاد، برائے شریک شدن منشیان انشا پرداز آن روز ہائے ترّے کہ دار بو صف دکان تنبولی بہ تتبع ظہوری برفتری (ترشیزی) گفتہ بودم' بمعرض بیان آوردم ...... ریختہ رفتہ مجلس مناترہ اش بہ مشاعرہ تبدیل یافت ...... یعنی از رفتن عاصی دراں مجلس بہ کثرت (ہ) مجمع کثیر شاگرداں خود (شور) غزل خوانی از سامع سبحان (سامع سکان) ملاء اعلیٰ درگذشت"۔ (ص ۲۰۵)

زبان کی سلاست و سادگی اور انتخاب کی پاکیزگی و نفاست جسے ہم نے تذکرۂ ہندی" کے اوصاف میں شمار کیا ہے، اس تذکرے میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہم طرح غزلیں اور اشعار بھی مصحفی نے بکثرت نقل کیے ہیں۔ جن کی مدد سے مختلف شاعروں کے طرحی کلام کی دریافت اور زمانۂ تصنیف کے تعین کا مرحلہ بھی کسی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ شعرا اور منتظمین مشاعرہ کی عمر اور مدتِ مشق سے متعلق بیانات تحقیق کی اس منزل میں کافی دور تک ہماری رہبری کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ "ریاض الفصحا" سوانح نگاری اور تنقید کلام کے نقطۂ نظر سے تذکرہ نویسی کا کوئی بلند معیار پیش نہیں کرتا لیکن لکھنؤ کے ادبی ماحول، اردو زبان اور شاعری کی روز افزوں مقبولیت اور صاحب تذکرہ کی شخصیت اور اسکے دائرۂ اثر کے مطالعے میں اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف ناگزیر ہو اس کے ساتھ ہی تنقید سیرت کے سلسلے میں مصحفی کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

گلشنِ ہند

اردو ادب اور بالخصوص اردو نثر کے نشو ونما میں فورٹ ولیم کالج نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں اس ادارے کے زیر اہتمام فارسی، عربی اور سنسکرت کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں جن سے ایک طرف تو اس زبان کے سرمایۂ ادب میں مفید اور قابلِ قدر اضافہ ہوا اور دوسری سلیس و سادہ اسالیب بیان کی بنیاد پڑی۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ "گلشن ہند" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لطف باقاعدہ طور پر کالج سے منسلک تو نہ تھے لیکن گلکرسٹ کی نگاہِ مردم شناس نے اس کارِ خاص کے لئے ان کا انتخاب کر کے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے "گلزارِ ابراہیم" کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی اور انھوں نے اسے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ حیدر بخش حیدری کے "گلشن ہند" کے بعد شعرائے اردو کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جس میں اظہار مطالب کے لئے اردو زبان کو اپنایا گیا ہے۔

"گلشن ہند" مترجم کی صراحت کے مطابق ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۱۷ر صفر ۱۲۱۵ھ کو عمل میں آیا تھا۔[۱] ترجمہ و تصنیف کا سلسلہ اس کے بعد

---

[۱] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۰۔

شروع ہوا۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب و تدوین صرف چند ماہ کی سعیٔ مسلسل کا نتیجہ ہے۔

"گلشن ہند" پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے مولانا شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا دوبارہ ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے "گلزارِ ابراہیم" کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ اڈیشن ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ترتیب دیا ہے، اور اشاعتِ اول کی بہ نسبت زیادہ مروّج ہے اس تذکرے میں اڑسٹھ شاعروں کے حالات و اشعار درج کئے گئے ہیں لطف کے بیان کے مطابق یہ اصل تذکرے کی پہلی جلد یا مجوزہ کام کا ایک حصہ ہے۔ دیباچے کے اختتام پر لکھتے ہیں کہ

"حسب ارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصدر (گلکرسٹ) کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلد اول جو تحریر کی جاتی ہے اس میں عرش پردازیاں سلاطین نامدار کی اور گوہر باریاں امرائے عالی مقدار کی اور سخن طرازیاں شعرائے صاحب دستار کی جو کہ نام آور صاحب دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعرائے گمنام وغیرہ مشہور زیادہ نوشتن کو ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں۔ کہاں شمع و پروانہ اور بلبل و گل گی!"

(اشاعت لاہور ص ۶)

دوسری جلد مکمل ہوئی یا نہیں اس سلسلے میں کوئی سراغ نہیں ملتا بصورتِ تکمیل اس کی ضخامت جلد اول کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی۔ کیونکہ گلزار ابراہیم میں مذکور تین سو چھبیس شعرا میں سے پہلی جلد میں صرف

اردستھ ممتاز ارباب کمال اور قدر دانان شعر و سخن ہی کا ذکر کیا گیا ہو باقی شعرا کو یقیناً جلد دوم میں جگہ دی گئی ہوگی۔

یہ تذکرہ چونکہ فورٹ ولیم کالج تحریک کے سلسلے میں ایک تالیف ہے اس لئے اس میں خاص توجہ زبان و بیان کی صحت و صفائی پر صرف کی گئی ہے۔ لطف نے اپنے دوسرے شرکائے کار کی طرح دقیق الفاظ مشکل عربی و فارسی تراکیب اور پیچیدہ طرز بیان سے احتراز کرتے ہوئے سلاست و سادگی کی راہ اپنائی ہے ان کا بیان ہے کہ:

"مدعائے دلی اس صاحب عالی تدبیر (گلکرسٹ) کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم ان کی تربیت کے لئے یہ سارا خون جگر کھاتے ہیں تاکہ انکے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت اس سے بخوبی مزا اٹھاوے تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ایسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں واہ واہ ... ..." (اشاعت لاہور ص ۳)

جن خصوصیات کا اس بیان میں ذکر کیا گیا ہے وہ لطف کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور ان کی بدولت ان کی تحریر حد درجہ عام فہم اور روزمرہ سے بہت قریب ہوگئی ہے البتہ قافیہ بندی کا شوق اکثر غالب ہے چنانچہ جگہ جگہ اس قسم کی مقفی عبارتیں ملتی ہیں۔

(الف) نواب آصف الدولہ :- " بلکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی

طرز میلانِ خاطر تھا ایک ایک کمال کا ہزار ہا آدمی ـــــ حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی اور خواہش شکار کی مزاج سے بہ شدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا دھرنا اور ہر سال میں واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبہ سفر کرنا"۔ (ص ۱۳)

(ب) رضا قلی خاں آشفتہ :- "پرورش انھوں نے لکھنؤ میں پائی ہے اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ ۱۲۰۰ھ میں لکھنؤ سے مرشد آباد آئے نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے اگرچہ معالجے میں انھوں نے رنگ مسیحائی دکھائے لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے خلف الصدق سے ان کے یعنی نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے نہایت موافقت آئی اور صحبت نے بشدت یکرنگی پائی۔ چنانچہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے اور قریب دو لاکھ روپیے کے بنگالہ میں پیدا کئے لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے بلائے روزگار تھے کہ جس دن مرشد آباد سے نکلے تو قرضدار تھے"۔ (ص ۵۱-۵۲)

(ج) نواب محبت خاں محبتؔ :- "جوانِ خوش ظاہر و خوشرو ہیں اور خوش اختلاط و خوش خو۔ حسن خلق سے معمور اور مروت و جوانمردی کے ساتھ مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انھیں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا اور خوش استعدادی طبع کے سبب طبع بیگانہ خو کے تیئں لطافت معنی سے یاد کیا جمیع اقسام

نظم میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اصلاح سخن کی مرزا جعفر علی حسرت سے لی ہے۔ معاصرین میں اپنے مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے' اور روشن طبعوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ رنگین زبانی کے"۔ (ص ۱۶۶ - ۱۶۷)

یہ طرزِ تحریر قوافی کے التزام کے باوجود اس زمانے کے ابھرتے ہوئے تقاضوں اور بدلتی ہوئی قدروں کے عین مطابق ہے اور اُردو کے اسالیب بیان کی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے جس کی اہمیت کا اعتراف ناگزیر ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہو کہ "گلشن ہند" میں جا بجا ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں لطف اپنی اس سلیس و سادہ روش کو برقرار نہیں رکھ سکے ہیں اور قافیوں کی التزام کی ہوس انھیں سیدھے راستے سے ہٹا کر کبھی اغلاق و تعقید کے خارزار میں گھسیٹ لے گئی ہے اور کبھی فصاحت و بلاغت کے منصب بلند سے اتار لائی ہے۔ سطور ذیل میں اس قسم کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) قلندر بخش جرأت :- "گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے لیکن مضمون رنگین سوجھتا ہے"۔ (ص ۷۷)

(ب) جعفر علی حسرت :- "اکثر ذمشق لکھنؤ کے مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں اور یا استاد کہکر پکارتے ہیں"۔ (ص ۷۸)

(ج) حیدر علی حیران :- "ساکن شاہجہاں آباد کے شاگرد رائے سرب سکھ دیوانہ تخلص استاد کے"۔ (ص ۸۵)

(د) شاہ گھسیٹا عشق :- "جہاں بیاں ہوئی ہے شاہ فرہاد کی حالت سکر و مستی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ

سکی نہیں کی ہے"! (ص ۱۳۶)

(۵) شرف الدین ممنون:۔ "شیخ مذکور علت سے تزلزلے کی منہ میں ایک دانت نہیں دھرتے تھے۔ تو خان آرزو انھیں شاعر بیدار کہا کرتے تھے۔ دلی میں نظم وجود کو انھوں نے ناموزوں کی بوجھا ہے اور مضمون عالی انھیں سیر عدم کا دہیں سوجھا ہے"! (ص ۱۶۱)

بعض اوقات محض قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی کی خاطر لطف نے "گلزار ابراہیم" کی صاف و سادہ عبارتوں کو توڑ مروڑ کر خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح کسی جگہ غور و فکر کے فقدان کی بنا پر ان کے ترجمے اصل سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ سطور ذیل میں دونوں تذکروں کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے اس قسم کے اختلافات کا اندازہ ہوگا۔

گلزار ابراہیم

میر غلام حسین شورش

میر غلام حسین شورش بہ میر بھینا خواہر زادہ ملا میر وحید شاگرد میر باقر حزیں است بہ ایں خاکسار آشنا بود۔ بہ محض پندار التفات بہ تابع افکار خود دمی نمود۔ تذکرہ در ریختہ تالیف نمودہ۔ خالی از درد و حالتے نبود۔ در سنہ

گلشن ہند

"غلام حسین نام، متوطن عظیم آباد کے۔ مشہور میر بہنا کر کے تھے بھانجے تھے میر ملا وحید کے اور شورۂ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ میرے آشنا تھے اور بیماری

ایک ہزار و یک صد و نود و پنج ہجری رحلت کردہ۔"

میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیالِ فاسد سے انھوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے۔ اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے۔ ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انھوں نے لکھا ہے۔ لیکن وہ بھی بہ سبب ان کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ ۱۱۹۵ھ میں اس سرائے فنا سے جادہ نوردِ منزلِ بقا ہوئے (ص ۱۲۱)

صانع بلگرامی

"از دوستانِ ایں خاکسار و محبانِ مرزا محمد رفیع سودا است اشعار فارسی مدون دارد و در ریختہ کمتر می گوید از خواندنِ اشعار خوب بسیار متاثر می شود بہ عالم اخلاص مشغلے در ذہنش و بفہم اشعار رسا ست الحال بہ سال بیست و دوم شاہ عالم بادشاہ در مرشد آباد و کلکتہ

"علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ محبانِ قدیم سے مرزا محمد رفیع سودا کے اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے بڑے صاحبِ درد تاثیر اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر کسی سے سنتے تو گھڑیوں روتے اور بےچین رہتے۔ عالم

نرمی بود"

اخلاص اور دوستی میں رما مے
کے انتشار، استقامت طبع اور
رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے
سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ
عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد
آباد اور کلکتہ میں ایام زندگی کے
بسر کرتے تھے۔" (ص ۱۲۲)

سید عبدالولی عزلت

"باوصف فضیلت اطوار در
اقوالش خالی از سبکی و ہرزائی نبود
در زبان دولت نواب محمد علی وردی
خان مہابت جنگ مغفور وارد
مرشد آباد و مورد مہربانی نواب
مذکور گردیدہ و بعد انتقال نواب
بہ دکن رفت۔ اشعارش عدون
بنظر این خاکسار در آمد"

"باوصف حمکنت و فضیلت
کے اوضاع و اطوار اس عزیز
کے خالی سبکی اور بے مغزی سے
نہ تھے۔ نواب علی وردی خال
مہابت جنگ مغفور کے عہد
دولت میں مرشد آباد کے ہوئے
اور مورد عنایات و امداد کے ہوئے
حرکات ان کے خلاف ان کے
منصب کے عمل میں آتے تھے اور
آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت
کو اعتبار کی گھٹاتے تھے نواب
موتمن الصدر کی وفات کے بعد
سرزمین دکن نو رجمالی سے اپنے

منور کی اور بقایائے عمر اس مملکت
میں بسر کی۔ دیوان ان کا مدت
سے پا چکا انتظام ہے اور یہ انکا
منتخب کلام ہے۔" (ص ۱۲۴)

ولی دکنی

"اصلش گجرات در شعرائے
دکن مشہور و ممتاز است گویند در
زمانۂ عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان
آمدہ مستفیہ از شاہ گلشن گردید از
شاہیر ریختہ گویان ولی کے
است کہ دیوانش در دکن مشتہر
و مدون گشتہ"

"وطن بزرگوں کا اسکے گجرات
ہے شاعر بلند مقام تھا۔ اول
زبان ہندی میں دیوان اس عزیز
نے جمع کیا ہے اور نظم ریختہ کو
سرزمین دکن میں رواج اس نے
دیا۔ شعرائے دکن میں مشہور و ممتاز
ہے اور اپنے معاصروں میں سربلند
اور سرفراز۔ عالمگیر بادشاہ کی
سلطنت میں ہندوستان کی طرف
آیا اور یہاں گلشن کے فیض خدمت
سے فائدہ انواع و اقسام کا اٹھایا
خوب خوب داد تلاشِ معانی کی دی
آخر اس بیت بے معنی وجود سے
راہ کاشانۂ عدم کی لی" (ص ۱۰۵)

ان اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لطف نے صرف بے ضرورت
عبارت آرائی کا مظاہرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ جابجا نفسِ مضمون میں بھی

اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے اکثر اضافے بہت مفید اور کار آمد ہیں۔ خصوصاً جو لوگ حکمراں طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان کے حالات میں لطف نے ذاتی معلومات یا تلاش و جستجو کی بنیاد پر جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان کی وجہ سے گلشن ہند کی قیمت و اہمیت کافی بڑھ گئی ہے۔ مثال کے طور پر شاہ عالم کے بارے میں علی ابراہیم کے یہاں رسمی قسم کے چند جملے اور نمونۂ کلام میں صرف دو شعر ملتے ہیں لیکن لطف نے ان کے سوانح حیات کے لئے تقریباً چار صفحات وقف کر کے تمام اہم حالات اور تاریخی واقعات قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے اور آخر میں انتخاب کلام کے ذیل میں نو اشعار کی ایک غزل اور ایک دو شعری قطعے کے علاوہ وہ مشہور فارسی نظم بھی منظوم اردو ترجمے کی صورت میں شامل کر دی ہے جس میں شاہ عالم نے اپنی برگشتہ طالعی اور زوال سلطنت پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ نواب آصف الدولہ، عمدۃ الملک امیر خاں انجام، قزلباش خاں امید، ابوالحسن تاناشاہ اور شہزادہ جہاندار شاہ جواں بخت کے حالات میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔

سراج الدین علی خاں آرزو کے ذکر میں صاحب گلزار ابراہیم نے صرف ڈھائی سطر پر اکتفا کیا ہے۔ اس کے برخلاف لطف نے ان کی زندگی کے اہم گوشوں اور علمی و ادبی مصروفیات پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی سیرت و شخصیت کے متعلق ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"شاعر زبردست و صاحب استعداد تھا کہ اکثر مضمون میں سے مضمون پیدا کرنا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت

مشتاق خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔" (ص ٤٦)

میر شیر علی افسوس مرزا علی لطف کے قریبی دوستوں میں سے تھے اس لئے ان کے خاندانی و ذاتی حالات کے بیان میں بھی لطف تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ دوران ذکر میں علی ابراہیم کی ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں انھوں نے علی ابراہیم کے شاگردان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔" (ص ٤٨)
آخر میں ان کی نسبت اپنے تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"وہ ذات ان کی زمانے کے انتخاب سے ہے۔ عجب جوانے خلیق اور اہلِ دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فرد کامل ہیں۔ منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات و معالجات فنِ طبابت کے بھی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔" (ص ٤٩)

مرزا رضا علی آشفتہ کے ذکر میں علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں کہ "تا حین تحریر این اوراق احوالش معلوم نہ شد ظاہراً در لکھنؤ می گذارند" لطف نے ان کا تعارف کافی شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اپنی طرف سے ان کی لطافت طبع اخلاق و عادات اور رنگ سخن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:-

"جوانِ آزاد وضع اور خوش اختلاط، وارستہ مزاج اور مائلِ ارتباط ہیں محبت اور یک رنگی میں خلاصے اور آشنائیوں

عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر ہیں۔ مشورۂ سخن کا انھوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے لیکن تھا گردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں انھوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے" (ص ۱۰۱)

سودا کے حالات میں لطف نے اگر کچھ زیادہ اضافے نہیں کئے ہیں تاہم ان کے بڑھائے ہوئے یہ چند جملے کافی اہم ہیں لکھنؤ میں وارد ہونے کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی اور چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر کر دی چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں اور کیا کیا اثر و تازگی کے ساتھ مضامین عالی باندھے ہیں۔۔۔۔ آغا باقر کا امام باڑہ اُس محب امام علیہ السلام کا مدفن ہے"

(ص ۱۰۴)

قائم چاند پوری کے کلام کی نسبت علی ابراہیم کے خیالات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

"اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے"

(ص ۱۳۲)

علی ابراہیم نے جس زمانے میں "گلزار ابراہیم" میں میر صاحب کا

حال سپرد قلم کیا ہے وہ (میر صاحب) دہلی میں مقیم تھے لیکن "گلشن ہند" کی تالیف کے وقت ان کے ترک وطن اور لکھنؤ میں سکونت کو تقریباً انیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس درمیانی مدت میں حالات نے جو رخ بدلے لطف کے بیانات سے بڑی حد تک ان کی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کی خدمت میں باریابی اور ان کی قدرشناسی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ :-

"سنہ گیارہ سو ستانوے (۱۱۹۷ھ) ہجری میں رایات عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور رہا۔" (ص ۱۵۳)

میر کے کلام کے بارے میں بھی ایسی جامع اور مانع رائے دی ہے جو ایک طرف ان (لطف) کے ادبی شعور اور ناقدانہ بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اور دوسری طرف میر و مرزا کے فرق مراتب کی وضاحت کرتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ :-

"اقسام نظم میں یہ صدر نشین بارگاہ سخندانی ہر قسم یکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم مرزا محمد رفیع سودا پر ہوا۔ ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے۔ خصوصاً دریائے عشق جو انکی مثنوی

ہے اک جہاں کو مرغوب ہے۔" (ص ۱۵۳)

مرزا علی لطف کا یہ وصف بھی قابلِ تعریف ہے کہ انھوں نے اپنے شاہدات کے بیان اور ذاتی رایوں کے اظہار میں بڑی جراءت اور صاف گوئی سے کام لیا ہے وہ بعذرِ مصلحت حقائق کے بیان سے احتراز کے قائل نہیں بطور مثال نواب آصف الدولہ کے ذکر میں انکی سخاوت و شجاعت کی تعریف کے ساتھ ہی وہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ:-

"ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا مثیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا۔ اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا۔" (ص ۱۴)

سراج الدین علی خاں آرزو کے فضل و کمال اور ذوقِ شعر و ادب کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ لیکن جہاں شیخ علی حزیں سے معاوضے اور اس کے نتیجے میں "تنبیہ الغافلین" کی تصنیف کا ذکر آیا ہے وہاں صاف الفاظ میں یہ لکھ دیا ہے کہ:-

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب بار یک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے۔" (ص ۲۳)

محمد حسین کلیم کے حالات بعینہٖ "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ ہیں۔ لطف نے صرف ایک جملہ کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:-

"باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور کم رکھتا

ہے۔" (ص ۱۴۵)

لطف نے بعض جگہ ضمناً اپنے زمانے کے اقتصادی و معاشرتی حالات کی طرف بھی اشارے کئے ہیں ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں جو آصف الدولہ کے دورِ حکومت کی ابتدا کے ساتھ شعر و ادب کا ایک توانا مرکز بن گیا تھا، متاعِ ہنر کی کساد بازاری عام ہوتی جا رہی تھی۔ اربابِ کمال گردشِ روزگار کے ہاتھوں ناقدری اور معاشی مشکلات کے حریف نبرد تھے۔ حتیٰ کہ بعض اکابر شعرا بھی کسمپرسی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میر تقی میر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ناقدردانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہلِ دنیا کی اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور چونکہ شہرستانِ معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاریٔ سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازیٔ بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا۔ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور کوئی نہیں پوچھتا جو حالت اس کی آج ہے۔ جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتہ سے لکھنؤ کو گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوتِ بدنی کی مقبول ہوئے"۔

(ص ۱۵۲)

مصحفی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

"بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری میں ایک چودہ برس

سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے[1] ضیق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب اہلِ کمال ہے اسی طور پر درہم و برہم اس غریب کا بھی احوال ہے"! (ص ۱۶۶)

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے "گلشنِ ہند" فورٹ ولیم کالج تحریک کے سلسلے کی ایک کڑی اور اردو سے اس کے عوامی و جمہوری کردار کی بنا پر نیز اردو انگریز حکام کے شغفِ خاص کی ایک دستاویز ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کر کے بھی اس تذکرے سے انگریزوں کی اردو زبان اور اس کے شعری ادب سے دلچسپی کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہے، مثال کے طور پر میر شیر علی افسوس کے متعلق لطف کا بیان ہے کہ:۔

"ایک مدت سے بہ توکل و قناعت ہمراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کی دن زندگی کے بسر کر رہے تھے کہ صاحب والا مناقب عالی شان بارلو صاحب کے مشورہ سے عالی سخن آفریں مسٹر گلکرسٹ صاحب کے زبان دانِ ریختہ لکھنؤ سے طلب کئے بڑے صاحب نے لکھنؤ کے کہ نام نامی اس معدن دانش کا ہر صاحب (؟) ہے بہ عزت تمام ان کو بلوا کے اور مشاہرہ دو سو روپیہ کا ٹھہرا کے پانچ سو روپیہ خرچ راہ دیا اور کلکتے کی طرف روانہ کیا ۔۔۔۔۔۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری میں بلدہ کلکتہ میں صاحبانِ عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزتِ تمام رکھتے ہیں اور گلستان کے ترجمے کا کمپنی کی طرف سے کام رکھتے ہیں"۔ (ص ۲۹)

---

[1] لکھنؤ میں مدتِ قیام کے متعلق لطف کا بیان درست نہیں مصحفی ۱۱۹۸ھ، ۱۱۹۹ھ میں وہاں پہنچے تھے۔ (عقدِ ثریا ص ۱۳، ۱۴) اس لحاظ سے یہاں چودہ کی بجائے تیرہ برس ہونا چاہیئے۔

حافظ رحمت خاں کے صاحبزادے نواب محبت خاں محبت کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ

"قصہ سسّی پنّو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کے انھوں نے نظم کیا ہے اور نام اس کا مثنوی اسرارِ محبت رکھا ہے" (ص ۱۶۷)

میر قمر الدین منت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:-

"مربی گری سے میر (محمد حسین لکھنوی) کی ممتاز الدولہ مسٹر جانسین بہادر کی سرکار میں توسل انھوں نے حاصل کیا اور رفاقت میں صاحبِ مذکور کی کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہیسٹینگز (وارن ہسٹنگز) جلالت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کی خطاب ملک الشعراء کا لیا" (ص ۱۷۱)

"گلشنِ ہند" میں علی ابراہیم کے بیانات کے ترجموں کے پہلو بہ پہلو لطف کی اپنی تحریروں میں بھی سنین کے حوالے خاصی تعداد میں موجود ہیں بالخصوص ان لوگوں کے ذکر میں جو "گلزارِ ابراہیم" کی تالیف کے بعد فوت ہو چکے تھے، لطف نے عام طور پر ماہِ رحلت کی صراحت کر دی ہے. لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلے میں ان کے بیشتر بیانات خلافِ حقیقت اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ہم ان میں سے یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں:-

(الف) عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے حال میں لکھتے ہیں۔

"۱۱۶۹ھ گیارہ سو انہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے ... اس ازشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھونکے میں کٹاری کے بجھا دیا" (ص ۱۶)

انجام کا سال شہادت ۱۱۶۹ھ ہجری نہیں ۱۱۵۹ھ ہے۔ علی ابراہیم نے بھی ان کی شہادت کو اسی سال (۱۱۵۹ھ) کا واقعہ قرار دیا ہے[1]۔ امرا اللہ الہ آبادی نے اپنے تذکرے میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:۔

"در سال ہزار و یکصد و پنجاہ و نہ (۱۱۵۹ھ) ملعوے الملازمانش

غافل بودہ در صحنِ دولت خانہ بادشاہ شربت شہادت بچشانید

و انجامش بخیر گردید"[2]

(ب) میر حسن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"انھوں نے ۱۲۰۵ھ میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے"

(ص ۹۲)

حسن کا انتقال محرم ۱۲۰۱ھ کے عشرۂ اول میں ہوا ہے مصحفی جو ان کے قریبی دوست تھے اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"در عشرۂ ماہ محرم رحلت اوست ...۔ فقیر تاریخ رحلتش

چنیں یافتہ تاریخ

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں

روز از یں گلزار رنگ و بو بتافت

بس کہ شیریں بود نطقش مصحفی

"شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت"[3]

(ج) خواجہ میر درد کی نسبت رقم طراز ہیں کہ:۔

---

[1] گلزار ابراہیم مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ورق ۳۔ الف

[2] مسرت افزا مخطوطہ آکسفورڈ بحوالہ سہ ماہی معاصر پٹنہ شمارہ جنوری ۱۹۵۴ء

[3] تذکرہ ہندی مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۶۲

"۱۲۰۲ھ بارہ سو دو ہجری میں اس بلبل گلشن آزادی نے دامِ ہستی سے نکل کر شاخسار گلزار چمن عدم کے آباد کیا۔" (ص ۹۹)

حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی اور خیراتی لال بے جگر نے درد کی تاریخ وفات "بست و چہارم صفر روز جمعہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و نہ ہجری بیان کی ہے[1]۔ میر اثر (برادر خواجہ میر درد) کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "وصل خواجہ میر درد" سے بھی یہی سال ۱۱۹۹ھ برآمد ہوتا ہے۔

(د) میر شمس الدین فقیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"۱۱۷۰ھ گیارہ سو ستر ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے اور بعد حصول سعادت کے جبکہ پھرے تو کشتیٔ حیات اس آشنائے بحر معانی کی گرداب ممات میں تباہ ہو کر ڈوبی"

(ص ۱۲۹)

حسین قلی خاں عاشقی کے بیان کے مطابق فقیر ۱۱۸۰ھ میں زیارت عتبات عالیات کے لئے تشریف لے گئے تھے اور ۱۱۸۳ھ میں اس سفر سے واپسی کے وقت بصرہ کے قریب ان کی کشتی غرق ہوئی تھی[2]۔ حکیم وحید اللہ بدایونی کا بیان بھی اس روایت سے مطابقت رکھتا ہے انھوں نے اس سلسلے میں علامہ آزاد بلگرامی کی درج ذیل تاریخی رباعی بھی نقل کی ہے۔

---

[1] نشتر عشق مخطوطہ رضا لائبریری رامپور، ورق ۲۵۴ ب۔ تذکرہ بے جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۶۶ ب

[2] عاشقی کا مکمل بیان تذکرہ میر محسن کے زمانہ ترتیب پر بحث کے ذیل میں گزشتہ اوراق میں نقل کیا جا چکا ہے

رفت از عالم سخن ور شیریں ہائے
خوابیدہ بخاکِ شاعرِ رنگیں ہائے
آزاد نوشت مصرعۂ تاریخش
کو آہ فقیر میر شمس الدین ہائے[1]

(۵) مرزا مظہر جانجاناں کی شہادت کا سنہ صاحب گلزار ابراہیم نے ۱۱۹۴ھ قرار دیا ہے۔[2] لطف بھی اپنے ترمیم کردہ ترجمے میں یہی سنہ نقل کرتے ہیں (ص ۱۶۰) لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب شبِ ہفتم ماہِ محرم ۱۱۹۵ھ کو طپنچے کی گولی سے زخمی ہوئے اور اسی حادثے کے نتیجے میں عاشورہ کے دن ان کا انتقال ہوا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ

"شخصے ..... شبِ ہفتم محرم الحرام سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج او را بہ گولۂ طپانچہ مجروح ساخت ...... چوں زخم بہ پہلوئے دل رسیدہ بود، بروز عاشورہ طائر روحش از قفسِ عنصری پرواز کرد۔"[3]

میر قمر الدین منت کی کہی ہوئی تاریخ "عاش حمیداً، مات شہیداً"، اور مرزا سودا کے درج ذیل قطعے سے بھی ۱۱۹۵ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ قطعہ

مرزا کا ہوا جو قاتل اک مرتدِ شوم — اور ان کی خبر ہوئی شہادت کی عموم
تاریخ از روئے درد بہ سن کے کہی — سودا نے کہا ہائے جانجاناں مظلوم

(۶) قمر الدین منت کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ:-

۱ مختصر سیر ہندوستان ص ۹۱
۲ مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ورق ۲۰۰ ب
۳ عقد ثریا، مرتبہ عبدالحق ص ۵۵-۵۶

"۱۲۰۶ھ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ ٹکیت رائے ... لکھنؤ سے کلکتہ جو تشریف لائے میر قمر الدین منت بھی ساتھ آئے ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی اور بغیر جان کے لیے وہ تپ نہ گئی چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا۔"

(ص ۲۷۱)

منت کا انتقال ۱۲۰۸ میں ہوا ہے۔ ان کی تاریخ وفات "مرد شمع بزم غزنال آہ حیف" اور لفظ "غریب" سے نکلتی ہے۔[1]

واقعات کے بیان میں اس قسم کی غلطیوں کی وجہ سے "گلشنِ ہند" کی استنادی حیثیت کمزور ہو گئی ہے پھر بھی اس تذکرے میں مفید اور معلومات افزا مواد کافی مقدار میں موجود ہے۔ خصوصاً لکھنؤ عظیم آباد اور کلکتہ سے متعلق شعرا کے بارے میں ہمیں اس سے بہت سی اہم اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی اس تذکرے کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی کہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُردو شعرا کے تعارف کے لئے اردو زبان استعمال کی گئی ہے۔

---

[1] زیرِ نظر باب کے ابتدائی صفحات میں "تذکرۂ ہندی" کے بیانات پر تنقید کے ذیل میں اس حادثے کے سالِ وقوع پر مفصل بحث کی جا چکی ہے۔

تذکرۂ عشقی

شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی صوبۂ بہار کے اہل قلم میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ زیر بحث تذکرہ ان کی وہ گراں قدر علمی یادگار ہے جس نے انھیں اردو ادب کی تاریخ میں حیاتِ دوام عطا کردی ہے۔ یہ تذکرہ ابھی چند سال پہلے پروفیسر کلیم الدین احمد کی کوشش سے "تذکرۂ شورش کے ساتھ" "دو تذکرے" کے عنوان سے دو جلدوں میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ دونوں جلدیں لیبل لیتھو پریس پٹنہ کی مطبوعہ ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۵۹ء میں اور دوسری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

مطبوعہ متن بعد بودلین لائبریری آکسفورڈ کے مخطوطے پر مبنی ہے، جس کے چند درمیانی اوراق ضائع ہو گئے ہیں۔ یہ ضائع شدہ اجزا ایک دوسرے قلمی نسخے سے جو قاضی عبدالودود صاحب کی ملکیت ہے نقل کر کے دوسری جلد کے آخر میں بطورِ ضمیمہ شامل کر دیے گئے ہیں موخرالذکر نسخے کے مطابق اس تذکرے میں ۴۳۰ شاعروں کے حالات واشعار درج ہیں۔ ان دو نسخوں کے علاوہ ابھی تک "تذکرۂ عشقی" کے کسی اور قلمی نسخے کا پتہ نہیں چلا ہے۔ ان نسخوں سے تذکرے کے نام زمانۂ ترتیب اور سنینِ کتابت کے بارے میں کوئی واضح اور فیصلہ کن معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ نہ تو ان میں سے کسی کے آغاز میں

کوئی مقدمہ یا دیباچہ ہے اور نہ آخر میں ترقیمہ۔ اشپرنگر کی فہرست میں سال ترتیب ۱۲۱۵ھ مرقوم ہے[1]۔ اس کے برخلاف قاضی عبدالودود صاحب اسے ۱۲۰۵ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیانی عرصے کی تالیف قرار دیتے ہیں[2]۔ ہمارے نزدیک پہلا خیال قطعاً بے بنیاد اور دوسری رائے کسی قدر ترمیم طلب ہے۔ صحیح صورت حال کا اندازہ درج ذیل تفصیلات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔

(الف) محمد یار خاں امیر کے متعلق عشقی کا بیان ہے کہ:۔

"مردیست خوش خلق و قدردان و جوانیست جوہر شناس سخنورانِ حقیقتِ سخن باستصواب محمد قائم قائم تخلص می کند"

(جلد اول ص ۵۶)

امیر کی تاریخ وفات غرہ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/۳ جنوری ۱۷۷۵ء[3] اس لحاظ سے ان کے حالات یقیناً ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/جنوری ۱۷۷۵ء سے قبل لکھے جا چکے ہوں گے۔

(ب) میر بہادر علی حشمت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"از یارانِ میر جعفر علی حسرت و متوسلان سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر است"۔ (جلد دوم ص ۳۱۹)

شجاع الدولہ کا انتقال ذی قعدہ ۱۱۸۸ ہجری کے عشرۂ ثالث جنوری (۱۷۷۵ء) میں ہوا ہے[4] اور موت کے بعد ان کی سرکار سے وابستگی کا کوئی ش

---

[1] بحوالہ یادگار شعرا ص ۶ [2] مقدمہ دیوان جوشش ص ۱۵

[3] اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۰۵؛ تذکرہ کاملان رام پور ص ۲۲۰

[4] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد دوم ص ۲۹۴

سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وحشت کا حال بھی ۱۱۸۹ھ/۵-۱۷۷۵ء سے قبل یا زیادہ سے زیادہ ۱۱۹۰ھ/۷-۱۷۷۶ء میں قلم بند کیا گیا ہوگا۔

(ج) شاہ سعد اللہ شاہ عظیم آبادی کی نسبت رقم طراز ہیں کہ۔

"برراقم آثم توجہ و اشفاق بسیاری فرماید خدا ایشاں سلامت باکرامت دارد"۔ (جلد دوم ص ۲۵)

ڈاکٹر ممتاز احمد کی تحقیق کے بموجب شاہ نے ۲۴ر ذی قعدہ ۱۱۹۹ھ/ ۲۸ر ستمبر ۱۷۸۵ء) کو وفات پائی ہے[1]۔ باہمی تعلقات کے پیش نظر اس واقعے سے عشقی کی لاعلمی بعید از قیاس ہے، اس لئے ان کے حالات یقینی طور پر اس تاریخ سے قبل معرض تحریر میں آئے ہوں گے۔

(د) سرپ سکھ دیوانہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اکثرے از موزوں طبعان لکھنؤ بصلاح و صوابدید آں ذی استعداد بہ مشق سخن می پردازند و بصحبتش ہنگامہ قیل و قال گرم می سازند"۔ (جلد اوّل ص ۳۰۸)

دیوانہ کی تاریخ وفات رائے بھگوان داس ہندی نے اس طرح نظم کی ہے۔

بچار شنبۂ ماہ صیام نوز دہم
برفت رائے سرپ سکھ سوئے بہشت بریں
"بہشت یافتہ" تاریخ رحلتش باشد
دلیل مغفرت او ہمیں بود بہ یقیں[2]

[1] شذریات راسخ، ص ۲۱ [2] سفینہ ہندی ص ۷۲

"بہشت یافتہ" سے ۱۲۰۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب تقویم کی روشنی میں اس سنہ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) کو سالِ وفات قرار دیتے ہیں[۱] بہر صورت دیوانہ کے حالات ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۹۰ء سے قبل لکھے گئے ہیں۔

(۵) میر حسن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"قریب چار سال است کہ ۔۔۔۔۔۔ بہ عالم جاودانی رحلت نمود"۔ (جلد اول ۲۱۴)

مصحفی کی تحریر کے مطابق میر حسن کا انتقال محرم ۱۲۰۱ھ (نومبر ۱۷۸۶ء) کے عشرۂ اول میں ہوا ہے[۲]۔ اس لئے اندازہ یہ ہے کہ ان کے حالات ۱۲۰۴ھ کے اواخر (۱۷۹۰ء) میں سپرد قلم کئے گئے ہوں گے۔

(۶) محمد علی تمنا عظیم آبادی کے حالات میں لکھتے ہیں کہ۔

"از چند سال بسر رشتۂ منشی گری در عدالتِ فوجداری شہر بنارس بر رفاقت عزیز الملک امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ المتخلص بہ حال می گذراند"۔

(جلد دوم ضمیمہ نمبر ا ص ۷)

علی ابراہیم خاں کے متعلق عشقی نے آیندہ صفحات میں خود ہی یہ معلومات فراہم کی ہے کہ ۱۲۰۸ھ میں محرم کی تئیسویں تاریخ (۳۱ راگست ۱۷۹۳ء) کو ان کا انتقال ہو گیا[۳]۔ جراءت کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "لو آہ مٹا مطلعِ دیوانِ عدالت" سے بھی اس سنہ کی تائید ہوتی ہے، لہٰذا انکی وفات

---

[۱] نوائے ادب بمبئی شمارہ [۲] تذکرہ ہندی ص ۶۹

[۳] دو تذکرے۔ جلد اول ص ۲۴۲

میں بنارس کی عدالتِ فوجداری سے تمنا کی وابستگی کے متعلق یہ بیان محرم ۱۲۰۸ھ اگست ۱۷۹۳ء سے قبل کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(ز) آصف الدولہ کے بارے میں رقم طراز ہیں۔
"بالفعل در شہر لکھنؤ کوسِ ناموری و کرم گستری نوازد"۔
(ج ۱ ص ۵۳)

یہ عبارت آصف الدولہ کی تاریخ وفات یعنی ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ / ۲۰ ستمبر ۱۷۹۷ء سے قبل معرضِ تحریر میں آئی ہے[۱]

(ح) محمد علی وہم کے ذکر میں لکھتے ہیں۔
"از متوسلان سرکار نواب آصف الدولہ بہادر است"
(ج ۲ ص ۳۰۷)

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عشقی نے وہم کے حالات بھی آصف الدولہ کی زندگی میں یعنی ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ / ۲۰ ستمبر ۱۷۹۷ء سے قبل تحریر کئے ہیں۔

(ط) خواجہ میر درد کے فرزند صاحب میر الم کی نسبت لکھتے ہیں کہ
"بالفعل در شاہجہاں آباد بطریقِ بزرگانِ خود درویشانہ می گزرانند"
(ج ۱ ص ۵۰)

الم کا انتقال ۱۲ جمادی الاخری ۱۲۱۵ھ (۹ نومبر ۱۸۰۰ء) کو ہوا ہے[۲] اور یہ عبارت ان کے بقید حیات ہونے کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس لئے ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء سے قبل کی تحریر ہونا چاہیئے۔

---

[۱] تاریخ اودھ از نجم الغنی جلد سوم ص ۲۵۰

[۲] خواجہ میر درد۔ ذکرادر فکر ص ۱۹۳

(ی) میر شیر علی افسوس کے بارے میں یہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

"الحال از چند سال در شہر کلکتہ بہ سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر بعہدۂ منشی گری نثر ہندی سرفراز گردیدہ بہ فراغ بالی و خوش حالی می گزراند۔" (ج ۱ ص ۵۴)

افسوس ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے ملازم کی حیثیت سے کلکتہ پہنچے[1]۔ اور ۱۲۲۴ھ (۱۹ ستمبر ۱۸۰۹ء) میں وہیں ان کا انتقال ہوا[2]۔ اس لحاظ سے تذکرۂ عشقی میں ان کا حال ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء اور ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء کے درمیان کسی سال میں لکھا گیا ہوگا۔

(ک) میر محمد رضا کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"مدتے در شہر عظیم آباد طرح استقامت انگندہ آخر در شہر مرشد آباد بسرکار نواب مبارز الدولہ بہادر بکام دل گزرانیدہ ہمانجا وفات یافت" (ج ۱ ص ۳۵۰)

رضا کی وفات کے سلسلے میں خیراتی لال بے جگر کا بیان ہے کہ

"در سنہ یک ہزار و دو صد و شانزدہ رشتہ حیاتش بمقراض اجل قطع شد ...... آغا حسین قلی خاں عاشقی ازیں مادہ کہ افسوس از رضا" تاریخ وفاتش برآوردہ[3]"

اس شہادت کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رضا کا حال بھی ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء کے بعد تذکرہ میں شامل کیا گیا ہے۔

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۰ و بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۰

[2] دستور الفصاحت ص ۱۰۲،۱۰۳ و بنگال کا اردو ادب ص ۱۱۰

[3] تذکرہ بے جگر مخطوطہ مملوکہ ورق ۹۰ ب

(ل) محمد تقی خاں مشتاق کے حال میں لکھتے ہیں کہ

"بود مشتاق لقائے حیدرؑ" تاریخ وفات اوست"

(ج ۲۔ ص ۲۲۷)

اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مشتاق کے حالات ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء کے بعد لکھے گئے ہیں

(م) مفتی غلام مخدوم ثروت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:-

"از مدتے در شہر عظیم آباد طرح اقامت انداختہ بہ درس و تدریس می پرداخت ...... ناگاہ بہ اجلِ طبعی جہانِ فانی را پدرود نمود"

(ج ۱، ص ۱۱۰)

پروفیسر اختر اورینوی نے مفتی صاحب کا سنہ رحلت ۱۲۱۹ھ/(۱۸۰۴ء) متعین کیا ہے[1]۔ اس روشنی میں ان کا تعارف ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء یا زمانہ مابعد کی تحریر قرار پاتا ہے۔

(ن) آیت اللہ جوہری کی نسبت رقم طراز ہیں کہ

"عرصہ پانزدہ سال می شود کہ ازیں دارِ فانی بہ عالمِ جاودانی انتقال فرمود"

(ج ۱ ص ۱۱۸)

اختر اورینوی اور ممتاز احمد نے "تذکرۃ الصالحین" کے حوالے سے جوہری کی تاریخ رحلت یکم رجب ۱۲۱۰ھ/ ۱۱ جنوری ۱۷۹۶ء) بیان کی ہے[2]۔ عشقی کی تحریر کے بموجب ان کے حالات اس تذکرے میں وفات کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں قلم بند ہوئے ہیں۔

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۰۸

[2] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۳۸ و مثنویات راسخ ص ۳۷

(س) مرزا جان طپش کی زندگی کے آخری ایام کی تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں:

"بقدمہ نواب شمس الدولہ بہادر بحکم صاحبانِ عالی شان کونسل بہ شہر کلکتہ اسیر و محبوس گشتہ اوقات بہ تلخ کامی بسر بردہ ۔۔۔۔۔۔ بعد چند سال ازیں بلائے ناگہانی نجات یافتہ ۔۔۔۔۔۔ باجلِ طبعی ازیں دار رحلت فرمود" (ج ۲ ص ۵۵)

طپش ۱۲۲۱ ہجری (۱۸۰۶ء) میں قید سے رہا ہوئے (طپش از قید الم یافت رہائی) اور "بیاض طپش" میں شامل ایک خط سے جو مرزا مغل سبقت کے نام بنارس سے لکھا گیا تھا، ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۲۸ھ (۲۲ اپریل ۱۸۱۳ء) تک ان کے بقید حیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے[1]۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تحقیق کے مطابق ان کی وفات ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) کا واقعہ ہے[2]۔ اس لئے تذکرۂ عشقی کے اوراق پر ان کے متعلق منقولہ بالا معلومات ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۴ء یا اس کے بعد فراہم کی گئی ہوں گی۔

(ع) ظہور اللہ خاں نوا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"چندے در شہر بنارس ۔۔۔۔۔۔ بفراخیٔ حال گزرانیدہ۔ آخر ازیں جا بسمت لکھنؤ رفتہ ودیعت حیات سپردہ۔ خدا ایش بیامرزد!" (ج ۲ ص ۲۹۴)

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی تحقیق کے مطابق نوا کا سالِ وفات ۱۲۴۶ھ (۳۱-۱۸۳۰ء) ہے[3]۔ لہٰذا عشقی نے ان کے حالات اس سنہ کے بعد ہی سپرد

---

[1] مجلہ نقوش لاہور شمارہ نمبر ۱۰۸ ستمبر ۱۹۶۶ء [2] اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۳۸۷

[3] سہ ماہی نوائے ادب بمبئی شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء ص ۲۰

قلم کئے ہوں گے۔

ان تفصیلات کا ما حصل یہ ہے کہ عشقی نے تذکرے کا آغاز ۱۱۸۰ھ سے قبل اور اختتام ۱۲۴۶ھ کے قریب کیا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نوا کی وفات کے بعد اختتام کار سے متفق نہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں عشقی کے منقولہ بالا بیان کو ان کی بے خبری پر محمول کیا ہے[1]۔ نوا ۱۲۲۱ھ کے قریب اصفہان میں مقیم تھے[2] اور اس سے تقریباً دس برس قبل حج بیت اللہ اور زیارت عتبات عالیات کی غرض سے ہندوستان کو خیرباد کہہ چکے تھے[3]۔ نیز ان کا انتقال عشقی کے بیان کے برخلاف لکھنؤ کے بجائے برایول میں ہوا ہے[4]۔ اس لئے قاضی صاحب کی رائے کو قرین صحت تسلیم کرتے ہوئے طپش کی وفات کے قریبی زمانے یعنی ۱۲۲۰ھ ۱۸۰۵ء کو ترتیب و ترمیم کی آخری حد کہا جا سکتا ہے البتہ ابتدائے کار کے زمانے سے متعلق ہمارے اندازے میں جو قاضی صاحب کے اندازے سے مختلف ہے، اس لئے کسی غلطی کی گنجائش نہیں کہ اس کا انحصار ایسے اشارات پر ہے جن سے شجاع الدولہ کے بقید حیات ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور شجاع الدولہ کی موت سے عشقی کا لاعلم رہنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔ تذکرے کی ترتیب میں عشقی کی مصروفیات کا یہ طویل دور جس کے حدود ابھی متعین کئے گئے ہیں، تذکرہ نگاری کے عروج و ارتقا کا زمانہ ہے۔

---

[1] مجلہ نقوش لاہور۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۲۱۴

[2] صحائف شرائف ورق ۲۹۴ ب

[3] طبقات سخن مخطوطہ شاہجہانپور ص ۱۵۰

[4] مختصر سیر ہندوستان ص ۹۴ نوائے ادب بمبئی شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء ص ۴۰

اس وقت تک شعرائے اُردو کے جتنے تذکرے مرتب ہو کر منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ عشقیؔ کی تحریریں ان میں سے نکات الشعرا، تذکرۂ میر حسنؔ اور گلزارِ ابراہیم سے ان کی براہِ راست واقفیت کا پتہ دیتی ہیں۔ قدرت اللہ شوقؔ کے متعلق یہ بیان کہ صاحبِ دیوان و تذکرۂ اشعارِ شعرائے ہندی است[1]" طبقات الشعرا سے بھی ان کی واقفیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے لیکن ان کے یہاں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جسے اس تذکرے کے مطالعے اور اس کے اندراجات سے استفادے کی دلیل ٹھہرایا جا سکے۔ اس کے برخلاف میرؔ، میر حسنؔ اور خلیلؔ کے تذکروں سے اخذ و اقتباس کا انھوں نے جابجا اعتراف بھی کیا ہے اور ان کے بعض بیانات بھی ان تذکرہ نگاروں کی معلومات پر اعتماد و انحصار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً سید امام الدین منظومؔ کے بارے میں میر حسنؔ نے لکھا ہے کہ

"سید امام الدین خاں ولد معین الدین خاں سرچہ کی رسالۂ والاشاہی بود در وقت محمد شاہ۔ او ہم تذکرۂ مختصر معاصرین خود نوشتہ است"۔ (تذکرۂ شعرائے اردو طبع دوم ص ۱۶۹)

عشقؔ انھیں باتوں کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں۔

"سید امام الدین خاں خلف سید معین الدین خاں در عہد سلطنتِ محمد شاہ بادشاہ غازی سرچوکی رسالۂ والاشاہی بود گویند کہ تذکرۂ مختصر مشتمل بر احوال و اشعار ریختہ گویانِ معاصر خود مرتب ساختہ"۔ (ج ۲ ص ۲۶۵)

شیخ احمد وارث احمدی کے متعلق صاحب گلزار ابراھیم

کا بیان ہے کہ

"احمدی تخلص اسمش شیخ احمد وارث ، موطنش قصبہ زمانیہ و
نسب آبائش بحضرت قاضی شمس الدین ہردی کہ از خلفائے
سلطان السالکین شاہ شرف الدین بہاری بود می پیوند دا ما مشارٌ
الیہ اسلاف خود بشیوۂ مال گزاری پرگنہ زمانیہ و رسالہ داری
انصاف داشتہ از تربیت یافتگان نواب فضل علی خاں غازیپوری
است۔" (گلشن ہند طبع ثانی ص ۴۷)

عشقی نے اپنی معلومات کو اس طرح پیش کیا ہے۔

"احمدی تخلص اسمش شیخ احمد وارث متوطن قصبۂ زمانیہ است
از تربیت یافتگان نواب افضل علی خاں غازی پوری است و
با حضرت قاضی شمس الدین ہردی کہ از خلفائے شاہ شرف الدین
بہاری بود، سلسلۂ نسبت دارد، بزرگانِ او از قدیم بشیوۂ مالگذاری
ضلع مسطور اشتغال داشتند۔" (ج ۱۔ ص ۵۶)

اس قسم کے اکتساب فیض کی مثالیں عشقی کے یہاں جا بجا نظر آتی ہیں
لیکن انھوں نے صرف دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات پر اکتفا کر کے
اپنے قوائے عملی اور ذہنی جستجو کو مفلوج نہیں کیا ہے بلکہ معلومات کے تمام
ذرائع و وسائل سے پوری پوری مدد لینے کی کوشش کی ہے چنانچہ ان کے
تذکرے سے ایسے متعدد شاعروں کے متعلق نہایت مفید اور کار آمد معلومات
حاصل ہوتی ہے جن کے بارے میں میر، میر حسن اور علی ابراہیم وغیرہ نے
بالعموم مطلق خاموشی اختیار کی ہے۔ علی ابراہیم کے متعلق درج ذیل بیان
اسی قسم کی مثالوں میں سے ایک ہے۔

"حالؔ تخلص موسوم و ملقب بہ عزیز الملک امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ۔ مردے عزیز الوجود ذیشان از مشاہیر دانشمندان و فطانت پیشگان روزگار بود۔۔۔۔ بزرگانش از قدیم بہ قصبۂ شیخوپورہ ضلع صوبۂ بہار مسکن و ماوا اختیار نمودند۔ بالجملہ آں والا منزلت در آغاز حال بزمرۂ منسلکانِ میر محمد قاسم خاں بہادر المخاطب بہ عالی جاہ سرفرازی یافتہ رشدے و عزتے بہم رسانیدہ، بعد از شکستِ بسترِ چندے در مرشد آباد بہ نیابت نواب مظفر جنگ بہادر معزز و ممتاز گردیدہ۔ در آخر از جانب کمپنی انگریز بہادر بہ عہدۂ عدالت شہر محمد آباد عرف بنارس مامور شدہ بہ حکومتِ تمام می گزرانید شیوہ انشا پردازی و نثر نویسی را بسلاست و روانی ادا می کرد گاہ گاہ بجب جولانئ طبع سمند فکر را در مضمار نظم فارسی و ریختہ نیز جولان می داد و در مقطعِ اشعار فارسی خلیل و در مقطعِ غزلیاتِ ہندی حالؔ تخلص می آورد[1]۔ بہ تقضائے الٰہی بسال یک ہزار و دو صد و ہشت ہجری بتاریخ بست و سوم شہر محرم الحرام شربتِ ممات چشید نقیر مولف تاریخ وفاتش چنیں بہ سلکِ ارقام کشید"

---

[1] یہ تحریر درست نہیں حقیقت یہ ہے کہ علی ابراہیم پہلے حالؔ تخلص کرتے تھے۔ بعد میں غالباً اپنے نام کی رعایت سے خلیل انھوں نے تخلص اختیار کیا چنانچہ شورش کا بیان ہے کہ قبل ازیں حالؔ تخلص می کرد و ندالحال خلیل تخلص می فرمایند"
(دو تذکرے ج ا۔ ص ۲۴۳)

خان ذی قدر، صاحبِ دانش — کرد رحلت چو در ریاضِ نعیم
گفت سالِ وفاتِ او رضواں — شد بہ جنت مقیم ابراہیم

(ج ۱ - ص ۲۴۴)

مرزا عبدالقادر بیدل کے ذکر میں عشقی کے پیشرو عام طور پر یہ دلیل پیش کر کے مختصر نویسی سے کام لیتے رہے ہیں کہ ان کے مفصل حالات خاص کے تذکروں میں مرقوم ہیں اس لئے تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ اسکے برخلاف عشقی نے ان کے سوانح حیات نہایت شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کئے ہیں لکھتے ہیں کہ :-

"بیدل تخلص اکبر آبادی اسمش مرزا عبدالقادر خلف مرزا عبدالخالق از قبیلۂ ارلان تورانی الاصل بود۔ از چاشنیٔ فقر و تصوف بہرہ وافی و حظے کافی داشت۔ در اوائل حال از ملا کمال بہ تکمیل فن خوش سخن پرداختہ بہ ارشاد آں رمز شناس اصرار کمالی ونزی تخلص قرار داد۔ وقتیکہ بسنِ شباب رسید شرفِ ملازمت شاہزادۂ عالی جاہ محمد اعظم شاہ دریافتہ بہ منصب پانصدی ذات و دارو غگی توشک خانہ عز امتیاز یافت چنانچہ بیست سال کامل دریں کار و بار بہ کام دل گزرانید در ہماں ایام بیدل تخلص اختیار نمودہ، نتائج ذہن صافی خود را بنظر شیخ عبدالعزیز عزت تخلص کہ از شاہیر شعرائے آں عہد بودند، جلوہ افروزی ساخت۔ دریں اثنا بہ رہنمونیٔ خضر توفیق قطع علائق دنیائے فانی و ترک منصب خدمت سلطانی کردہ در تورو سیاحت بنگالہ و بہار

گردید۔ بعد چندے بہ حسب آب خورد تکلیف بعضے از ہوا خاہان
باز بہ ہندوستان مراجعت فرمودہ ز پا بدامن صبر و قناعت
پیچید۔ آخر الامر بتاہل رغبت نمودہ سی و شش سال دیگر بہ
اہل و عیال بسر برد۔ بالجملہ مرزائے عالی مرتبت در جمیع اقسام
نظم و نثر فارسی خاصہ در شیوۂ غزل داد معانی پروری می داد۔
کلیات دیوانش تخمیناً دو لک بیت باشد۔ در سال یک ہزار
یک صد و سی (و دو) در عہد محمد شاہ جنت آرام گاہ چہارم
ماہِ صفر بروضۂ رضوان خرامید" چہارم از شہر صفر" "تاریخ
وفات آں ببرو مغفور است" (ج ۱۔ ص ۸۲)

ان ترجموں میں جس طرح زیر بحث شعرا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر
روشنی ڈالی گئی ہے اس سے مولف کی سلیقہ مندی اور ذوق جستجو کا
پتہ چلتا ہے لیکن ہر چھوٹے بڑے شاعر کے بارے میں اس قدر تفصیلات
فراہم کرنا نہ تو عملاً ممکن ہے اور نہ ضروری تھا مناسب۔ اس لئے ان کے
یہاں وسعت بیان کی یہ کیفیت عام نہیں البتہ ایک نمایاں عنصر کی
حیثیت رکھتی ہے اس حسن ترتیب میں تاریخی شعور کے ساتھ ہی فن
تاریخ گوئی سے عشقی کی طبعی مناسبت بھی ایک فعال محرک کے طور پر
کار فرما رہی ہے۔ چنانچہ بعض جگہ سنین وفات کے تعین کی غرض سے
انھوں نے اپنے کہے ہوئے تاریخی قطعات بھی نقل کئے ہیں۔ مثلاً:

(الف) غلام حسن حسن عظیم آبادی " در عین جوانی وفات یافت
راقم الحروف تاریخ وفات او چنیں منظوم ساخت"

حیف سفر کرد جواں صورتے　　جانب فردوس زدار کہن

خامۂ عشقی زپئے یادگار کرد رقم "وائے غلام حسن"
(۱۲۰۶ھ)

(ج ۱۔ ص ۲۳۴)

(ب) طالب علی طالب۔ "در عین آغاز جوانی ازیں سرائے فانی رہگرائے عالم جاودانی گردید۔ راقم آثم تاریخ رحلتش بدیں گونہ در سلک نظم کشیدہ تاریخ۔

کرد رحلت زیں جہاں در عین آغاز شباب
طالب دیدار حق، آں نوجوان خوش لقا
بہر تاریخ وفات او چو کردم جستجو
گفت دل، طالب علی، در قرب احمد یافت جا

(ج دوم ص ۵۵)

(ج) شاہ رکن الدین عرف مرزا گھیسا عشق:"وفاتش در سال یک ہزار و دو صد و سہ ہجری اتفاق افتاد۔ فقیر مولف تاریخ رحلتش بدیں گونہ منظوم ساخت

حق شناس درویشے زیں جہاں ہے بنیان
بہر دیدن مولا جانب جناں بشتافت
از خرد چو تاریخش خواست طبع موزونم
عقل گفت، رکن الدین قرب با محمدؐ یافت"

(جلد دوم ص ۶۷)

(د) حسن رضا نجات:" در سال یک ہزار و دو صد و ہفت ہجری عنان عزیمت بریاض جاودانی برتافت۔۔۔۔ فقیر مولف تاریخ رحلتش بدیں گونہ انجام دادہ"

نجاتؔ آں مرد خوش اخلاق مومن
سفر کردہ بملکِ جاوداں رفت
چو سالِ رحلتش از عقل جستم
خرد گفتہ "نجاتؔ آہ از جہاں رفت"

(جلد دوم ص ۲۸۱)

حالات نویسی کے ضمن میں احتیاط پسندی بھی عشقی کا ایک قابلِ ذکر وصف ہے۔ اس خصوصیت کا اندازہ ان مقامات پر ہوتا ہے جہاں انھوں نے تذکرہ نگاروں کے باہمی اختلافات کی بنا پر ایک ہی شاعر کی شخصیت کے دو مختلف موقعوں میں داخلی وحدت کی گرفت سے محروم رہنے کے باوجود اپنے شبہات ظاہر کر دئے ہیں اور قارئین کو درج تذکرہ بیانات پر اکتفا سے باز رکھ کر دوسرے ذرائع سے تحقیق و تصدیق کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بیتاب الہ آبادی سے متعلق درج ذیل بیانات ملاحظہ ہوں۔

(الف) "بیتابؔ تخلص الہ آبادی اسمش شاہ محمد علیم برادر قاضی مفخر از جوانانِ موزوں طبع بود۔ ایں مطلع منسوب بہ اوست۔

رفتہ رفتہ بتِ خوش قد مرا آفت ہوگا
قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا (جلد اول ص ۸۹)

(ب) "بیتابؔ تخلص اسمش شاہ علیم اللہ مرد فاضل از متوطنانِ الہ آباد است بیشتر فکر فارسی می کند۔ گاہ گاہ بہ حسبِ اتفاقی جہتِ تفریحِ طبع دو ستان مطلعے و غزلے بزبانِ ریختہ

می گوید ..... " (جلد اول ص ۸۹)

سات اشعار پر مشتمل انتخاب کلام کے بعد یہاں عشقی نے اس اعادے کے متعلق ان الفاظ میں اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے۔

"مخفی نماند کہ در بعضے از سفاین ..... شش شعر اخیر بنام میر محمد علیم بنظر در آمد گمان غالب ایں کہ میر محمد علیم و شاہ علیم اللہ تخلص واحد باشند واللہ اعلم" (جلد اول ص ۹۰)

میر محمد حسن حسن اور میر ابوالحسن وحشت کے سلسلے میں بھی عشقی کو اختلاط و اشتراک کے اس مرحلے سے گزرنا پڑا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی انھوں نے ان دو بظاہر مختلف شاعروں کے حالات علیحدہ علیحدہ سپرد قلم کر کے آخر میں اصل صورت حال کی وضاحت کر دی ہے۔ متعلقہ بیانات درج ذیل ہیں۔

(الف) حسن۔ "نامش میر محمد حسن از شاگردان مرزا رفیع سودا احوالش بوجہ احسن معلوم نیست اما از تذکرۂ میر محمد تقی میر تخلص کہ دو مطلعے از واردات طبع او دران مندرج است، مطلع دریں مقام حسن ارتسام می پذیرد و از دست۔

قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑ یو
خنجر تو ایک دم کے لیے منھ نہ موڑیو" (جلد اول ص ۲۳۲)

(ب) وحشت۔ "میر ابوالحسن متوطن دارالخلافت شاہجہاں آباد جوانے اہلیت شعار سپاہی پیشہ از بنا بر تیر انداز خیال مشق سخن بمشورت مرزا رفیع السودا می نمود کلامش

سلاست و پاکیزگی دارد و از وست۔

کہیں یہ جھوٹ دیکھا ہے، تجھے جب میں بلاتا ہوں
صریحاً تو چلا جاتا ہے اور کہتا ہے آتا ہوں
لگتا ہے آج مجھ کو یہ سارا اجال خراب
شاید کہ ہو گیا ہے کوئی خانماں خراب

مخفی نماند کہ از تذکرۂ میر غلام حسن و گلزار ابراہیم چنیں متحقق می گردد کہ میر ابو الحسن وحشت ہموں محمد حسن، حسن تخلص است کہ میر محمد تقی ذکرش در تذکرۂ خود کردہ۔ اغلب کہ وحشت و حسن ہر دو تخلص داشتہ باشد و شاید کہ ابو الحسن را بہ اسم محمد حسن نیز ملقب کردہ باشند ..." (جلد دوم ص ۳۰۹)

تذکرہ نگاروں کو شعرا کے حالات کی دریافت و تحقیق کے دوران قدم قدم پر اس قسم کے اختلافی مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مطالعے کی غیر معمولی وسعت، حاضر دماغی اور امعانِ نظر کے بغیر ان سے عہدہ برا ہونا دشوار ہے اس لئے ضروری نہیں کہ انتہائے احتیاط کے بعد بھی کسی شخص کا دامن لغزشوں سے قطعی طور پر محفوظ رہ سکے۔ عشقی کے تذکرے سے جو مثالیں اوپر کی سطور میں نقل کی گئی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حتی الامکان وہ اپنے بیانات میں کوئی واقعاتی نقص یا تضاد نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں سے کوئی الجھاؤ یا غلط بحث پیدا نہ ہو پھر بھی بعض اوقات ان کی نظر اس خصوصیت کو برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئی ہے اور ایک ایسے شاعر کو جس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے دوبارہ متعارف کراتے ہوئے وہ

اس تکرار کی گرفت نہیں کر سکے ہیں۔ میر محمدی بیدار کے بارے میں درج ذیل بیانات ایسی ہی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

(الف) "بیدار تخلص اسمش محمد علی از شاگردانِ مرتضیٰ قلی بیگ فراق تخلص مرد وارستہ مزاج در عہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ بود۔ در شاہجہاں آباد بہ لباس فقر و شکستگی حال می گذرانید۔" (جلد اول ص ۷۱)

(ب) "بیدار تخلص اسمش میر محمدی ساکن شاہجہاں آباد (از یاران) و تربیت یافتگانِ خواجہ میر درد است کلامش سلاست و روانی دارد۔" (جلد اول ص ۹۱)

(ج) "بیدار تخلص اسمش محمدی شاہ از مریدان مولوی فخر الدین مردے مستعد صاحب دیوانِ فارسی و ہندی بود و در اکبر آباد بہ عزت و فراغت اوقاتِ عزیز خود بسر می برد و در سنہ یک ہزار و دو صد و دوازدہ ہجری ازیں سرائے فانی و بملک جاودانی رحلت نمود۔۔۔۔" (جلد اول ص ۹۲)

ان بیانات میں اعادے کی جو صورت پیش آئی ہے وہ اپنی قسم کی واحد مثال ہے چونکہ دوسرے دو تین مقامات پر جہاں عشقی کا قلم ایسی ہی لغزش سے دوچار ہوا ہے نہ تو یہ نقص اس قدر نمایاں ہوا اور نہ اس درجہ قابلِ التفات اور بہ حیثیت مجموعی تلاش و جستجو کے ذریعہ اصل حقائق و واقعات تک رسائی کی لگن ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے عشقی کے مزاج میں دخیل رہی ہے۔ اس لئے اعادہ و تکرار کی ان مثالوں کو تذکرے کی ترتیب و تدوین کی طویل مدت اور شعرا کی کثرتِ تعداد کے

پیش نظر صرف وقتی اتفاق اور خلاف معمول سہو نظر ہی سے تعبیر کیا جا سکتا؟
اب تک تذکرۂ عشقی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ عشقی کے یہاں چند خامیوں کے باوجود تذکرہ نگاری کے محدود دائرے میں ایک اچھے سوانح نگار کی تمام خوبیاں موجود ہیں لیکن ایک تذکرہ نویس کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ مختلف شعرا کے حالاتِ زندگی کو یکجا کر کے مطمئن ہو جائے، اپنے انتخاب کئے ہوئے فن کاروں کی شخصیات کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے عشقی کی کوششوں کا یہ دوسرا رخ اول الذکر کے برخلاف بہت ہی کمزور اور بے جان ہے۔ انھوں نے جن شاعروں کے اخلاق و عادات اور ذہنی و فکری سطح کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ ہم ان کے نام انگلیوں پر گن سکتے ہیں تاہم ان میں سے چند مثالیں یہاں پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ملاحظہ ہوں۔

(الف) محمد رمضان جوشش "مردے خوش اخلاق و گرم جوش است۔۔۔۔ احوالِ جوہر ذاتی و صفاتی او بر جمیع صغیر و کبیر روشن و ہویدا است" (جلد اول ص ۲۱۸)

(ب) غلام یحییٰ حضور "مردے قابل و قابل دوست۔۔۔۔ طبعش بشیوۂ خلق و آشنا پرستی چالاک و چست و مزاجش بحضور و حبیب با جمیع اخلاص کیشان درست" (جلد اول ص ۲۰۸)

(ج) حمزہ علی رند۔ "مردے وارستہ مزاج و آزاد مشرب است و از شیوۂ خاکساری و دردمندی کہ طریقہ خاص رندان

درد آشام حقیقت است؛ چاشنیٔ معقول بہم رسانیدہ و از حظ
نفسانی و مستلزات جسمانی تنفر گزیدہ آئین بے تعلقی اختیار
گردانیدہ" (جلد اول ص ۳۲۸)

(د) میر کلو شاعر:- "مردے درد مند و منصف مزاج متصف
بصفات قابلیت و موصوف بحلم و آدمیت بود- دائماً عنان
ہمت بر شاہراہ صلاح و تقویٰ کہ بزرگ زادگان است
معطوف می داشت و قدم بر جادۂ خاکساری و فروتنی کہ
ہمیں شیوۂ غیر ازیں نیست می گزاشت"۔ (جلد دوم ص ۱۹)

یہ اقتباسات جن شعرا کے ترجموں سے ماخوذ ہیں ان سے عشقی ذاتی
طور پر واقف تھے اور چونکہ عموماً ایسے فنکاروں کی تعداد بہت زیادہ
نہیں ہوتی جن سے ایک عام اہل قلم بخوبی واقفیت رکھتا ہو غالباً
اسی لئے انھوں نے اپنے جانے بوجھے محدود سے چند شاعروں کے
علاوہ باقی شعرا کے عادات و خصائل اور علمی و ذہنی صلاحیتوں کے
بارے میں اظہار خیال سے دامن بچایا ہے۔ تذکرے کا یہ نقص قابل لحاظ
ضرور ہے لیکن یہ طریقہ کار دوسرے تذکرہ نگاروں کے مشاہدات و
تاثرات کو اپنے الفاظ یا انھیں کی زبان میں دوہرا دینے سے
بہر حال بہتر معلوم ہوتا ہے۔

تنقید فن کے نقطۂ نظر سے بھی "تذکرۂ عشقی" کسی خاص حیثیت
کا حامل نہیں۔ سیرت و اخلاق کی طرح کلام کے محاسن و معائب پر رائے
زنی کے معاملے میں بھی عشقی حد درجے بے نیاز نظر آتے ہیں۔ معمول کے
برخلاف جہاں کہیں انھوں نے کسی رائے کا اظہار کیا بھی ہے وہاں بھی

وہ نہ صرف نقد و نظر کا کوئی بلند معیار پیش کرنے ہی سے قاصر رہے ہیں بلکہ ان کی عبارات ان کے ناقدانہ شعور کی ناپختگی اور عجز بیان کی دلیل بن گئی ہیں گردیزی کی طرح ان کا سرمایۂ تنقید بھی "پختگی و رنگی" "سلاست و روانی" "چاشنیٔ درد" اور "ربط معانی و الفاظ" جیسے چند لفظوں میں محدود ہے۔ انھیں الفاظ کو بلا کسی تغیر وہ بار بار استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ درج ذیل مثالیں اس کا واضح ثبوت ہیں

۱۔ سنتوکھ رائے بیتاب۔ "کلامش از پختگی و رنگی خالی نیست"

(جلد اول ص ۹۰)

۲۔ شاہ قدرت اللہ قدرت:۔ "کلامش از پختگی و رنگی خالی نیست"

(جلد دوم ص ۱۴۹)

۳۔ شاہ واقف۔ "کلامش از پختگی و رنگی خالی نیست"

(جلد دوم ص ۲۱۱)

۴۔ وارث علی نالاں۔ "کلامش از پختگی و رنگی خالی نیست"

(جلد دوم ص ۱۳۹)

۵۔ ثناء اللہ فراق۔ "کلامش از پختگی و روانی خالی نیست"

(جلد دوم ص ۱۳۹)

۶۔ نظر علی گمان۔ "کلامش بے گمان پختگی و روانی دارد"

(جلد دوم ص ۱۰۳)

۷۔ محمد تقی ہوس۔ "شیوۂ ریختہ را بطریق مشاقان این فن پختگی و روانی انجام می دہد" (جلد دوم ص ۳۲۸)

۸۔ میر محمدی بیدار۔ "کلامش سلاست و روانی دارد" (جلد اول ص ۹)

۹۔ شاہ گھسیٹا عشق:۔ "کلامش از طرزِ سلاست و روانی خالی نیست"۔
(جلد دوم۔ ص ۶۷)

۱۰۔ محمد محترم خاں محترم:۔ "شیوۂ ریختہ را بسلاست و روانی ادا می ساخت"
(جلد دوم ص ۲۱۵)

۱۱۔ ہدایت اللہ ہدایت:۔ "شیوۂ ریختہ را بسلاست و روانی ادا می سازد"
(جلد دوم ص ۲۲۳)

۱۲۔ کرم اللہ خاں درد:۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست"۔
(جلد اول ص ۲۸۰)

۱۳۔ مظہر علی زار:۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست"۔
(جلد اول ص ۳۷۸)

۱۴۔ حمایت علی مجنوں:۔ "کلامش از چاشنیٔ درد خالی نیست"۔
(جلد دوم ص ۲۷۵)

۱۵۔ حسن علی شوق:۔ "کلامش از لذت درد خالی نیست"۔
(جلد دوم ص ۱۷)

۱۶۔ کرامت اللہ خلیق:۔ "کلامش از مربوطی الفاظ و معانی خارج نیست"۔
(جلد اول ص ۲۴۸)

۱۷۔ میر غلام حسین شورش:۔ "کلامش از ربط معانی و درستی الفاظ خالی نیست"
(جلد دوم ص ۳۶)

۱۸۔ میر مہدی شورش:۔ "ریختہ را بدرستی الفاظ و معانی انجام می دہد"
(جلد دوم ص ۲۹)

۱۹۔ فتح محمد دل:۔ "فکر ریختہ بطرزِ ایہام می کرد"۔ (جلد اول ص ۳۱۶)

۲۰۔ عبدالوہاب یک رو۔ "مشق ریختہ بطرز ایہام می کرد"

(جلد دوم ص ۳۳۷)

انتخاب کلام کے تحت عشقی نے بیشتر غزلیات کے اشعار پیش کیے ہیں ان میں سے زیادہ تر اشعار دوسرے تذکروں سے منقول ہیں۔ البتہ جن شعرا کے دواوین ان کی نظر سے گزر چکے ہیں ان کے کلام کا انتخاب انھوں نے خود ہی کیا ہے۔ یہ انتخابات نہ تو بالعموم بہت زیادہ طویل ہیں اور نہ بہت مختصر۔ شعراء کے مخصوص رنگ سخن اور فنی استعداد کا ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اشعار کے غلط انتخاب کی مثالیں بھی اس تذکرے میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اگرچہ عشقی کے یہاں تنقید سیرت اور تنقید کلام سے متعلق مواد کی غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے، تاہم ان کے تذکرے کا سوانحی پہلو بہت جاندار اور تابناک ہے۔ اس لئے اردو کی ادبی تاریخ کے مطالعے میں اس تذکرے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

طبقاتِ سخن

"طبقاتِ سخن" غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی[1] کی تالیف ہے یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اب تک اس کے کل تین قلمی نسخے دستیاب ہو سکے ہیں۔ ان میں سے ایک نسخہ فضل الرحمٰن خاں لائبریری جی۔ ایف کالج شاہجہاں پور میں دوسرا برلن کے قومی کتب خانے میں اور تیسرا دہلی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پاس محفوظ ہے۔ شاہجہانپور کا نسخہ مکمل ہے لیکن جگہ جگہ سے بوسیدہ اور کرم خوردہ ہے۔[2] برلن کے نسخے کی مائکرو فلم دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بیشتر اوراق منتشر اور بے ترتیب ہیں اور ان میں سے کچھ ضائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آب رسیدگی کی بنا پر بعض جگہ تحریر اس قدر دھندلی ہو گئی ہے کہ پڑھنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیسرا نسخہ صرف چند منتشر اوراق پر مشتمل ہے جن کی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ تینوں نسخوں کے ان ظاہری نقائص کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم اپنے مطالعے کے لئے نسخۂ شاہجہانپور کو قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں جو ان میں نسبتاً سب سے زیادہ بہتر اور بلحاظ قدامت

---

[1] متوفی رمضان ۱۲۴۱ھ/ اپریل، مئی ۱۸۲۶ء "تذکرۂ بے جگر" مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۲۳ ب

[2] ڈاکٹر محمد حسن نے ہفتہ وار "ہماری زبان" علی گڑھ کے ۱۵ جنوری سے ۸ اپریل ۱۹۶۰ء تک کے شماروں میں اس نسخے کی تلخیص شائع کر دی ہے لیکن یہ تلخیص انتہائی ناقص اور بے شمار اغلاط سے پُر ہے۔

بجز فہرست ہے۔ اس نسخے کی کتابت رام سروپ ولد روشن رائے ساکن قصبہ باغپت ضلع میرٹھ کے قلم سے ۱۲ ماہ دسمبر ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲ ماہ محرم ۱۲۲۱ھ روز پنجشنبہ کو مکمل ہوئی ہے۔

"طبقات سخن" اس تذکرے کا تاریخی نام ہے کہ جس سے ۱۲۲۲ھ بر آمد ہوتا ہے۔ پیش نظر نسخے میں مولف کے اس بیان کے علاوہ کہ اس تذکرے میں محمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء - ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) سے محمد اکبر شاہ کے پہلے سال جلوس (۱۲۲۱-۲۲ھ/ ۷-۱۸۰۶) تک کے شاعروں کا ذکر ہے۔ ایسی شہادتیں بہت مفقود ہیں جن سے ترتیب و تدوین کی مدت کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل کی جا سکے۔ لیکن نسخہ برلن میں بعض جگہ اس قسم کے بیانات مل جاتے ہیں جن سے بعد کے زمانے میں اضافہ و ترمیم کے عمل کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر شاہ نصیر دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"بعد چند سال از تحریر ایں تذکرہ کہ آں عزیز بتقریب وصولی زر سالیانہ درگاہ پیر ممدوح (میر عبدرجہاں) از سرکار صاحب کلکٹر در میرٹ (میرٹھ) آمد از مولف ہم ملاقات نمود۔"

ان جملوں سے تو یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ اضافہ کس زمانے میں کیا گیا ہے البتہ تذکرۂ بے جگر[1] میں اس تذکرہ سے منقول شاہ نصیر کے حالات کے اقتباس میں اس بعد میں بڑھی ہوئی عبارت کی موجودگی سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء سے جبکہ بے جگر اپنے تذکرے کی ترتیب میں مصروف تھے، قبل کی تحریر ہے۔

مبتلا نے اس تذکرے کو دو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اول "اشعار

---

[1] مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۱۹۴ الف

ہندی شعرائے زبان ماضی و حال" سے متعلق ہے۔ اس میں تقریباً دو سو شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے[1]۔ طبقہ ثانی "اشعار فارسی خود بضمن خاتمے و بعضے احوال" پر مشتمل ہے۔ نسخہ شاہجہاں پور میں یہ دوسرا حصہ موجود نہیں۔ تذکرے کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ جس میں نثر پر نظم کا غلبہ رہا ہے۔ کئی صفحات کو محیط ہے۔ اس کے بعد فن شعر کی اہمیت۔ اور شعر گوئی کی ابتدا کے بارے میں مختلف روایات نقل کی گئی ہیں۔ نثر کے مقابلے میں نظم کی امتیازی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے مبتلا لکھتے ہیں کہ

"رتبۂ نظم از نثر صد درجہ بلند تر است و ہزار مرتبہ بہتر ہر چند نثر بہ سلاست الفاظ و تناسب معانی آراستہ باشد بے میانجی نظم رونق پذیر و پیراستہ نیست۔" (ص - ۵)

مختلف ملکوں اور زبانوں میں شاعری کی ابتدا سے متعلق جن روایات کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:-

(الف) جمعے از مورخین ابتدائے شعر سازی از حضرت آدم صفی اللہ نگاشتہ اند۔ وقتے کہ ہابیل قابیل را کشت چند بیت در مرثیہ او بزبان مبارکش آمد لیکن دریں مقام تردد دے ہست کہ زبان آدم سریانی بود۔ دراں زبان گفتہ باشد ترجمہ اش تفریق کردند۔" (ص ۵)

(ب) "قول بعضے آنست کہ در زبان فارسی اول شعر بہرام گور گفتہ و سببش آں بود کہ او محبوبۂ داشت دل آرام ..... ہر سخن کہ

---

[1] "تاریخ تذکرہ ہائے فارسی" کے مصنف احمد گلچیں معانی نے فہرست کتب خانہ بوڈلین کے حوالے سے شعرا کی تعداد ۱۹۶ بتائی ہے۔ (جلد اول ۶۴)

بہرام گفتے او جواب دادے۔ روزے بہرام بجضور او با شیرے درآویخت وآں شیر را ہر دو گوش گرفتہ (بر پشتش نشست) و از غایتِ تفاخر گفت۔ منم آں پیل دماں و منم آں شیر یلہ دلی آرام جواب داد۔ نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ"۔

(ص ۵)

عربی فارسی زبانوں کی شاعری کے بعد مبتلا نے ہندوستانی شاعری کا ذکر کیا ہے وہ امیر خسرو کو غزل ہندی کا موجد قرار دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے شیخ سعدی شیرازی کی سیاحتِ گجرات اور ہندوستانی زبان میں طبع آزمائی کے متعلق روایت بھی نقل کی ہے۔ بعد ازاں ولی دکنی کی شاعری اور ان کے کمالات و اجتہادات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"اگرچہ زبانش بر محاورہ عصر اوست لیکن در استعداد شاعری قصورے ندارد" (ص ۷)

اس کے بعد مختلف زبانوں اور مقامی بولیوں کی مختلف العہد نثری روایات کے تقابلی مطالعے کی غرض سے پوربی، مارواڑی، برج بھاشا پنجابی اور فارسی کی شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے گئے ہیں جن میں آنند گھن بیراگی۔ ساکن متھرا کا یہ قطعہ بھی شامل ہے۔

ہندو بچہ طرفہ بلا حسن دھر بیچ
در حالتِ گفتار ز مکھ پھول جھڑ بیچ

گفتم کہ پری لال یکے بوسہ بمن دہ
گفتا کہ ہرے رام ترک دھرن ظلم کو بیچ

اس قسم کی مثالیں مولف نے اس بات کی وضاحت کے لئے پیش کی ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے اردو زبان ترقی کی منزلیں

طے کرتی جاتی ہیں، ارباب سخن کے اندازِ فکر اور اظہار و بیان کے اسالیب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ تدریجی ارتقا کے اس عمل کو سمجھنے کے لئے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ "طبقات سخن" کی ترتیب اسی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے عمل میں آئی ہے۔

تذکرے کی ترتیب میں مبتلا نے ذاتی تعلقات خط و کتابت اور اتفاقیہ ملاقاتوں کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کے علاوہ "قائم، میر حسن اور مصحفی کے تذکروں سے بھی مدد لی ہے۔ چنانچہ شاہ حاتم، محمد یار خاکسار، میر قمرالدین منت، فدوی لاہوری، محمد عسکری نالاں وغیرہ کے حالات میں واضح طور پر ان تذکروں کے حوالے موجود ہیں لیکن یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس استفادے کے باوجود مبتلا کے بعض بیانات ان تذکروں کی متفق علیہ روایات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ آیندہ سطور میں اس موضوع پر مفصل بحث کی جائیگی۔

حالات کی ترتیب میں مبتلا نے حروف تہجی کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ کسی خاص اصول پر کاربند نہیں۔ چنانچہ بعض شاعروں کو انھوں نے بغیر کسی خاص سبب کے تخلص کے حرفِ اول کی بجائے نام کے پہلے حرف کی مناسبت سے جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر میر کا ذکر ردیف میم کے بجائے ت کی ردیف میں، شرف الدین علی خاں پیام کا ذکر ردیف ش کے تحت اور ظہور اللہ خاں نوا کا ذکر ردیف ظ کے ذیل میں ملتا ہے اس بے نظمی و بے ترتیبی کے لئے کوئی وجہ جواز پیش نہیں کی جاسکتی کیونکہ عملاً اس سے دامن بچانا کچھ دشوار نہ تھا۔

شعرا کے تعارف میں مبتلا کے بیشتر اجمال و اختصار سے کام لیا ہے۔ نام تخلص اور سکونت کی صراحت پر اکتفا کی جو مثالیں ابتدائی زمانے کے تذکروں میں علی العموم نظر آتی ہیں، اس تذکرے میں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ سطور ذیل میں کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے مولف کی اس کوتاہ قلمی اور مختصر بیانی کا اندازہ ہوگا۔

۱۔ اشرف :۔ "اشرف خاں خلف حکیم شریف خاں دہلوی عالم شاہی عالی طبع بلند فکر است۔" (ص ۱۹)

۲۔ افغان :۔ "امام علی خاں نام لکھنوی است۔" (ص ۲۴)

۳۔ برکت اللہ خاں دہلوی :۔ "از اولاد افغان اسدیار خاں است کہ او مرثیہ خوب می گفت و خوب می خواند و انسان تخلص می کرد۔" (ص ۲۷)

۴۔ زاہد :۔ "میر مظہر علی نام در سرکار احمد علی خاں شوکت جنگ سلسلہ روزگار داشت۔" (ص ۱۱۵)

۵۔ شرف الدین علی خاں پیام :۔ "احوالش داخل تذکرہ فارسی۔" (ص ۱۴۲)

۶۔ محمد عارف عارف :۔ "مردے رفوگر بود در عصر محمد شاہ" (ص ۱۶۷)

۷۔ محشر :۔ "متوطن بداؤن اکرام اللہ نام دارد" (ص ۲۱۹)

۸۔ میر سجاد اکبر آبادی۔ "جوانے مستعد متوطن شاہجہاں آباد بودہ۔" (ص ۲۲۴)

۹۔ یک رنگ :۔ "نامش مصطفیٰ خاں معاصر آبرو و خان آرزو بود و بعضے گویند کہ شاگرد میاں آبرو ست۔" (ص ۲۶۳)

درجہ دوم و سوم کے تمام معروف و غیر معروف شعرا کے حالات میں طبقات سخن میں بالعموم اختصار کی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ البتہ ان شعرا کے ذکر میں جو اس وقت تک ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر چکے تھے اور جن کے تعارف سے اس طرح سرسری گذر جانا آسان نہ تھا۔ کسی قدر تفصیل سے کام لیا گیا ہے جعفِ اول کے اِن فن کاروں کے علاوہ ان شاعروں کے تراجم بھی جن سے مولف کے خصوصی تعلقات یا خط و کتابت کی حد تک رسم و راہ تھی، عام روش سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن بجز دو ایک مقامات کے ان مستثنیات میں بھی سنین کے حوالے کسی جگہ نہیں ملتے۔ تاہم ان بیانات سے ہماری سابقہ معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے اور غور و فکر کے لئے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں

(الف) جرأت:۔ "خوش باش لکھنؤ، باعتبار محض عمر او شصت سال از آبائش سیحی مان بود کہ متصل چاندنی چوک در شاہجہاں آباد مقام داشت از گردش زمانہ کہ ساز و برگِ افلاس لاحقِ احوال او گردید، بعمر بہ دوازدہ سالگی در لکھنؤ رسیدہ مشق ریختہ از جعفر علی حسرت تخلص صاف ساخت بیارے از شاگردان دارد تا جلنے کہ مرزا رفیع سودا و بعضے دیگر از شعرائے پائے تخت در سرکار نواب وزیر بودند اشعارش شہرت کم یافت بعد وفات آنہا کہ مشق او صاف شد خودش تالون استادی نواخت بار از حضور مرشد زادہ مرزا سلیمان شکوہ ہم بہ عطیہ دو شالہ وغیرہ در صلۂ سخن امتیاز یافتہ و از سرود سرائے عشرت کدۂ سخن بہ گوش سرایتانِ حالِ کار کام و زبان ساختہ...." (ص ٥٦)

(ب) میر حسن :- "از شعرائے عالم شاہی است پسر میر غلام حسین ضاحک تخلص کہ مرزا سودا اکثرے از ہجایا در حق او نوشتہ بزرگانش را وطن ہرات بودہ۔ بعد از استفادۂ تربیت در شاہجہاں آباد در ایام شباب بہ اطراف پورب رفتہ بود۔ در فیض آباد و لکھنؤ در سرکار نواب سالار جنگ ممتازی داشت مشق شعر از میر ضیاء الدین ضیاء نمودہ۔۔۔۔ چوں ملازم سرکار نواب آصف جاہ۔ (آصف الدولہ) گردید وقتے مزاج آصف جاہ از طرف او آزردہ شد و از لکھنؤ بدر کردند بعد چندے کہ (مثنوی) سحر البیان را بہ فصاحتِ تمام در زبانِ محل طرح دادہ بحضور آوردہ بیارے از صلہ و اکرام سرافرازی یافت چنانچہ امروز آن قصہ اشتہار تمام دارد۔" (ص ۸۲)

(ج) فدوی لاہوری :- "نامش مرزا فدائی بیگ قوم مغل بر لج شاگرد صابر علی شاہ صابر تخلص، زاد بوم او خطۂ لاہور تربیت یافتہ شاہجہاں آباد۔ مردے آزاد سپاہی وضع بانکہ طور امامیہ مذہب بود۔ در عین شباب از دار الخلافہ بسبیل سیاحت در اصفہان رفت چہار سال با سخنوران آنجا صحبت داشت از آں جا باز بہ ارادۂ ہندوستان در ضلع کٹھیر آمدہ بحضور یکے از سلاطین زادہ صاحب جمال چندے چشم صورت بین را نورے داد چوں دریں ضلع آمدہ، در سرکار نواب ضابطہ خاں خلف الصدق نواب نجیب الدولہ مرحوم بروزگار شاعری ملازم گردید و حسب الحکم قصہ یوسف زلیخا در زبان ہندی

طرح داد۔ اتفاقاً ہمدران عرصہ دائرہ گاہ نواب نواح میرٹھ شد کہ از مولف ملاقات نمود۔ باہم سلسلۂ محبت چنداں منضبط شد کہ ہر روز ملاقاتی گشتہ در یک مجلس طرح غزل می کردیم۔ ہرگاہ روزگارے آں سرکار را گذاشت بہ لکھنؤ رفت و از مرزا رفیع وغیرہ شعرائے حضور نواب وزیر معارضہ اش افتاد و ہم غزل گردید۔ آخر در بریلی آمد و بر یکے از افغان پسر فریفتہ از دستِ رقیب بہ تیغ بیداریغ شہید گشت۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ و آنچہ مصحفی او را در تذکرہ خود بقال پسر و غلام مغل نوشتہ محض غلط است۔" (ص ۱۸۸)

(د) قائم چاندپوری۔ "مخزنِ اسرارِ ظہور قائم متوطن قصبہ چاندپور قوم شیخ از ۱۶۰ ۶ ہ آنجا و صاحب منصبانِ حضور معلی بودہ است با مرزا رفیع سودا وغیرہ مدتے در شاہجہاں آباد ہم مشق ساخت کوبکوے معروف و مشہور ماندہ۔ تا حین حیات اوقات بخوبی گذراند۔ از دفترِ طبع رقم ہائے تازہ بدیوان روزگار رسانیدہ و بہدایتِ ازلی در علمِ سخن گوئی استاد وقت گردیدہ جامے از خمخانۂ عرفان نیز می پیمود و علی الدوائم طالب صحبت اہل اللہ بود۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مولف در خدمت ایں قائم الصراط یکجائی ربطِ آشنائی داشت چنانچہ اکثر از اشعارِ ہندی من ہیچمداں بقید احوال در تذکرہ اش ثبت است بہ سالِ چند شد کہ ازیں سرائے ناقی رو بجہانِ جاودانی نہادہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۲۰۸)

ان تراجم کی اہمیت کے سلسلے میں یہاں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ ان میں دہلی سے ترکِ وطن کے وقت اور اس کے بعد ترتیب تذکرہ کے زمانے میں جرأت کی عمر، میر حسن سے نواب آصف الدولہ کی ناراضگی، ان کے شہر سے اخراج اور چند سال کے بعد مثنوی "سحر البیان" کی تصنیف اور پیش کش کے صلے میں دوبارہ دربار تک رسائی اور انعام و اکرام سے سرفرازی، ندوی لاہوری کے حسب و نسب اور قائم چاندپوری کے تصوف کی طرف رجحان اور اہل اللہ سے تعلق خاطر کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئی ہیں اور ان کے مطالعے سے متعلقہ سمتوں میں تحقیق و تلاش کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی قسم کے معلومات افزا بیانات بعض اور شاعروں کے حالات میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تفصیلات میں جانا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے ہم ان چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں

مبتلا نے اپنے حالات بھی کافی شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کئے ہیں انھوں نے اولاً عشق تخلص کے تحت ردیف العین میں دوبارہ دوسرے تخلص کی رعایت سے ردیف میں اور تیسری مرتبہ تذکرے کے خاتمے پر خود کو ناظرینِ تذکرہ سے متعارف کرایا ہے۔ ان تینوں بیانات میں تیسرا بیان سب سے مفصل اور اہم ہے جسے ادب کے ایک سرگرم خدمت گزار کی حیثیت سے ان کی اہمیت واضح کرنے کے لئے بیان نقل کیا جاتا ہے لکھتے ہیں کہ :-

"الحمد للہ العزیز المستعان ..... کہ ایں ہیچدان دبستان انش از زمانہ شعور تا الاالعان بہ استفادہ صحبت طبعان سرانجام

هرکارے و خدمتے را که بر خدمت بر میانِ جان چست بسته
صورتِ شاهدِ مقصود در آئینهٔ خیال بخوبترین نمود جلوه گر گشته
در ابتدائے سن و قوت که سالِ عمر بدوازده رسیده بود حضرت
ابوی مغفور و مبرور ... . بنابر جودتِ ذهن و [illegible]
بجز خدمتِ ترتیب دیوانِ فارسئی خویش که موقوف بود بنام
مستهام مقرر فرمودند تا که در چند روز بتاثیر کلام افاضت انجام
آشنائے طرزِ گفتہ گاهے بیتے و رباعی فکر کردن گرفت و بیمن
اصلاح آں مقتدائے ایں طریق در مدّد ایام دیوانے بتخلص
مبتلا طرح یافت. ازاں پس بتاثیر صحبتِ بعض اعزه شوق
تیراندازی دامن دل کشیده و ازیں علم هم بهره بر داشت. هم دریں
عرصه اوقات بحثِ آیات نحوے بجز اندانِ علم صرف و نحو
مصروف بود که دفعتاً عارضهٔ نزله و صرفه مانع تحصیلش گردید
حتی که تا حال در هجان بیماری گاهے بشفا و گاهے بمرض
گزاره می گردد. چوں شناخت مزاج منحصر بر علم طب است.
خیلے از فضائل آں نیز بهره ور شد تدارکش تدبیرش به از استقدام
در تقریرش. خود را صحتے و دیگراں را راحتے اندو حاصل
ساخت. اوقاتِ عمر اکثر در نثر طرازی و نظم پردازی بسر برد که
حضرتِ ارم مقام شاه عالم بادشاه با فوجِ جرار از ضلع پٹنه
دار الخلافه شاهجهان آباد را زیب و زینت بخشیدند و با یکے از
مرزایانِ همراهی نجف خاں که اسمش ابراهیم بیگ الم تخلص
بود صحبتم اتفاد، تخلص دیگر عشق اختیار ساخته [illegible]

ترتیب دادہ و نسخۂ "فنونِ عشق" در بحر مثنوی متضمن قصۂ شہ رخ و مہ رخ قریب یک ہزار و ہفت صد بیت فارسی در ہماں ایام طرح کردہ از تالیف تذکرہ فارسی مسمیٰ (بہ) مجموعہ عشق" و ملقب بالتزام بہ "باغ گلہائے حسن" (۱۲۰۸ھ) مشغول با تمام فنون قریب ہشتاد جزو الفراغی (کذا) گشت ازاں پس منشآتے (چند) بضخامت سیزدہ چہاردہ جزو بہ اقسام صنائع و بدائع ہم رنگین و ہم متین فراہم آمد و بہ اصاد دفتر اشواق (۱۲۰۷ھ) از التزام تاریخ نامزد گردید۔ نسخۂ سوانح" (۱۲۰۶ھ) بہ التزام تاریخ در فن تاریخ طرح کرد کہ مبتدیان را بکار آید۔ الحال انقضائے دو سال است کہ تالیفے تازہ موسوم بہ "چہار تشریح" و رسالۂ دیگر در علم تصوف مسمیٰ (بہ) اشعات العشق" بعد فراغ ایں تالیف بر روئے کار آمدہ چنانچہ اندک اندک از تصنیف و تالیف خود در طبقہ دوم بسبیل تفنن طبع احباب تحریر خواہد یافت۔ و از اشعار فارسی حضرت الوی نیز زینت کتاب خواہد نمود۔ بالفعل از تالیف ایں تذکرۂ ہندی منفرغ (کذا) گردیدم

کس جوہر من نمی شناسد جز من ۔ مانند گہر در گرۂ خویشتنم

(ص ۲۶۴)

مشاہیر شعرا اور اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں میں سے جن لوگوں کے تعارف پر مبتلا نے خاص توجہ دی ہے ان کی شخصیت اور کردار کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اپنے تاثرات و مشاہدات کے بیان میں

بھی انھوں نے بالعموم کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ
مصوری کے فن اور دریا کو کوزے میں سمو دینے کے آرٹ سے بخوبی
واقف ہیں۔ چنانچہ کہیں تو انھوں نے زیر بحث شاعر کی زندگی کے
بعض کوائف اور معمولات کے ذکر میں وہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ
قاری کو الفاظ کے پردوں کی اوٹ سے اس کی شخصیت اپنے تمام
خط و خال کے ساتھ ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور کہیں براہ راست
اظہار و ابلاغ کے پیرائے میں مختصر طور پر شخصی اوصاف کے سارے
نمایندہ پہلوؤں کا احاطہ کر کے ایک واضح تصویر پیش کر دی ہے۔
سطور ذیل میں اس قسم کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

(الف) خواجہ میر درد :- "خلاصہ خاندانِ مصطفوی و نقاوۂ
دودمانِ مرتضوی است۔ حقیقت کیش معرفت اندیش
دیدہ حق بیں و سینۂ وحدت آگیں۔ در دار الخلافہ سجادۂ
طاعت بکنج قناعت گسترده داشت۔ صوفی مشرب صافی
مذہب، متصوف کامل مانند اسم شریف خود ہمہ درد دل
...... ہشتم ہر ماہ در خانۂ وحدت نشانہ بزم مشاعرہ و
سرود آراستہ می فرمود صاحب طبعان و سرود سرایان
دہلی ہمہ حاضری گشتند خود ہم دریں فن مہارت کلی داشت"

(ب) مرزا مظہر :- "شیخ کامل، مقتدائے اہلِ زمان ہوشیار
باطن، بیدار مغز، صاحب نسبت بود۔ در سلسلۂ
نقشبندیہ تلقین فیض نمود۔ از بس دوام بہ آب شریعت
شست و شوئے کدورت نہا داشت، جمالی ادر اجمہ

فیض در خضرِ طریقت می پنداشت، فی الواقع آئینہ حقیقت از تمثال بے مثالش جلا دید و جبرنا پیدا کنارِ معرفت را بضمیر صفا تصویر خود تموج بخشید۔ کلاہ سرش از تخشیہ ارجمندی با تاجِ سربلندی خورشید ہم پیوند و بند جبۂ او را کشادِ حرف فی مع اللہ در سر گرہ۔ از اعظم مستعدان و اکابر عالی فطرتانِ عصر بودہ است۔

(ج) خیراتی خاں دل سوز " از بس میل خاطر او بجانب خرابی بسیار بود، ہر گاہ مئے گل رنگ می کشید ہر چہ از نقد و پارچہ نزد خود می داشت بہ میفروشش می بخشید و اکثر بہ اندیشہ عتاب نواب (ظفریاب خاں صاحب تخلص مربی خود) از قصبہ سرزمینہ رہ پوش گشتہ در میرٹھ آمدے و در مقام مولف جا گرفتے و بزم شاعرانہ می آراست۔ خدا آبروئے ایں جبت اعجب بریزد کہ خاکسارے را آتش نذلت در اسباب اوقات اندوختہ برباد ساختہ بود۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۹۱)

(د) ضیاء الدین ضیا۔" شاعرے آشفتہ مزاج عاشق طور بودہ است کہ روز و شب با شاہدان بازاری مخمور بود و بمعشوق پرستی مشہور۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۵۱)

(ہ) ظہور اللہ خاں نوا۔" در مکارم اخلاق و محاسن اشفاق و لطافت طبع و ظرافت مزاج و استقامت عقل ۔ ۔ ۔ ۔ و رزانت رائے ۔ ۔ ۔ ۔ مرد لیست دانشمند ۔ ۔ بود" (ص ۱۵۵)

(ش) نظام الدین ممنون :- "موصوف بہ صفاتِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ و ہوشیار باطن، بیدار مغز، عالی طبع، والا اعتبار است...."

(ص ۲۲۴)

کہیں کہیں مبتلا نے شعرا کی خصوصیاتِ کلام اور ذہنی کمالات کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے لیکن اس سلسلے میں ان کا اندازِ گفتگو تنقید کی بہ نسبت تقریظ سے قریب تر ہے شاہدِ معنی کے لئے استعارات و تشبیہات کے لطیف و رنگین پیرہن کی تراش متاعِ فن کی تحسین و تعبیر کے اس مخصوص اسلوب کی بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ مبتلا کے یہ بیانات بھی اسی کیفیت کے حامل ہیں:

(الف) جرأت :- "چاشنیٔ نعمت ہائے شکرین معنی در رگ و پے نئے قلم دوانیدہ دستِ قدرت اوست و حلاوتِ مضامین تازہ بتازہ بساز و برگِ الفاظ رسانیدۂ زورِ طبیعت او۔ بری رویان بزمِ تازہ خیالی را پرستانِ خانہ زاد حسنِ فکر خود می پنداشت و خود فروشانِ بازارِ خوش مقالی را کنیزکانِ آزاد بندِ طبعِ خویش می انگاشت۔ جلوہ گری سادہ رویان نازک بندی در آئینہ خانہ رائے روشنش پیدا و ہم بستری نارسانِ معنی بہ خلوت گاہ بلندیٔ فکر او ہویدا۔" (ص ۵۷)

(ب) خواجہ میر درد :- "دیوان تصوف سامانِ او...... از پرتوِ تجلیاتِ الفاظِ وحدت بادہ اوراق مہر و ماہ برابر و مضامین ہدایت آگین نثرش از ظلمت فروغِ معنی با سبعہ سیارہ ہم سر...... بیاضش در اندازِ سخن بہ اجزائے آفتاب

ہم مطلع نمودہ شاہدانِ مضامین نالۂ دردش از شورِ چپانی شنک بر جراحتِ دل ہا می بافند و معشوقانِ معنی آہ سردش بہ چاشنی شیریں کلامی قوام شربتِ شوق می گردانند"۔ (ص ۹۶)

(ج) سعادت یار خاں رنگین :- "۲۳۔ ہم برشتگی الفاظ و شیفتگی معانی از دوضع آشفتہ اش پیدا است و پری چہرگانِ مضامین ادرا با غازہ تازگی و گل گونہ نازکی حسنے دو بالا۔ ایجاد ریختی بزبانِ محل از نتائج طبع حسن سرشار اوست و نیک ورزی محاورات در ان کلام بمرورِ بازوئے عشق گفتار او۔ چپانی کلمات تازہ پیرا ہنے است بر قامتِ معشوقان اشعارش دوختہ در برجستگیٔ سخن ہائے دلفریب عاشق شکیبِ شمع در محفل گفتار برافروختہ"۔ (ص ۱۰۱)

(د) مرزا رفیع سودا :- "فارس مضمار سخندانی (و پہلوان عرصہ معانی است) ۔۔۔۔۔ در طرح قصائد بدائع و پرداز مثنویات ہجو مثل او از خاک دار الخلافہ احدے برنخاستہ ۔۔۔۔۔ مانند او بسیار گو و خوش گو کم پیدا شدہ ۔۔۔۔۔ ہر چند در ہم عصرانِ خود زبانِ صاف پیدا کردہ، اما یاران حال بر اکثر محاورہ اش حرف می گیرند و کرخت می گویند ۔۔۔۔۔ دریں سخن نیست او سعنی یاب تازہ گو بودہ آں ہا صرف گفتگوئے دارند" (ص ۱۲۱ - ۱۲۲)

(ہ) قائم چاندپوری :- "رباعیاتش چوں ترکیب عناصر از چہار مصرعہ بہم مختلط و مثنویاتِ دلآویز او مانند زلف و گیسو با

یک دیگر مرتبط قصائدش در چمنستانِ فکر ریحانِ بوستانِ دل پذیری در غزلیاتِ او در انظارے بانظیری شاہدانِ معنی در زیر نقاب الفاظش چہرہ ۔۔۔ برافروختہ اند و آئینہ رویانِ الفاظ بخال و خط دل بستی خود را بانازِ یوسفی فروختہ۔ پیچ و تاب مضامین چوں طرہ دلآویز مسلسل مویانِ دلکش سنبلستانِ بہار در نگینیٔ کلمات عندلیبانِ چمن استعداد را سرمشق گفتار۔ کرسی نشینیٔ استعارات از عرش فصاحت را کنگرہ ایست بلند و سجع گزینی کلماتش در عرض جوہر بد عادل پسند۔ آئینہ داری یوسف طلعتانِ معانی از کلامش ہویدا ... و شانہ چینیٔ عنبریں مویانِ سخن بزنجیرۂ الفاظش ہویدا۔"

(ص ۲۰۸)

(و) میر نظام الدین ممنون :۔ "قافیہ سنجانِ قانون سخن را کہ عمرے دریں فن صرف کردہ اند بہم رسانیدن جنس کلام ... بمنزلۂ انگارش دشوار۔ حبذا جودتِ طبع (آں) سحر آفریں کہ گوہر شاہوارِ معنیٔ آبدار از محیطِ طبع بر می آرد و در جا بلند پروازی شہبازِ فکر آں اعجاز مکیں کہ بسر پنجۂ قدرت عنقائے خیال می شکارد۔"

(ص ۲۲۴)

(ز) نصیر دہلوی۔ "در نازک بندی برہم عصرانِ خود ممتاز معنی ہائے جستہ جستہ اش بالفاظِ دلپسند مانند جسم و جان مرتبط: از روائح فوائح طرزِ تازہ اودماغ و جانِ ہنروران منبسط از اقسام شعر در طرح مطلع و قطعہ ممتنع الجواب است

و بہ نتائج افکار تازہ بتازہ گل سر سبد انتخاب۔ تازگی مضامین
او با رنگینیٔ الفاظ غیرتِ بہارستانِ عدن و بلندیٔ فکر
او با شرفۂ عرش ہم سخن جدولِ دیوانش برادبا) خطوطِ شعاعی
ہمسر است و نقطہ انتخاب از انداز الفاظ نہر و ماہ برابر۔"
(ص ۲۴۶)

ان عبارتوں میں معانی پر الفاظ کے غلبے یا استعاراتی اندازِ بیان کی وجہ سے کسی حد تک ابہام و اغلاق کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، تاہم ان کے مطالعے سے شاعر کی ذہنی استعداد، اس کی طبیعت کے رجحان، کلام کے رنگ ڈھنگ اور زبان و بیان کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں ابتدائی نوعیت کی معلومات ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کو لایعنی اور بے مصرف کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انتخابِ کلام کے سلسلے میں "طبقاتِ سخن" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کی طرح اس تذکرے میں بھی صرف صنفِ غزل ہی کی نمایندگی نہیں کی گئی ہے بلکہ موقع اور محل کے مطابق جا بجا دوسری اصنافِ سخن کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں اس تنوع کی بنا پر اگرچہ حجم میں کسی قدر اضافہ ہو گیا ہے لیکن اسکے نتیجے میں کچھ ایسے ادبی نوادر بھی دستبردِ حوادث سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچ گئے ہیں جن کا دوسرے ذرائع سے حاصل کرنا دشوار ہے۔ نظم کے ان گرانمایہ انتخابات کے پہلو بہ پہلو تذکرے میں نثر کے کچھ قابل قدر نمونے بھی ملتے ہیں۔ یہ نثر پارے جنھیں بلاشبہ اردو کے اسالیب

بیان کی تاریخ میں نمایاں اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ حسین عطا خاں تحسین کی "نوطرزِ مرصع" کے ایک طویل اقتباس، رائے ٹیکا رام تسلی کے قلم بند کئے ہوئے "لطائف" اور مؤلفِ تذکرہ کے نام حسین علی مرزا پوری کے ایک خط اور اس کے جواب پر مشتمل ہیں۔ تحسین کی نوطرز مرصع شائع ہو چکی ہے، اس لئے اس کے اقتباس کے بارے میں یہاں کسی قسم کا اظہار رائے بے سود ہے البتہ ٹیکا رام تسلی، حسین علی مرزا پوری اور مؤلفِ تذکرہ کے رشحات قلم ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری توضیحات کے ساتھ سطورِ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں

تسلی کے متعلق مبتلا کا بیان ہے کہ:۔

"وطنِ بزرگانش اٹاوہ است و در لکھنؤ تربیت یافتہ اشعار فارسی از نظر مرزا فاخر مکین می گزراند۔" (ص ۱۳)

اس کے بعد اس تمہید کے ساتھ کہ "دو نقل پارہ بزبان اردو بنظر درآمدہ، دریں جا بتحریر می آید۔" درج ذیل لطائف نقل کئے گئے ہیں

۱۔ "نقل ہے کہ نادر شاہ جب شاہجہاں آباد میں داخل ہوا تو اس کی فوج میں سے کتنے مغل شہر کی سیر کو آئے۔ ایک ان میں بھوکا تھا۔ اتفاقاً کسی صابن گر کی دوکان میں صابن کے بڑے بڑے ڈلے نظر آئے۔ کہنے لگا "ازیں چکیدی ہائے پنیر بکے زود بدہ کہ بسیار گرسنہ ام" صابن گر بولا "آغا صاحب یہ صابن ہے پنیر نہیں"۔ تب جھنجھلا کر مغل نے کہا کہ "قرمساق غلط می گوئی بیار" جب اس نے دیکھا کہ یہ عقل کا اندھا مانے گا نہیں ایک ڈلا صابن کا حوالے کیا اس نے

ایک بڑا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔ سارے ہونٹ پھٹ گئے، جیب تڑک گئی۔ تب گھبرا کے کہنے لگا "اے وائے اے وائے دہنم سوختہ شد" سب بازاری ہنسنے لگے۔ اور ان سے کہا مرزا صاحب اس بنیر کا مزا تو خوب چکھا۔ بڑا شرمندہ ہو کر گردن نیچی کیے ہوئے چلا گیا۔" (ص ۳۰)

۲۔ "ایک مغل تازہ ولایت ہندوستان میں آیا تھا اتفاقاً کہیں سبزی منڈی میں جا نکلا وہاں ایک کنجڑی ٹوکری میں جامنیں بیچتی تھی مغل نے پوچھا "اے کنجڑی این میوہ چہ نام دارد" بولی "مرزا جی ان کو جامنیں کہتے ہیں" مغل کے پاس پیسہ نہ تھا جو لے کر کھاتے، صورت ان کی یاد رکھی۔ پھرتے پھرتے کسی باغ میں آ نکلا ایک جامن کے درخت کے نیچے گئی ایک جامنیں پڑی تھیں اور دو چار بھونرے بھی (بھی) یہ لگا اٹھا چن چن کے کھانے ساتھ ہی لگا بھونرول کو چبا لے جب منہ میں لگے بھر بھر کرنے تو مغل بولا تم جیں کرو یا بیں بیں کالا کالا ایک بی (بھی) نہ چھوڑ دوں گا" (ص ۳۰۔ ۳۱)

میرامن کی "باغ و بہار" جسے سلیس اردو نثر کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے، ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ لطائف اگر اس سے قدیم نہیں تو کم از کم اس زمانے کی تحریر ضرور ہیں لیکن ان میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ باغ و بہار کی زبان سے بھی زیادہ صاف اور روزمرہ سے قریب تر ہے۔ اس اعتبار سے اردو کے لسانی ارتقا کے مطالعے سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے

ان نثرپاروں کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے۔

حسین علی مرزاپوری اور مبتلا کے خطوط کی زبان پیچیدہ اور پرتکلف ہے اور سادگی اور صفائی بیان کو تقاضائے علمی کے منافی سمجھنے والے گروہ کے اسلوب کی نمایندگی کرتی ہے، کاتب کی غلط نویسی، خط کی خرابی اور املا کے فرق کی وجہ سے اگرچہ ان خطوط کے بعض جملے صحیح طور پر نہیں پڑھے جاسکتے ہیں تاہم ان کا یہاں نقل کرنا دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

"سوادِ خط حسین علی"

"واقفِ موافقاتِ سخن کے، کاشفِ مکاشفاتِ اس فن کے باریکیوں کے اشعار کی شناسائیاں صاحب متخلص بہ عشق و مبتلا ایک روز بحسب اقتضائے وقت کے اتفاق مخزنِ محبت و مذاق شاہ آفاق کا بیچ غریب خانہ اس منزل شناس مطارحات آشنا و بیگانہ کے ہوا تھا اور ہر قسم کے اشعار آبدار زبانِ معنی ترجمان شاہ اس کے گوہر نشان ہوئے (۹) تا بیچ خیالِ بے نظیر مرزا جلال الدین اسیر کے سے ذکر ایک بیت کا درمیان آیا۔ جو معنی جائے اس کے تلاش سے نہیں حاضرانِ صحبت کے خود اسکے میں غواص فکر کئے ہوئے لیکن مطلع صاف نہ دیکھا اور بیت وہ یہ ہے،

بوئے گل درد ے ماہ دارد — آئینہ ہزار آہ دارد

آخرش رائے سب کی اس پر آئی کہ آگے اس موشگافِ زلفِ معشوقانِ سخن کے بھیجئے امید کہ شانہ کاری فکر کی کسی پیچ کا کل معنی کا

کھولنا کر کے یاران صحبت کو مسرور بخشیں اور مجھ کو بند فکر کی سی سے آزاد کریں۔ زیادہ ہم بستر معشوقہ مراد کے ہو کر سب کو آرزو مند ملاقات جانیں اور سلام"۔ (ص ۸۱)

جواب جانب از مبتلا

"عاشق معشوق حسین کے میاں حسین علی سلمہٗ، گلدستا گلزار کرم کا یعنی رنگین نامہ ــــــ اس وقت کہ چشم انتظار کسی شاہراہ آرزو پر نرگس دار چار تھی، ہاتھ قاصد صبا رفتار کے اوتر ما اشفاق کا کر کے آنکھوں کو نور اور دماغ کو طیبو و سرور بخشا۔ اگرچہ تقریر یعنی مطلع آسیری جانی فکر سے نہیں لیکن واسطے تسکین خاطر نزہت آفریں کے صورت نمائے تحریر کرہوں کہ آئینہ صاف طینتی سے وہ لطافت رکھتا ہے کہ جس وقت محاذی روئے معشوق کی ہو، تماشائے صفائی بہار چہرہ کی سی کہ بوئے گل اور روئے ماہ دونوں وہاں موجود ہیں اور اوس دونوں کی خوضمیر آئینہ تاثیر بدولت کی سی رنگ کلفت پکڑے نہ وہ شفافی اور صافی اوس کو جو زمہنی ہے قائم نہ رہے بلکہ داماں حسن آئینہ کا گرد آلود کدورت ہو، یہی تلاش کی۔ ایک شعر نتائج طبع اپنے سے یہ ناقص لکھتا ہو شعر گشتہ زاں نرگس خواب آلودہ دید آئینہ آب آلودہ معنی اوس کے یوں نہ جبتک چشم معشوق مائل بہ بیداری تھی، آئینہ بھی گلچین بہار تماشا تھا دفتیکہ وہ در خواب آگئی یہ بیکار پڑا۔ اس واسطے چشم پر آب ہے۔ صاحب بندہ اگر

معنی دونوں بہت وقت پر. تمھاری کے آویں، مجھکو ممنون اشتغاق جانیں (؟) زیادہ دعا ... ..." (ص ۸۱-۸۲)

آخر میں ہم مبتلا کے بعض ایسے بیانات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو امور واقعہ کے خلاف ہیں۔ یہ بیانات نہ تو ان تذکروں کی روایات سے مطابقت رکھتے ہیں جن سے مبتلا نے بالاعلان استفادہ کیا ہے اور نہ دوسرے مستند ذرائع ہی سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر

(الف) کسی تذکرہ نگار یا مورخ نے نواب آصف الدولہ کو آصف جاہ کے لقب سے یاد نہیں کیا۔ یہ خطاب دکن کے صوبیداروں اور فرمانرواؤں کے لیے مخصوص رہا ہے لیکن مبتلا جا بجا آصف الدولہ کے بجائے آصف جاہ لکھتے ہیں۔[1]

(ب) میر محمدی بیدار کو مبتلا نے میر محمد علی شاگرد مرزا غنی بیگ قبول لکھا ہے (ص ۶۳) بیدار کے نام کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں کے بیان میں کس قدر اختلاف ہے۔ قایم کی تحریر کے مطابق ان کا نام میر محمدی[2] اور میر حسن کے بیان کے بموجب میر محمد علی ہے۔[3] مصحفی نے ان دونوں ناموں کو صحیح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "میر محمد علی نام دارد بہ میر محمدی بیدار مشہور است"[4] اس جزوی اختلاف سے قطع نظر تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق

---

[1] مثال کے لیے گزشتہ سطور میں میر حسن کے ترجمے کا اقتباس دیکھا جا سکتا ہے۔

[2] مخزن نکات ص ۶۳

[3] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۳۱

[4] تذکرہ ہندی ص ۳۱

ہیں کہ وہ مرتضیٰ قلی بیگ فراق کے شاگرد تھے۔ غنی بیگ جو کشمیر کے رہنے والے تھے اور قبول تخلص کرتے تھے ایک بالکل مختلف شخصیت ہیں[1] جن کی شاگردی سے بیدار کا کوئی تعلق نہیں۔

(ج) میاں تجلی دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں

"میر غلام علی نام خلف میر طالب حسین کلیم ہمشیر زادہ میر تقی۔ قصہ لیلیٰ مجنوں نام بزبانِ ہندی در عشق زنے برہمنہ کہ برو فریفتہ در حبالۂ نکاح آوردہ بود، بسیار دلچسپ گفتہ!!

(ص ۳۲)

تجلی کے مندرجہ بالا نام (غلام علی) کی تائید میں قطب الدین باطن اکبرآبادی کے "گلستانِ بے خزاں" کے علاوہ کسی دوسرے تذکرے کی شہادت موجود نہیں[2]۔ سید محمد فاروق شاہ پوری کی رائے کے مطابق یہ روایت مثنوی لیلیٰ مجنوں کے مندرجہ ذیل شعر کی غلط تعبیر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے[3]

زباں پر رہے ورد نام علی   لقب میر اظہر ہے غلام علی

دوسرے تذکرہ نگاروں نے انھیں عام طور پر ان کی عرفیت میاں حاجی یا میر محمد حسن کے نام اور میر محمد حسین کلیم کے فرزند کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ البتہ لالہ سری رام "میر حسین عرف میر حاجی دہلوی پسر

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۱۲۷ سفینۂ خوش گو ص ۱۰۱ سفینۂ ہندی ص ۱۶۹

[2] گلستان بے خزاں ص ۵۶

[3] بحوالہ مضمون بعنوان میر تجلی اور مثنوی لیلیٰ مجنوں مشمولہ نگار پاکستان شمارہ ستمبر ۱۹۶۲ء

میر محمد حسن کلیم" لکھتے ہیں۔[1] فاروقی صاحب نے موخر الذکر روایت کو قرین صحت قرار دیتے ہوئے تجلی کی مثنوی کا یہ شعر سند کے طور پر پیش کیا ہے

زبانِ عرب میں وہ آشفتہ حال پکارا مجھے یا حسینی تعال

اس دلیل کو جو یقیناً دوسرے تمام دلائل سے زیادہ قوی ہے، صحیح مان لینے کے بعد لالہ سری رام کے بیان کے دوسرے جز یعنی کلیم کے نام کی صحت کا اقرار بھی لازم آتا ہے ورنہ باپ اور بیٹے کے ناموں میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں نام لفظ محمد کے اضافے کے ساتھ جو اکثر یمن و برکت کی غرض سے اصل نام کی ابتدا میں بڑھا دیا جاتا ہے میر محمد حسین اور میر محمد حسن کی شکل میں بھی صحیح مانے جا سکتے ہیں۔ طالب حسین عیار الشعرا کے نسخہ لندن کے علاوہ کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا۔[2] اس کے علاوہ "زلف برہنہ" پر فریفتگی کا افسانہ بھی بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مثنوی لیلیٰ مجنوں میں مبتلا کے بیان کے برخلاف وہی مشہور داستان عشق بیان کی گئی ہے جو روایتی طور پر ان دونوں ناموں سے وابستہ ہے۔[3]

(د) میر عبدالحی تاباں کے حال میں رقم طراز ہیں

"دقیقہ گرد خط از آئینہ رخسارش پیدا شد، دست بر عارض گردانیدہ ایں بیت بدیہتہً برخواند و جاں جاناں سپرد بیت۔

[1] خم خانۂ جاوید جلد دوم۔ ص ۳۶

[2] عیار الشعراء مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ص ۱۱۰

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے "اردو مثنوی شمالی ہند میں" از ڈاکٹر گیان چند جین ص ۳۰۳ تا ۳۰۵

اس خط نے تو حسن سب گنوایا
یہ سبز قدم کہاں سے آیا" (ص ۵۲)

تاباں کے متعلق یہ بات تو تقریباً تمام ہی تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے کہ انھوں نے عنفوان شباب میں وفات پائی لیکن یہاں ان کی موت کا جو پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس کی کسی دوسرے ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوتی۔ بظاہر یہ روایت کسی افسانہ طراز کی طباعی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد جس شعر پر رکھی گئی ہے وہ تاباں کا نہیں ان کے استاد محمد علی حشمت کا ہے[1]

(۵) میر حسن کو مبتلا نے "میر غلام علی" کے نام سے متعارف کرایا ہے (ص ۴۲) یہ بیان بھی خلافِ واقعہ ہے۔ حسن خود اپنا نام میر غلام حسن لکھتے ہیں[2]۔ دوسرے تذکرہ نگاروں میں ان کے قریب ترین ہم عصر اور دوست مصحفی کا بھی یہی بیان ہے[3]۔

(۷) حاتم کے ذکر میں اس اعتراف کے باوجود کہ "مولف..... شرح احوالش ..... بموجب عبارت تذکرہ میر غلام ہمدانی مصحفی تخلص کہ او از حاتم بسیار صحبت ہا اتفاق بعمل آوردہ است" (ص ۸۷) مصحفی کے بیان کے بالکل برخلاف مبتلا نے ان کے نام کے ساتھ مرزا کا اضافہ کر دیا ہے (ص ۸۷) اور دوسرے مقامات پر بھی جہاں کہیں ضمناً ان کا ذکر آیا ہے مرزا شاہ حاتم ہی لکھا ہے۔ مصحفی کے علاوہ

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ص ۱۰۷، مخزن نکات ص ۲۷، تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۴۹
[2] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۲
[3] تذکرہ ہندی ص ۸۰

دوسرے تمام معاصر تذکرہ نگار بھی اس پر متفق ہیں کہ شاہ صاحب موصوف فنا گستیخ تھے۔[1] ایسی صورت میں اس اختلاف کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور اسے امر واقعہ سے انحراف کے علاوہ کچھ اور کہنا دشوار ہے۔

(ز) میر تقی میر کے بارے میں فرماتے ہیں:

"سید عالی نسب است کہ خواہر سراج الدین علی خاں آرزو در حبالہ نکاحش بود۔" (ص ۴۲)

میر صاحب کی سیادت کے متعلق محققین کے اختلاف سے قطع نظر یہ بات کہ آرزو کی بہن ان سے منسوب تھیں، قطعاً غلط ہے۔ یہ خاتون میر کے والد کی زوجہ اولی اور میاں محمد حسن کی والدہ تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد زوجہ ثانی کے بطن سے میر پیدا ہوئے تھے۔[2] گویا آرزو اور میر کے درمیان نہ کوئی خونی رشتہ تھا اور نہ کوئی نسبتی تعلق۔ میاں محمد حسن کے صاحبزادے میاں محمد محسن محسن کے سلسلے میں بھی مبتلا سے ایسی ہی غلطی ہوئی ہے۔ وہ انھیں "خواہر زادۂ خان آرزو" لکھتے ہیں (ص ۲۲۰) حالانکہ یہ نسبت آرزو اور میاں محمد حسن (محسن کے والد) کے باہمی رشتے کو ظاہر کرتی ہے۔

(ح) محتشم علی خاں حشمت کے حالات میں انھیں میر عبدالحی تاباں کی

---

[1] مصحفی کے تذکرۂ ہندی (ص ۰۰) اور عقد ثریا (۲۳) کے علاوہ ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۴۶، نکات الشعرا طبع ثانی ص ۵، عمدہ منتخبہ ص ۲۰۹، مجموعہ نغز ص ۱۷۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو دلی کالج میگزین میر نمبر (ص)

کا استاد جانا ہے (ص ۷۸) جبکہ تاباں کے استاد ایک دوسرے ہم تخلص شاعر محمد علی حشمت تھے، جن کا ذکر دیوان تاباں میں کئی جگہ موجود ہے[1]

(ط) مصحفی کے تعارف کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

"مصحفی بدایونی، نامش میر غلام علی ہمدانی است"

(ص ۲۲)

اس مختصر سے جملے میں کئی خلافِ واقعہ باتیں جمع ہو گئی ہیں، سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مصحفی کا بدایوں سے کوئی تعلق نہ تھا، ان کے آباؤ اجداد موضع اکبرپور متصل امروہہ کے رہنے والے تھے[2] دوسرے ان کے نام کے ساتھ میر کا اضافہ بھی غلط ہے کیونکہ نہ تو وہ خود سیادت کے مدعی ہیں اور نہ مبتلا کے علاوہ کسی اور شخص نے انھیں میر لکھا ہے ان کے بیان کے مطابق ان کے مورثِ اعلیٰ ایک نومسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے[3] تیسرے یہ کہ خود مصحفی اور دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں کی تحریر کے بموجب ان کا نام غلام ہمدانی ہے[4] غلام علی ہمدانی کی تائید میں کوئی غیر ثقہ روایت بھی موجود نہیں۔

(ی) انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

---

[1] دیوان تاباں مطبوعہ ص ۲۷۲، ۲۷۶ و دیگر صفحات

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے سید محی حسن کا مضمون "مولد مصحفی" مشمولہ سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ شمارہ مارچ ۱۹۵۵ء و سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ اکتوبر ۱۹۵۹ء

[3] "مجمع الفوائد" مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور بحوالہ تحقیقی مطالعے ص ۶۲ تا ۶۸

[4] "عقد ثریا" ص ۵۷، "تذکرہ ہندی" ص ۲۲۷، "ریاض الفصحا" ص ۲۸۶، طبقات الشعرا (نسخہ کتب خانہ آصفیہ ورق ۱۰۵ الف) بحوالہ مجموعہ نغز جلد ۲ ص ۱۰۸

"حمید الدین خاں ملقب بہ نتیجہ صلبیۂ خود را بہ آں بزرگوار نامزد کردہ بود، منصب ہزار و پانصدی داشت۔ پدرش را نام اظہر الدین خاں است۔" (ص ۲۶۲)

اس عبارت میں آخری جملہ "پدرش را نام اظہر الدین خاں است" پہلے دو جملوں سے پیشتر آنا چاہیئے۔ کیونکہ حمید الدین خاں کی صاحبزادگی یقین سے نہیں، ان کے والد سے منسوب ہے[1] اور ہزار و پانصدی منصب بھی نواب مبارک جنگ بہادر کے خطاب[2] کے ساتھ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے انہیں کو عطا ہوا تھا۔ پھر یقین نے عین عالم جوانی میں وفات پائی[3]۔ اس لیے انہیں بزرگوار کہنا بھی کسی لحاظ سے درست نہیں[4]۔

اس قسم کے بعض اہم واقعات اور حقائق سے بے خبری یا انحراف کی مثالوں کے نتیجے میں "طبقات سخن" کی استنادی حیثیت مشکوک ہو گئی ہے لیکن مبتلا نے اپنے بعض ایسے معاصرین احباب اور ملاقاتیوں کے بارے میں جن سے ان کے ذاتی اور قریبی تعلقات تھے جو بیش قیمت معلومات فراہم کی ہے اس کی اہمیت اور اس کی بنا پر تذکرے کی افادیت بہر حال مسلم ہے۔

---

[1] مخزن نکات ص ۲۹، دیباچہ دیوان یقین ص ۱۱

[2] دیباچہ دیوان یقین ص ۱۲

[3] طبقات الشعراء مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ ورق ۲۳ ب، "تذکرہ ہندی" ص ۲۷۵

[4] نسخہ برلن میں بھی یقین کا ترجمہ لفظاً بہ لفظ نسخہ شاہجہاں پور کے مطابق ہے۔ (ورق ۳۷۰ الف)

تذکرۂ بے جگر

بعض کتابیں اپنے مصنفین کے ناموں سے زندہ رہتی ہیں جبکہ بعض مصنف اپنی کسی خاص تصنیف کی وجہ سے تاریخ ادب میں شہرت دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ خیراتی لعل بے جگر ایسے ہی ارباب قلم میں سے ایک ہیں جن کا نام صرف ان کے تذکرۂ شعرائے اردو کی وجہ سے زندہ ہے۔ آج ان کے بارے میں ہماری معلومات صرف اس حد تک محدود ہے کہ وہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے ایک ذی علم کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بحیثیت تھانیدار محکمہ پولیس سے وابستہ تھے۔ شعرائے اردو کے تمام تذکرے حتیٰ کہ گارساں دتاسی کی "تاریخ ادب ہندوستانی" لالہ سری رام کا "خمخانہ جاوید" اور بابو شیام سندر لال برق بتاپوری کا تذکرہ "ہندو شعرا موسوم بہ "بہار سخن" بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے خود بھی دوسرے بے شمار شاعروں کے حالات میں تواریخ وسنین کے التزام کے ساتھ اہم واقعات زندگی کے انضباط کے باوجود اپنے بارے میں صرف چند انکسار آمیز جملوں پر اکتفا کیا ہے جن سے ان کے سوانح حیات سے متعلق کوئی اہم اور نتیجہ خیز معلومات حاصل نہیں ہوتی

"تذکرۂ بے جگر" کا اب تک صرف ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی اس اعتبار سے

ناقص الوجود ہے کہ اس کے شروع کے چار اوراق، درمیان سے تیرہ اوراق ۱۶۳ ب
ورق اور آخر سے ردیف "ی" کے پہلے شاعر انعام اللہ خاں یقین
کے حالات و اشعار پر مشتمل تین صفحات کے بعد کے باقی تمام اوراق ضائع
ہو چکے ہیں اس نقص کی وجہ سے نہ تو اس نسخے کے تذکرے کے نام
اور زمانۂ کتابت کے بارے میں کوئی معلومات حاصل ہوتی ہے اور نہ
واضح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کب اور کتنے عرصہ میں مکمل ہوا، البتہ
متن میں بکثرت ترمیم و تنسیخ اور تصحیح و اصلاح کے عمل سے یہ اندازہ
ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غالباً مولف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا کم از کم
ان کی ملکیت میں رہ چکا ہے۔ بحالت موجودہ اس نسخے میں مکمل یا
نامکمل صورت میں تین سو اکسٹھ (۳۶۱) شاعروں کے حالات و اشعار
ملتے ہیں تخلص کے حرف اول کی رعایت سے حروف تہجی کی ترتیب کے
مطابق قلم بند کئے گئے ہیں۔

تذکرے کے زمانۂ تالیف کی دریافت میں ہمیں سب سے زیادہ
مدد مولف کے درج ذیل بیان سے ملتی ہے۔ منشی ہرچند فرخ آبادی
کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"تولد ارجمندش .... در سنہ یک ہزار و یک صد و
ہشتاد و دو ہجری (۱۱۸۲ھ) بروز پنجشنبہ در کوچۂ جہاں آباد
رو نمود ہ .... و .... تا حالی ...... عمر شریفش بہ
پنجاہ و پنج (۵۵) سال رسیدہ" (ورق ۱۶۲ الف)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جگر ۱۲۳۷ھ (۱۱۸۲ + ۵۵)
۱۸۲۱ء کے قریب تذکرے کی ترتیب میں مصروف تھے لیکن نہ کے

تصنیف سے قبل وہ واضح طور پر راد ھاکشن تشکر مراد آبادی (ورق ۱۱۰ ب) سے میرٹھ میں اپنی ملاقات کے ذکر میں ۱۲۳۸ھ کا ، راسخ عظیم آبادی (ورق ۱۰۹- الف) اور مصحفی (ورق ۹۵ ب) کی تواریخ رحلت کے سلسلہ میں ۱۲۴۰ھ کا اور غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی (ورق ۴۲ ب) کے سال وفات کے طور پر ۱۲۴۱ھ کا حوالہ دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی متن کی کتابت کے بعد حاشیوں پر جو اضافے کیے گئے ہیں ان میں ۱۲۴۰ھ اور ۱۲۴۱ھ کے بعض واقعات کے پہلو بہ پہلو ایک جگہ ۱۲۴۲ھ کے ایک واقعہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حاشیہ ورق ۵۰ (الف) ان تفصیلات کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ زیر نظر نسخے کی کتابت ۱۲۴۱ھ میں ہوئی ہے اور اضافہ و ترمیم کا سلسلہ کم از کم ۱۲۴۲ھ / ۲۷ - ۱۸۲۶ء یا اس کے بعد کے قریبی زمانے تک جاری رہا ہے۔

بے جگر نے اس تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع اور مفید بنانے کی غرض سے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کے سرمایۂ معلومات سے ضرورت کے مطابق پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں ان میں سب سے زیادہ مدد مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" اور مبتلا میرٹھی کے "طبقاتِ سخن" سے ملی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں تو سے کچھ زائد شعرا کے حالات میں اول الذکر تذکرے سے اور تقریباً پچاس مقامات پر مبتلا کے بیانات سے اکتساب فیض کے حوالے ملتے ہیں۔ ان دو تذکروں کے علاوہ کہیں کہیں حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی کے "نشترِ عشق" آزاد بلگرامی کے "خزانۂ عامرہ"، شفیق اورنگ آبادی کے "گلِ رعنا" والہ داغستانی

کے "ریاض الشعرا" اور شرف الدین مسرور میرٹھی کے "تذکرۂ شعراء بزبانِ اُردو"
سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ قائم چاند پوری، میر حسن، خوب چند ذکا،
قدرت اللہ قاسم اور اعظم الدولہ سرور کے تذکروں سے بھی بے جگر
نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے، لیکن یہ تذکرے ان کی نظر سے
نہیں گزرے تھے۔

اوپر کی سطروں میں جن تذکروں کے نام آئے ہیں ان میں سے "نشترِ عشق"
"خزانۂ عامرہ" اور "گلِ رعنا" کے مولفین نے اس صنف کے دوسرے
لوازمات کی بہ نسبت سوانح نگاری کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہ لوگ
تذکرہ نگاری کے فن کو تاریخ نگاری سے قریب تر لانے کے لیے پوری
لگن کے ساتھ کوشاں رہے ہیں۔ بے جگر نے اگرچہ مواد کی فراہمی میں
ان تذکروں سے نسبتاً بہت کم مدد لی ہے لیکن معنوی طور پر وہ سب سے
زیادہ انھیں سے متاثر ہوئے ہیں چنانچہ عام طور پر ان کی یہ کوشش رہی
ہے کہ جہاں تک ممکن ہو انضباطِ سنین کے ساتھ ہر شاعر کی زندگی کے سارے
اہم واقعات کا احاطہ کر لیا جائے اور اس کی شخصیت کے تمام اہم پہلو اجاگر
کردئے جائیں۔ اس سلسلے میں ان کی یہ روش بھی خاص طور پر قابلِ تحسین
ہے کہ اس دور میں جب کہ مآخذ اور دوسرے ذرائع معلومات کی نشاندہی
کو غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ انھوں نے پیشِ نظر تذکروں سے اپنے
افادات کو باقاعدہ حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تذکروں کے علاوہ
بے جگر نے بشرطِ سہولت شعرا کے احباب و اعزہ سے بھی استفسارِ حالات
میں مدد لی ہے۔ اپنی اسی تندہی، ذوقِ جستجو اور طریق کار کی باقاعدگی
کے نتیجے میں وہ سوانح نگاری کے معاملے میں اپنے تمام معاصر اور پیش رو

تذکرہ نگاروں سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ میر درد سے متعلق اس تذکرے کے درج ذیل اقتباس میں ان کی ولادت وفات اور مدفن کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ اس سے قبل کے کسی تذکرے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ لکھتے ہیں کہ۔

"در سنہ یک ہزار و یک صد و سی و سہ (۱۱۳۳ھ) شعشعۂ جمالِ باکمالش کاشانۂ ولادت را برافروختہ چنانچہ مورخے ہند و بیدار تخلص از شاگردان مقبولش کہ بیشتر او را بخطاب بیدار دل می نواخت تاریخ ایلاد خجستہ بنیاد برنگاشتہ قطعہ از حضرتِ میر عارف یزدانی
گہوارۂ آفاق چو شد نورانی
بیدار نوید سالِ تاریخش گفت
آمد بوجود نقشبند ثانی

..... آخر بتاریخ بست و چہارم صفر روز جمعہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و نہ (۱۱۹۹ھ) ایں جہانِ پر ہوان را بگذاشت ...... برادرش میر سید محمد مرحوم متخلص بہ اثر در سالِ انتقالش فرمودہ۔

وصل باشد چوں وصالِ اولیا
"وصل خواجہ میر درد" آمد ندا

..... جسدِ مبارکش در شاہجہاں آباد بیرون ترکمان دروازہ بمقبرۂ آبائی او کہ فی الحال بباغیچہ میر درد شہرت دارد مدفون گردید۔" (ورق ۶۶ الف و ب)

مرزا مظہر جانجاناں کے حالات میں ان کی شہادت کا واقعہ کئی اردو تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے لیکن ان کی ولادت، حسب و نسب، خاندانی ماحول اور دوسرے اہم واقعات کے بارے میں ان میں سے کسی کے تذکرے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ بے جگر پہلے شخص ہیں جنھوں نے شعرائے فارسی کے بعض تذکروں اور بالخصوص والہ داغستانی کے "ریاض الشعرا" کی طرف رجوع کر کے اس سلسلے کی کافی تفصیلات قلمبند کی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ

"نسب او بہ بست و ہشت واسطہ بہ محمد بن حنفیہ ابن علی مرتضیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام می رسد۔ یکے از اولادش امیر کمال الدین کہ از خطۂ طائف بود، در ترکستان آمدہ بہ زمانروائی بعضے از آں ممالک گذرانیدہ و اولاد کثیرے از دے دراں سرزمین پیدا آمد۔ از آنہا امیر مجنون و امیر بابا ہمرکاب ہمایوں بادشاہ از ایران بہ ہندوستان رسیدند و بیلاز مت سلاطین گورگانیہ صرف اوقات نمودند و مرزا جان (والد مرزا مظہر) کہ در ششم مرتبہ از امیر بابا و در چہار دہم از امیر کمال الدین مسطور (سطور) واقع شدہ، از حضور عالمگیر بادشاہ تارک مناصب دنیا شدہ بہ اکبرآباد سکونت گرفت و بہ سبب قرابت از خاندان گورگانیہ تیموریہ باعزت و اعتبار تمام منازل عمر را طے می کرد و ظہور باسعادت مظہر از بطون ولادت آخر شب جمعہ یازدہم رمضان المبارک سنہ یک ہزار و یک صد و دہ (۱۱۱۰ھ) وقتے کہ پدرش از ملک دکن بہ

اکبرآباد می آمد، در سرزمین مالوہ گردید. نشو و نمائے ظاہری در وطن آبائی خود آگرہ یافتہ مگر چوں برائے تربیتِ باطنی در خدمتِ پیر نور محمد بدایونی نقشبندی مجددی اقامت شاہجہاں آباد ورزید، مشہور بہ دہلوی گشت و علی قلی خاں والہ داغستانی در تذکرہ مؤلفہ خود "ریاض الشعرا" می نگارد کہ اصلش از ساداتِ علوی است اما چوں اہلِ سنت اولاد حضرت امیر المومنین علی علیہ الصلوٰۃ را سید نمی دانند، مرزا ندبود نیز خود را داخلِ سادات نمی شمرد، در عمر ہشتاد و پنج سال و چند ماہ فی سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنج (۱۱۹۵ھ) روز چہارشنبہ کہ تاریخ ہفتم محرم الحرام بود، در مکان بالاخانہ دوکانِ بزازان واقع متصل مسجد جامع شاہجہان آباد باختلافِ مذہب شخصے او را بہ نیشِ افعی قرابین مسموم گردانیدہ روز شنبہ ماہِ مذکور بتاریخ نہم رجب دہم بوقتِ مغرب از ہمانِ زخم کاری کارش بآخر رسید۔"

(ورق ۱۶۱ ب و ۱۶۲ الف)

"گلشنِ سخن" کے مولف مرزا کاظم مبتلا کے ذکر میں اگرچہ بے جگر نے ان کے سوانح حیات زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان نہیں کئے ہیں لیکن ان کے والد اور جد امجد کے حالات اور خاندانِ مغلیہ سے توسل کے متعلق جو تفصیلات بہم پہنچائی ہیں ان کی روشنی میں ہم اس ماحول کو بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں جس میں مبتلا نے تعلیم و تربیت اور نشو و نما کے مراحل طے کئے اور جنھوں نے ان کی شخصیت کو بنانے اور

سنوارنے میں موثر ترین عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ معلومات گویا دو "نشتر عشق" سے ماخوذ ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

"جد ما جدش مرزا محمد کہ در مشہد مقدس سکونت داشت ہمراہ نواب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری بہ عصر فرمانروائی محمد سعد الدین بن شاہ عالم بادشاہ خاں خزلی از خراسان بہ شاہجہاں آباد آمدہ در حضور محمد فرخ سیر ملازم گردیدہ ایام حیات راہ بخوبی گزرانیدہ در عہد محمد شاہی ازیں جہان بے بقا در گذشت پسرش محمد علی خاں بہادر والد مبتلا کہ از سابق امور مرجوعۂ منشی گری سرکار نواب برہان الملک را منصرم بود، از قدردانی نواب منصور خاں صفدر جنگ داماد نواب ممدوح در ہنگام تفویض خدمتِ صوبۂ اودھ بنام وے از پیشگاہ سلطنت بہ ثروت و عزت کثیر رسیدہ بہ بجاآوری خدماتِ لائقہ و اظہار فتوحاتِ فائقہ بزور بازوے خود زرافشانِ فوج نشانِ ناموری برافراخت و نواب مشارٌ الیہ بمشاہدۂ حسن خدمتی مستعدی وے از حضورِ احمد شاہ بن حضرت فردوس آرام گاہ بہ دہانیدن منصب پنج ہزاری و خطاب بہادری محسود اماثل واقران و بہ نیابت خود صوبہ داری الٰہ آباد مفتخر ہم چشمان گردانید۔ آخر چوں انتقال آں وزیر قدرشناس رو نمود، محمد علی خاں مستور (مسطور) خود را جانب بنگالہ کشیدہ در سرکار نواب میر جعفر علی خاں و نواب عالی جاہ قاسم علی خاں والی ملک بنگالہ معزز و محترم شدہ تا کہ سنۂ ہم حجازی لا یدل

سنہ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و شش (۱۱۷۶ھ) بعالم بالا توجہ نمود و در درگاہ شاہ ارزاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدفن یافت ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ مبتلا در لکھنؤ از بطن لبطون بظہور رسیدہ موسوم بہ مرزا کاظم گردید و در نزد موصوف مخاطب بہ مرداں علی خاں فرمود استفادۂ علم رسمی بخدمت مولوی وجیہ الدین نظام آبادی نمودہ۔ در فقہ و نحو زیادہ تر امتیاز بہم رسانیدہ نظم و نثرش بہ اصلاح آں جناب رد بہ پختگی آورد۔ خطِ نستعلیق را بہ زیبائی و خوش ادائی می نگاشت و اکثر مبتلائے سیر و ادیں اساتذہ می ماند۔ "تذکرۃ الشعراء فارسی مسمیٰ بہ "نظم معانی" کہ بالتزام تاریخ اتمام نام دارد از تالیفات اوست ۔ ۔ ۔ ۔

بعد چندے از لکھنؤ بہ عظیم آباد رفتہ بعد انقضائے ایام معہودہ ودیعتِ جاں را بجان آفریں سپرد" (ورق ۱۶۶ - الف و ب)

خصوصی مراسم اور ذاتی تعلق کی بنا پر بے جگر نے جن شعرا کے تعارف میں کافی تفصیل سے کام لیا ہے، ان میں حسین قلی خاں عاشقی مولف "نشترِ عشق" بھی شامل ہیں۔ عاشقی سے ان کی ملاقات اپنے وطن سکندر آباد میں ہوئی تھی جبکہ وہ بحیثیت تحصیلدار وہاں پہنچے تھے۔ بے جگر نے ان کے بارے میں حسب ذیل معلومات فراہم کی ہیں۔

"ایلادِ سیادت بنیاد عاشقی در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار (۱۱۹۴ھ) در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ رو نمودہ چنانچہ در تاریخ میلاد خود می گوید

جمعہ و ہفتم محرم مرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کردم از عالم نہفتہ طلوع

چوں بجستم سنِ ولادتِ خویش — گفت ہاتف کہ اے خجستہ طلوع

بسبب انقضائے اوقاتِ عمرش بسیر و سفر ہمراہِ پدر عالی قدر خود از عمر چہار دہ سالگی سوائے علم فارسی و تواریخ داجی و صرف و پارۂ نحو قسمے کہ شاید از تحصیل عربی بہم بقولش بہرہ وافی بار نرسیدہ و الحال از مدت ہفدہ سال کف توسل بدامن اولیائے دولتِ سرکار کمپنی انگریز زدہ بہ تحصیلداری محالات می گذراند۔ ... ... (ورق ۱۲۱ الف)

"طبقات سخن" کے مولف غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی کے متعلق مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچانے کا فخر بھی شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں میں صرف بے جگر ہی کو حاصل ہے۔

"فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و یک (۱۲۴۱ھ) در شہر رمضان روز پنجشنبہ ازیں جہاں گزران در گذشت و در درگاہ حضرت گنج علم واقع بیرون شہر میرٹھ پہلوئے والد بزرگوار خود جا یافت لالہ ہرگوپال خستہ تاریخ وفاتش بہ تخلص مبتلا نوشتہ، قطع۔

خاک بر سر چہاں بیفشانیم — شیخ ما ہائے از جہاں رفتہ
خستہ بنوشت سالِ رحلتِ او — مبتلا ہائے از جہاں رفتہ"

(ورق ۱۲۴ ب)

ان اقتباسات کو پیش کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بے جگر نے شروع سے آخر تک اپنے تذکرے کی ترتیب انھیں خطوط پر کی ہو انکے یہاں بھی اس روایتی اختصار اور عبارت آرائی کی مثالیں خاصی

تعداد میں موجود ہیں۔ جو صنفِ تذکرہ کا ایک عام نقص خیال کی جاتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی انھوں نے جس طرح سوانح نگاری کے آداب و مطالبات سے باخبری کا علمی ثبوت پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ ان کا یہ کارنامہ کچھ کم اہم نہیں کہ انھوں نے ایک کثیر تعداد میں شاعروں کے سنین وفات اور بعض اوقات سنین ولادت بھی متعین کر کے تاریخی معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے جس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ شعرائے اردو کے تذکروں میں ہمیں انھیں کے تذکرے کے ذریعے پہلی بار اس بات کا علم ہوتا ہے کہ شاہ مبارک آبرو نے ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی۔ قلندر بخش جرات کا انتقال ۱۲۲۴ھ میں ہوا، میر تقی میر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اور مصحفی کا سالِ رحلت ۱۲۴۰ھ ہے سنین کے التزام کی اس کوشش میں فنِ تاریخ گوئی سے انکے شغف خاص کو بڑا دخل رہا ہے چنانچہ انھوں نے اپنے اور دوسرے کے کہے ہوئے تاریخی قطعات بھی کثرت سے نقل کئے ہیں ان قطعات کی ایک مشترک اور قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مادہ ہائے تاریخ میں شاعر کے نام یا تخلص کی شمولیت کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے اس سلسلے کی کچھ مثالیں گذشتہ سطور میں سامنے آچکی ہیں اور کچھ یہاں نقل کی جاتی ہیں

۱۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق۔ ... فی سنہ یک ہزار و یک صد پنجاہ ...... بہ اشتیاقِ سیرِ فردوس رخت بست و کمیت برلبت راقم آنخم در سالِ وفاتش تعمیہ۔ یک عدد دلِ پاک کہ مراد از الف باشد ایں قطعہ بہم رسانید۔

دہ چہ سازیم شاہ ولی اللہ　　دست بر زندگی خود افشاند
با دلِ چاک بے جگر تاریخ　　گفت صد حیف اشتیاق نماند"

(ورق ۹)

۲۔ قلندر بخش جراءت :۔ "در سنہ یک ہزار و دو صد و بست و چہار ہجری رخنہ قضا تار زندگانیش را از ہم گسیخت شاگردش لالہ گنگا پرشاد رند از "جرأت ہائے جرأت" سال انتقالش برآوردہ و ایں بے جگر کم استعداد نیز قطعہ نوشتہ کہ ہر چہار مصرعہ اش موضح سنہ وفات اوست۔"

نموز جراتِ موزون با سفر ہے ہے
چہ سال کنیم نہ زیں رنج گریہ شام و پگاہ
سنِ وفات وے ار سائلے بہ پرسد گو
چگویم آہ نماند آں سخنورِ آگاہ

و نیز قطعہ ایضاً و بصنعتِ صوری و معنوی فکر کردہ۔

وحید عصر سخن آفریں قلندر بخش
گزشتہ از سرِ جاں ہائے زیر خاک بخفت
دلِ حزیں بدو آئینِ سنِ وفاتِ او
ہزار و دو صد و بست و چہار ہجری گفت

و لالہ ہر گوپال خستہ ازیں قطعہ تاریخ ارتحالش برآوردہ۔

خود از جہاں بگذشت و مرا بجلقۂ غم
نشاند جراتِ رنگیں کلام داویلا

نوشتہ مصرعۂ تاریخ او دلِ خستہ
نماند جرأت رنگیں کلام وا ویلا

(ورق ۲۷ ب ۵)

۳۔ مصحفی امروہوی۔ "در لکھنؤ فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ہجری (۱۲۴۰ھ) نقد جاں بمقتضایانِ اجل سپردہ چنانچہ لالہ ہرگوپال خستہ تاریخ وفاتش نظم کردہ کردہ رحلت غلام ہمدانی: اے دلِ تفتہ نالہ باید کرد
کس چو تاریخ پرسد از تو بگو: مصحفی رفتہ نالہ باید کرد"

(ورق ۵۹ ب)

۴۔ میر تقی میرؔ۔ "بعد تقطیع مراحلِ نود و شش از سنینِ عمر در سال یک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری (۱۲۲۵ھ) بوصالِ جاناں حقیقی پیوست ۔۔۔۔ لالہ ہرگوپال خستہ تاریخ وفاتش نوشتہ۔

بجہاں شور درافتاد چو ناگاہ بمرد
نکتہ داں، سحر بیاں، فخرِ زماں میر تقی

چہ بلا ہا کہ نیامد بسرِ اہلِ سخن
چوں سوئے ملکِ عدم گشت رواں میر تقی

خستہ بنوشت سنِ او ز حروفِ منقوط
چوں نہ نالیم برفتہ ز جہاں میر تقی (ورق ۱۷۳ الف)

۵۔ انعام اللہ خاں یقینؔ:۔ لالہ لچھمی نرائن شفیق، صاحب تذکرہ "گلِ رعنا" ۔۔۔۔ از زبان شاہ عبدالحکیم حاکم متخلص لاہوری

نقل کردہ کہ یقین مرادِ شاہجہاں آباد فی سنہ تسع و ستین
و مایت والف (۱۱۶۹ھ) ...... از دست خود گشت ایں

قطعہ تاریخ فکر کردہ شفیق است

آہ! نازک سخن و خوش خیال ؛ کرد سفر جانبِ ملکِ عدم
سالِ وفاتش خردِ نکتہ سنج ؛ گفت یقین رفت بسوئے ارم

واز طبعِ دریا بار خستہ ؛ چنیں گوہر آبدار ترا وید ہ
بعینِ شباب آہ آں تیز فہم ؛ بجاں آفریں جاں خود را سپرد
جزایں پس چہ گویم سنِ رحلتش ؛ یقین سخن یاب ہے ہے بمرد

و فکرِ نارسائے ایں خاکسار ایں قطعہ مبہم رسانیدہ

آں خسروِ ملکِ سخن واں مقبلِ اہلِ زمن
چوں رفت زیں دارِ محن تاریخ او گفتم چنیں
فخرِ ذکا دانش و غرورِ کمال و امتیاز
شد بے سر و بے پا ہمہ اے آہ از فوتِ یقیں"

(ورق ۸۹، ۹۰ ب)

مختلف معروف و غیر معروف شعرا کی تواریخ رحلت کے علاوہ "تذکرہ بے جگر" سے بعض ایسے واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور اس سے قبل کسی تذکرے میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔ میر حسن اور ان کی مثنوی "سحر البیان" کے متعلق درج ذیل بیان اس ضمن میں آتا ہے۔

" تو بتے حسن بہ تقریبے کہ آیندہ مذکور می شود معاتب حضور شدہ از شہر آوارگی اختیار کرد و پس از چندے مثنوی سحر البیان

طرح دادہ بنظر نواب قدردان گزرانید مگر جناب ایشاں بریں
مصرع عشق ع "کہ اک دن دوشالے دئے سات سے"
چنداں مسرور نہ شدند وہم مشہور است کہ اگرچہ مثنوی مذکور
بمرتبہ پسند خاطر نوجوانانِ روزگار افتادہ کہ سوداگرانِ دیار بقید
تصاویر و جدولِ زرکار مرتب کراندہ بجوانب و امطار می بردند
لیکن اگر روزے چند علی التواتر بخوانند در مجمع یاران متفق
انتشار رو نماید و باہم دگر مفارقت افتد اما در نظر راقم السطور
بسببِ انتہار نحاست مثنوی ہذا سوائے ایں نباشد کہ در
مصروفیت ایں شوق روح افزائے عشاق عدم متوجگی
ایشاں از طرفِ دیگر می تواند... بود بناءً علیہ دانایانِ زمانہ
آں را منحوس قرار دادہ تا کسے متوجہ بر خواندنش نگردد مگر محروم
ماندن مصنف از بقولِ بعضے از صلہ و انعام نمایاں باوصف
ایں قدر خوردن خونِ جگر و کاوشِ جانِ گفتار عوام را...
بپایۂ صداقت می رساند۔ حاصل کلام کہ عتاب نواب وزیر را
نسبت بحسن بریں طور بیاں کردہ آید..... در ایام کہ وے زاد
بوم خود شاہجہاں آباد را خیرباد گفتہ ہمراہ زایران ہندی کہ
جمعے بود کثیر در لکھنؤ رسید مثنوی بہ ضخامتِ پنج چہار جزو مشتمل
بر کوچ و مقام آں ازدہام و حالِ پر اختلال خود چہ از فراقِ
جانکاہ جانانہ دلربا کہ تعلق خاطر بطرفے داشت و چہ از حسرت
واگذاشت وطن مالوف بزرگان خود نوشتہ و چوں مذمت لکھنؤ در تعریف فیض آباد
ہم کمے کہ احدے را از اہل حرفہ در قدح و مدح نگذاشتہ ضمیمہ آں بود مزاج والائے

ملازمانِ حضور، ازیں حرکتِ ناشائستہ اش کہ ایں چنیں شہر

مینو سواد را ماند موم دانستہ، کمال رنجید ... " (ورق ۵۶)

اسی طرح مرزا محمد رفیع سودا کے متعلق یہ روایت بھی بے جگر

سے پہلے شعرائے اردو کے کسی تذکرہ نگار نے نقل نہیں کی ہے کہ

" سراج الدین علی خاں آرزو کہ در آغاز حال تلاشش

فارسیش را اصلاح می داد روزے باوے بایں گفتگو پیش

آمدہ کہ ایرانیاں بزبانِ خاص خود کلام فارسی را بپایۂ اعلیٰ

رسانیدہ و زبانِ ما و شما ہر چند کہ فارسی دانی را مبدا ارتفاع

ارتفاع فائز گرداند مانند چراغ پیش آفتاب قدر نمی

آرد بنا بر آن اگر ازیں تقلید دم گزشتہ بزبانِ خود کہ عبارت

از ریختہ گوئی باشد مشقِ سخن نماید یقین کہ بفیضانِ طبیعت

گوئے سبقت از ہم چشماں بوید چرا کہ ہنوز کسے نامورانِ ایں

فن جا نیافتہ۔ چوں صلاح باصواب بود، ازاں روز بگفتن

شعر ریختہ طبع داد۔ چنانچہ در اندک مدت بکوس استادی

برنامِ سخن نہاد۔ کہ گاہ در حدیقۂ فارسی ہم گل چینی اشعار

رنگیں دامنِ فکر را تختہ گلزار می کرد" (ورق ۹۴)

حالات و واقعات زندگی کے بیان میں بے جگر نے جس تدر کار آگاہی

اور ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اخلاق و عادات، مزاج و طبیعت، وضع

قطع اور دوسرے اوصافِ ذاتی و صفاتی کے متعلق اظہارِ خیال میں بھی وہ

اتنے ہی محتاط رہے ہیں وہ ہر اس شخص کے ذکر میں سیرت اور شخصیت

کے موضوع پر لب کشائی سے گریز کرتے ہیں جس سے نہ وہ ذاتی طور پر

واقف ہیں اور نہ دوسرے قریبی اور باوثوق ذرائع سے انھیں اس کے بارے میں کوئی قابلِ اعتبار معلومات حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جہاں ذاتی شاہدات یا راوی کی ثقاہت ان کے ذوقِ جستجو کو مطمئن کر دیتی ہے، وہاں وہ خاموش بھی نہیں رہتے۔ درج ذیل اقتباسات ان کے اس دستور العمل پر شاہد ہیں:

(الف) جوالا پرشاد آذر لکھنوی:۔ "راقم الحروف فی سنہ یک ہزار و دو صد و سی و شش ہجری (۱۲۳۶ھ) در میرٹھ ازو ملاقاتی شدہ ۔ ۔ ۔ ۔ سوائے وجاہت ظاہری کہ مقتضائے شباب است بحسن معانی ہم موصوفیت داشت یعنی باہر کسے کہ وری خورد در اول ملاقات بے تکلف شدے و با اخلاقِ حسنہ پیش آمدے غرض اوقاتِ عمر را بخوش مزاجی و ظریف الطبعی بسر می آورد۔" (ورق ۱۷ ب)

(ب) میر سوز:۔ "مصحفی کرباوے ۔ ۔ ۔ ملاقاتِ دوستانہ داشت در تذکرہ خود اورا الکمال مستودہ کہ سوائے کمالِ شاعری و درویشی در تیر اندازی و سواری اسپ و نازک بندی و نزاکت فہمی شعر و آدابِ صحبت ملوک و ظریف الطبعی و خندہ روئی و ندامت پیشگی نہ تحصیل وجہ معاش و گفتنِ کلام الخیر در حق دیگرے بالیں ہمہ استغنا مزاجی کہ شعارِ شعر است، نظیر خود ندارد۔" (ورق ۹۸ الف)

(ج) رادھا کشن تمکیں مراد آبادی:۔ "در ایام قیام میرٹھ فی سنہ یک ہزار و دو صد و سی و ہشت ہجری (۱۲۳۸ھ) ۔ ۔ ۔ ۔

درویش کہ جوانیست انیق و عمدۂ روزگار و انسانے خلیق و ستودہ شعار ....." (ورق ۱۱۱ الف)

(ز) عاشقی عظیم آبادی :- "در ایام مامور بودنش بہ تحصیل داری سکندر آباد ..... درویش کہ سوائے وجاہت ظاہر بحسن معانی ہم آراستہ یعنی باہر کسے بخلق در ادائیش می آمد و خصوص اہلِ سخن را بجانِ عزیز دارد۔" (ورق ۱۲۱ الف)

(ہ) سید قاسم علی خاں قاسم لکھنوی :- "شخصے است کہ قاسم حقیقی از روزِ ازل دولتِ دینی و دنیاوی بقسمتش دادہ و کسے است کہ منعم بے احسان تا ابد نعمتِ صوری و معنوی بر خوان زندگی اش نہادہ۔ ہم دریں عمریست و پنج سالگی مقسوم از اقسام ہر علم کمالے بہم رسانیدہ کہ گویا علم برائے او بایجاد رسیدہ و او را برائے علم آفریدہ۔ از اں جملہ علم موسیقی کہ مقام شناسان ایں فن را با او مشابہ کردن از مقام عقل خارج و دور است و سخنہ کاران زمن را باو بے برابر شمردن مخبر از خام خیالیٔ اہلِ شعور۔ ہم در ستار نوازی بقانونے دل نوازی بکار می بود کہ ہر ترانۂ شور انگیزش پردہ گوش سامعان را بناخن رفت می درد دیگر بمقتضائے عالی دماغی ہا کہ شعار ہر دارلیست ہر یکے راہ ساز ایں محفلِ عیش منزل نمی گرداند۔ لالہ ہر چند بہر ..... بہ تقاضائے دوستی خود ترجمہ احوالش ..... معرفت لالہ ہر گوپال خستہ فرستادہ کہ بعینہٖ در عبارتِ خود بزبانِ قلم سوانح نگار رسیدہ" (ورق ۱۴۵ ب)

راقم الحروف را اینجا فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ہجری (۱۲۴۰ھ) بمقام قصبہ مراد نگر . . . . . اتفاق ملاقات و ہم نشینی . . . . . تا چند روز دست دادہ ۔ در وجاہت ظاہری و باطنی و خوش اخلاقی و رسائی طبع و ذکاوت فہم و شناسائی علم موسیقی وغیرہ او را یکتا یافتم بلکہ دو بر وہم دو سہ غزل بدیہہ گفتہ کہ یک قلم مرغوب طبع شد۔" (حاشیہ ورق ۱۴۴ ب)

"بے جگر کے یہاں شاعری سے متعلق تنقیدی مواد کی مقدار تبیع بہت کم ہے۔ ان کی تحریروں سے ان گنے چنے شاعروں کے کلام کی خصوصیات اور قدر و قیمت کے بارے میں تو کچھ باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں جن کی فنکارانہ عظمت و شہرت یا دواوین و کلیات کے مطالعے نے ان کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں لیکن عام شعرا کی متاعِ فکر کے حسن و قبح اور مرتبہ و معیار کی دریافت انھوں نے مطلقاً قارئین کی سخن شناسی اور ذوقِ نظر پر موقوف رکھی ہے یا پھر دوسرے تذکرہ نگاروں کی رائیں نقل کر کے براہِ راست ذمہ داری سے اپنا دامن بچالیا ہے تذکرہ نویسی کے ایک اہم تقاضے کی طرف مناسب توجہ کی یہ کمی انھیں اس منصب بلند سے نیچے لے آتی ہے جو انھوں نے اپنی کامیاب سوانح نگاری کی بدولت حاصل کیا ہے۔ بہرحال بعض شاعروں کے کلام کے متعلق اپنی رائے یا تاثرات کے اظہار کے لئے انھوں نے جو اندازِ گفتگو اختیار کیا ہے اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

(الف) مرزا محمد رفیع سودا :- " اگرچہ در اقسام سخنوری استاد مسلم الثبوت بود، اما در انجاح قصاید۔ قدرح و مدح اعجاز می نمود کہ

اگر ملا عرفی شیرازی تا وقتِ او زندہ ماندے خود را بہ طفیلِ خود
باز رساندے۔ غزل لمؤلفہ

وصفِ تو را نمودن آں داند — بہر آبِ کوثرش راند
بود طبعش بہ قسمِ معنیٔ ابر — مثلِ نیساں کہ گوہر افشاند
در قصاید بجاست کز طرزش — روحِ عرفی بدام بستاند
در ہمہ نسبتش بہ خاقانی — ذرہ و آفتاب را ماند
الغرض در ستایشِ سودا — بلے جگر چوں زباں بجنباند
سر کند گر قصیدۂ در صفتش — منکرِ او جز گریز نتواند

خلاصہ مدعا کہ درین دیار دل خواستہ ماندے بانیٔ زبان دانی
ریختہ کم خاستہ ہر کہ درین (راہ) قدم گذاشتہ او دل بخوشہ
چینیٔ خرمنش زاد راحلہ برداشتہ ۔۔۔ برخے از شاعران
بملک الشعرائیش مقر بودہ اند و جمعے بدریافتِ اغلاط صریح
و تواردِ صاف در بعض اشعارش بہ تجہل و سرقہ منسوب می
گردانند (و) بر طرزِ کلام او بہ تشتتِ زبانِ خود متعرض می
شوند مگر چوں راقم السطور کہ کلیاتِ ضخیم اش (ضخیمش) را بہ
چشمِ خود دیدہ، انصاف مقتضی بر آنست کہ روانیٔ طبعِ معنی
بارش چہ در مثنوی ہائے متعددہ و غزلیات آبدار و چہ در
دیگر اقسامِ شعر و قصائدِ سحرکار مدلل بہ نظیری است۔ الا از
محاورۂ شعرائے زمانِ حالی البتہ مخالفتے دارد۔"

(ورق ۹۳ الف و ۹۴ الف)

(ب) قائم چاند پوری :- "در پختگی طرز و شستگی کلام و چستی الفاظ

درستی معانی و پیوستگی مصراع غزل و (خوش) اسلوبی ردیف قصیدہ و مثنوی و غیرہا دوش بدوش استاد خود (مرزا سودا) می رفت بل بقول مصحفی در اکثر مقام غلبہ هم جست و در تحریر مثنویات عجیب و تنظیم حکایات غریب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فصاحت بسیار بکار بردہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(ورق ۱۴۱ ب ۔ ۱۴۲ الف)

(ج) ظهور اللہ خاں نوا ۔ "صفائی طبع آئینہ دارش بہ شیریں زبانی ها طوطیانِ سخن را بکلام آوردہ و گلفشانیِ فکر سراپا بہارش برنگیں خیالی ها بلبلان این چمن را رام کردہ ۔ شعرے کہ می گفت چون نالۂ رفت افزائے نوائے نے بہ آتش افروزیِ اضطرابِ عاشقانِ سوختہ دل را نعل در آتش می گردانید و غزلے کہ می خواند مانند حسرتِ دیدار جانان بہ اعلائے دردِ اشتیاق دل دادگانِ نیم بسمل را برخاک و خوں همی طپانید الغرض کہ در ہمہ اقسامِ شاعری تلاش دل چسپ بخوبی و پختگی می نمود مگر در تنظیم قصیدہ بسبب اندراج لغات عربی و فارسی کہ خلاف محاورۂ زبان دانانِ حالی است بقول مصحفی ۔ ۔ ۔ ۔ خسکست نا خستہ خوردہ حالانکہ بسیار بہ متانت و درستگی می گوید"

(ورق ۱۰۰ الف)

(د) ولی دکنی ۔ "از کارگاہ طبع جوادش قامت دیبائے شاهدان فارس بخلاع هندی زیب پذیرفتہ و در بارگاہ فکر نقادش لعل گراں بہائے کان فارسی بر اطباق هندی

جا گرفتہ۔ در حقیقت کسے کہ (پیشتر از ہمہ) اسپ در میدان
ہندی دوانید، آن بود۔ فی الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در
جوئے ایں زبانِ ہندی رسانید، ہماں بود۔ ... رفتہ
رفتہ شعرائے متاخرین تبدیل محاوراتِ و تکلف استعارات
و صفائی زبان و سنجیدگی بیان ایں کلام را بجائے رسانیدند
کہ بہ نسبتِ فارسی صد درجہ مطبوع و ہزار مرتبہ مرغوب مردم
ایں زبان (گردید)۔ ... اگرچہ آن شاہِ ولایتِ معنی
پروری و مضمون یابی و بلاغت گستری داد عالی تلاش ہا
دادہ، مگر بسبب اختلافِ محاورۂ اسلاف فی الحال مطبوع
سخن سنجانِ ایں زمان و مرغوب شاعرانِ ایں زبان نمی شود"
(ورق ۲۰۱)

بے جگر نے اپنے محدود دائرے میں موقع بہ موقع اظہار و ابلاغ کے
جن مختلف اسالیب سے کام لیا ہے یہ اقتباسات ان کی نمایندگی کے لئے
کافی ہیں اس لئے اس موضوع سے ہٹ کر اب ہم ان مباحث کی طرف
آتے ہیں جو موقع و محل کے اعتبار سے ثانوی اور ضمنی حیثیت کے حامل ہیں،
لیکن افادیت اور دلچسپی کے نقطۂ نظر سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ مثال کے
طور پر ان کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دور کے اہل علم
شاعری کو فن شرفا تصور کرتے تھے، اس لئے کسی ایسے شخص کو جو اپنی خاندانی
نسبت یا پیشے کے لحاظ سے شرافت کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو نہ تو شعر و سخن
کی محفلوں میں "فصحائے صحیح النسب" کے پہلو بہ پہلو جگہ مل سکتی تھی اور نہ
تذکرۂ شعرا ہی میں اس کی شمولیت کو مناسب خیال کیا جاتا تھا بے جگر نے

اگرچہ اپنے یہاں آگرے کے ایک بخشی نامی قوال کا ذکر کر کے بظاہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی اس تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی گفتگو کا معذرت خواہانہ انداز ان کے ذہن میں اس تصور کے موجود ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ ذکر خال ایں چنیں سفیہان در محفلِ رنگین فصحا صحیح النسب محض بے ادبی است، اما ازیں جا کہ در بارگاہ والا جاہِ سخن شاہ و گدا بیک جامی نشینند و ادنیٰ و اعلیٰ را بیک نظر می بینند، شمولِ ایں کسان نیز واجب افتادہ و علاوہ براں چوں مدعائے خود فقط از اجتماع موزون الطبعان فصیح البیان است، دریں بزم دل نشیں حسب و نسب را دخلے نیست۔ پس چہ ضرور کہ نثر خار ابر نگارم و برنام اجلاف قلم از دست گذارم۔" (ورق ۲۴ الف)

یہ جگہ اردو کی لسانی و ادبی ترقیوں کو اہلِ لکھنؤ کی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ شہر ہندوستان کا وہ بے نظیر اور نادر خطہ ہے جس کی آب و ہوا میں فصاحت اور شیرینی گھل مل چکی ہے، جس کی فضائیں نزاکت و لطافت کا ایک سیلِ رواں اپنے دوش پر اٹھائے پھرتی ہیں اور جس کے کوچہ و بازار میں یوسفِ طلعتانِ سخن کے جلوے عام ہیں۔ ولی کے ذکر میں ان کی خدمات کے اعتراف کے بعد ان الفاظ میں اپنا یہ تاثر پیش کرتے ہیں۔

"موجود و مسطرِ ایں ایجادِ دلچسپ و طرزِ نیکو و بانی مبانی ایں بنائے والائے ذکر اردو نام دارد، ساکنانِ لکھنؤ

باشند کہ ہر محلہ آں بلدۂ رنگین بنیاد چوں نگار خانۂ چین است و ہر کوچۂ آں شہر مینو سواد مانند نگار خانۂ شہر فرورین۔ ہر رشتۂ راستہ اش (وہر بوستہ آراستہ اش) دامے است برائے وحشیانِ سخن و ہر دیوار سر بہ آسمان افراشتہ اش نشیمنے بہ طائران ایں انجمن۔ باغبانِ فراست از ازل شگفتگی نصیب آں گلزمین مطرا کردہ یعنی گلے کہ می شگفاند، برنگِ الفاظ شگفتہ عبارت ستعدانِ انشا پرداز بخندہ روئی و شگفتہ درد نی مقرون و نخل بند ندرت از ازل موزونی تربیب آں فضائے دل کشا پروردہ اعنی نخلے کہ درلشہ اشتگی می دواند، چوں مصرع قامتِ سرو قدانِ باناز سرتاپا موزوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در یں دیار آں بلدہ لطافتِ ولد را اشرف البلاد گفتن روا است و درین رو نگاران بقعۂ نزہت مرتعہ را فخر البقاع نوشتن بجا ۔ ۔ ۔ ۔" (ورق ۲۰۱ ب)

مفید اور دلچسپ معلومات کے گراں قدر سرمائے کے ساتھ ہی اس تذکرے میں ایسے بیانات اور روایتیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جو حقائق سے صریح انحراف اور واقعات سے عدم مطابقت کی مثالیں پیش کرتی ہیں اور اردو ادب کی تاریخ، اس کے وسیع پس منظر اور دوسرے متعلقات پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔ یہ روایات یارانِ خوش فکر کی قیاس آرائیوں پر یقین، مناسب غور و فکر کی کمی اور درایت کے تقاضوں سے بے اعتنائی کی غماز ہیں۔ سطور ذیل ضروری توضیحات کے ساتھ ایسی

سے چند مقالات و مطالب کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(الف) شاہ عالم آفتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تا چہل وسہ سالی آفتابِ جمال باکمالش جہاں افروز سلطنت ماند...... ہرگاہ فی سنہ یک ہزار و یک صد و چہل وسہ مشقی بدانجام غلام قادر خان از ہیلہ نمک حرام آمادۂ بے ادبی ہا نسبتِ آں جناب شدہ ذخائر خسرانِ حالی و مآلی برائے خود اندوخت...... شخصے تاریخ بے ادبی آن کمبخت خسران مآب نسبت بجناب کیوان انتساب ازیں کلمۂ عربی برآوردہ "فاعتبروا یا اولی الابصار" یعنی پس عبرت گزینید ائے صاحبانِ بینش"۔ (ورق ۶ ب)

شاہ عالم ۴ر جمادی الاول ۱۱۷۳ھ (۲۴ر دسمبر ۱۷۵۹ء) کو اپنے والد سلطان عزیز الدین عالمگیر ثانی کی جگہ تختِ سلطنت پر رونق افروز ہوئے ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ (اگست ۱۷۸۸ء) میں غلام قادر نے انھیں بینائی سے محروم کیا اور اڑتالیس سال چند ماہ کی حکمرانی کے بعد ۷ر رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۱۸ر نومبر ۱۸۰۶ء) کو انھوں نے وفات پائی۔[۱] ان شواہد کی بنیاد پر جو تاریخ کی کتابوں میں اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ ہیں، بے جگر کے بیان کردہ مدتِ حکومت (چہل وسہ سال، سالی) بصارت سے محرومی کے زمانے (۱۲۴۳ھ) اور متعلقہ مادہ تاریخ (فاعتبروا یا اولی الابصار) کا مبنی بر سہو اور بعید از حقیقت ہونا کسی

---

[۱] وقائع عالم شاہی ص ۵ تاریخ ہندوستان۔ جلد نہم ص ۳۱۱ و ۳۴۰ و نادرات شاہی.....

..... دیباچہ مرتب ص ۱۴، ۲۹ و ۲۲

مزید دلیل کا محتاج نہیں۔

(ب) ولی اللہ اشتیاق کے ذکر میں رقم طراز ہیں

"شاہ ولی اللہ محدث از نبایر مجدد الف ثانی۔۔۔۔۔۔ شاعر عصر محمد شاہی است۔۔۔۔۔ فاضل کامل و محدث بے نظیر۔۔۔۔۔ غرض ہمیں بسکہ مثل مولوی شاہ عبد العزیز صاحب۔۔۔۔۔ فرزندے دارد۔ چنانچہ نسخہ مولفہ او فصول تفسیر کلام اللہ را صحیح و مشتہر است۔۔۔۔۔۔ فی سنہ یک ہزار و یک صد و پنجاہ در مسکن خود کوٹلہ فیروز شاہ کہ یکے از محلات دہلی است، بہ اشتیاق سیر فردوس رخت عزیمت بربست" (ورق ۹ الف)

ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ محدث دو مختلف شخصیتیں ہیں بے جگر نے ان دونوں کو ایک سمجھ کر ایک قسم کا خلط مبحث پیدا کر دیا ہے اشتیاق کے مسکن اور سالِ وفات کے بارے میں ان کا بیان اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ قول کہ وہ شاہ عبد العزیز دہلوی کے والد اور اپنے زمانے کے مشہور محدث اور عالم تھے درست نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ ان کا انتقال ۱۱۶۰ھ (۱۷۶۲ء) میں ہوا ہے۔[1]

(ج) عبد الحئی تاباں کے حال میں لکھتے ہیں کہ

"شاہ حاتم دہلوی آں۔۔۔۔۔ را از شاگردان خود نوشتہ مگر در حقیقت از خدمت محمد علی حشمت۔۔۔۔۔ استفاضۂ تلمذ

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی سیاسی تحریک ص ۳۰ و ۷۰ و اورینٹل کالج میگزین لاہور شمارہ نومبر ۱۹۲۵ء ص ۲۲

بہ داشتہ۔ چنانچہ می گوید بیت

کرے تو کس طرح تاباں غلط الفاظ میں معنی

کہ تیرے پاس حشمت سا ترا استاد بیٹھا ہے" (ورق ١٢٠ الف)

بے جگر کا یہ بیان بھی جزوی طور پر غلط ہے۔ معاصر تذکروں سے قطع نظر خود تاباں کے دیوان میں حاتم اور حشمت دونوں سے اکتسابِ فیض کی شہادتیں موجود ہیں چنانچہ جہاں منقولۂ بالا شعر میں انھوں نے حشمت کے فیضانِ صحبت کا اعتراف کیا ہے وہیں مندرجہ ذیل اشعار میں وہ حاتم کے یمن تربیت کا بھی اقرار کرتے ہیں۔

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا

جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف [له]

ریختہ کیوں نہ میں حاتم کو دکھاؤں تاباں

اس سوا دوسرا کوئی ہند میں استاد نہیں

(د) شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فی سنہ یک ہزار و دو صد و چہل ازیں جہانِ فانی،

بعالم جاودانی شتافت!" (ورق ٩١ الف)

ڈاکٹر اختر اورینوی نے راسخ کی تاریخ وفات ان کے ایک شاگرد

له تاباں کے اس شعر کے ساتھ حاتم کا یہ شعر بھی ملاحظہ طلب ہے۔

ریختے کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت

پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

ایک اور غزل کے مقطعے میں اس خصوصی توجہ کے کامیاب نتائج پر اظہارِ فخر کرتے ہیں۔

فیض صحبت کا تری حاتم جہاں در ہند بیچ طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا۔

یاس آروی کے حوالے سے ۲۰ر جمادی الاولیٰ ۱۲۳۸ھ (۲ر فروری ۱۸۲۳ء تحریر کی ہے[1]۔ عبدالغفور نساخ کے مستخرجہ مادۂ "تاریخ" "ز شیخ شیوا زبان" سے بھی یہی سنہ برآمد ہوتا ہے[2]۔ اس لئے اس سلسلے میں بھی بے جگر کا بیان خلاف واقع ہے۔

(۵) مرزا محمد رفیع سوداؔ کے حالات میں "قیصر اللطائف" مولفہ سید بہادر علی ترمذی کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں

"در ہنگامے کہ نواب آصف الدولہ مرحوم زیب فرمائے وسادۂ وزارت گردیدند، چوں دراں ایام مزاج اوشان از عہد صاحبزادگی بطرف ہزل و مزاح بنہایت راغب و مصروف بودند دراں ضمن ہر کہ کلمات ہزل و مزاح باوشان بابدیگرے می نمود کمال منبسط گردیدہ بہ انعام بیکرانش معزز می نمودند لہٰذا انظر ہم بریں معنی مرزا محمد رفیع سوداؔ ان قطعہ تاریخ جلوس خان بر مسند وزارت گفتہ بودند کہ مادۂ تاریخ ایں بود ...... (مخش) ..... از آں جاکہ مثل مشہور است کہ سلاطین و امرا گاہے بسلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند نواب ممدوح بہ اصغاء ایں تاریخ خیلے برہم گردیدہ حکم بہ بے عزتی مرزائے موصوف فرمودند۔ چنانچہ معروف است کہ سودا بہمیں بغیرت در ہمدراں چند چہاں فانی را پدرود کرد .... "

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ص ۳۰۱

[2] بحوالہ تاریخ لطیف مخطوطہ رضا لائبریری رام پور

نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء میں مسندِ وزارت پر متمکن ہوئے
سوزؔ اس کے تقریباً سات برس بعد ۱۱۹۵ھ/ ۸۱-۱۷۸۰ء میں وفات پائی
اس لئے ان پر آصف الدولہ کے عتاب اور اس کے نتیجے میں "چند روز"
کے اندر ان کی موت کے متعلق یہ بیان بے بنیاد معلوم ہوتا ہے

حالات و واقعات کے ضمن میں امور مسلّمہ سے اختلاف کے علاوہ تذکرۂ
بے جگر کے مطالعے کے دوران عبارت کے اعادے اور اشعار کے غلط
انتساب کی کچھ مثالیں بھی سامنے آتی ہیں لیکن گزشتہ سطور میں ہم نے جس
قسم کی واقعاتی غلطیوں سے بحث کی ہے ان کے مقابلے میں یہ کوتاہیاں
بہت معمولی نوعیت کی ہیں اس لئے یہاں ان کی تفصیل نظر انداز کی جاتی ہے

اس تذکرے کا ایک اور عیب یا نقص جو بعض اوقات بری طرح کھٹکتا
ہے اس کے اسلوب نگارش کی ناہمواری ہے۔ اگرچہ بے جگر نے عام طور
پر اظہار مطالب کے لئے سادہ و سلیس پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے لیکن کہیں
کہیں رنگین نگاری و مرصع کاری کے شوق میں تشبیہات و استعارات اور
صنائع لفظی و معنوی کے سلسلے جوڑتے ہوئے وہ اس جادۂ مستقیم سے بہت
دور بھی نکل گئے ہیں اور محض عبارت آرائی کی خاطر معمولی معمولی باتوں کو
غیر ضروری طول دے کر پیش کیا ہے۔ الفاظ کے اس ہجوم میں قاری کے
لئے گوہر مقصود کی تلاش کس قدر دشوار ہو جاتی ہے اس کا اندازہ ذیل
کی مثالوں سے ہوگا۔

(الف) عبدالحئی تاباںؔ :- "پر تو افگنی فکر روشنش عرش سخن را بود
آفتابے تاباں، و ظلِ گستریِ خیال نورسگستش آسمان ایں
فن را ماہے درخشاں۔ ملے ملے، تابندگیِ آفتاب

آسمانی بینش در درخشانی آفتاب نگرش در روز روشن چوں ماہ است درخشندگی ماہِ جہان تاب مقابل تابانی ماہِ خیال او مانند آفتاب در ابر سیاہ ہر مصرعۂ اش بسان ابروئے ہلال روشن خیالی را اشارہ فرمانہ ہر بیتش مثال خانہ آفتاب از نور فصاحت متجلی۔"

(ورق ۲۸ الف)

(ب) قائم چاند پوری:۔ "قیام دین سخن وابستہ بفکرِ مستقیم اوست و استحکام قوانین ایں فن پیوستہ بہ رائے قویم او۔ کاخِ رفیع بلند خیالی بہ استقامت ستونِ قلم نگارینش تا ابد قائم و بنائے مبنیٔ عالی مقالی بہ پشت دستیٔ بیانِ متینش مستحکم بہ دائم۔ سنگینیٔ تلاشِ سنگین او بہ گفتارِ رنگین از لعلِ بدخشانی ہم سنگ و رنگینیٔ گفتارِ رنگین وے بتلاشِ سنگیں با عقیقِ یمنی ہم رنگ۔"

(ورق ۱۴۱ ب)

(ج) نظیر اکبر آبادی:۔ "رسائی حافظہ رسایش را اگر بہ حافظ رسائے رسائی برابر نہ کنم چہ کنم و جودتِ طبع جوادش را اگر بہ طبع جواد جودت مطابقت نہ دہم چہ دہم۔"

(ورق ۱۹۲ الف)

تلازمہ بندی اور عبارت آرائی کی یہ کیفیت اگرچہ بے جگر کی تحریر دل میں عنصرِ غالب کی حیثیت نہیں رکھتی پھر بھی اسے ان کے تذکرے کے نقائص ہی میں شمار کیا جائے گا لیکن اس قسم کی تمام خامیوں کے باوجود تذکرہ نگاری کے بعض بنیادی تقاضوں کی تکمیل میں انھوں نے جس قدر کامیابی حاصل کی ہے وہ انکے امتیاز اور انفرادیت کی ضامن ہے شعرائے اردو کے بہترین تذکروں کی کوئی فہرست اس تذکرے کا نام شامل کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

طویل اور جامع تذکرے

یہ باب عیارالشعراء، عمدۂ منتخبہ، مجموعۂ نغز اور گلشنِ بے خار کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ یہ چاروں تذکرے ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء اور ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء کے درمیانی عرصے میں مرتب ہوئے ہیں۔ ظاہری اعتبار سے جو خصوصیت ان تذکروں کو اس عہد کے دوسرے تذکروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی وسعت و جامعیت ہے۔ عام تذکرہ نگاروں کے برخلاف ان تذکروں کے مولفین نے زیادہ سے زیادہ شاعروں کے حالات معلوم کرنے اور ان کا منتخب کلام بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ عیارالشعرا کے مولف نے اس کی ترتیب پر لگ بھگ چالیس سال صرف کیے ہیں اور کم و بیش ساڑھے آٹھ سو شاعروں کو روشناس کرایا ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں نو سو چھیانوے شاعروں کا ذکر ہے۔ اس تذکرے میں بھی ابتدائی ترتیب کے بعد تقریباً تیس سال تک اضافے ہوتے رہے ہیں۔ مجموعۂ نغز جو نسبتاً کم وقت میں مکمل ہوا ہے چھ سو چورانوے شاعروں کے حالات و کلام پر مشتمل ہے۔ اسی طرح گلشنِ بے خار میں شعرا کی شمولیت کلام کی دل کشی کے ساتھ مشروط ہونے کے باوجود چھ سو چھیاسٹھ شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے قبل ان تذکروں کے علاوہ کسی تذکرے میں شاعروں کی اتنی تعداد نظر نہیں آتی۔ تذکرہ نگاروں کے دائرۂ کار کی یہ وسعت نسبتاً زیادہ وسیع مطالعے کا تقاضا کرتی ہے، اسی لئے ہم نے ان تذکروں کو

ایک علیحدہ باب کے تحت جگہ دی ہے۔

عیار الشعراء

"عیار الشعراء" انیسویں صدی کے مشہور ادیب و شاعر خوب چند ذکا دہلوی (متوفی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء) کی تصنیف ہے اور مشرقی علوم و ادبیات کے میدان میں غیر مسلم ارباب قلم کے گرانمایہ کارناموں کی ایک ناقابل فراموش یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اب تک اس کے صرف دو قلمی نسخے دستیاب ہو سکے ہیں جو انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ اور انڈیا آفس لندن کے کتب خانوں کی ملکیت ہیں۔ انجمن کے مخطوطے سے ورق ۲۰ کے بعد کے ۲۳ اوراق اور آخر کے کم از کم دو تین صفحات غائب ہیں انڈیا آفس کا نسخہ مکمل ہے لیکن اس کے اختتام پر سنہ کتابت وغیرہ درج نہیں۔ اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کا بھی زمانہ کتابت واضح طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا البتہ بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اول الذکر نسخہ ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کے قریب اور دوسرا ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء کے بعد لکھا گیا ہے۔

گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ ذکا نے یہ تذکرہ اپنے استاد میر نصیر الدین نصیر عرف میر کلو (شاہ نصیر دہلوی) کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا۔[1] ذاتی حالات کے سلسلے میں مؤلف کی درج ذیل تحریر اس قول کی تائید کرتی ہے "روزے استادِ صاحب تدبیر، میر نصیر الدین نصیر مدظلہ کہ توجہ استادانہ و نوازش بزرگانہ بحالِ من زیادہ از حد دارند،

---

[1] خطبات گارساں دتاسی (خطبہ پنجم) صفحہ ۹۱۔

از زبانِ فیضِ بیان ارشاد فرمودند کہ درزمرۂ شاگردانِ خود شمارا شاگردِ رشید خواندہ ام آیا چہ خوش باشد کہ نسخہ جاں فزائے تذکرہ بہ سعی شما مرتب گردد وزودِ قابلیت و مذاق شاعری ایشاں وملکہ سخن گوئی تمامی شاعرانِ ہند و شیراز و دیگر امصار و بلاد و قریات از ہنگامِ احداثِ زبان ریختہ بہ امتحان در آید و ہرگاہ خاطر از عوارض و صوادم دنیوی منتشر و مکدر گردد، بہ سیر ایں نسخہ دل آویز شگفتگی پذیرد و بہ مطالعہ ہرقسم اشعار فرحتِ تازہ و نشاط بے اندازہ پدید آید۔ ازاں جا کہ عنایتِ ایزد کار ساز و اعانتِ اوستاد شاملِ حال بود، بہ درستیٔ ایں امر کہ فی الحقیقت کارِ ہرکدام نیست بدونِ اعانت الٰہی انصرام نمی باید پرداختم۔"

(نسخہ لندن صفحہ ۲۷۵)

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ابتدائی اوراق میں دیباچہ کے تحت جو وجہ تالیف بیان کی گئی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں انھوں نے تذکرے کی ترتیب کو اپنی طبیعت کی ایک بے اختیار تحریک کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"شبے کہ شبِ قدر را بہ بیداری گش و روزِ نوروز را بہ لمعہ نمائی آن زوال داد، بہ خاطرِ بے حضور چناں پرتو انگند کہ سطرے چند بطور تذکرہ شعرائے ہم عصر و سلف بہ قلم دادہ بیادگار گزارد کہ چاشنی خوارانِ مائدۂ سخن را کیفیتے ولذتے حاصل آید۔ در کمتر مدتے اشعار برجستہ و منتخب سخنورانِ دور و نزدیک آں قدر بہم رسید فراہم آوردہ بدستیاری استعداد برشتہ تحریر کشیدہ

بہ عیار الشعراء موسوم گردانید" (نسخۂ لندن صفحہ ۳ و ۴)

لیکن اصل صورت حال کچھ بھی رہی ہو بظاہر اس تضاد اقوال کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً مولف کے ذہن میں ایک مختصر تذکرہ تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے لیے انھوں نے تھوڑی سی مدت میں ضروری مواد فراہم کر لیا۔ اسی دوران میں شاہ نصیر نے انھیں ایک مفصل اور جامع تذکرہ ترتیب دینے کا مشورہ دیا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ بارہ تیرہ سال کی کوشش و محنت کے بعد "عیار الشعرا" کو ایک طویل و بسیط تذکرے کی حیثیت سے منظر عام پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس درمیانی مدت کا تعین مادۂ تاریخ ترتیب کے اس لفظی اختلاف کی بنا پر کیا گیا ہے جو کہ مذکورہ نسخوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ نسخۂ لندن میں دیباچہ کے اختتام پر رقمطراز ہیں

"تاریخ تذکرہ کہ بدیہہ بخاطر گذشتہ نیز درج نمودہ۔

باللہ التوفیق۔ ابیات

اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار
آگے بالطف کے کیا پیر خرد نے مذکور
مصحفی کرکے رہیں اس نے یہ تاریخ کہی
آفریں کہہ کیا نام سبھوں کا مشہور"

(صفحہ ۴ نسخۂ لندن)

آخری مصرعے سے ۱۲۰۸ ہجری برآمد ہوتا ہے جسے ابتدائی ترتیب و تشکیل کا سال سمجھنا چاہیے۔ نسخۂ علی گڑھ میں یہی قطعہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ اس طرح درج ہوا ہے :-

اے ذکا ہو چکا جس روز یہ نسخہ تیار
آگے ہاتف نے کیا پیر خرد نے مذکور
منصفی کر کے دو ہیں اونے یہ تاریخ کہی
آفریں کہہ کہ کیا اسم سبھوں کا مشہور (ورق ۳ ب)

یہاں مادۂ تاریخ میں لفظ "نام" کی جگہ "اسم" کے اندراج نے زمانۂ تالیف کو دس سال کے آگے بڑھا کر ۱۲۰۸ ہجری کا سلسلہ ۱۲۱۸ھ سے ملا لیا ہے۔ لیکن "عیار الشعرا" کو نقش آخر کی حیثیت ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء میں بھی حاصل نہ ہو سکی اور ذکا اندازاً ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک اس میں برابر اضافے اور تبدیلیاں کرتے رہے۔ زیر بحث مخطوطات کے سنین ترتیب سے قبل اور بعد کی اس طویل مدت کے تعین میں مولف کے جن بیانات سے مدد ملتی ہے ان کی تفصیل یہ ہے:-

(الف) میر قمر الدین منت کے متعلق نسخۂ علی گڑھ میں ورق ۲۰۳ کے حاشیے پر مندرجہ ذیل اطلاع فراہم کی گئی ہے۔

"در سنہ یک ہزار و دو صد و ہشت ہجری ہمرکاب راجہ ٹکیت رائے بہادر بہ کلکتہ رسیدہ راہی شہر آخرت گردید"

متن کے بجائے حاشیے پر اس جملے کے اندراج سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ذکا منت کا حال ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء سے قبل تحریر کر چکے تھے۔

(ب) احسن الدین خاں بیان کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:-

"حالا از چندے بہ حیدر آباد رفتہ در سرکار نواب

مشیر الملک بہادر بر شاعری و ہم علاقہ دیگر عز امتیاز اندوختہ دارد۔"
(نسخہ علی گڑھ ورق ۳۰ ب و نسخہ لندن صفحہ ۸۳)

معتبر روایات کے بموجب بیان اپنے سال وفات ۱۲۱۳ھ (۹۹-۱۷۹۸ء) سے کچھ سال قبل دہلی کو خیرباد کہہ کر دکن کی طرف چلے گئے تھے۔ اس لئے جہاں یہ بات یقینی ہے کہ ذکا نے ان کا حال ۱۲۱۳ ہجری سے قبل لکھا ہے وہاں یہ امر بھی بعید از امکان نہیں کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۸ ہجری سے بھی پہلے کی تحریر ہو۔

(ج) میر صاحب کے حال میں لکھتے ہیں کہ:-

" در سرکار فیض آثار نواب وزیر الملک آصف الدولہ —
شرفِ اختصاص دارد۔"

(نسخہ علی گڑھ ورق ۱۴۱)

نواب آصف الدولہ کا انتقال ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ/ ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو ہوا ہے لہذا یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ میر صاحب کی ان کے دربار سے وابستگی کے متعلق مندرجہ بالا تحریر اس تاریخ سے قبل کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

(د) میر سوز کی نسبت جن کے حالات شروع سے آخر تک صیغہ حال میں لکھے گئے ہیں رقم طراز ہیں کہ:-

" از چندے بہ لکھنؤ اقامت ورزیدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہ نظر عمدہ ہائے قدر شناس خیلے معزز و محترم است آں جا بہ حرمت می گزراند۔"
(نسخہ علی گڑھ ورق ۱۲۵ ب و نسخہ لندن صفحہ ۳۹۲)

میر سوز نے ۱۲۱۳ھ/ ۹۹-۱۷۹۸ء میں وفات پائی ہے اور ان کی شہرت

و مقبولیت کے پیش نظر یہ بعید از قیاس ہے کہ ان کے انتقال کی اطلاع بروقت مولف تک نہ پہنچ پائی ہو اس لئے یقینی طور پر ان کے حالات ۱۲۱۲ھ سے پہلے ہی لکھے گئے ہوں گے۔

(ہ) "مجمع الانتخاب" کے مولف شاہ کمالؔ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"در لکھنؤ قیام دارد و بزہد و ورع اوقاتِ شریف خود بسر می برد۔" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۰۴ ب)

کمالؔ اپنے بیان کے مطابق ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں لکھنؤ سے ترک سکونت کرکے حیدر آباد جا چکے تھے[1]۔ لہذا قیام لکھنؤ کے بارے میں یہ صراحت یقیناً اس سنہ سے پہلے عمل میں آئی ہوگی۔

(و) نواب اعظم الدولہ سرورؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"از چندے اشتیاق فراہمیٔ اشعار سخنوران و تالیف تذکرہ بہ گوشۂ خاطر در بار متقاطرش جا گرفتہ، اغلب کہ بظہور آید[2]۔" (نسخہ علی گڑھ ورق ۱۲۷ ب)

نظام الدین ممنونؔ کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "یہ ہے معیار نقد سخن" کی رو سے سرورؔ کے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" کا نقش اول ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں تیار ہو چکا تھا اور چونکہ ذکا اور سرورؔ دونوں ہی دہلی میں مقیم اور ایک دوسرے سے متعارف تھے[3] اس لئے بظاہر اس تذکرے کی تکمیل سے مولف کی بے خبری کا کوئی امکان نہیں۔ ایسی صورت میں سرورؔ کے حالات

---

[1] مجمع الانتخاب مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ورق ۲۰۴ ب

[2] یہ جملہ انڈیا آفس لائبریری کے نسخہ میں موجود نہیں۔ [3] ذکا کی درخواست پر سرورؔ نے انھیں تذکرے میں شامل کرنے کی غرض سے اپنے اشعار اپنے ہاتھ سے لکھکر دیے تھے۔ نسخہ لندن ص ۱۰۱م

کو ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے پہلے کی تحریر ہونا چاہیئے۔

(ز) میر جواد علی خاں ہادی کے ذکر میں ان سے اپنے خصوصی مراسم کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"از دور بندہ پروری اکثر بہ غریب خانہ ایں بندہ ذکا قدم رنجہ می فرماید" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۹۵)

سرور اور شیفتہ[1] کے بیانات کے مطابق ہادی کی وفات ۱۲۱۵ھ میں ہوئی ہے اور ذکا باہمی تعلقات کی بنا پر یقیناً اس حادثے کے زمانہ وقوع سے بے خبر نہ رہے ہوں گے لہذا یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں کہ ان کے حالات ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔

(ح) میر شیر علی افسوس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اس وقت لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں[2]۔ یہ بیان بھی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء سے قبل کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ افسوس اپنی تحریر کے مطابق ۲۷ر جمادی الاولیٰ ۱۲۱۵ھ ۱۷ر اکتوبر ۱۸۰۰ء کو کرنل اسکاٹ کے حکم کے بموجب فورٹ ولیم کالج کے لیے منتخب ہو گئے تھے اور اس کے کچھ ہی دن بعد وہ لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر کلکتہ پہنچ چکے تھے[3]۔ ۱۹ر ستمبر ۱۸۰۹ء (۹ر شعبان ۱۲۲۴ھ) میں کلکتہ ہی میں ان کا انتقال ہوا[4]۔

(ط) مظہر علی خاں ولا کے متعلق یہ اطلاع فراہم کی گئی ہے کہ :-

---

[1] عمدۂ منتخبہ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۱۹ ۸۰ گلشن بے خار طبع اول صفحہ ۲۳۶

[2] "در لکھنؤ قیام دارد" نسخہ لندن صفحہ ۲۲

[3] دیباچہ باغ اردو بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۰

[4] بنگال کا اردو ادب ص ۱۱۸

"دریں ولا از لکھنؤ بہ کلکتہ رفتہ نوکر شدہ آں جا بہ عزت و وقار می گذرانند۔" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۰۰ ب)

(ہی) ولا جمادی الثانی ۱۲۱۵ھ / نومبر ۱۸۰۰ء میں بمقام لکھنؤ فورٹ ولیم کالج کے لئے منتخب ہوئے تھے اور شعبان ۱۲۱۵ھ (جنوری ۱۸۰۱ء) تک کلکتہ پہنچ کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے۔[1] منقولہ بالا جملے کے انداز بیان سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اس کی تحریر کے وقت انھیں لکھنؤ چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ اس لئے یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ ان کا حال ۱۲۱۵ کے اواخر یا زیادہ سے زیادہ ۱۲۱۶ھ کے اوائل (۱۸۰۱ء) میں داخل تذکرہ کیا گیا ہے۔

شیخ ابراہیم ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ اکثر شاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں اور میر نصیر سے قواعد شعریہ کے اکتساب میں مصروف ہیں۔[2] (۱) شیخ صاحب کی ولادت ایک قول کے مطابق ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء میں[3] اور دوسری روایت کے بموجب ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ (۲۲ اگست ۱۷۹۰ء) کو ہوئی تھی[4] اور یہ بیان بظاہر ان کی مشق کے ابتدائی زمانے سے متعلق معلوم ہوتا ہے جسے عمر کی تیرہویں یا چودہویں منزل سے پیچھے لے جانا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے اسے ۱۲۱۸ ہجری کے

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۶۰

[2] اکثر در مجالس مراختہ داد دہی گر: ود فوائد قواعد شعر بہ از خدمت سراپا برکت محمد نصیر الدین نصیری رباید" (نسخہ علی گڑھ ورق ۸۶ ب۔ نسخہ لندن صفحہ ۲۷۰)

[3] ذوق ۔ سوانح اور انتقاد، صفحہ ۲۵

[4] دیباچہ دیوان ذوق مرتبہ شمس العلماء آزاد صفحہ ۲

قریب کی تحریر تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں۔

مندرجہ بالا شہادتیں ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء کے قریب تک مسلسل تحریر کا پتہ دیتی ہیں۔ اس سال کے بعد جس قدر اضافے ہوئے ہیں ان کا اندازہ دونوں نسخوں کے باہمی مقابلے کے ذریعے باآسانی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں سے اکثر علی گڑھ کے نسخے میں جگہ نہیں پا سکے ہیں۔ اس کے علاوہ بعد کے زمانے کی ان تحریروں میں بعض جگہ سنین کے حوالے بھی موجود ہیں مثلاً۔

(الف) ہدایت اللہ خاں ہدایت :-

"در سنہ یک ہزار و دو صد و نوزدہ ہجریہ مقدسہ رخت حیات بہ عالم جاودانی بربست[1]۔" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۸۲ ب ونسخہ لندن صفحہ ۲۷۰)

(ب) میر نثار علی تمکین :-

"در ۱۲۳۸ ہجری ہم رکاب فیض انتساب شوکت جنگ بہادر از فرخ آباد بہ دہلی تشریف آوردہ۔" (نسخہ لندن صفحہ ۷۱)

(ج) رسول بخش حسرت بدایونی :-

"در سنہ یکہزار و دو صد و چہل ہجری از سفر دار الامارت کلکتہ بہ دہلی آمدہ در مشاعرہ وارد شدہ و غزل طرحی نیز خواند، حاصی دکا بازہم مجلس و ملاقی گشتہ۔" (نسخہ لندن صفحہ ۱۹۳)

(د) اپنے استاد بھائی مقبول کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

"در ۱۲۴۷ ہجری از ضلع ٹانڈہ در دہلی وارد شدہ بود" (نسخہ لندن صفحہ ۳۴۲)

---

[1] نسخہ علی گڑھ میں یہ جملہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے اس لئے اس سے بھی ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ اس نسخے کی کتابت ۱۲۱۹ ہجری سے قبل مکمل ہو چکی تھی۔

ان تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ "عیارالشعرا" ۱۲۰۸ ہجری/۹۴-۱۷۹۳ء یا اس سے کچھ دن پہلے سے ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک مولف کی خصوصی توجہات کا مرکز بنا رہا۔ اور وہ چالیس سال کے اس عرصہ میں برابر اسے زیادہ سے زیادہ جامع اور مفید بنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ تذکرے کے اختتام پر اپنے اس غیر معمولی اور طویل المیعاد انہماک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"بعد تالیفِ تاریخ نسخۂ ہذا کہ بر دیباچہ مرقوم یافت اشعارِ ہر کدام کہ بہم رسید بقدرِ خاطر پسند خود بہ قلم در دادم۔ پیداست کہ انتخاب اشعار و بہم رسانیدن دواوین شاعرانِ سلف و حال از صغار و کبار، جوانب و اطراف دانستہ، ادراکِ احوال ہر کدام را چہ قدر عرصہ و مشقت و تلاش می باید و چہ قدر خونِ جگر خوردہ می شود۔ سالے چند بہ تصنیف ایں نسخہ جگر کاوی کہ نمودم و از امور دینی و دنیوی باز ماندہ محنتے کہ بکار بردہ ام از فرطِ وضوح محتاج بہ گذارش نہ در زمانہ ناقدرداں کہ احدے شنوائے و داد رس

۱؎ اس فیصلے کی روشنی میں نگار پاکستان "تذکروں کا تذکرہ نمبر" کے مرتب جناب فرمان فتحپوری کا یہ دعویٰ کہ عیارالشعراء کا سالِ تکمیل دتا سی کے بیان (۱۲۰۸ھ تا ۱۲۴۷ء) کے برخلاف ۱۲۱۳ ہجری غلط پاتا ہے۔ فرمان صاحب کے یہ رائے نسخہ علی گڑھ میں شامل قطعۂ تاریخ کے آخری مصرعے کے ساتھ مرقوم سنہ (۱۲۱۳ھ) کی روشنی میں قائم کی ہے جس کے بارے میں پہلے ہی یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ سہو کتابت پر مبنی ہو جناب عرشی رامپوری کا یہ ارشاد بھی کہ "یہ تذکرہ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں شروع ہوا اور تقریباً ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔" (دیوان غالب۔ نسخہ عرشی ص ۲۹۲) اسی ضمن میں آتا ہے۔

کلام نیست عمرے بہ فراہمی و گرد آوری اشعار بسر بردم و رنج لا طائل و محنت لاحاصل برداشتم ازیں انفعال کلی دامن گیر است کہ اگر تا ایں عرصہ سالہا سال ریاضت خدائے کریم می کردم سہانا از پایہ می گذشتم چونکہ خود کردہ را درماں نیست بہ لحاظ ایں معنی کہ سعی آغاز کردہ برسانش بہ انتہا، مدد از جناب ناصر مطلق خواستہ ہمت بہ اختتام گذاشتم" (نسخہ لندن صفحہ ۹۴۴ و ۹۴۵)

عمر گرانمایہ کا ایک وقیع حصہ اس طرح خدمت لوح و قلم میں گزارنے کے بعد کامیابی کے باوجود محرومی و ناکامی کا جو شدید احساس مولف کا دامن گیر ہے اس سے ان کے خلوص، لگن اور تندہی کا اندازہ ہوتا ہے شعرائے اردو کے تذکروں کی تاریخ میں یہ اپنی قسم کی پہلی مثال ہے۔

اخبیرنگر نے "فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ" میں اس تذکرے کو تقریباً ڈیڑھ ہزار شاعروں کے حالات پر مشتمل قرار دیا ہے[1]۔ اس ضمن میں گارساں دتاسی[2] اور ڈاکٹر سید عبداللہ[3] کے تائیدی بیانات اسی قول کی صدائے بازگشت ہیں[4]۔ جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے موجودہ مخطوطات کے مطابق یہ تعداد کسی طرح ساڑھے آٹھ سو سے متجاوز نہیں۔ ذکا نے ان شاعروں کے متعلق ضروری مواد کی فراہمی میں جن ذرائع و وسائل سے مدد

---

[1] بحوالہ "یادگار شعرا" صفحہ ،

[2] خطبات گارساں دتاسی (خطبہ پنجم) صفحہ ۹۱

[3] شعرائے اردو کے تذکرے صفحات ۴ و ۴۸

[4] لالہ سری رام نے یہ تعداد چار پانچ ہزار کے قریب بتائی ہو (خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۴۶) جو بالیقین نادیدہ اندازے یا کسی روایت پر مبنی ہے۔

لی ہے ان میں مجموعہ ہائے کلام کے علاوہ پیش رو مصنفین کے تذکرے بھی شامل ہیں چنانچہ پیام اور گرامی کے حالات میں واضح طور پر داغستانی اور خانِ آرزو کے تذکروں (ریاض الشعراء اور مجمع النفائس) کے حوالے ملتے ہیں۔ مبتلا میرٹھی کا "طبقاتِ سخن" بھی ان کی نظر سے گذر چکا ہے[1]۔ اور میر کے "نسخہ تذکرہ مختصر" (نکات الشعراء) قدرت (شوق) کے "تذکرہ شاعرانِ ریختہ گو" (طبقات الشعرا) مصحفی کے "تذکرہ فارسی" (عقدِ ثریا) اور "تذکرہ ہندی" سے بھی انھوں نے اپنی واقفیت کی طرف اشارے کئے ہیں اس لئے ان تذکروں سے استفادے کے امکانات بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے علاوہ بعض شاعروں کا کلام تذکرے میں درج کرنے کے لئے بطورِ خاص انھیں سے حاصل کیا گیا تھا جیسا کہ درج ذیل بیانات سے ظاہر ہوتا ہے :-

(الف) میر شجاعت علی تسلی :- "بعضے از اشعار مولفہ اش کہ بہ خط خود نوشتہ بہ بندہ ذکا لطف فرمودہ، در تذکرۂ ہذا ثبت ساختہ"۔

(نسخہ لندن صفحہ ۱۳۳)

(ب) رسول بخش حشر بدایونی "جہت ادخال تذکرہ استدعائے شعر نمودہ چنانچہ بہ عطائے غزل طرحی شاعرہ بنواخت"۔

(نسخہ لندن صفحہ ۱۹۳)

(ج) اعظم الدولہ سرور۔ "اشعارے چند بحسب استدعائے ایں کمترین بخط خود نوشتہ داد" (نسخہ لندن صفحہ ۱۰۲)

---

[1] "تذکرۂ ہندی ... ... از ترتیب یافتہ دبہ نظر احقر ہم گذشتہ (نسخہ لندن صفحہ ۹۸)

(د) مرزا فدا حسین خاں فدا :۔ "بہ تکلیف این بیخبر طلب چند غزلیات و اشعارِ منتخب از دیوانِ مروت بہ خطِ خود نوشتہ لطف فرمودہ"

(نسخہ لندن صفحہ ۶۷۴)

غیر معروف اور گمنام شعرا کے کلام کی تحصیل و جستجو میں ذکا نے جس محنت اور تندہی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ ایک قدیم شاعر لطفی کے بارے میں اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

"بہ کمالِ تلاش کہ مصنف تذکرہ لازم و واجب است۔ ایں اشعار بہ کمترین بہم رسید" (نسخہ لندن صفحہ ۶۴۹)

یہ تلاش اور جستجو اس لئے اور بھی زیادہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ انکے نزدیک معیار کی بلندی و پستی سے قطعِ نظر ہر معلوم شاعر کا کلام لازمی طور پر تذکرے میں شامل ہونا چاہیئے تاکہ آیندہ نسلیں اس کے وجود سے بے خبر اور اسکے نتائج سے ناواقف نہ رہیں چنانچہ درجہ سوئم کے ایک شاعر حابد کے حال میں رقم طراز ہیں کہ :۔

"چوں در تذکرہ اشعار رطب و یابس ہر کدام نوشتن لازم آمدہ لہذا بعضے از غزلیاتش کہ بتلاش کاملہ بہم رسید اشعرے بقیدِ قلم می دہد" (نسخہ علی گڑھ ورق ۶۶۔ الف)

فہوت ایک خش گو شاعر ہے جس کا کلام شروع سے آخر تک رکاکت اور ابتذال سے معمور ہے اور کسی طرح نوکِ قلم تک لانے کے قابل نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ذکا اسے تذکرے میں شمولیت کے حق سے محروم رکھنے کو، اصولِ تذکرہ نگاری سے انحراف کے مترادف خیال کرتے ہوئے ان الفاظ میں قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ :۔

"اگرچہ دریں کتاب ذکرِ سخن آں نوشتن نامناسب محض است الا چوں ازیں خیال گذشتن شعار تذکرہ نویسی نیست در رطب و یابس ہر کدام بہ نوشتن می آید لہٰذا درج نمودہ شد۔ تقصیر معاف"!!

(نسخہ علی گڑھ ورق ۱۴۴ الف)

جعفر زٹلی اور امام علی صاحب قران وغیرہ کو بھی اسی اصول کے تحت تذکرے میں جگہ دی گئی ہے ورنہ اس قسم کے شعرا اور ان کے کلام کے متعلق مولف کا ذاتی نقطۂ نظر منقولۂ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہے۔ اسی طرح ہجویہ شاعری کو بھی وہ بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے اور تذکرے کے صفحات پر اس کے نمونے پیش کرنا آئین تہذیب و متانت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اسی لئے بہرحال کمترین کے حال میں انھیں اس وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

"ایں عاصی دریں نسخہ ہجو کسے نہ نوشتہ الا بمقتضائے ضرورت و لاچارگی۔ از شاعر ہذا ایں قسم اشعار بروئے کار آمدہ (لہٰذا) ایں امر باوبت نمود" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۰۵ ب)

تذکرے کی ترتیب کے سلسلے میں اپنے مقرر کردہ معیار اور مخصوص اصول و نظریات کے ضمن میں ذکاؔ نے مختصر نگاری اور غیر ضروری تفصیل و اطناب سے گریز کو بھی کافی اہمیت دی ہے۔ حالات و واقعات کی بحث ہو یا کلام کے انتخاب و اندراج کا معاملہ، وہ ہر جگہ طول نویسی کو آدابِ تذکرہ نگاری کے منافی اور معیوب خیال کرتے ہیں[1]۔ ان کے نزدیک تذکرہ وہ صنف ادب ہے جس کی وساطت سے اہلِ ذوق زیادہ سے زیادہ شاعروں سے ابتدائی تعارف حاصل کر سکیں اور

---

[1] عیار الشعراء میں اس کلیے سے استثنا کی مثالیں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تعداد قابلِ لحاظ نہیں۔

منتخب کلام کی روشنی میں ان کے معیار فکر اور ادبی مقام سے واقف ہو جائیں۔
چنانچہ غالب علی خاں سعید کے حال میں لکھتے ہیں کہ :-

"طول نویسی معیوب دانستہ برسم تذکرہ اشعار چند منتخب از تالیف آن صاحب طبع عالی وقار زبانِ خامۂ نیاز فرسودہ"

(نسخہ علی گڑھ ورق ۱۲۴ ب)

مشہور مجہول الاحوال شاعر سعدی کے کلام سے متعلق درج ذیل بیان میں بھی اس خیال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ

"بحسب رواج تذکرہ بہ مختصر نویسی پرداختہ ہمیں دو شعر تبرکاً بروئے قلم آوردہ" (نسخہ علی گڈھ ورق ۱۳۲ ب)

میر صاحب کا منتخب کلام سپرد قلم کرنے سے قبل عمل انتخاب کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"از تصانیف پاکیزہ تلاش او قریب یک ہزار بیت انتخابی قابل نوشتن تذکرۂ برآمدہ بود از ان جا کہ مختصر نویسی شعار تذکرہ سازی است لہذا عمداً بہ طوالت کلام نہ پرداخت و برہمیں قدر اختصار نمودہ، ایں گوہر ہائے اشعار آبدار ...... برشتۂ تحریر کشید"

(نسخہ علی گڈھ ورق ۱۴۱ ب)

ان بیانات سے آگے بڑھ کر ہدایت اللہ خاں ہدایت کے حال میں ذکا نے اپنا یہ موقف بالکل واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ :-

"ایں اضعف العباد بہ مختصر نویسی شعار دارد"

(نسخہ علی گڈھ ورق ۲۸۲ ب)

ہمہ گیری اور مختصر نگاری کے اس امتزاج کی بدولت اگر ایک طرف ذکا

کے یہاں رنگا رنگی اور جامعیت کی شان پیدا ہو گئی ہے تو دوسری طرف وہ تذکرے کے دامن کو اس تشنگی سے نہیں بچا سکے ہیں جسے بجا طور پر شعراء کے حالاتِ زندگی کے بیان میں اجمال کا ردِ عمل کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ انھوں نے پہلی بار بساط تحریر پر شاعروں کی اتنی بڑی محفل سجا کر قارئین کو اردو کے شعری سرمائے کی وسعت اور تنوع سے آشنا کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ وہ جلوؤں کی اس کثرت و فراوانی میں گم ہو کر اربابِ سخن کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ عام طور پر ان کے یہاں تعارف کا جو انداز کار فرما نظر آتا ہے اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں۔

میر شیر علی افسوس :۔ "متوطن نارنول ابن میر علی مظفر خاں داروغۂ توپ خانۂ عالی جاہ شاگرد رشید میر حیدر علی حیران است۔ در لکھنؤ قیام دارد۔ از کلام بہجت التیامش بوئے فصاحت بمشام جاں می رسد" (نسخہ لندن صفحہ ۲۲)

میاں صاحب میر الم :۔ "خلف رشید حضرت خواجہ میر درد انار اللہ برہانہ بسیار متواضع و حلیم الطبع و نیک ذات و ستودہ اطوار است بموجب روبۂ خاندانِ عالی صدر نشین فقر و انتقار است و سر رشتۂ سخن سنجی ہم از دست ندارد۔ بغایت خوش فکر و صاف گو طرز کلام بعنوانِ والد ماجد دعوئے بزرگوارِ خود پیدا کردہ"
(نسخہ لندن صفحہ ۷۰)

شاہ کمال الدین حسین کمال :۔ "ساکن قصبہ مانکپور۔ بزرگانش بہ منصب داری حضور معلّٰی سرفراز بودند۔ از شاگردانِ رشید میاں قلندر بخش جرأت است۔ در لکھنؤ قیام دارد و از تعلقات دنیوی درگذشتہ بزہد و

و ورع اوقات می گذارند" (نسخہ لندن صفحہ ۲۳۶)

مرزا غالب :۔ " مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ خاں عرف مرزا دولہ نبیرہ مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبر آباد شاگرد مولوی محمد معظم شاعرِ فارسی و ہندی است" (نسخہ لندن صفحہ ۵۴۲)

یہ ان ممتاز معاصرین کے حالات ہیں جو ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء سے قبل ہی کسی نہ کسی حیثیت سے شہرت و امتیاز کے منصب اعلیٰ پر فائز ہو چکے تھے اور جن کے بارے میں مزید معلومات کی فراہمی حدِ امکان سے باہر نہ تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز صورتِ حال اس وقت پیش آتی ہے جب کہ ہم آتش، ناسخ اور ذوق کے بارے میں مولف کے دائرہ معلومات کو اس سے بھی محدود تر پاتے ہیں۔ ذوق ان کے ہم وطن اور استاد بھائی یعنی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور آتش و ناسخ کی شہرت بھی تذکرے کی ترتیب جدید سے پہلے پرواز حاصل کر کے ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے باوجود زکا نے ان تینوں شاعروں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے۔

آتش :۔ " وے از باشندہ ہائے قدیم بلدۂ لکھنؤ ست شعر ہندی و فارسی می گوید۔ کلامش گرمی دارد" (نسخہ لندن صفحہ ۱۰)

ناسخ :۔ " شیخ امام بخش قوم سید (کذا) باشندہ لکھنؤ طرز کلام گوئی او بسیار مرغوب و مطبوع دل ہاست" (نسخہ لندن صفحہ ۵۰۱)

ذوق :۔ " از ساکنینِ دار الخلافہ شاہجہاں آباد اکثر در مجلسِ مراختہ دار ذی گرد و فوائد قواعد شعر بہ از خدمت سراپا برکت محمد نصیر الدین

نعیبر می رباید۔" (نسخہ لندن صفحہ ۲۷۲)

"عیار الشعراء" میں کہیں کہیں اس روشِ عام سے استثنا کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے ان مستثنیات میں کسی نہ کسی حد تک وہ خصوصیات موجود ہیں جو تذکرے کو بیاضِ اشعار سے ممتاز کرتی ہیں۔ چنانچہ ذیل کے اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ خوب چند جب کبھی "شمار مختصر نگاری" کو خیرباد کہہ کر اپنے محدود دائرے سے باہر نکلے ہیں تو اکثر انھوں نے ان فرائض کی ادائیگی میں کامیابی کی حدوں کو چھو لیا ہے جو ایک تذکرہ نویس کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"خلفِ حکیم ماشاء اللہ خاں مرحوم عالم و فاضل شاعرِ ریختہ و دری ہندی و فارسی مصنف چند نسخہ مثنویات و دواوین (کذا) و قصائد منقوط و غیر منقوط و رباعیات و مدح و ہجو وغیرہ۔ نیاکانش از بزرگ زادہ ہائے نجف اشرف۔ والدِ ماجدش در ایام ثروت و حشمت امیر الامراء نواب ذوالفقار الدولہ بہادر از ضلع مشرق بہ جمعیتِ دو زنجیر فیل دارد خطۂ پاک دہلی شدہ بود۔ گویند کہ خیلے جوان مرد و پر فتوت بودہ است۔ حکیم انشاء اللہ خاں انشا در فن بے نظیر طبابت مہارت کلی دارد۔ مولدش مرشد آباد لیکن از چند سال در لکھنؤ بہ رفاقتِ شاہزادۂ جم جاہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ محترم و مفتخر است۔ از مشاہیر سخن پردازانِ آن ضلع واقع گشتہ۔ بزورِ طبیعت شعر خود را بپایۂ اعلیٰ رسانیدہ بشہرۂ آفاق گردیدہ۔" (نسخہ لندن صفحہ ۲۱)

شاہ حاتم کے حال میں لکھتے ہیں کہ :-

"شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم المتخلص بہ حاتم درویشے متعبد و مرتاض بود در دہلی سخن خوب می گفت بلکہ اوستاد وقت بودہ است۔ ... ... اول پیشہ سپاہ گری می نمود و در ایام نوکری نواب عمدۃ الملک امیر خاں بہادر شراب و بنگ وغیرہ بہ کثرت می نوشید و در آخر ترک مسکرات و منہیات ساختہ از تعلقات دنیاداری دل بر داشت و ریاضت شبانہ روزی اختیار نمود۔ شاعر فارسی و ہندی و گفتگویش بطور زباندانان سلف حال بود۔ در دیباچۂ دیوان خود اسم جیل و پنج کس شاگردان مندرج کردہ۔ دیوانے کلاں مشتمل بر اقسام کلام و دیوان دیگر خرد کہ دیوان زادہ اش نام نہادہ از و بر صفحہ گیتی یادگار است عجب خلیق و اہل محبت و صاحب دل سراپا شفقت بود کہ در ایں ایام ہیچ او مردے بزرگ و زیرک متصف بہ اقسام کرم و خوبی ہا بہم رسیدن اشکال است، خدا اش مغفرت بخیرہ نیکی کردہ باشد۔" (نسخہ لندن صفحہ ۷۰)

سعادت یار خاں رنگین کا ترجمہ ان تفصیلات پر مشتمل ہے :

"خلف الصدق نواب محکم الدولہ طہماس بیگ خاں رومی اعتضاد جنگ بہادر کہ اول در دار السلطنت لاہور بہ سلک ملازمان خاص نواب عالی جناب معین الملک بہادر عرف میر منو پسر وزیر الممالک اعتماد الدولہ بہادر انتظام داشت بعدہ بہ جمعیت چند سوار بعلاقہ رسالہ داری در سرکار دولت مدار

امیر الامرا نواب نجیب الدولہ بہادر و نواب ذوالفقار الدولہ بہادر بہ ثروت و تمکنت تمام بسر برد۔ خودش نیز بہ عزت تمام و امتیاز مالا کلام بملازم شاہزادہ ہائے عالی اقتدار ماندہ۔ نہایت خوش خلق و یار باش پاکیزہ سیرت خجستہ معاش واقع شدہ۔ ظاہر حالش بہ صلاح آراستہ و باطنش بہ فلاح پیراستہ طبع رنگین دارد و سخن انواع و اقسام از و بنجوبی انصرام یافتہ۔ اشعار ندرت طراز خود را بنظر استاد ان وقت مثل شیخ ظہور الدین حاتم و محمد امان خاں نثار شاگرد رشید حاتم گذرانیدہ و مدام با فضلاء حکماء و سخنوران کاملِ فن صحبت داشتہ۔ چہار دیوان مرتب یکے بقید غزل در غزل و دو می بزبان ہزل و ضحک با قصائد چند کہ بیشتر از گفتگوے نسواں مناسبت دارد، طرح دادہ و دو دیوان از غزلیات طرحی و طبعی و رباعی و مخمسات و قطعات و مستزاد و غیرہ تالیف فرمودہ سوائے ازیں رسالہ نثر کہ بہ مجالس رنگین موسوم است، از طبع او ترادیدہ مناسبت کلی از شاعری و سحر پردازی دارد۔ لہا مغتنم است۔ از چندے دامن حال از تلاشِ معاش و اکثر زاویہ نشیں گوشۂ فقر است و بہ ترک لباس ظاہر دنیا پرداختہ بیادِ ایزد غفار مصروف گشتہ" (نسخہ لندن صفحات ۳۵۳ و ۳۵۲)

ان بیانات کا مقابلہ اگر ان تعارفی جملوں سے کیا جائے جو آتش ناسخ، ذوق اور غالب وغیرہ میں اس سے قبل نقل کئے جا چکے ہیں تو زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا لیکن یہ تفصیلات بھی اس اعتبار سے

ناقص و نامکمل ہیں کہ ان کے مطالعے سے نہ تو ہمیں زیرِ تبصرہ شاعروں کے زمانہ ہائے ولادت و وفات ہی کا علم ہوتا ہے اور نہ دوسرے اہم واقعاتِ زندگی کے سنین متعین کرنے میں کوئی خاص مدد ملتی ہے۔ البتہ خاندانی شرافت و وجاہت، سیرت و اخلاق، علمی مرتبے، سماجی حیثیت اور ادبی کارناموں کے متعلق کچھ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کے مفید اور کارآمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ موخرالذکر ذاتی و صفاتی خصوصیات کو وہ کبھی مختصر الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بھی اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں کہ مزید تفصیل و تشریح کی حاجت باقی نہیں رہتی مثلاً :-

شیخ قلندر بخش جرأت :-

"بیشتر نوشقان را بہ اصلاحِ خود شاگرد رشید گردانیدہ۔ بہرۂ از علم نجوم ہم دارد۔ شاگرد میر جعفر علی حسرت و در حقیقت از استادِ خود فائق است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاحالت تحریرم چو او شاعرِ زبردست و نادرِ سخن از خطہ پاک لکھنؤ برنخاستہ"

(نسخہ لندن صفحات ۱۴۶ تا ۱۴۷)

جعفر علی خاں ذکی :-

"بسیار صاحب حشم و اہلِ حمیت و خلیق و نیک زندگانی، کشادہ پیشانی و ستودہ اطوار حمیدہ کردار بود"

(نسخہ لندن صفحہ ۲۷۰)

اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور :-

"بسیار خلیق و شفیق و اہلِ توفیق و قدرشناس، صاحب مروت نیک اساس، عمدہ معاش، خجستہ قماش است از جودتِ ذہن رسا

وجودت طبع معنی زاد کثرت محاورہ اردوئے معلّی صدہا اشعار چیدہ و منتخب از بر دارد" (نسخہ لندن صفحہ ۴۰۱)

میر عزت اللہ عشق :-

"مرد صالح است ..... جوہر صلاحیت از ناصیۂ حالش پیدا و از آثار نجابت از صفحۂ جمالش ہویدا ....

انسان با مروت و پر حیا دوست یک رنگ و باوفاست - بہ عمر شباب لیاقت و شائستگی مزاج بسیار دارد" (نسخہ لندن صفحہ ۴۹۶)

یہ بیانات تصویر کے ایک ہی رُخ کو نمایاں کرتے ہیں لیکن انھیں تحسینِ بے جا کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ وہ جہاں محاسن اخلاق و شخصیت کے اعتراف کو ایک خوشگوار فریضے کے طور پر انجام دیتے ہیں وہیں سیرت و کردار کی تنقید سے بھی گریز اور پہلوتہی نہیں کرتے۔ شہوت کے بارے میں یہ بیان اس خصوصیت کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"شخصے (است) بد اطوار، بیہودہ کردار، زشت اعمال قبیح خصال، از بسکہ بوئے نخوت بدماغش جا گرفتہ بود اندرز نصائح را خیر باد می گفت و تمسخر و تضحیک را شعار خود گردانیدہ اوقات بہ حرکات لغو و ناشائستہ می گذاشت۔ از پیش گاہ خلافت بہ تمنائے تمام مسخرۃ الدولہ قرم ساق خاں بہادر بھکڑ جنگ خطاب گرفتہ ...... بر خود (می) بالید و خود را در فرقہ ہم اطوار ان خویش معزز (می) انگاشت" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۴۴ الف)

ان کی بالغ نظری اور آزاد خیالی کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جب کہ نظیر اکبر آبادی جیسے شعراء کو ممتاز

فنکاروں کے زمرے میں شامل کرنا اپنے مذاقِ سخن کی رسوائی اور تشہیر کو دعوت دینے کے مترادف تھا، انھوں نے نظیر کی قدر پہچانی، ان کے لئے ان کے حسبِ حیثیت الفاظ استعمال کئے اور ان کے سارے سرمایۂ فکر کو سوقیانہ اور ساقط المعیار قرار نہ دے کر اس کے انتخاب سے تذکرے کے اوراق کو زینت بخشی۔ مندرجہ ذیل جملے اس عظیم عوامی فن کار کی شخصیت کے خط و خال کو بڑی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں۔

"ولی محمد خاں نظیر شخصے است، معلم ساکن مستقر الخلافہ اکبرآباد مشاق قدیم است۔ خط نستعلیق درست می نویسد و طبع رسا دارد، و در آں ضلع کوس اوستادی می زند۔ اکثر نو مشقان و تازہ گویان را اصلاح سخن می فرماید۔ و در اں دربار فرحت آثار در زمرۂ سخن گویانِ حال ہم چو او استادِ قابل و سخن طرازِ کامل تا حال پیدا نشدہ" (نسخہ لندن صفحہ ۵۲۸)

نقد کلام کے نقطۂ نظر سے ذکا کے یہاں کوئی امتیازی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ وہ بالعموم تاثراتی انداز اور مختصر الفاظ میں کلام کی مجموعی فضا کی طرف اشارے کرتے ہوئے اشعار پیش کر دینے کے عادی ہیں۔ اس ضمن میں کہیں کہیں ان کے قلم سے اس قسم کے مکمل جملے بھی نکل جاتے ہیں۔

افسوس :- "از کلام بہجت التیامش بوئے فصاحت بہ شامِ جاں می رسد" (نسخہ لندن صفحہ ۳۴)

خیراتی خاں دل سوز :- "کلامش رتبہ پیدا کردہ و خالی از کیفیت و برجستگی نیست" (نسخہ لندن صفحہ ۲۵۲)

جعفر علی خاں ذکی :- "شورش مطابق روزمرہ آں وقت و گفتگوئے

آں زماں سرانجام می یافت و متانت و فصاحت تام داشت"

(نسخہ لندن صفحہ ۷۰)

سید الشعراء غالب علی خاں نیید :- "غزلیاتِ طویل ....
بہ کمال متانت و خوبی سرانجام می فرماید"

(نسخہ لندن صفحہ ۳۸۹)

ہدایت اللہ خاں ہدایت :- "شعرش مستغنی از تکلف است و خالی
از کیفیت نہ" (نسخہ علی گڑھ ورق ۲۰۳)

شاہ گھسیٹا عشق :- "کلامش از تصوف آمیز و نہایت درد آگیں و
تصیح و بلیغ است" (نسخہ لندن صفحہ ۴۰۴)

حکیم قدرت اللہ قاسم :- "سر رشتہ متانتِ کلام از دست نمی دہد
و تلاشے کامل بہ کار می برد"

(نسخہ لندن صفحہ ۶۱۴)

اس روش کے برخلاف بعض اوقات ذکا نے مجموعی تاثرات کے مختصر بیان پر اکتفا نہ کرتے ہوئے کسی قدر واضح الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے اور شعرا کے انفرادی رنگ اور امتیازی کارناموں کی نشاندہی پر مناسب توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کے یہ فرمودات تنقید کا نسبتاً بہتر معیار پیش کرتے ہیں مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

میاں حاجی تجلی :-

"فکرِ شعر بطرزِ میر می کند، مثنوی لیلیٰ مجنوں بسیار خوب گفتہ
و تلاش نمایاں بکار بردہ .... اشعارے کہ از فکرِ بلندش
تراویدہ، ازاں بوئے اوستادی می آید و ناخن بدل است"

(نسخہ لندن صفحہ ۱۱۸)

قلندر بخش جرأت :-

"شورش بسیار برجستہ در مضمون، طور ادائے کلام روزمرہ و محاورہ اُرد و بخوبی و صفائی تمام جلوۂ نمایش می پذیرد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شورش رتبہ پیدا کردہ" (نسخہ لندن صفحہ ۱۴۷)

مرزا رفیع سودا :-

"سخنش از پایۂ گذشتہ ۔ ۔ ۔ ۔ زبان ریختہ را آب و تاب دادہ و محاورۂ اردوئے معلّی را خوب رونق بخشیدہ بلکہ بمنزلہ فارسی رسانیدہ خصوصاً در ہجو و قصیدہ گوئی ید طولیٰ داشت" (نسخہ لندن صفحہ ۳۷۵)

مرزا عظیم بیگ عظیم دہلوی :-

"در قصاید گوئی ۔ ۔ ۔ ۔ وحید العصر و یگانۂ دوراں بودہ است در خیال بندی معنی بے نظیر بود ۔ کلامش فصاحت وجودت از در صفحۂ روزگار ناپائیدار ثبت افتادہ ۔ فی الحقیقت شاعری کردہ بل ساحری نمودہ" (نسخہ لندن صفحات ۴۸۵ و ۴۸۶)

مصحفی امروہوی :-

"قصائد چند بہ کمال خوبی و متانتِ کلام ۔ ۔ ۔ ۔ از و سرانجام یافتہ ۔ ۔ ۔ ۔ تصانیف بسیار دارد با ایں ہمہ، صحتِ محاورہ و استخوان بندی الفاظ کما حقہ دراں یافتہ می شود ۔ از کلامش بوئے متانت بہ مشامِ جاں می رسد و ہوائے سخنش بے اختیار دامنِ دل می کشد" (نسخہ لندن صفحہ ۴۹۰)

ہرچند کہ اس قسم کی تنقیدیں "اس تذکرے میں" "النادر کالمعدوم" کے حکم میں داخل ہیں اور نقد و نظر کے اس معیار تک نہیں پہنچتیں جو مصحفی اس سے قبل "تذکرۂ ہندی" میں پیش کر چکے ہیں، پھر بھی انھیں دائرۂ تنقید سے خارج کر دینا اور تنقید کو معشوق کی موہوم کمر یا اقلیدس کے فرضی نقطے سے تعبیر کرنے کی طرح بعید از انصاف ہوگا اس لیے اشپرنگر کے اس اعتراض سے کہ "اس تذکرے میں تنقید کا نام نہیں"[1]۔ پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

اشپرنگر کا دوسرا اعتراض ان مکررات و اغلاط سے متعلق ہے جن کو انھوں نے مولف کی بے احتیاطی کے نتائج سے تعبیر کیا ہے[2]۔ یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے باوجود کہ اس دور کے محدود ذرائع و وسائل کے پیش نظر ایک ایسی ضخیم و جامع کتاب میں بعض نقائص اور خامیوں کا باقی رہ جانا لازمی اور بدیہی امر تھا، اس کی وقعت و واقعیت میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ کہیں کہیں غلطیاں اس قدر صریح اور واضح ہیں کہ ادنیٰ غور و فکر اور تحقیق و تلاش کے بعد انھیں دور کر دینا زیادہ دشوار نہ تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حالات کے اعادہ و تکرار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نسخہ لندن صفحہ ۱۰۰ پر کاظم حسین بیقرار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

"میر کاظم حسین بیقرار ساکن دہلی ہمشیرہ زادہ نواب سیف الدولہ سید رضی خان بہادر صلابت جنگ سلمہٗ۔ انسان بامروت و سعادت مند و خوش خواست کلام خود را بہ گوش معنی نیوش

[1]، [2] بحوالہ "یادگار شعرا" صفحہ ۲ و خطبات بنگالہ غنان دتاسی (خطبہ پنجم) صفحہ ۱۱

سخن سنجِ بے نظیر محمد نصیر الدین نصیر گذرانیدہ سخنش بر جستگی دارد۔"

صفحہ ۱۰۹ ایر: دبارہ انھیں بیقرار کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے۔

"مرزا کاظم حسین بیقرار شاگرد رشید میاں نصیر خلف نواب قلندر علی خاں، نخیلے صاحبِ طبع و خوش فکرد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ذہین و جوان خوش خلق، مرد بت اساس دُوردنشاس است۔ در صلاح چندروزہ بہ برکتِ فیضِ اوستاد سخن را بجائے رسانیدہ خداامش خوش دارد۔"

اس تکرار کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مزید براں ایک ہی شخص کو ایک جگہ میر اور دوسری جگہ مرزا لکھنا بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ اس سے رشتۂ ہم وطنی کے علاوہ قریبی تعلق بھی ہو تعجب خیز ہے۔ ذکا اور بیقرار دونوں ہی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اس لئے ایک کا دوسرے سے واقف ہونا خلافِ قیاس ہے۔ چونکہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" اور دیباچۂ دیوان ذوق میں ہر جگہ بیقرار کو میر کاظم حسین کے نام سے یاد کیا ہے اس لئے اس سلسلہ میں ذکا کا پہلا بیان قابلِ ترجیح قرار پاتا ہے۔

متذکرہ بالا نسخہ لندن ہی میں حزیں تخلص کے تحت بہ تفصیلِ ذیل دو شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔

(الف) شیخ محمد علی حزیں از نصیریانِ مرزا جانجاناں مظہر، بسیار سیر مشق و مناسبت کلی از شعر و سخن داشت و ہمت بہ تلاشِ کامل می گماشت دیوانِ مختصرش بہ ایں احقر سراپا تقصیر ہم رسید ازاں اشعار انتخابی برآوردہ بہ سلک تحریر منسلک

گرداںید" (صفحہ ۱۹۹)

(ب) "میر باقر حزیں شاعر خوش کلام، صاف گو نسبت تلمذ بہ یکے از سخن پردازانِ لکھنؤ دارد۔ کلام برجستہ و مربوط می گوید"

(صفحہ ۲۲۶)

محمد علی مشہور فارسی ادیب و شاعر حزیں اصفہانی کا نام ہے جو نہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے اور نہ اردو کے شاعر۔ ذکا نے جس دیوانِ مختصر کو ان سے منسوب کیا ہے وہ در اصل موخر الذکر شاعر میر محمد باقر حزیں کے کلام کا مجموعہ ہے جو دہلی کے باشندے اور مرزا جانجاناں کے شاگرد تھے۔ چونکہ مرزا صاحب موصوف کے علاوہ کسی دوسرے استاد سے ان کے اکتسابِ فیض کے متعلق کوئی روایت موجود نہیں اس لئے ذکا کا یہ قول بھی کہ "نسبت تلمذ بہ یکے از سخن پردازانِ لکھنؤ دارد" خلافِ واقعہ قرار پاتا ہے۔ علی گڑھ کے نسخہ میں ان دو مقامات کے علاوہ تیسری جگہ بھی ایک مجہول الاحوال شاعر کی حیثیت سے انھیں حزیں کا تعارف ان الفاظ میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

"حزیں تخلص شاگردِ مرزا مظہر۔ شاعرے در عہد سلطنت فردوس آرام گاہ بود۔ اکثر بہ تصنیفِ کلام دلآویز متوجہ می شد"

(ورق ۶۵ ب)

تکرار در تکرار سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں جو اشعار نمونہ کلام کے طور پر نقل کئے گئے ہیں وہی اس سے قبل محمد علی حزیں کے نام سے پیش کئے جا چکے ہیں۔

تذکرہ "طبقات سخن" کے مولف غلام محی الدین مبتلا میرٹھی کے حالات بھی

چند صفحات کے فرق سے دو جگہ لکھے گئے ہیں اور دونوں خاکے ظاہری و معنوی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور مماثل ہیں کہ بیک نظر تکرار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

(الف) "غلام محی الدین مبتلا، ساکن میرٹھ و از شعرائے قدیم است۔ اکثر اشعارش کہ بہ سمع رسیدہ، جوہر استعداد باطنی ان بمراءت ضمیر نیاز پذیر عکس انداز گشت۔ اگرچہ این نحیف بہرۂ از فیض ملاقات فرحت سمانش نہ برداشتہ و ہنوز مشتاق است الا این افراد از تصنیفش بہم رسانیدہ۔"
(صفحہ ۴۰، ۷۶ و ۱۴۱)

(ب) شیخ غلام محی الدین مبتلا، عشق ہم تخلص می کند او ساکن میرٹھ خیلے مستعد و فاضل و شاعر فارسی و ہندی و مصنف مثنوی ہا و تذکرۂ ہندی از عہد محمد شاہ بادشاہ تا سنہ احد جلوس اکبر بادشاہ غازی و از ترتیب یافتہ و بنظر احقر ہم گذشتہ۔ بہر حال در قصیدہ میرٹھ از مغتنمات است۔" (صفحہ ۹۸)

ذرا بدایونی کے معاملے میں بھی ذکا نے اسی قسم کی تکرار کا ارتکاب کیا ہے۔ پہلی مرتبہ ان کو اس طرح متعارف کرایا گیا ہے۔

"شیخ محمد ظہور اللہ خاں ذرا شخصے است طالب علم در بلدہ لکھنؤ شاگرد محمد بقا خاں بقا اکبر آبادی از حضور فیض گنجور حرمشید زادۂ آفاق مرزا جہاندار شاہ بہادر مغفور مبرا خوش فکر۔ خاں خطاب داشت یعنی قصاید و ہم غزلیات بہ کمال متانت و جودت طبع از دسر انجام یافتہ۔ فی الجملہ تلاشے دارد۔" (صفحہ ۵۳۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"ظہور اللہ خاں نوا شاعرِ شیریں (بیان) فصیح زبان است"

(صفحہ ۹۴۸)

شیخ شرف الدین الہام اور شاہ شرف الدین ملکوں، خداوردی خاں بیتاب اور خداوردی خاں ظریف، اسد علی خاں تمنا اور میر اسد علی تمنا دکنی، میر صادق علی صادق اور میر صادق علی خاں صادق، میر عبدالواسع عزلت اور سید عبدالولی عزلت کے تراجم بھی ظاہری اختلاف اور باطنی وحدت کی ایسی ہی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

بعض جگہ دو مختلف شاعروں کے حالات کچھ اس طرح آپس میں خلط ملط ہیں کہ ایک عام قاری کے لئے ان کے درمیان فرق کرنا دشوار ہے۔ یہ صورتِ حال نسبتاً کم پیش آئی ہے، اس لئے صرف دو مثالیں جو زیادہ اہم اور نمایاں ہیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

محمد روشن جوشش اور محمد عابد دل عظیم آباد کے دو مشہور شاعر ہیں۔ یہ دونوں حقیقی بھائی اور راجہ ناگرمل کے نومسلم بیٹے تھے[1]۔ ذکا نے انکے بارے میں ایک ہی تخلص جوشش کے تحت درج ذیل معلومات فراہم کی ہیں

(الف) "محمد روشن جوشش تخلصے بہ ضلع لکھنوست از مشاہیر سخنوران آں ضلع واقع شدہ و دریں فن عمرے صرف نمودہ جوشش طبعش از کلامش روشن۔

دل میں ہے اب قرب میں آئینہ ساں پیدا کردں
وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اسے دیکھا کروں

[1] سفر نامہ (مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) ورق ۸۳ الف

چوں آئینہ پہ ستم رسیدہ رہتا ہے مدام آب دیدہ"

(صفحہ ۱۶۳)

(ب) "محمد عابد جوشش ساکن عظیم آباد است۔ از خوش گویان آں ضلع واقع شدہ۔ عاصی نگار را اتفاق ملاقات منعقد نہ گشتہ مگر ازیں مطلع طبعزادش واقفیت دارد۔

تمھارے در پہ جو درباں نے آستیں جھاڑی
برنگِ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

(صفحہ ۱۶۴ و ۱۶۵)

پہلے اقتباس میں نام اور تخلص کی حد تک کوئی غلطی نہیں لیکن لکھنؤ سے شاعر کی نسبت اور وہاں قیام کی بات صریحاً خلاف واقعہ ہے۔ دوسرے اقتباس میں نام صحیح اور تخلص غلط ہے۔ یہاں جوشش کے بجائے دل ہونا چاہیے۔ محمد علی حشمت اور محتشم علی خاں حشمت کے حالات بھی اسی قسم کی بعض اغلاط سے معمور ہیں۔ دونوں کے تراجم کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

(الف) "میر محمد علی خاں حشمت از کہنہ مشقان بودہ است مگر دیوانش مروج نیست۔ عابد یار خاں و مراد علی خاں برادران وے بہ علاقہ خدمات جواہر خانہ حضور حضرت فردوس آرام گاہ نور اللہ برہانہ منسلک بودند مرد عمدہ روزگار صاحب مروت زردار بود۔ بہ تلاش خطیر دو ابیات وے بہم رسانیدہ بریں قرطاس ثبت می گرداند۔ میر عبدالحئی تاباں اشعار خود بہ نظر ہمیں استادمی گزرانید چنانچہ صیتِ سخنش شہرۂ عام است!!

خط نے ترا حسن سب گنوایا یہ سبز قدم کہاں سے آیا

نکہتِ گل نے ستایا کسے زندان کے بیچ
پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

(صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷)

(ب) "میر محتشم علی خاں حشمت ساکن شاہ جہاں آباد داصل وے بدخشاں مرد عمدہ روزگار خوش کردار عمدہ معاش نیک تلاش بود۔ شعر فارسی و ہندی بہ متانت و فصاحت تمام می گفت مگر بہ نسبت ریختہ مزاجِ او بہ طرفِ فارسی گوئی بسیار رغبت داشت۔ سخن میر عبدالحئی تاباں و دیگر شاگردان را بہ اصلاح خود رونق بخشیدہ۔ مرد قابل بود، سخن خوب سرانجام می دارد۔

خط نے ترا حسن سب گنوایا
یہ سبزہ قدم کہاں سے آیا

بہار آئی دوانے کی خبر لو
اگر زنجیر کرنا ہے تو کر لو

ہم نے نجف میں جا کے کیا خوش مقام ہے
کعبہ کو دور ہی سے ہمارا سلام ہے

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنوں ز خود رفتہ مگر راہ پر آوے

(صفحہ ۱۱۱)

عبدالحئی تاباں محمد علی حشمت کے شاگرد تھے۔[1] ذکا نے انھیں محتشم علی خاں کے زمرۂ تلامذہ میں بھی شامل کر دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ ان دونوں شاعروں کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کر سکے۔ اس غیر شعوری التباس کا دوسرا ثبوت پہلا شعر ہے جو دونوں کے کلام میں مشترک ہے اور در حقیقت اول الذکر حشمت کے سرمایۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ آخری دو اشعار جنھیں محتشم علی خاں سے منسوب کیا گیا ہے۔ میر صاحب کے نتائج فکر ہیں اور ان کے کلیات اور اس کے اکثر انتخابات شامل ہیں۔

انشا کا یہ مطلع بھی جسے ذکا نے شاہ عالم آفتاب کے انتخاب کلام میں نقل کیا ہے انتساب کی غلطی کی ایسی ہی ایک مثال پیش کرتا ہے۔

چھیڑنے کا تو مزا جب ہے کہو اور سنو
بات میں ہم سے خفا ہو گئے لو اور سنو (صفحہ ۹)

یہ مطلع مکمل غزل کے ساتھ انشا کے دیوان میں موجود ہے۔[2] اس لئے اسے ان کی ملکیت قرار نہ دے کر شاہ عالم آفتاب سے منسوب کرنا درست نہیں خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ کسی مستند ماخذ سے اس کی تائید بھی نہیں ہوتی

---

[1] ایک غزل کے مقطع میں تاباں نے اس طرح اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہو ؎

نہ مانے جو کوئی حشمت کو تاباں وہ دشمن ہے محمد اور علی کا

مثنوی "در مدح استاد خود" کے یہ اشعار اس مسئلے میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں:-

کسی کو کہاں اس سے ہے برتری ؛ کہ ہے نام اس کا محمد علی
تخلص بھی حشمت ہے اس کا بجا ؛ وہ اہل سخن بیچ ہے بادشا

(دیوان تاباں مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۲۶۰)

[2] کلام انشا مرتبہ مرزا محمد عسکری ص ۱۷۳۔

اس کے برخلاف درج ذیل رباعی جو آثمؔ کے نام نقل کی گئی ہے۔ اصل میں میر عبدالحئی تاباںؔ کی تصنیف ہے۔ رباعی۔

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی
نت شیخ و برہمن سے ہے پھٹکی پھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے کافر
یہ دختر رز ہے جس سے اٹکی اٹکی[1]

(صفحہ ۲۱)

میر صاحب نے نکات الشعرا (طبع ثانی ص ۹۴) میں مرزا مظہر فطرت کے نمونہ کلام کے تحت یہ شعر درج کیا ہے۔

از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

ذکاؔ نے اس شعر کو بہ ادنیٰ تغیر اولاً خان آرزو سے اور اس کے بعد فطرت سے منسوب کیا ہے۔ ہمارے خیال میں انتساب اول اس بنیاد پر غلط ہے کہ اگر یہ مطلع فی الواقع خان آرزو کی تصنیف ہوتا تو میر اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہوئے محض شہرتِ عام کی بنا پر اسے فطرت سے ہرگز منسوب نہ کرتے۔ "نکات الشعرا" (ص ۱۳۶) میں حسنؔ شاگرد سوداؔ کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

قاتل اگر کہے کہ سسکتا ہی چھوڑ دیو
خنجر تو ایک دم کے لئے منہ نہ موڑ دیو

---

[1] دیوان تاباں شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ہند (ص ۲۰۵) میں اس رباعی کا دوسرا مصرعہ بایں الفاظ درج ہے ع "زاہد عابد سے دُور بھٹکی بھٹکی"

ذکا نے شاعر مذکور کو میر حسن صاحب سحر البیان خیال کرتے ہوئے یہ مطلع ان کے کلام میں درج کر دیا ہے اور انھیں مرزا سودا، میر ضیا اور میر سوز کا شاگرد بتایا ہے[1]۔ لیکن میر حسن کے سودا یا سوز سے مشورہ سخن کی کوئی مستند شہادت موجود نہیں۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں صرف میر ضیا دہلوی سے اکتساب فیض کا اعتراف کیا ہے[2]۔ اس کے علاوہ اس تذکرے میں زیر بحث مطلع بھی میر ابو الحسن وحشت سے منسوب ہے[3]۔ ان حالات میں حسن شاگرد سودا کو میر حسن سے ممیز کرنے کے لئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

درج ذیل شعر عیار الشعراء کے نسخہ علی گڈھ میں شرف الدین علی خاں پیام کے کلام میں نقل ہوا ہے لیکن معتبر روایات کے بموجب احسن اللہ احسن کی تصنیف ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

اشعار ذیل اس تذکرے میں اولاً "قدرت اللہ قدرت" سے اور اس کے بعد شاہ واقف سے منسوب کئے گئے ہیں۔

ہوا ہے عشق سے آکر مقابلہ دل کا
بھڑا پہاڑ سے جا، بل بے حوصلہ دل کا

سر شک و آہ ہے، شورِ جنوں ہے وحشت ہے
عجب شکوہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

---

[1] "اشعارِ خود منظرِ اکسیر اثر مرزا محمد رفیع سودا و میر ضیاء الدین ضیا و محمد میر سوز گزرانیدہ" (نسخہ لندن ص ۱۹۴)

[2] "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی صفحہ ۹۵

[3] "تذکرہ شعرائے اردو" طبع ثانی صفحہ ۱۰۶

کہاں ہے شیشۂ مے، محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

قدرت اللہ شوقؔ نے ان اشعار میں سے دوسرے اور تیسرے شعر کو مراد علی حیرتؔ مرادآبادی کے نام سے نقل کیا ہے اور انھیں یہ اشعار منجملہ دوسرے کلام کے خود حیرتؔ ہی سے حاصل ہوئے تھے جیسا کہ ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

"چند غزلیاتِ متفرقاتِ ازراہِ مہربانی از دستِ خاص بایں راقم حروف نوشتہ دادہ بود، انتخاب نمودہ نوشتہ می شود۔"[1]

دوسرا شعر مصحفیؔ کے یہاں بھی حیرتؔ ہی کے کلام میں درج ہے۔[2] اور تیسرے شعر کی ملکیت کے سلسلے میں قائمؔ چاندپوری،[3] میر حسنؔ[4] اور عشقیؔ کے تذکروں سے شوقؔ کے انتساب کی تائید ہوتی ہے۔

بے احتیاطی کی ان مثالوں کے علاوہ اس تذکرے میں جزوی و ثانوی نوعیت کی ایسی متعدد غلطیاں بھی موجود ہیں جو مولف کے نقصِ معلومات کی غمازی کرتی ہیں لیکن ان کے کام کی وسعت اور دقت طلبی کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس تذکرے کی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے ان لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ وصف کچھ کم نہیں کہ اس کے ذریعے

۱۔ "طبقات الشعرا" نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ورق ۱۰۶ ب

۲۔ "تذکرہ ہندی" صفحہ ۸۰

۳۔ "مخزنِ نکات" نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن

۴۔ "تذکرہ شعرائے اُردو" طبع ثانی صفحہ ۴۹

۵۔ "دو تذکرے" (تذکرہ عشقیؔ) جلد اول مرتبہ کلیم الدین احمد صفحہ ۲۴۰

پہلی بار بہت سے ایسے شاعروں کو منظر عام پر آنے کا موقع ملا ہے جنھیں پچھلے تذکرہ نگار نظر انداز کر چکے تھے۔ ان نئے شاعروں کی فہرست میں غیر مسلم فن کاروں کے نام بھی دوسرے تذکروں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں۔ اس اعتبار سے "عیار الشعراء" اردو زبان و ادب کے جمہوری کردار کی وضاحت کے نقطۂ نظر سے دوہری اہمیت کا حامل ہے۔

عمدۂ منتخبہ

"عمدۂ منتخبہ" شعرائے اردو کے ان تذکروں میں شامل ہے جو دوسرے متعدد تذکروں کے مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک میں اس تذکرے کا صرف ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ذخیرۂ مخطوطات سے انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانے میں منتقل ہوا ہے[1] اس کے علاوہ ایک نسخہ پیرس کے قومی کتبخانے میں اور ایک انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے موخرالذکر مخطوطے کی بنیاد پر اس تذکرے کو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے شائع کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایڈیشن چونکہ دوسرے دستیاب نسخوں سے مقابلے کی اہمیت کو یکسر نظرانداز کر کے مرتب کیا گیا ہے، اس لئے ترتیب و تحقیق متن کے موجودہ معیار پر پورا انہیں اترتا۔

شیفتہ کے قول کے مطابق تذکرے کے مولف نواب اعظم الدولہ

---

[1] یہ نسخہ مولف کا اصل مسودہ ہے جس کی کتابت ۱۲۲۳ھ میں پایۂ اختتام کو پہنچی ہے۔ زمانہ مابعد کے اضافے اس کے حاشیوں پر درج ہیں۔ متن میں بھی بعض جگہ لفظی ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔ بعض اشعار یکسر قلم زد کر دئے گئے ہیں اور بعض جگہ ان کے بجائے دوسرے شعر لکھے گئے ہیں۔ موخرالذکر دونوں نسخے اسی سے منقول ہیں۔

میر محمد خاں سرور (متوفی شوال ۱۲۵۰ھ / فروری ۱۸۳۵ء) "اعاظم امرائے عالی نہاد" اور "اجلۂ اراکینِ جہاں آباد" میں سے تھے لیکن شعر و سخن سے انھیں بے حد دلچسپی تھی اور شاعری کی محفلوں میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ شعر و ادب سے یہی تعلقِ خاطر شعرائے معاصرین و متقدمین کا تذکرہ مرتب کرنے کا محرک ہوا جس کے نتیجے میں "عمدۂ منتخبہ" عالمِ وجود میں آیا۔ اس تذکرے میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ڈیڑھ ہزار کے قریب شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مولف کا مطمحِ نظر جامعیت ہے۔ اس لئے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اختصار و تفصیل کا خیال کئے بغیر زیادہ سے زیادہ شاعروں کا حال اور کلام درج کر دیا جائے۔

"عمدۂ منتخبہ" تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۱۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام سید الشعرا سید غالب علی خاں سید کا تجویز کردہ ہے جیسا کہ ان کے طبع زاد قطعۂ تاریخ کے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

عمدۂ اہلِ سخن، میر محمد خاں وہ | اعظم الدولہ سرورِ سرورِ خیلِ امرا
تذکرہ ریختہ گویوں کا بطرزِ عمدہ | منتخب کر کے کلامِ شعرا اس نے لکھا
اور تاریخ کا اس منتخبِ عمدہ کی | حکم اس منتخبِ عمدۂ دوراں نے کیا
"عمدۂ منتخبہ" اس کی دی سید نے | لکھی تاریخ وہی نام بھی اس کا رکھا

اس تاریخی نام اور منقولہ اشعار کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۱۶ھ / ۲-۱۸۰۱ء میں یا اس سے کچھ پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ نظام الدین خاں ممنون کے مصرعے "یہ ہے معیارِ نقدِ سخن" اور تمنا اللہ خاں فراقی کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "سفینۂ اعظم" سے بھی ہجو علی الترتیب

۱۲۱۵ھ اور ۱۲۱۶ھ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس خیال کی تائید ہوتی ہو ممنونؔ کے اشعار سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے "تذکرے" کے مطالعے کے بعد تاریخ کہی تھی۔ لکھتے ہیں کہ۔

رہے اعظم الدولہ نکتہ سنج — کہ ہر نکتہ اس کا ہے درِ عدن
لکھا زور ہو اس نے یک تذکرہ — کہ باہم ہو تمیّزِ اربابِ فن
جو تاریخ پوچھی تو ممنونؔ نے — کہا "یہ ہے معیارِ نقدِ سخن"

لیکن سرورؔ کے بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ متن میں ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ ابتدائی ترتیب کے اس زمانے سے کئی سال بعد تک جاری رہا ہے۔ مثلاً محرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالبؔ کے حالات اس جملے پر ختم ہوتے ہیں کہ "در سنہ یکہزار دو صد و ہژدہ ہجری (۱۲۱۸ھ) بہ آزار ... ... در گذشت" (صفحہ ۴۴۶) میر ہدایت علی کیفیؔ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انھوں نے ۱۲۱۹ھ میں وفات پائی (ص ۵۳۴) ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ کا سالِ وفات بھی ۱۲۱۹ھ ہی بتایا گیا ہو (ص ۸۱۲) سنہ مذکور کا تیسرا حوالہ "مجموعۂ نغز" کے مولف حکیم قدرت اللہ قاسمؔ کے متعلق مندرجہ ذیل جملے میں ملتا ہے کہ

"درینولا کہ ۱۲۱۹ھ است بہ سبب مطالعہ ایں مجموعہ خود ہم ذوقِ تالیف نمودن تذکرہ پیدا کردہ چنانچہ از مولفِ مسودہ را گرفتہ۔ انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است"

(ص ۵۱۱)

ان داخلی شواہد کے علاوہ سیف الدولہ سید رضی خاں بہادر رضیؔ اور بھولا ناتھ عاشقؔ کی تاریخوں سے، ۱۲۱۷ھ میں، قلندر بخش آفریں کی تاریخ

"مفتاح بوستان نعیم" سے ۱۲۱۰ھ میں اور عبدالرحمن خاں احسان کے مصرعے "سرور دلی شاعرانِ زماں" سے ۱۲۲۰ھ میں ترتیب و تکمیل کا پتہ چلتا ہے۔ مرتب تذکرہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے نزدیک اس سلسلے کی آخری شہادت خاتمہ کی درج ذیل عبارت ہے۔ جو "عمدۂ منتخبہ" کے مذکورہ بالا تینوں نسخوں میں مشترک ہے۔

"الحمد للہ کہ بہ فضل ایزد متعال ایں نسخہ بتاریخ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ھ موافق سنہ (سویم) جلوس مبارک ... حضرت محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ، صورتِ اختتام پذیرفت"

(ص ۸۲۴ : ۸۲۵)

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں "اسے اتمام تذکرہ کی تاریخ سمجھنا چاہیے" (مقدمہ ص ۱۵) ان ہی امور کے پیش نظر اس سلسلے میں آخری فیصلہ دیتے ہوئے آپ نے ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) یا ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) کو آغازِ تالیف اور ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) کو اختتام تذکرہ کی تاریخ قرار دیا ہے (ص ۱۸ مقدمہ) لیکن خواجہ صاحب کا یہ فیصلہ درست نہیں کیونکہ تذکرے کے اسی نسخے میں میر فرزند علی موزوں کے ذکر میں نہایت واضح طور پر اس کے بعد کے ایک سنہ کا حوالہ موجود ہے لکھتے ہیں کہ:-

"در (ینولا کہ) سنہ یک ہزار و دو صد و بست و نہ ہجری است ... بدار البقا رحلت نمود" (ص ۶۵۲)

تذکرے میں ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) کے بعد کا کوئی سنہ وضاحت کے ساتھ مذکور نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اضافہ و ترمیم

کا آخری سال ہے۔ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی کئی سال تک جاری رہا ہے سطور ذیل میں پیش کردہ تفصیلات اس دعوے کی تائید کے لئے ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

سرور اپنے مجموعہ مثنویات "سبعہ سیارہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:-

"چوں دریں ایام از تدوینِ طبع زاد خود و تالیف تذکرہ ریختہ گویان فراغ حاصل شد۔ چناں بہ خاطر فاتر خطور کردہ کہ اگر ہفت حکایات منظومہ در مجلد مختلف ...... موزوں نموند یادگار رے خواہد ماند"[1]

ذوق کی کہی ہوئی تاریخ "دریائے اعظم" کی رو سے اس مجموعے کا سالِ تصنیف ۱۲۲۶ھ قرار پاتا ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں "دریں ایام" کا التزام اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ سرور اسی زمانے میں تذکرے کی تالیف سے فارغ ہوئے ہوں گے۔

ردیف الف کے تحت سب سے آخر میں اسد تخلص کے ساتھ مرزا غالب کا ذکر آتا ہے۔ سرور نے انھیں "جوانِ قابل دیار باش و دردمند" کہہ کر یاد کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ" (ص ۱۹۶) مرزا کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ہے[2]۔ اور اس عبارت کی تحریر کے وقت ان کی عمر کم سے کم بائیس تیئس سال کی ضرور رہی ہوگی۔ اس بنا پر یہ قیاس کرنا غلط نہ

---

[1] بہ حوالہ "ہماری زبان" شمارہ یکم نومبر ۱۹۶۰ء

[2] یادگار غالب از مولانا حالی۔ ص ۹

ہوگا کہ ان کا حال ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کے قریب داخلِ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ یہ اضافہ اس سے بھی بعد کے زمانے سے متعلق ہو۔

حکیم مومن خاں مومن مرزا غالب سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے۔ محققین نے خود ان ہی کے بعض بیانات اور دوسری مختلف شہادتوں کی روشنی میں ان کا سالِ ولادت ۱۲۱۵ھ (۱-۱۸۰۰ء) متعین کیا ہے[1]۔ سرور چونکہ اس تذکرے میں انھیں نوجوان شعرا کے زمرے میں شمار کرتے ہیں اس لئے بعید از امکان نہیں کہ ان کا حال بھی ۱۲۳۶ھ کے قریب ہی لکھا گیا ہو۔ یہ بات بہر صورت طے شدہ ہے کہ یہ اضافہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء کے بعد کیا گیا ہے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف کے کلام میں دیوانِ غزلیات سے منقول اشعار کے علاوہ "تسبیح زمرد"[2] کے سو مطلعے بھی شامل ہیں۔ (ص ۶۹۲ تا ۷۰۰) ذوق کے مصرعۂ تاریخی "طرفہ تسبیح زمرد آورد"[3] سے اس مجموعے کا سالِ تصنیف ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا معروف کا حال یا کم از کم یہ اشعار اس سنہ کے بعد ہی اضافہ کئے گئے ہوں گے۔

شیخ پیر بخش سرور کا کوروی کی نسبت سرور کا بیان ہے کہ۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مومن ۔۔۔۔۔ حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر" از کلب علی خاں فائق رام پوری۔ ص ۱۰، ۱۱ و ۱۲

[2] یہ مجموعہ سو مطلعوں پر مشتمل ہے اور ہر مطلع میں کسی نہ کسی عنوان سے سبزی کا مضمون باندھا گیا ہے نام کے انتخاب میں یہی رعایت ملحوظ رہی ہے۔

[3] دیوانِ ذوق۔ مرتبہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد۔ ص ۲۴۷

"در سنہ بست و سہ جلوس قبلہ عالم .... مرزا محمد اکبر شاہ غازی ..... ہنگام مراجعت مرشد زادۂ عالمیان مرتبہ ملازمی حاصل نمودہ" (ص ۶۶۰)

اکبر شاہ ثانی ۷ر رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸ر نومبر ۱۸۰۶ء کو شاہ عالم ثانی کے انتقال کے بعد اسی مہینے میں مسند نشین سلطنت ہوئے تھے[۱]۔ اس حساب سے ان کے جلوس کا تیئیسواں سال رمضان المبارک ۱۲۴۴ھ/ مارچ ۱۸۲۹ء میں شروع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سرور کا حال ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء کے بعد ہی لکھا گیا ہوگا۔

ان داخلی شہادتوں کی مدد سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگرچہ "عمدۂ منتخبہ" کا نقشِ اول ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء کے قریب تیار ہو چکا تھا لیکن کم سے کم ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء تک اس کے متن میں وقتاً فوقتاً ضروری ترمیمیں اور اضافے کئے جاتے رہے ہیں۔

اس تذکرے کی ترتیب میں سرور نے میر حسنؔ کے "تذکرۂ شعرائے اردو" اور مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" سے کافی استفادہ کیا ہے جس کا وہ جا بجا اعتراف بھی کرتے رہے ہیں۔ بعض بیانات اور غلطیوں کے اشتراک سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خوب چند ذکا کے "تذکرۂ عیار الشعرا" سے بھی خاصی مدد لی گئی ہے بلکہ اگر مشہور مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر کے الفاظ میں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "عمدۂ منتخبہ" "عیار الشعراء" کا ایک حد تک ترقی یافتہ

---

[۱] "مطلع العلوم و مجمع الفنون" دفتر اول (اردو ترجمہ از منشی زین العابدین خاں مراد آبادی)، ص۔ ۱۲۱

ایڈیشن ہے[1]۔ اس کے علاوہ میر تقی میر[2]، قدرت اللہ قدرت رام پوری[3]،
غلام محی الدین مبتلا میرٹھی[4]، اور مرزا علی لطف[5] کے تذکروں سے بھی مولف
نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان سے بھی حسب ضرورت
استفادہ کیا گیا ہو۔ دتاسی کا خیال ہے کہ "یہ تذکرہ قاسم کے تذکرے
کے بعد کا ہے اگرچہ سال تالیف وہی ہے مگر شیفتہ کے تذکرے سے
پہلے لکھا گیا ہے اور شیفتہ نے اس سے اسی طرح استفادہ کیا ہے جس
طرح سرور نے قاسم کے تذکرے سے[6]"۔ تذکرۂ قاسم کے بارے میں سرور کا
بیان جو تعین زمانہ کی بحث کے ضمن میں گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے۔
"مجموعۂ نغز" کی اولیت اور "عمدۂ منتخبہ" پر اس کے اثرات کے متعلق
فاضل مستشرق کے اس دعوے کی نفی کرتا ہے۔ البتہ شیفتہ کے اکتساب فیض
کے بارے میں ان کی رائے بالکل صحیح ہے۔ "گلشن بے خار" کے تراجم
صاف طور پر "عمدۂ منتخبہ" کے قائم کردہ خطوط کی پیروی کا پتہ دیتے ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے سرور نے اس تذکرے کی انجمن
میں زیادہ سے زیادہ شاعروں کے شریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ ان کے یہاں ممتاز، غیر ممتاز اور معروف و غیر معروف کی کوئی

---

[1] فہرست کتب خانہ شاہان اودھ ص ۱۸۶

[2] ترجمہ میر۔ ص ۵۵۴

[3] ذکر قدرت۔ ص ۵۱۷

[4] ذکر مبتلا بہ تخلص عشق۔ ص ۴۳۲

[5] ذکر لطف۔ ص ۵۵۰

[6] گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص ۶۷

تخصیص نہیں اور نہ حالات کی کمیابی کی وجہ سے کسی شاعر کو نظر انداز کیا گیا ہو
حتیٰ کہ بہت سے ایسے شعرا بھی اس بزم میں جلوہ افروز ہیں جن کے متعلق
صاحبِ بزم کا علم صرف تخلص سے واقفیت تک محدود ہے۔ شعرا کے
دائرے کو اس عمومیت کے ساتھ وسیع کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ تذکرے
کی ضخامت و جامعیت پر ایجاز و اختصار کا عنصر غالب آگیا ہے اور ایسے
شاعروں کو اکثریت حاصل ہوگئی ہے جن سے ابتدائی تعارف کے لئے
بھی دوسرے ذرائع و وسائل اختیار کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ یہ
"عمدۂ منتخبہ" کا ایک نمایاں نقص ہے لیکن اس کے باوجود اس تذکرے
میں ایسے شاعروں کی تعداد بہت سے دوسرے تذکروں کے مقابلے میں
کہیں زیادہ ہے جن کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔
یہ مفصل اجزا زیرِ بحث شاعروں کے بارے میں جو معلومات فراہم کرتے
ہیں اس کے سہارے ان کے مختلف مراحل زندگی سے قریب آنے اور
سیرت و شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انشا
کے متعلق سرور کا یہ بیان اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔

"حکیم انشاء اللہ خاں خلف میر ماشاء اللہ خاں۔ اصلش از
نجف اشرف۔ خود در مرشدآباد تولد یافتہ از ابتدا عمدہ معاش
ماندہ۔ در فنِ طبابت مہارت کلی دارد۔۔۔۔۔ در ایامیکہ بہ
سرکار مرشدزادہ آفاق میرزا سلیمان شکوہ بہادر در لکھنؤ ملازم بودہ
قصیدہ در تہنیت سالگرہ مرشدزادہ دام عمرہٗ (ع۔ف) موزوں
نمودہ ہمہ پر از مضامین عالی است کہ مطلعش ایں است
صبح دم میں نے جو لی بسترِ گل پر کروٹ ۔ جنبشِ بادِ بہاری سے گئی غنچہ اچٹ

ہنگامیکہ در اقتدار نواب ذو الفقار الدولہ مرحوم خان مذکور (میر ماشاء اللہ خاں) شاہجہاں آباد (شدہ بود) در مشاعرہ امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میٹھو صاحب المتخلص بہ آمیر خلف وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مغفور انشاء اللہ خاں یا حکیم قدرت اللہ قاسم و ثناء اللہ خاں فراق و میرزا عظیم بیگ صاحب عظیم و شیخ ولی اللہ محب کہ ہر چہار شخص بذلہ سنج و سخندان و سخن فہم و سخن گوئے عصر خود اند، معارض و طرف شدہ بودند، در مجلس مشاعرہ غزل ہائے ثلاثیہ از جانبین بہ زبان عربی، فارسی و ترکی و ریختہ برائے امتحان طبائع بہ گفتار آمد ...... اکنون در لکھنؤ با غلام ہمدانی مصحفی (معارض شدہ) سقم در غزلیات بر آوردہ بنا براں فی مابین ناخوشی کمالی بہ میاں آمد و بعد ردو بدل بسیار منجر بہ ہجو گوئی شد۔" (ص ۲۴-۲۵)

میر قمر الدین منت کے حالات بھی اس تذکرے میں کافی تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں جن سے ان کی علمی استعداد، ادبی ذوق، امراء و رؤساء کے درباروں سے توسل، مختلف شہروں کی سیر و سیاحت اور مقام و زمانہ وفات سے متعلق کافی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لکھتے ہیں کہ :-

"سید عالی نسب از قصبۂ سونی پت خودش بہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد نشو و نما یافتہ۔ بعد از فراغ تحصیل علوم عربی و فارسی دست بیع بہ خدمت حضرت مولوی فخر الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز گشتہ و از جناب او شان فوائد باطنی حاصل نمودہ دیگے از خلفائے ایشان گشتت ...... تصانیف بسیار در نثر

و نظم از طبع وقادش بہ نہایت بلاغت و کمال قوتِ شاعری یادگار : ہر ماندہ مثنوی در جواب "سحرِ حلال" تصنیف مولانا اہلی شیرازی ...... بہ خوبی تصنیف ساختہ ماسوائے ایں اقسام اشعار بہ کمالِ فصاحت از موزوں گشتہ است ۔ از نواب نظام الملک ناظم صوبہ حیدرآباد : پنج ہزار روپیہ نقد در صلۂ قصیدہ تہنیت یافتہ حد و حصر قابلیت او آں قدر نیست کہ بہ شرح و بسط در آید ......

از دار الخلافہ شاہ جہاں آباد بہ طرفِ دکن و پورب و کلکتہ سیر نمودہ آخرش در لکھنؤ رسیدہ استقامت اختیار کردہ ، راجہ ٹکیت رائے کہ دیوانِ نواب وزیر الممالک مرحوم و سردار کثیر الاقتدار بودہ ، بہ سبب بزرگی کمالات ایشاں نزد خود داشتہ کفائے موافق اخراجات ایشاں معین کردہ ، امیدہ بود بسیار اعزاز میکرد و معتقدانہ پیش می آید ۔ آخرش بہ ہمراہی راجہ موصوف باز بہ کلکتہ رسیدہ در ۱۲۰۸ھ سفرِ آخرت گزیدہ و ہماں جا در مقامے کہ بہ کربلا مشہور است دفن یافت ۔"

(ص ۸۵ تا ۸۶)

مصحفی کے ذکر میں بھی یہی ہمہ گیری نظر آتی ہے ۔ مولفِ تذکرہ کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور غالباً ان کی بعض تصانیف بھی نظر سے گزر چکی تھیں لکھتے ہیں کہ ۔

" اصلش از قصبہ امروہہ ۔ بزرگانش در سرکار دار الملازم بودند ۔ از ابتدائے شباب در دار الخلافہ بود و باش اختیار کردہ ...... صاحب تصانیف بسیار است ۔ یک دیوانِ فارسی و شش دیوانِ ریختہ موزوں نمودہ و دو رسالہ تذکرہ یکے فارسی دوم ہندی تالیف ساختہ

کلامش بسیار صحت محاورہ دارد۔ از دہلی بہ سمت لکھنؤ رفتہ ہمانجا اقامت گزیدہ در سرکار مرشد زادۂ آفاق میرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ سلسلہ نوکری بہ صیغہ شاعری درست نمودہ۔ اکثر قصائد در مدح مرشد زادہ بکمالی قوت فہم و جودت طبع تصنیف کردہ۔ در ایامیکہ مشارٌ الیہ در دار الخلافہ بود مجلس مشاعرہ در خانہ اش منعقد می شد ۔۔۔۔۔ دراں وقت او را راقم دیدہ است۔ بسیار خلیق و متواضع و کم گو بنظر رسیدہ۔" (ص ۵۸۹ - ۵۹۰)

ہدایت اللہ خاں ہدایت :- کا ترجمہ ان تفصیلات پر مشتمل ہے۔

"قوم افغان، عموئے ثناء اللہ خاں فراق۔ متوطن دار الخلافہ شاہجہاں آباد مشاقِ قدیم و شاعر زبردست۔ شریک دودۂ میر درد میرزا مرید خواجہ میر درد صاحب قدس سرہٗ فرد متواضع و متورع و خلیق۔ در فن ریختہ گوئی نہایت ماہر۔ ۔۔ اوستادِ وقت خود۔ در سنہ یک ہزار و دو صد و نوزدہ از یں دار فانی بہ عالم جاودانی انتقال نمودہ۔ خدا ایش بیامرزاد۔ تصانیف بسیار مثل دیوان و مثنوی غزلیات و مراثی و سلام و غیرہ و قصاید موزوں نمودہ۔ اکثر اہل ایں فن دم شاگردی او می زنند۔" (ص ۸۱۳)

یہ اقتباسات سوانح نگاری کے جو نمونے پیش کرتے ہیں وہ تذکرہ نویسی کے تقاضوں کے مطابق بڑی حد تک جامع اور مکمل ہیں۔ اگر شروع سے آخر تک تمام شاعروں کے حالات اسی تفصیل سے لکھے جاتے تو "عمدۂ منتخبہ" ایک تذکرہ کے بجائے مختصر تاریخ ادب کی صورت اختیار کر لیتا لیکن اس وقت کی روایات اور محدود ذرائع معلومات نیز شعرا کی کثرتِ تعداد کے پیش نظر

ایسا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس سلسلے میں سرور کو کوتاہ قلمی کا مرتکب قرار دینا بعید از انصاف ہوگا۔

ادبی خدمات کا جائزہ اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کا تذکرہ بھی سوانح نگاری کا ایک جز ہے۔ چنانچہ سرور نے جہاں تفصیل سے کام لیا ہے اس پہلو کو بھی بطورِ خاص مدنظر رکھا ہے۔ سطورِ بالا میں پیش کردہ اقتباسات کے مطالعہ سے اگرچہ اس سلسلے میں ان کی کوششوں کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے تاہم کچھ اور مثالیں پیش کردینا بے محل نہ ہوگا۔ سعادت یار خاں رنگین کے حالات میں ان کے دواوین غزلیات اور دوسری تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"چہار دیوان بجودتِ طبع ترتیب دادہ یکے قدیمی، دوم تمامی غزل در غزل مسلسل بہ قیدِ حروفِ تہجی از الف تا یا۔ سیومی بہ محاورۂ زناں۔ چہارمی کہ دراں ہزلیات درج است مثلِ اشعار صاحبقراں متخلص کہ در لکھنؤ شخصے است ہزال۔ ورائے ایں دیگر اقسامِ شعر مثل قصاید و مخمس و مسدس و رباعیات و قطعات و مثنوی و نامہ ہائے منظومہ موزوں کردہ و یک رسالہ مشتمل بہ نظم و نثر کہ اعتراضات بر جمیع شعرائے وقت نمودہ و بہ "مجالس رنگین" موسوم کردہ بقیدِ تحریر آوردہ۔ و در دیوان ہزلیات قصیدہ در مدح شیطان گفتہ عوض بسم اللہ در آغاز اعوذ باللہ نوشتہ۔" (ص ۲۸۷)

میر قدرت اللہ قاسم کے ذکر میں ان کی تصنیف کی نوعیت و کیفیت

تذکرے کی تالیف کے اسباب و محرکات اور زمانہ آغاز کے متعلق ان کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"تصانیفش اکثر برجستہ و خوش مضمون و دل چسپ۔ دیوان ضخیمے ترتیب دادہ ہمہ اقسام شعر مثل مثنوی و واسوخت و مناقب و مراثی و مخمس و مسدس و رباعی وغیرہ در سلک نظم کشیدہ۔ پسند خاص و عام گشتہ علی الخصوص حقایق معراج جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہ فصاحتِ تمام در زبانِ ریختہ موزون ساختہ و دیگر مثنوی عشقیہ حسب حال خود کہ از زبانِ سحر بیانش سر زدہ توصیفش خارج از بیان است۔ و دریں ولا کہ ۱۲۱۹ھ است بہ سبب مطالعہ ایں مجموعہ خود ہم ذوقِ تالیف نمودنِ تذکرہ پیدا کردہ۔ چنانچہ از مولف سرزدہ را گرفتہ، انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است۔" (ص ۵۱۱)

میر صاحب کے حالات میں ان کے ادبی و شعری کارناموں کے متعلق حسب ذیل معلومات فراہم کی گئی ہے:-

"تصانیفش بسیار چنانچہ پنج دیوان ریختہ و یک دیوان فارسی و تالیف تذکرہ ریختہ گویان و اکثر مثنویات و ہجویات و مخمسات و واسوخت و مسدسات و ترجیع بند و مناقب و مرثیہ وغیرہ تصنیف نمودہ۔" (ص ۵۵۴)

سیرت و شخصیت پر اظہار رائے زنی کے معاملے میں سرور، مصحفی سے متاثر ہیں۔ دونوں تذکرہ نگاروں کے اظہارِ خیال کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ اسی انداز کے مختصر مگر جامع اور پُرمغز جملے چن گئے ہیں۔ اس لیے مصحفی نے

معاصرین و متقدمین کی پروقار شخصیتوں کو حیات دوام بخش دی ہے۔ "عمدۂ منتخبہ" میں بھی عام ہیں۔ سرور کی تحریر کی دوسری اہم خصوصیت حفظ مراتب کا خیال ہے وہ ہر شخص کے لئے اس کے مقام اور مرتبے کی مناسبت سے الفاظ انتخاب کرتے ہیں تاکہ ان کے قطع کیے ہوئے پیراہن انداز قد کی شناخت میں حائل نہ ہوں۔ اس خصوصیت کی وضاحت کے لئے اولاً بعض ایسے ارباب سخن کے متعلق مولف کے بیانات نقل کیے جاتے ہیں جو اس وقت نوجوان تھے اور جنھیں میدان شاعری میں قدم رکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ ملاحظہ ہوں۔

خداوردی خاں بیتاب برادر اصغر سعادت یار خاں رنگین:۔ "جوانیست سپاہی وضع بیار موءدب وخلیق یار باش و فہیم و کم گو"۔ (ص ۱۷۱)

سید سعید علی ذکی:۔ "جوانیست قابل و موءدب"۔ (ص ۲۱۰)

مرزا اوگھڑ بیگ لوذر:۔ "جوانیست سپاہی وضع"۔ (ص ۔ ۲۱۱)

دیوالی سنگھ سخنور:۔ "جوانے خلیق و موءدب و کامل است"۔

(ص ۳۵۰)

مہدی علی کوثر:۔ "جوانیست مہذب اخلاق حمیدہ خرسائے از جبہش ہویدا"۔ (ص ۵۳۸)

ان لوگوں کے بعد وہ اہل فن آتے ہیں جو شاعری کی معراج کمال تک پہنچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ جوان العمر ہیں اور کچھ سن رسیدہ لیکن شاعرانہ مرتبہ کے اعتبار سے کوئی کسی سے آگے نہیں۔ ان حضرات کا ذکر بالعموم اس انداز سے کیا گیا ہے۔

صاحب میرالم خواجہ میر درد ۔ "مردِ سلیم الطبع و خوش گو و خلیق و متواضع و بہ
کمال درویشی آراستہ و بر روش و طرزِ آبا و اجدادِ خود قائم و مستحکم"

(ص ۱۰)

اسد اللہ خاں اسد : "جوانِ قابل و یار باش و درد مند۔ ہمیشہ بہ خوش معاش
بسر بردہ" (ص ۔ ۱۱۶)

صلاح الدین تمکین : "شخصے فارغ از تعلقاتِ دنیا و از اختلاطِ اہلِ عالم
نفور با ہیچ کس سر و کار نداشت" (ص ۔ ۱۶۴)

سعادت یار خاں رنگین : "جوانے عشق مشرب، شخصے با مروت در فنِ سپاہ گری
بسیار ماہر، یار باش متواضع" ۔ (ص ۔ ۲۸۶)

میر عزت اللہ عشق : "جوانیست بلباسِ صلاح و تقوی آراستہ ... و زیورِ حلم و حیا
پیراستہ ... شخصے حلیم و متواضع و مؤدب است"

(ص ۔ ۴۲۷)

نظیر اکبر آبادی : "بہ معلم گری اوقات بسر می برد ..... بسیار خلیق و متواضع و
خوش مزاج و سلیم الطبع است" ۔ (ص ۷۷۷)

ان ابھرتے ہوئے فن کاروں یا نسبتاً غیر اہم شاعروں کے مقابلے میں ان
لوگوں پر جو اس وقت تک اساتذہ کی صف میں جگہ حاصل کر چکے تھے، زیادہ
زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ اور ان کی شخصیات کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو
روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ امرا و رؤسا بھی جنھوں
شعر و ادب کی سرپرستی کے لئے اپنی دولت اور وقت سب کچھ وقف کر رکھا تھا
اس امتیازی سلوک کے مستحق قرار پائے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل مثالیں
بطورِ نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشا کے متعلق جو دہلی اور لکھنؤ میں بڑے بڑے اساتذہ سے معرکہ آرائیوں کی بنا پر اس وقت تک ایک خاص حیثیت اور کافی شہرت حاصل کر چکے تھے، صاحب تذکرہ کا مشاہدہ ہے کہ

"بہ زعم خود در عقل و قوت شاعری ہیچ یکے را در این فن ہم بر خود نمی داند۔ فی الواقع در قوت شاعری او حرفے نیست لیکن بسیار ہنگامہ آرا و شوخ طبع است۔"

(ص۔ ۲۵)

شاہ حاتم کے حال میں ان کی درویش منشی، نیک مزاجی اور استغنا پسندی کی نسبت سرور نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں سپرد قلم کیے ہیں

"مرد درویش وضع، پاک طینت مرتاض وقت از قید علائق وارستہ تعلقات دنیائے فانی را پشت پا زدہ.... سعی و تلاش را کہ لازمہ اہل دنیا است، خیرباد گفتہ بر مسند توکل نشست... خواص و عوام بہرہ یاب و فیض اندوز از انفاس متبرکہ ایشان می شدند"

(ص ۲۰۹)

خواجہ میر درد کے ذکر میں ان کی جامع الکمالات اور ہمہ گیر شخصیت کا خاکہ اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"صاحب مقامات عالیہ، جامع کمالات باطنیہ و ظاہریہ، رونق افزائے وادی مجاہدت، آشنائے بحر ذخار معرفت، عالم متبحر علم وحدت، سجادہ نشیں۔ چار بالش فقر و اعتقاد، تمکن گزین و سادہ نغز انتخار۔"

(ص ۲۵۳)

مہدی علی خاں عاشق آج شاعر کی حیثیت سے غیر معروف ہیں لیکن اس زمانے

میں وہ اپنی ادب نوازی کی بنا پر فن کاروں کی صف میں ایک اہم مقام پر متمکن تھے

سرور ان کی خاندانی وجاہت اخلاق و عادات اور فراست و فرزانگی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"شخصے از خاندانِ بزرگ بہ اخلاق حمیدہ موصوف و بہ خوش خلقی مشہور و معروف۔ با ہر کس اخلاق و محبت مرعی داشتہ مرد عاقل و دانا و شاعر و متواضع و مودب و حلیم بود۔"

(ص۔ ۴۳۱ و ۴۳۲)

دار، و زبان و ادب کے محسنِ عظیم، باکمال شاعر اور مشہور عالم و عارف مرزا مظہر جانِ جاناں کے بارے میں فاضل مولف کا بیان ہے کہ

"تعریف و توصیفِ فراست و دانائی و رسائی ذہن و ذکائے و علم و فضل و خوش تقریری و شعر فہمی او بیرون از تحریر است الحق کہ مسلکش در فصاحت و محاورہ دانی بالفعل پیدا نیست کمالات درویشی و صفاتِ زاویہ نشینی و توکل بہ اقصی غایت داشت... اکثر سکنۂ شہر از فیضِ باطنی او مستفید و بہرہ مند بودند۔"

(ص۔ ۵۵۲)

اس قسم کی مثالیں سرور کے یہاں نادر و نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو یا اس کی سماجی اور علمی و ادبی حیثیت سے پوری پوری واقفیت نہ ہو اس کی سیرت و شخصیت کے متعلق لب کشائی ایک غیر ذمہ دارانہ اقدام کے مترادف ہے۔ تنقیدِ اشعار بھی اسی محتاط رویے کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہاں بھی کلام کے براہِ راست اور بغائر مطالعے کے پہلو بہ پہلو شاعر کے علمی پس منظر اور ذہنی و فکری ارتقا کا علم حاصل

کیے بغیر کسی قطعی اور ذاتی رائے کا اظہار ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف ایسی صورت میں جب کہ بیشتر شعرا کا کلام عام طور پر دستیاب نہ ہو یا محض چند اشعار تک محدود ہو، دوسرے ارباب قلم کے بیانات پر اعتماد کرتے ہوئے یا اس زمانے کی عام شعری روایات اور رجحانات کو نظر میں رکھ کر صرف مجمل تبصرے ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے تذکرہ نگاروں کی روش عام کے مطابق سرور کے یہاں بھی بالعموم اس قسم کے جملے ملتے ہیں۔

۱۔ زبان و بیانش بطور/ بطرز پیشینیان است" (شہاب الدین ثاقب ص ۱۷۷، دخاص ص۔ ۲۵۳)

۲۔ "اشعارش/ کلامش/ شعرش خالی از کیفیت نیست" (اسیر ص۔ ۹۹۔ ذکی ص۔ ۲۱۲۔ بہاری لال عزیز ص۔ ۲۳۹۔ ہمت رامپوری ص۔ ۸۲۱)

۳۔ "کلامش مطبوع است" (مرزا مچھو بیگ بسمل ص۔ ۱۳۶ شائق بریلوی ص ۳۷۲ نغفل لکھنوی ص ۴۸۱)

۴۔ کلامش عاشقانہ است" (قدرت اللہ شوق ص ۳۷۶ میر صادق علی صفدری ص ۳۹۶۔ مجنول عظیم آبادی۔ ص ۱۰۷، نزہت ص۔ ۷۸۰)

۵۔ "طرز/ مضمون کلامش دلچسپ است" راجہ رام ناتھ ذرہ ص۔ ۲۷۰۔ مرزا علی شوکت ص ۳۷۵۔ امام الدین منتظر و محترم علی خان محترم ص۔ ۴۳۲)

۶۔ "در کلامش شوخی طبع مفہوم می گردد" اکبر شاگرد حاتم ص۔ ۹۷۔ اکبر علی اختر شاگرد جرات ص۔ ۹۸)

۷۔ "در کلامش صوفیانہ است" امام بخش تھانیسری ص ۱۲۷؛ غلام مرتضیٰ جنون ص ۱۸۸)

۸۔ سخنش دردآلود و عاشقانہ است" مرزا تقی خان بہادر ترقی ص ۱۶۸ اداد

میر متقی متقی ص ۔ ۱۵۷)
۹۔ کلامش رنگین و عاشقانہ و درد آلود" (غلام حسین شکیبا ص ۔ ۳۸۰)
۱۰۔ کلامش رنگین و سخنش دلچسپ است"۔ (کاظم حسین بیقرار ص ۱۴۸)
۱۱۔ زبان و بیانش موافق ردیۂ اہل نواح است"۔ (احمدی گجراتی
(ص ۔ ۱۰۹)

طرز کلام اور زبان و بیان کے بارے میں یہ رائیں جن شاعروں کے حالات سے ماخوذ ہیں ان میں سے بیشتر غیر معروف و غیر اہم ہیں۔ ممتاز و مستند فن کار اور اساتذہ اس عمومی اندازِ تنقید سے مستثنیٰ رہے ہیں۔ خصوصاً صاحب تذکرہ کو جن لوگوں کے کلام کے تفصیلی مطالعے اور ان کے نکرو فن پر مختلف زاویوں سے غور و فکر کا موقع ملا ہے، ان کی شاعری کے متعلق ان کی رائیں بڑی صائب اور فیصلہ کن ہیں۔ مثال کے طور پر جس وقت "عمدۂ منتخبہ" لکھا جا رہا تھا۔ مرزا غالب کی شاعری اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ "رنگِ بہار ایجادی بیدل" کی تقلید کا ولولہ، فکر آزما اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی امنگ اور نازک خیالی و پیچیدہ بیانی کا انداز ان کے ذہن رسا اور خلاق طبیعت پر پوری طرح حاوی تھا۔
"نکتہ سرائی" کی اس "ادائے خاص" پر سرور نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔
"در فن سخن سنجی تتبع محاوراتِ میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ در ریختہ در محاوراتِ فارسی موزون می کند بالجملہ موجد طرز خود است۔ اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامینِ نازک موزون گشتہ ردیہ خیال بندی بیش از بیش پیشِ نہادِ خاطر دارد"۔ (ص ۔ ۱۱۶)

غالب کے ابتدائی کلام اور رنگِ سخن کے بارے میں اس پہلی رائے کی صحت وصداقت آج بھی مسلم و معتبر ہے، اور یہ تذکرہ نگار کی ناقدانہ بصیرت اور اصابت نکر و نظر کا ایک واضح ثبوت ہے۔

میر حسن کے حال میں ان کی مثنوی "سحر البیان" کی پسندیدگی اور مقبولیت اور مثنوی نگاری کے فن میں ان کے امتیاز خاص کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"مثنوی بے نظیر و بدر منیر کہ بہ فصاحت تمام موزوں ساختہ مقبولِ طبائعِ خاص و عام گشتہ۔ الحق کہ نہایت دلکش و دلچسپ است در فنِ خویش نادرِ زمانہ بود۔" (ص ۲۱۳)

خواجہ میر درد کے کلام کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے کہ

"اشعار گوہر نثارش نہایت پر کیف۔ صحت محاورہ چنداں کہ باید در کلامش مندرج است و سخنانش چاشنی، فصاحت دارد اکثر اشعار ناخن زنِ دل ہاست۔" (ص ۲۵۴-۲۵۵)

تاہم چاند پوری کو بعض تذکرہ نگاروں نے میرزا رفیع سودا کا ہم رتبہ و ہم پایہ قرار دیا ہے اور بعض اس رائے کو مبالغے اور تحسین بیجا پر محمول کرتے ہیں۔ سرور پہلے گروہ کے ہم نوا ہیں، چنانچہ ان کا بیان ہے کہ۔

"کی قدر محاورہ در ریختہ گوئی بہم رسانید کہ دوش بدوش استادِ خود شد و قدم بہ قدم میرزا نہاد و ۔۔۔۔۔ الفاظ دلفریبش دلکش و طرز بندی ترجیح بر دیگراں دارد و اکثر مثنویات و مقطعات و مدحیات و ہجویات و رباعیات وغیرہ بہ فصاحت تمام تصنیف نمودہ۔ تعریف اشعار دلکش ہر قدر کہ بریں صفحہ ثبت نماید گنجائش دارد

از غزلیاتِ دلچسپ دیوانش مملوست" (ص - ۶۹۸)
میر کے ذکر میں ان کی شاعری کی مجموعی کیفیت اور اس کے امتیازی اوصاف پر رائے زنی کرتے ہوئے آخر میں میرزا سودا سے ان کا مقابلہ و موازنہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ۔

"بہارتے تمام در فصیح گوئی و فنون شاعری دارد... و صحّہ ردیف شاعری بہ نہجے کہ دارد کسے را میسر نہ شدہ۔ القصہ بسیار عزیزان تلاشِ تتبعِ زبانِ او کردند لیکن بہ آن نہ رسیدند فی الواقع مرتبہ شاعریٔ او دریں زمانہ بسا بلند است و پایۂ او دریں فن کم از رفیع السودا نیست، بلکہ در غزل گوئی رجحان دارد۔"

(ص ۵۵۳)

ولی کی خصوصیات کلام کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔
"زبان و بیانش موافق محاورہ و گفتگوئے آن عہد است۔ اشعارش بر زبان خلق جاری۔ اکثر مضمونِ کلامش بسیار دلچسپ لیکن بندش و روزمرہ سخنش بالفعل رائج نیست۔" (۸۰۱)
انشا کے دہلوی حریف مرزا عظیم بیگ عظیم کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور قصائد کی خاص کیفیت کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔
"در غزلیات و قصائد تلاشِ تتبعِ میرزا رفیع السودا منظور می داشت الحق کہ معانی باریک و مضامینِ نازک در اشعار مندرج می کرد۔ استادِ زبان آور و خوش فکرِ زمانۂ خود بود۔ قصائد کہ در حمد و نعت و منقبت از طبعِ رسائے او موزون شدہ۔ پہلو بہ قصائد میرزا رفیع السودا می زند۔" (۷۱۶ - ۷۱۷)

مختلف شاعروں کے رنگ سخن، زبان اور اسلوب بیان کی نوعیت اور کسی خاص صنف میں ان کے کمال کے متعلق یہ اشارات اس قدر واضح اور پر از معلومات ہیں کہ ان کی روشنی میں بہ آسانی ان کے ادبی مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے کے ماحول اور روایات کو دیکھتے ہوئے یہ اندازِ تنقید ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے اور تذکرہ نگاری کے تقاضوں سے شعور کی باخبری نیز ان کی تکمیل کے لیے عملی اقدام کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

"عمدۂ منتخبہ" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے صفحات میں اس دور کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ محفوظ ہے۔ مہدی علی خاں عاشق کے مشاعرے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ یہ محفلِ سخن اپنے مقررہ وقت پر نہایت اہتمام اور باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتی تھی[1] اور شعرا کی ایک کثیر تعداد پابندی کے ساتھ اس میں شرکت کرتی تھی۔ مصحفی نے بھی دہلی کے زمانہ سکونت میں اپنی قیام گاہ پر اسی قسم کی ایک محفل کا اہتمام کیا تھا[2]۔ مرزا احمد بیگ رفیق[3]، سجاد اکبر آبادی[4] اور راجہ شنکر ناتھ ......

۱۔ "در خانۂ روشش مجلسِ مشاعرہ تا مدت دو سال بلا ناغہ روز جمعہ منعقد می شد تمام موزوں طبعانِ شہر شریکِ محفلِ سطور می گشتند۔" (ذکر عاشق ص۔ ۳۲۸)

۲۔ "در ایامیکہ مشارٌ الیہ در دارالخلافہ بود، مجلس مشاعرہ در خانۂ اش منعقد می شد" ذکر مصحفی ص۔ ۵۹۰)

۳۔ مجلس مشاعرہ در خانۂ مشارٌ الیہم منعقد می گردید۔ ذکر رفیق ص۔ ۲۹۸) [4] "در ایامیکہ وارد دارالخلافہ گشتہ۔ مجلس مشاعرہ بہ خانۂ خود منعقد می گرد" سجاد اکبر آبادی ص ۳۵۲)

صبا[۱] کے حالات میں بھی انکے مکانات پر مشاعروں کے انعقاد کا ذکر آیا ہے۔ ان کے ساتھ ہی ایک فرنگی نژاد شاعر مظفرالدولہ ممتازالملک نواب ظفریاب خاں بہادر نصرت جنگ متخلص بہ صاحب خلف سمرو صاحب کے یہاں دہلی کے تمام شاعروں کے اجتماع اور شعرخوانی کا پتہ چلتا ہے[۲]۔ نواب آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی میرزا مینڈھو امیر کے ذکر میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ

"در ایام تشریف داشتن بہ شاہ جہاں آباد پیش از
ہنگامۂ غلام قادر نمک حرام طرح مشاعرہ در خانہ خود انداختہ بودہم
شعرائے این جا بہ مجلس مشاعرہ جمع می شدند"۔ (ص۔ ۶)

اسی زمانہ میں مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ متخلص بہ غالب کے یہاں بھی ایک مشاعرہ ہوتا تھا جس کی نمایاں خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ

"با اقسام اغذیہ ضیافت شاعراں می نمود و شب بہ تماشائے
رقص بازیان مع حاضرین محفل بسر می برد"۔ (ص۔ ۲۲۶)

مشاعروں کے رواج اور عام مقبولیت کے متعلق اس معلومات کے پہلو بہ پہلو سرور کے بعض بیانات سے نوابین و امراء کی شعر و ادب سے دلچسپی ان کے درباروں میں شعرا کی قدر و منزلت اور فیاضی و سیرچشمی کے ساتھ سرپرستی و قدردانی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اودھ کے سخن سنج و سخن فہم اور فراخ دل حکمراں نواب آصف الدولہ کے حال میں

---

[۱] "بخانہ خود مجلس مشاعرہ منعقد می کرد"۔ (تذکرہ ص۔ ۳۹)

[۲] "در ایامیکہ وارد دارالخلافہ بود، مجلس مشاعرہ در خانہ منعقد می نمود... آنجا (اجتماع) ہمہ شعرائے شاہجہاں آباد و در مشاعرہ در خانہ اش می شد (صاحب ص ۲۹)

لکھتے ہیں کہ :۔

"پرداخت ومراعات شعرا منظور نظر عاطفت اثر داشت چنانچہ میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ در فن ریختہ گوئی سرآمد شعرائے وقت است بہ صیغۂ شاعری دو صد روپیہ در ماہہ را ملازم بودند"

(ص۔ ۵)

مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے متعلق رقم طراز ہیں کہ

"چوں طبیعت عالی اکثر بہ شعر و شاعری میلان دارد، از شعرائے سرآمد زمان مثل انشاء اللہ خاں انشا و غلام ہمدانی مصحفی و قلندر بخش جرأت و سعادت یار خاں رنگین و شیخ ولی اللہ محب وغیرہ در سرکار فیض آثارش رتبۂ ملازمی داشتند و مجلس مشاعرہ منعقد می شد۔ طبع وقادش بسیار رسا و عالی فکر۔ مضامین یاب و معنی فہم و قدر دان ہنروران این فن است"

(ص۔ ۳۱۳)

اردو شاعری کی یہ مقبولیت و محبوبیت شمالی ہند ہی تک محدود نہ تھی، اس کا جادو دکن کی اس سر زمین پر بھی چل رہا تھا جہاں اس نے اپنی نشو ونما اور ترقی کے ابتدائی مراحل طے کئے تھے۔ وہاں بھی آصف جاہی دربار اور امرا و اعیان سلطنت کی سرکاروں میں شعرا کی پذیرائی اور قدر و منزلت کا وہی عالم تھا جس کے مظاہر سے دہلی اور اودھ کی سلطنتوں اور ڈیوڑھیوں کی تاریخ روشن ہے۔ منشی علی رضا مرتجون کے ذکر میں ان کے سفر حیدرآباد اور حصول ملازمت کے متعلق تذکرہ نگار کا یہ بیان اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :۔

"از چندے در حیدرآباد رفتہ بہ صیغۂ شاعری در سرکار نظام الملک بہادر ماہانہ

دو صد روپیہ ملازم گشتہ" (ص ۱۱۷)

حاکمانہ بالادستی، سماجی مطالبات اور تہذیبی روایت سے کہیں زیادہ یہ اس تہور ذاتی اور فیض رسانی کا نتیجہ ہے کہ ان نوابوں اور بادشاہوں کے نام آتے ہی ہر تذکرہ نگار جوشِ احترام سے سر جھکا دیتا ہے اور زبان قلم باادب ہوکر عقیدت کے پھول بکھیرنے لگتی ہے۔ سرور بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں چنانچہ ان کی درج ذیل تحریریں جو اپنے مزاج اور رنگ و آہنگ کے اعتبار سے ان کی دوسری تحریروں سے بالکل مختلف ہیں، اسی ضمن میں آتی ہیں۔

شاہ عالم آفتاب شاہ گیتی پناہ، جم جاہ فریدون فر، والا مرتبت، کیخسرو شکوہ، سکندر منزلت، عدیم دوران، خلیفہ زمان شہنشاہ سلیمان مکان دادو دگر صاحبقران، جلال الدین لقب قبلۂ امانی و آمال، سرچشمۂ جود و نوال، ابوالمظفر مجاہد الدین شاہ عالم بادشاہ غازی.... آوازۂ سخاوتش شرق و غرب عالم را گرفتہ و شور شجاعتش زلزلہ در دل رستم مزاجان انداختہ۔ ذات فائض البرکاتِ قدسی صفاتش باعثِ امن و آرائشِ جہان و جہانیان وجودِ مسعودِ میمنت آمودش سببِ فلاح و رفاہ زمان و زمانیان۔ عالمے از خوانِ احسانش بہ نعمت ہائے گوناگوں متلذذ و بہرہ یاب و خلقے از دولت بے زوالش بہ حصولِ انواعِ تمنات مستفید و کامیاب"

(ص ۔ ۲)

مرزا سلیمان شکوہ :۔

مرشد زادۂ آفاق، قرۂ باصرۂ سلطنت، مہرِ درخشانِ آسمان خلافت

درۃ التاج شہریاری، اختر برج سعادت و کامگاری۔ فرازندۂ لوائے کشورستانی۔ طرازندۂ بساط ابہت و کامرانی۔ جوہر شمشیر حشمت و اقبال، رنگین رکین ایوانِ جاہ و جلال، مربع نشین مسند جہانداری، وارث تاج و تختِ شہریاری، بلند فطرت، عالی وقار گرامی نسب ذوالاقتدار، میرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ و زید اجلالہٗ" (صفحات ۳۱۲-۳۱۳)

محمد اکبر بادشاہ غازی

"بادشاہ جم جاہ گیتی پناہ، فریدون سپاہ، دارا مرتبت، سلیمان شوکت، کیخسرو منزلت، سکندر حشمت، غریب نواز، ظلم گداز، رعیت پرور، عدل گستر، عطا فرمائے زر و گوہر، دریا دل، در ہر فن کامل، واقف اسرار نہانی۔ کشاف رموز نہانی، اورنگ آرائے سریر سلطنت۔ رونق بخش و بہیم ابہت و مملکت۔ ہنر پروبیدان وغا دریائے صفحۂ سخا، مقبول بارگاہِ یزدانی منظورِ انظار سبحانی ظل اللہ محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہٗ" (صفحات ۸۳۴ و ۸۳۵)

ایک ایسے دور میں جبکہ سلطنتِ مغلیہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی بابر و تیمور کی عظمت اور اکبر و جہانگیر کے جاہ و جلال کا چراغ آخری سانسیں لے رہا تھا اور سلاطین دہلی کے اختیارات روز بروز محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے تھے، ان اعیان مملکت کے ناموں کے ساتھ توصیفی کلمات کی اس طلسم بندی اور پرشکوہ الفاظ کی صف آرائی کو حسن عقیدت کے مظاہرے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے لیکن عقیدت کے اس اظہار میں

تصنع اور تملق کو دخل نہیں بلکہ اس کے پیچھے پرخلوص، نیازمندی اور احسان مندی کا

کا جذبہ کارفرما ہے

انتخاب کلام کے سلسلے میں سرور نے صرف غزلوں کے اشعار پر اکتفا نہ کرتے ہوئے حسب موقع دوسری اصنافِ سخن کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ حتیٰ کہ مزید کلام دستیاب نہ ہونے کی صورت میں انھوں نے کسی تاریخی قطعے کے اشعار نقل کر دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ رباعیاں عام طور پر اور بکثرت نقل ہوتی رہیں۔ سلسل قطعات اور قصائد سے ماخوذ نمونہ ہائے کلام کی بھی کمی نہیں۔ مرزا عظیم بیگ عظیم دہلوی کے منتخب کلام میں رباعی در مدح مرشد خود حضرت خواجہ میر درد کے ساتھ ہی وہ مشہور ہجویہ مخمس بھی شامل ہے۔ جس میں انشا کی شخصیت اور شاعری کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ تذکرہ کے صفحات پر اشعار کا یہ تنوع اور کلام کی رنگارنگی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

یہ ضخیم تذکرہ جہاں بہت سی خوبیوں کا حامل ہے وہیں اس میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ خامیاں زیادہ تر اعادہ و تکرار، اور اشعار کے غلط انتساب کی مثالوں اور بعض شاعروں کے حالات کے غیر معمولی اختصار یا ان کی طرف حسب ضرورت توجہ کی کمی کی صورت میں رونما ہوتی ہیں۔ سرور نے جابجا میر حسن کے "تذکرہ شعرائے اردو" کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ وہ بہت سے ایسے شاعروں کے حالات سے بے خبر رہے ہیں جن کے متعلق میر حسن کے ابتدائی قسم کی تمام ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ مثلاً

(الف) امیر خاں انجام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"امیر خاں بہادر خلف نواب بقاء اللہ خاں برادر زادہ نواب عمدۃ الملک مرحوم کہ خان عالم خطاب داشت۔"

(ص۔ ۲۲)

میر حسن نے ان کا حال ساڑھے چار سطروں میں لکھا ہے۔ جس میں ان کی لطیفہ گوئی، درباری اعزاز اور شہادت کے واقعے پر روشنی ڈالی گئی ہے

(ب) میر فتح علی شیدا کا تعارف ان معدودے چند الفاظ میں محدود ہے۔

" شیدا تخلص مولدش قصبہ مئو شاگرد محمد رفیع السودا۔ ایک شعر از تصانیفش مسموع گشتہ"

(ص ۔ ۳۷۲)

تذکرہ شیدا کے نام سے بھی ناواقف معلوم ہوتے ہیں جبکہ میر حسن نے ان کے نام وطن اور شاگردی کے متعلق صراحت کے پہلو بہ پہلو ان کے اخلاق و عادات، افتاد طبع اور کلام کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے اور دو شعر نقل کئے ہیں جو "عمدہ منتخبہ" میں موجود نہیں۔

(ج) میر علی نقی کافر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"میر علی نقی نام دارد مطلقاً راقم از احوالش مطلع نیست"

(ص ۔ ۵۳۴)

میر حسن کے یہاں ان کا ذکر کسی قدر مفصل ہے۔ نام کے اختلاف کو سہو کتابت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(د) محسن اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"میر حسن برادر زادہ میر محمد تقی میر۔ زیادہ احوالش معلوم راقم نیست"

(ص ۔ ۱۳۷)

میر حسن نے ان کے مبلغ علم، وطن، خان آرزو سے قرابت قریبہ اور اکتساب فیض ملکۂ شعر گوئی: نواب سالار جنگ کی سرکار سے وابستگی اور آخر عمر میں شاعری سے بے تعلقی

کا ذکر کرنے کے بعد گیارہ شعر نقل کئے ہیں۔ "علاوہ منتخبہ" میں اشعار کی تعداد صرف بیاسات ہے۔ جن میں سے دو شعر "تذکرہ شعرائے اردو" میں منقول نہیں۔

(ح) مدہوش کے بارے میں سرور کا بیان ہے کہ۔

"شاگرد میر سوز مرحوم۔ از نام و نشانش واقفیت نیست ایک شعر از و بہم رسیدہ، ثبت می گردد"۔ (ص۔ ۱۹۷)

میر حسن کی تحریر کے مطابق مدہوش کا نام میر نبی جان تھا وہ ایک خوش وضع اور نیک خوجوان تھے اور کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔

(ط) سراج اورنگ آبادی کو بارہویں صدی ہجری کے اردو شاعروں میں ایک امتیاز حیثیت حاصل ہے لیکن سرور ان کے نام اور حالات سے بالکل نابلد ہیں۔

لکھتے ہیں کہ:۔

"شاعر ہمعصر بیاں آبرو است۔ از سکنائے اورنگ آباد۔ از نامش واقفیت نیست"۔ (ص۔ ۲۳۵)

صاحب تذکرہ کی کم التفاتی سے متاثر شعرا کے اس زمرے میں کچھ ایسے معروف فنکار بھی شامل ہیں جو خود انھیں کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ حیدر علی آتش، شیخ امام بخش ناسخ، حکیم مومن خاں مومن اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے متعلق جو اس وقت تک کافی شہرت حاصل کر چکے تھے، ضروری معلومات کی فراہمی زیادہ دشوار نہ تھی۔ لیکن سرور نے اس ضرورت کا احساس نہ کرتے ہوئے صرف سرسری قسم کے چند جملوں پر اکتفا کیا ہے۔ آتش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"آتش خواجہ حیدر علی خاں ساکن بلدۂ لکھنؤ شاگرد غلام ہمدانی مصحفی در شعر گوئی اکثر مضامین نازک از طبعش می تراود"۔ (ص۔ ۱۰۴)

ناسخ کے کئی شاگردوں کے تراجم کافی مفصل ہیں لیکن استاد کے تعارف کے لیے صرف ان گنے چنے الفاظ کو کافی سمجھا گیا ہے۔

"شیخ امام بخش شخصے است باشندۂ لکھنؤ سلیقہ شعر گوئی بر طرز خوب بہ دستش افتادہ لہذا اشعارش دلکش سامعان است" (ص۔۷۸۲)

مومن کا تعارف آتش و ناسخ کے مقابلے میں کسی قدر مفصل ہے، اس کے باوجود اسے مکمل اور ان کی شخصیت کے شایان شان نہیں کہا جا سکتا۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"حافظ محمد مومن، نوجوانیست ہمت بر تحصیل کتب عربی مصروف دارد اصلش از خطہ کشمیر مولدش دار الخلافۂ شاہجہاں آباد اجدادش بہ عزت و بزرگی بسر بردند۔ روبہ شعر گوئیش بسیار مطبوع، شخص بسیار خلیق است" (ص۔۱۵۷)

نواب الٰہی بخش خاں معروف سے فاضل تذکرہ نگار کے ذاتی تعلقات تھے، جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے کلام کے انتخاب میں انھوں نے بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن حالات زندگی کے بیان اور شخصیت کی مرقع کشی کے مرحلے میں وہ بھی اسی بے اعتنائی کا شکار رہے ہیں جس کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں یار سر ور نے ان کے بارے میں صرف اس قدر معلومات فراہم کی ہے۔

"الٰہی بخش خاں خلف رشید عارف خاں مرحوم برادر شرف الدولہ قاسم خان مغفور از امرائے مغلیۂ عہد ذو الفقار الدولہ مرحوم۔ شخص بسیار خوش اختلاط و خوش فکر، در فن سپاہ گری ماہر با مولف از قدیم تعارف دارد (ص ۲۰-۳۶۲)

"عمدۂ منتخبہ" کی دوسری قابل ذکر خامی مختلف تخلصوں اور ناموں یا ایک ہی نام اور تخلص کے ساتھ بعض شاعروں کے حالات کا اعادہ ہے۔ تلاش و تحقیق کے بعد اس قسم کی تکرار کی کافی مثالیں فراہم کی جا سکتی ہیں لیکن

یہاں بہ نظر اختصار صرف ان مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے جو مطالعے کے دوران بیک نگاہ سامنے آتے رہے ہیں۔

(۱) ردیف الباء کے ذیل میں بیتاب تخلص کے تحت خداوردی خاں کا حال اس طرح لکھا گیا ہے :-

"خداوردی خاں برادر کوچک سعادت یار خاں رنگین تخلص کہ ذکرش در حرف الرا مذکور خواہد شد۔ جوانیست سپاہی وضع بسیار مودب و خلیق و یار باش و فہیم و کم گو۔ از راقم تعارف تمام دارد و شعر ریختہ می گوید۔ شاگرد میر نظام الدین ممنون" (ص ۱۵۱)

اس "تعارف تمام" کے باوجود ردیف "ظ" کے تحت دوبارہ انھیں بیتاب کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے :-

"ظریف تخلص، خداوردی خاں برادر کوچک سعادت یار خاں رنگین بسیار خلیق در فن سپہ گری کما حقہٗ ماہر" (ص ۲۱۵)

قدرت اللہ قاسم نے شاعر موصوف کا ذکر ظریف تخلص کے ساتھ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے یہ بیتاب تخلص کرتے تھے[۱]۔ سرور کی تحریر دل میں شواہد کے علاوہ قاسم کے اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بیتاب اور ظریف ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں۔

(۲) تحسین کا حال معمولی سے فرق کے ساتھ ایک ہی ورق پر دو جگہ لکھا گیا ہے۔ دونوں عبارتیں درج ذیل ہیں۔

(الف) "منشی حسین عطا خاں ساکن قصبہ اٹاوہ از اشراف آں ضلع است روزگار بہ عمدگی گذرانیدہ، شوق ریختہ گوئی در خاطرش

۱؎ مجموعہ نغز ص ۳۷۱ جلد اول

متمکن"۔ (ص ۱۶۱)

(ب) "میر محمد حسین خاں مخاطب بہ خطاب مرصع رقم۔ شخصے است ساکن لکھنؤ در سرکار نواب وزیر الممالک بہ صیغہ خوش نویسی ملازم۔ در انشا پردازی نیز نہارتے دارد"۔ (ص ۱۶۲)

یہ وہی تحسین ہیں جن کی تصنیف "نوطرز مرصع" اردو کے اہم نثری کارناموں میں شمار کی جاتی ہے اور جو قصبہ اٹاوہ کے باشندے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ ان کے نام کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ مبتلا میرٹھی نے میر محمد حسین عطا خاں[1]، امر اللہ الہ آبادی نے حسین عطا خاں[2] اور خیراتی لال بے جگر نے میر عطا حسین خاں[3] لکھا ہے اور وجۂ تخلیق امر اللہ کا بیان درست ہے۔

(۳) جوشش عظیم آبادی کا نام بعض تذکرہ نگاروں نے محمد روشن کی بجائے محمد عابد لکھا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ سرور بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

"جوشش تخلص محمد عابد از سکنۂ عظیم آباد شاعر مستعد معلوم می گردد"۔ (ص ۱۰۰)

محمد عابد، جوشش کے بھائی تھے اور دل تخلص کرتے تھے۔ سرور کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے چند صفحات کے بعد درج ذیل الفاظ میں دوبارہ انھیں جوشش کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] تذکرہ طبقات سخن۔ مخطوطہ گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور۔

[2] تذکرہ مسرت افزا۔ مخطوطہ آکسفورڈ یونیورسٹی لائبریری

[3] تذکرہ بے جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۲۹ ب

"جوشش تخلص عظیم آبادی۔ در علم عروض ماہر، بسیار خوش لیاقت است۔" (ص ۱۰۵)

(۴) حزیں تخلص کے تحت بظاہر تین مختلف شعرا کے تراجم بہ تفصیل ذیل قلمبند کئے گئے ہیں۔

(الف)۔ "حزیں تخلص۔ محمد علی حزیں از تلامذۂ میرزا جانِ جاناں مظہر۔ کلامش دل چسپ و نمکین معلوم می شود۔"

وہ کہ ہے ملک سلم اسے یکتائی کا
خوب لیتا ہے مزا عالم تنہائی کا

اس کو کچھ لذتِ شراب نہیں
جس کا دل عشق سے کباب نہیں

ان بتوں کے دیکھنے کا جو کوئی مائل نہیں
زندگانی کا اسے واللہ کچھ حاصل نہیں

رباعی

کن کن طرحوں سے جان ہم سے لے دل
کرتا ہے اب اس طرح تو ہم کو بے دل
جلنے کی قدر ہمارے اس دل کی تجھے
ظاہر تب ہو کہ جب کسی کو دے دل

(ب) "میر باقر نام شاہجہاں آبادی۔ از چندے بہ عظیم آباد بود و باش اختیار نمودہ۔ شاگرد میرزا مظہر از دوست۔

کیونکہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو
کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں کیا تحریر ہو" (ص ۲۲۰)

(ج) "از نام و نشانش اطلاعے نیست۔ شخصے بزرد و عہد فردوس آرام گاہ۔ از وست۔

اس بے وفا کے عشق میں کچھ ہم کو جس نہیں
یاوں تلک بھی اس کے ہمیں دسترس نہیں

ویران ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہم
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

اس فصلِ گل میں کیوں نہ گریبان کیجئے چاک
جاتی ہے یوں بہار حزیں آہ لبس نہیں" (ص ۲۲۳)

ان تینوں تراجم کے تحت جتنے[1] اشعار نقل کئے گئے ہیں وہ سب کے سب مرزا مظہر کے مشہور شاگرد میر محمد باقر حزیں کی تصنیف ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرتب نے ایک ہی شاعر کو محض بے توجہی اور عدم تحقیق کی بنا پر تین علیحدہ علیحدہ شاعروں کی حیثیت سے پیش کیا ہے[2]۔

(۵) خادم علی خادم تخلص کا حال بھی دو جگہ درج ہے۔ پہلے صفحہ ۲۵۰ پر اس طرح ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔

"خادم تخلص باشندہ قصبہ کیتھل من مضافاتِ صوبہ سرہند"

دوسری مرتبہ صفحہ ۲۵۳ پر لکھتے ہیں۔

"خادم تخلص۔ خادم علی نام۔ متوطن قصبۂ کیتھل متعلقہ سرکار

---

[1] ترجمۂ اول کے تحت منقول اشعار کے بارے میں قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ:
"اشعار یکہ خانِ زینت نشان اعظم الدولہ محمد میر خاں بہادر در تذکرۂ خود بنام محمد علی حزیں تخلص نوشتہ اند از آنِ میر باقر حزیں است"۔ (مجموعۂ نغز جلد اول ص ۲۰)

[2] [illegible] کے سلسلے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

سرہند۔ قوم شیخ از ہندوستان زبانِ قدیم است۔ در ریختہ گوئی فکر خوبے دارد۔ دیوانِ اشعار فارسی و ریختہ ہر دو ترتیب دادہ
(۹) ردیف دال کے تحت خواجہ میر درد کے فوراً بعد محمد نقیہ دردمند کا ذکر آتا ہے ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔
"دردمند تخلص۔ متوطن دکن۔ از چندے در شاہجہاں آباد آمدہ۔ شاگردِ میرزا جانِ جاناں مظہر"۔ (ص ۲۵۸)
اس مجمل تعارف کے بعد سب سے پہلے ایک رباعی نقل کی گئی ہے اسکے بعد غزلیات کے ۲۲ شعر اور آخر میں سات رباعیاں بطور نمونہ کلام پیش کی گئی ہیں لیکن اس پورے انتخاب میں پہلی رباعی کے علاوہ باقی تمام اشعار خواجہ میر درد کی تصنیف ہیں[1]۔ متعلقہ ردیف کے اختتام پر بالفاظ ذیل پھر انھیں دردمند کا حال درج ہے۔
"دردمند تخلص۔ میر محمد نقیہ نام۔ شاگرد میرزا جانِ جاناں مظہر علیہ الرحمہ۔ ایں چند اشعار از ساقی نامہ اوست"۔ (ص ۲۷۰)
شعرا کے حالات کے اعادے کی طرح "عمدۂ منتخبہ" میں ایک شعر یا دو سے زیادہ شاعروں کے نام سے اندراج کی مثالیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں اس قسم کی بعض نمایاں لغزشوں کی نشان دہی کی جاتی ہے:۔
گزشتہ سطور میں تذکرے کے صفحہ ۱۲۳ سے حزیں تخلص کے تحت مذکور جس "بے نام و نشاں" شاعر کا ترجمہ نقل کیا گیا ہے اس کے منتخب کلام میں سب سے

---

[1] انتخاب کی یہ غلطی بظاہر اصل خطی نسخے کے اوراق کی بے ترتیبی یا کاتب کے سہو کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، ممکن ہے کہ ناقل رتب اس نقص کی گرفت نہ کر پائے ہوں۔

پہلے یہ شعر درج ہے۔

اس بے وفا کے عشق میں کچھ ہم کو حِس نہیں
پاؤں تلک بھی اس کے ہمیں دسترس نہیں

جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے یہ شعر میر باقر حزیں کی تصنیف ہے لیکن سرورؔ نے اسے حزیں کے علاوہ محمد علی حشمتؔ کے کلام میں بھی نقل کیا ہے (ص ۲۲)۔

سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے کلام میں درج ذیل شعر بھی شامل ہے۔

کھول کر بندِ قبا کو ملکِ دل غارت کیا
یہ حصارِ قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا (ص ۸)

یہی شعر صفحہ ۵۲ پر احسن اللہ احسنؔ کے نام سے نقل ہوا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں انتساب مشکوک ہیں لیکن تذکرہ نگاروں کی اکثریت... اسے آرزوؔ سے منسوب کرتی ہے۔ زیر بحث شعر کے بعد اس صفحے پر یہ مشہور شعر بھی کلام احسنؔ کے نمونوں میں شامل ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

لیکن صفحہ ۵۶ پر اسے نصرت الدین علی خاں پیامؔ سے منسوب کر دیا گیا ہے جو یقینی طور پر غلط ہے۔

بھورے خاں آشفتہؔ کے انتخاب کلام میں یہ دو شعر بھی منقول ہیں ۔

سر رشتۂ محبت ہم سب سے توڑ بیٹھے
اپنا سر آپ اپنے زانو سے جوڑ بیٹھے

برگشتہ بخت ہم سے دیکھے ہیں کم کسو نے
جب ہم ہوئے مقابل وہ منہ کو موڑ بیٹھے

آئندہ صفحات میں بھی دونوں اشعار میرزا رضا قلی آشفتہ کے نام سے نقل ہوئے ہیں (ص ۸۰) جو بکہ ذکا[1]، قاسم[2]، شیفتہ[3] اور دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے ان اشعار کو اول الذکر آشفتہ سے منسوب کیا ہے۔ اس لئے یہی انتساب قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی ایک مثال شاہ واقف فیض آبادی (صفحہ ۸۰۳) اور شاہ قدرت اللہ قدرت دہلوی (صفحات ۹۵ ۹۶) کے انتخابات کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار جو در اصل حیرت مراد آبادی کی تصنیف ہے[4]، ان دونوں شاعروں کے نام سے پیش کئے گئے ہیں۔

ہوا ہے عشق سے آکر مقابلہ دل کا
بھڑا پہاڑ سے، جاہل بے حوصلہ دل کا

سرشک واہ ہے، شہرِ جنوں ہو، وحشت ہو
عجب شکوہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

مکرر اندراج سے قطع نظر ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں جن کی ملکیت کے تعین میں غلطی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر شیخ عبداللہ آزاد کے انتخاب کلام کے تحت جتنے اشعار درج ہیں ان میں پہلے دو شعروں کے باقی تمام شعر سید محمد میر اثر کے نتائج فکر ہیں۔ اسی طرح حافظ عبدالرحمن خاں احسان کے متعدد اشعار میر غلام علی احسان حیدرآبادی کے کلام میں شامل ہو گئے ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار جو باستثنائے شعر اول میر حسن کے "تذکرہ شعرائے اُردو"

---

[1] "عیار الشعرا" مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ورق ۱۲ ب

[2] "مجموعہ نغز" جلد اول صفحہ ۲۰   [3] "گلشنِ بے خار" طبع اول۔ ص ۱۸

[4] "عیار الشعرا" کے ضمن میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔

میں ان کے اپنے نام سے منقول ہیں عمدۂ منتخبہ[1] ابوالحسن حسن کاندھلوی سے منسوب کیے گئے ہیں۔

کارِ جہاں تمام کمینے پہ آر ہے / سب نقش اس فلک کے نگینے پہ آر ہے
گر کیجیے رقم کبھو تری وحدت کے بیاں کا
تو چاہیئے خامہ بھی اسے ایک زباں کا

کیا غضب کرتے ہو اِدھر دیکھو / غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
ہر ایک کی جان تو ہے جس بن نہیں گزرتی / کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی
اے عشق کوئی پہ نہ تری راہ میں گرے / دریا میں ڈوب جائے کہ یا چاہ میں گرے
بکتے ہیں راہ تیری سر راہ میں گرے / جا کہیں نقش پا کہ مانندِ نقشِ پا

بھی دوسرے تمام شعروں کی طرح میر حسن ہی کی تصنیف ہے چنانچہ مصحفی نے اسی غزل کے ایک اور شعر اور مقطعے کے ساتھ اسے انکے انتخاب کلام میں نقل مطلع اول کیا ہے۔[2] میر حسن کے یہاں آخری دو اشعار میں "گرے" کے بجائے "پڑے" بطور ردیف منقول ہے۔ باقی اشعار میں کوئی لفظی اختلاف نہیں۔

ردیف شین کے تحت حیدرآباد کے ایک مجہول الاحوال شاعر شرن کے نمونہ کلام میں اس صراحت کے ساتھ کہ "غزلے از نصانیفش اکثر زباں زد مطربان و اہلِ نشاط دار الخلافہ است ...... دو سہ شعر از غزلِ مذکور بنا بر یادگار قلمی نمودہ شد۔" (ص ۳۰۲) مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے گئے ہیں

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو میں رہا نہ تو تو رہا جو رہی سو بے خبری رہی

---

[1] "تذکرۂ شعرائے اردو" ص ۷۵ تا ۷۵ "عمدۂ منتخبہ" ص ۲۱۶

[2] "تذکرہ ہندی" ص ۶۹

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ جنوں کی پردہ دری رہی، نہ خرد کی بخیہ گری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی وہیں دھری رہی[1]

یہ تینوں شعر شاہ سراج اورنگ آبادی کی ایک مشہور غزل سے ماخوذ ہیں
کلیات سراج میں شامل ہونے کے علاوہ مختلف تذکروں میں بھی اس غزل
کے متفرق اشعار انھیں کے نام سے نقل ہوئے ہیں۔ میرزا محمد علی قدوی
عظیم آبادی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

"عمدۂ منتخبہ" میں یہ شعر ناہگیسا عشق عظیم آبادی سے منسوب ہے جو
قطعاً درست نہیں۔ مصحفی[2]، عشقی[3] اور شیفتہ[4] کی تحریریں اول الذکر انتساب کی
تائید کرتی ہیں۔

میر تقی میر کے طویل انتخاب کلام میں پانچواں شعر یہ ہے۔

زلف کو کہنا پریشاں عقل کی دوری ہے یہ
ہر گرہ میں اس کی دل ہو گا گٹھڑی پوری ہے یہ

یہ شعر مختلف شاعروں سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے

---

[1] "کلیات سراج" مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۵۱۹

[2] "تذکرۂ ہندی" ص ۱۶۶

[3] "دو تذکرے" (تذکرۂ عشقی) جلد دوم۔ ص ۱۲۵

[4] "گلشن بے خار" طبع اول۔ ص ۱۹۹.

شاہ بنجیا کی تصنیف قرار دیتے ہیں[1]۔ معلوم نہیں کہ یہ انتساب کہاں تک درست ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ کلام میر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کے نقائص تذکرہ و تاریخ کے فن سے تعلق رکھنے والی کتابوں کو استناد و اعتبار کے درجے سے گرا دیتے ہیں۔ لیکن سرورؔ کے یہاں شعرا کی تعداد اور ان کے کلام کی مقدار کو دیکھتے ہوئے ان نقائص کا تناسب بہت کم ہے اور "عمدۂ منتخبہ" کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اس کی خوبیاں بہر حال ان پر غالب رہتی ہیں۔ اس تذکرے کی ایک قابلِ تعریف خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی زبان نہایت سادہ و سلیس ہے اور مولف نے حتی الامکان عبارت آرائی اور رنگین بیانی سے احتراز کیا ہے۔ دور از کار تشبیہات و استعارات اور مبالغہ آرائی کے سقم سے بھی ان کی تحریر بڑی حد تک مبرا ہے۔

طرزِ نگارش کی یہ سلاست جسے بہت کم تذکرہ نویس برقرار رکھ سکے ہیں ایک ایسی خوبی ہے جو معاصر تذکروں کے مقابلے میں "عمدۂ منتخبہ" کے معیار کو بلند تر کر دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس تذکرے کا مطالعہ ڈاکٹر فاروقی کے الفاظ میں "ادب ندیم" کے حیات افروز عناصر سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

---

[1] "مجموعہ نغز" جلد اول ص ۱۱۲

مجموعۂ نغز

"مجموعہ نغز" حکیم قدرت اللہ قاسم کی تالیف ہے جو اپنے دور کے ایک جید اور صاحب نظر ادیب تھے۔ شاعری سے قاسم کو خاص دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتے اور دہلی میں اپنے مکان پر مشاعروں کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔[1] مرزا عظیم بیگ عظیم، ثناء اللہ خاں فراق اور شیخ ولی اللہ محب کے ساتھ انشا کے خلاف معرکہ آرائیوں میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا تھا۔[2] نواب اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے لکھتے ہیں کہ:-

"شخصے است موصوف بہ صلاحیت و تقوی۔ تحصیل کتب عربی بہ خوبی نمودہ و در علم طب مہارت کلی دارد۔ شاعر مسلم الثبوت و بہ شمار جرگۂ استادان ایں عصر است۔ تصانیفش اکثر برجستہ و خوش مضمون و دلچسپ دیوان ضخیمے ترتیب دادہ و ہمہ اقسام شعر مثل مثنوی و واسوخت و مناقب و مراثی و مخمس و مسدس و رباعی وغیرہ کہ در سلک نظم کشیدہ پسند خاص و عام گشتہ" (۳)

قاسم کا زیر بحث تذکرہ جو بصورت مطبوعہ ۸ ½ سائز کے آٹھ سو

---

[1] عمدۂ منتخبہ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۵۱۱

[2] " " " ص ۲۵

[3] " " " ص ۵۱۱

دس صفحات اور چھ سو چورانوے شعرا کے اشعار و احوال پر مشتمل ہو شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے ذخیرۂ نوادرات سے حاصل شدہ مولف کے اصل مسودے پر مبنی ہے اور ۱۹۳۳ء میں پروفیسر محمود شیرانی کی تصحیح و تدوین کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے شائع ہوا ہے[1]۔ اس نسخے کی تیاری کے دوران مشکوک اور کرم خوردگی کے متاثر الفاظ و عبارات کی تصحیح و تکمیل اور متن کے اختلافات معلوم کرنے کی غرض سے انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ بھی مرتب کے پیش نظر رہا ہے۔ ترتیب کی دوسری خوبیوں سے قطع نظر یہ خصوصیت بطور خاص قابل ذکر ہے کہ متن میں حتی الامکان مولف کے مخصوص املا کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک عالم کو اہل قلم کی خصائص املا و انشا معلوم رہیں اور اُردو الفاظ کا مخصوص تلفظ جس طرح سے وہ (اس زمانے میں) بولے جارہے تھے ہم پر روشن ہو جاتے[2]۔

تذکرہ کا آغاز ایک دیباچہ سے ہوتا ہے جس میں حمد و نعت کے بعد اسباب تالیف و زمانہ ترتیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد کلام موزوں کی ابتدا اور فن شاعری کی اہمیت کے متعلق ایک تفصیلی مقدمہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ دیباچے کے ذیل میں اپنے ادبی اور تصنیفی و تالیفی انہماک کا ذکر کرتے ہوئے قاسم نے لکھا ہے کہ:۔

"اندر دیگر ان شعور و ابتدائے تمیز و ریانت امور ...... و اکثرے از احیان و بیشترے از آوان تحریر ظرفے از احوال

[1] مطبوعہ نسخہ دو جلدوں پر منقسم ہے۔ دوسری جلد کا آغاز مرزا عظیم بیگ کے حالات سے ہوتا ہے۔

نخجستہ مآل سخن طرازانِ ہندی زبان و تسطیر شطرے از اشعار آب دار ریختہ گویانِ جادو بیان بخاطر فاتر خطور می نمود اما بنابر رفیق ناشدنِ توفیق و دست بہم ندادنِ اسباب مالیق اقدام بریں امر خطیر نمی فرمود تا آنکہ روزے میمنت افروزے .... بابشارۂ ملہمِ غیبی ..... بحکم السعی منی و الاتمام من اللہ .... با وصفِ تشتتِ بال و تفرقۂ حال کمر ہمت بہ سرانجام مکنونِ خاطر قدیم و انصرام مافی الضمیر دیرینہ بربست و بہ دستیاری قلم جواہر رقم و پامردی کلکِ لآلی سلک بہ آبیاری ایں گلشن ہمیشہ بہار و سیرابیٔ ایں گلستانِ بے خس و خار شروع رفت۔" (صفحہ ۳)

اس ذوق و شوق کے ساتھ ابتدائے کار کے باوجود عدیم الفرصتی اور حالات کی ناساعدت کے باعث مولف کا یہ خواب ایک مدتِ مدید کے بعد شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ اس درمیانی عرصے کا تعین تقریباً ناممکن ہے۔ تذکرے سے اس سلسلے میں صرف اسی قدر معلومات حاصل ہوتی ہے کہ۔

"اتفاقِ تسویدِ ایں حدیقۂ دانش و حدیدۂ بینش بسیار کم می شد و مدت مکث ایں جریدۂ فریدہ و دفتر گزیدہ در صندوقِ غفلت و جامہ دانِ عطلت نہایت بہ طول کشیدہ۔ گاہے حسب الفرصت و حضورِ طبیعت از طاقِ نسیان بزیر آوردہ عروسانِ مفلیش را بایوانِ تدوین نجما نجما ملبس بہ لباسِ فاخرۂ تحریر و مزینِ پوشش کسوتِ تسطیر می نمودم ...... تا رفتہ رفتہ در سنہ یکہزار و دو صد و بست و یک ...... بہ اتمام رسیدہ شدہ بروز سعید

عید الفطر ۔۔۔۔۔۔ بہ اختتام گرائید۔" (صفحہ ۳)

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مجموعہ نغز کی داغ بیل ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء سے کئی سال قبل پڑ چکی تھی۔ اس ضمن میں میر اعظم الدولہ سرور کا یہ بیان غور طلب ہے کہ

"دریں ولا کہ ۱۲۱۹ ہجری است، بہ سبب مطالعۂ ایں مجموعہ (عمدۂ منتخبہ) خود ہم ذوقِ تالیف نمودنِ تذکرہ پیدا کردہ چنانچہ از مولف مسودہ را گرفتہ انتخاب اشعار نمودہ تذکرہ تالیف کردہ است۔"[1]

ہمارے خیال میں "عمدہ منتخبہ" کے مطالعے کے بعد ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں "مجموعۂ نغز" کی بنیاد گذاری کے متعلق سرور کا یہ دعویٰ درست نہیں۔ تاہم سرور کے بیان کی روشنی میں اندازہ یہ ہے کہ وہ اس سے بھی کچھ پہلے اس میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ میر جواد علی خاں ہادی متوفی ۱۲۱۵ھ[2] (۱۸۰۰-۱ء) کے ذکر میں "سلمہ الرحمٰن" اور "خدااش سلامت دارد کہ "بقیۃ السلف" است" جیسے کلمات کی موجودگی ہمارے اس قیاس کو تقویت بخشتی ہے۔ البتہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سرور کے فراہم کردہ مواد سے استفادے کا موقع پا کر وہ اپنی منزل کو قریب تر محسوس کرنے لگے ہوں اور ان کے کام کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی ہو۔ سرور کے حالات میں انھوں نے "عمدۂ منتخبہ" کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کی نظر سے گزر چکا تھا اور وہ اس کے حسن ترتیب سے کافی حد تک متاثر ہوئے

---

[1] عمدہ منتخبہ صفحہ ۱۱۵

[2] عمدہ منتخبہ صفحہ ۱۹۰ و گلشن بے خار صفحہ ۳۳۶

تھے۔ لکھتے ہیں کہ :-

"تذکرۃ الشعراء بسیار خوب نوشتہ و تخم گلہائے رنگیں بہ آئین
ہمیں دریں گل زمیں کشتہ"[1]

سالِ اختتام کے سلسلے میں میر سید علی خاں سید اور تمنا و اللہ خاں
فراق کے مستخرجہ مادہ ہائے تاریخ بھی مولف کے منقولہ بالا قول کی
تائید کرتے ہیں۔ تذکرے کا نام بھی جو در اصل سید صاحب موصوف کی
تاریخی رباعی سے ماخوذ ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل
مسودے کی کیفیت کے بارے میں پروفیسر محمود شیرانی کے اس بیان سے کہ

"یہ مخطوطہ جگہ جگہ سے قلم زدہ ہے۔ جملے اور فقرے مختلف
مقامات سے کاٹے گئے ہیں اور ان کی بجائے نئے جملے اصلاح
شدہ شکل میں لکھے گئے ہیں۔ مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت
بے شمار موقعوں پر حاشیے میں نئے اضافے داخل کئے ہیں۔
الفاظ میں حک و ترمیم سینکڑوں موقعوں پر نظر آتی ہے۔ کئی
مقام پر عین متن میں جگہ چھوٹی ہوئی ہے ایک صفحہ ختم ہو چکا
ہے اور بجائے دوسرے صفحے پر لکھنے کے پہلے صفحے کے حاشیہ
پر سلسلۂ کتابت جاری رکھا گیا ہے"[2]

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قاسم ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء کے بعد بھی موقعہ بہ موقعہ اور "وقتاً فوقتاً"
متن میں حسب ضرورت تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے ہیں لیکن دوسرے کئی
تذکروں کے برخلاف "مجموعہ نغز" میں ایسے قرائن تقریباً مفقود ہیں جن کی مدد سے

---

[1] مجموعہ نغز، صفحہ ۲۹۵ جلد اوّل

[2] مجموعہ نغز، مقدمہ مرتب صفحہ ۱۳

یہ اندازہ کیا جا سکے کہ ترمیم و تنسیخ کا یہ سلسلہ کس زمانے تک جاری رہا ہے البتہ ایک جگہ مرزا رفیع سودا (متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) خواجہ میر درد (متوفی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۶ء) اور میر تقی میر (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کے ناموں کے ساتھ "علیہم الرحمۃ من اللہ السمیع البصیر"[1] کا دعائیہ کلمہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ عبارت میر کی وفات یعنی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کے بعد معرض تحریر میں آئی ہے۔

قاسم نے عمدۂ منتخبہ کے علاوہ دریافت احوال و انتخاب اشعار کی غرض سے دوسرے معاصر تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ شرف الدین علیخاں پیام کے حال میں لکھتے ہیں کہ "خان آرزو و علی قلی خاں والہ احوالش در تذکرہ ہائے خود بہ شرح و بسط رقم زدۂ کلکِ حقائق سلک نمودہ" (صفحہ ۱۲۰) میر کے ذکر میں لکھا ہے کہ "در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ" (صفحہ ۱۰) سعدی دکنی کے حال میں رقم طراز ہیں کہ "سودا در تذکرۂ خود اشعار ایں سعدی دکنی را ۔۔۔۔ بہ شیخ شیراز ۔۔۔۔۔۔ نسبت نمودہ" (صفحہ ۲۹۸) ان اقتباسات نیز دوسرے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ضروری مواد کی فراہمی کے سلسلے میں خان آرزو کا "مجمع النفائس" والہ داغستانی کا "ریاض الشعرا" میر کا "نکات الشعرا" اور سودا کا نامعلوم الاسم نایاب تذکرہ بھی قاسم کے پیش نظر رہا ہے اسکے علاوہ خوب چند ذکا، قدرت اللہ قدرت رام پوری (شوق سنبھلی) اور مصحفی امروہوی کے تصنیفی کارناموں کی تفصیلات ان شعراء کے تذکروں سے بھی ان کی باخبری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

تذکرے کا جامع اور بسیط مقدمہ جن مباحث و مسائل پر مشتمل ہے ان کے

---

[1] مجموعہ نغز: مقدمہ مولف صفحہ ۱۱

ضمن میں تاسم نے کلام موزوں کے لئے ارادے کو شرط اولیں قرار دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی زبان یا قلم سے غیر ارادی طور پر ایسی کوئی عبارت یا جملہ معرضِ وجود میں آجائے جو وزن و بحر کے سانچے میں ڈھلا ہوا تو ان کے نزدیک اسے شعر کی تعریف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ فرماتے ہیں کہ:-

"بہر زبانے کہ کلام موزوں بر قواعد شعریہ یا بند شعر نامند مگر آنکہ [illegible] متکلم نباشد، گویندہ بر آن شعر را دنداردنہ ... ازینجاست کہ کلام اللہ تعالیٰ شانہٗ مانند لن تنالوا البر حتی تنفقوا ... ... وسخنِ صاحبِ الشرع علیہ الصلوات الزاکیات ... ... و ما بنا سہا را شعر نہ گویند" (صفحہ ۷)

تاریخی نقطۂ نظر سے فنِ شعر گوئی کی قدامت کے سلسلہ میں تاسم اس روایت کے مقلد ہیں کہ اس کی ابتدا ابو البشر حضرت آدمؑ کے اس مرثیے سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے ایک بیٹے قابیل کے ہاتھوں دوسرے بیٹے ہابیل کی موت پر کہا تھا اس کے بعد سے تاریخ انسانی کے ہر دور میں اس زمانے کے اہلِ کمال اس میدان میں اپنی طباعی کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ خاص طور پر عہدِ جاہلیت کے عرب شعراء نے اپنے قصائد کے ذریعے اس فن کو منتہائے عروج تک پہنچا دیا تھا۔ طلوعِ اسلام کے بعد حسان بن ثابت نے بھی رسول اللہ کے حسب الحکم شعرائے کفار سے معرکہ آرائی کے لئے اسی مقبول عام وسیلۂ ابلاغ کا سہارا لیا۔ عرب کے برخلاف ایران میں شاعری کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ تاسم کے خیال میں شعر فارسی کی ابتدا مشہور روایت کے بموجب بہرام گور کے ایک فخریہ مصرعے ع "منم آن پیل دمان و منم آں شیر یلہ" پر اس کی محبوبہ دلارام کے پہنچائے ہوئے مصرعۂ ثانی "نام بہرام

ترا از بدرت بد جلد؛ سے ہوتی ہے لیکن فارسی شاعری کا عہد زریں در اصل شیخ سعدی سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے غزل کو آب و رنگ تازہ عطا کیا اور ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی

عربی و فارسی کے شعری ادب پر گفتگو کا یہ سلسلہ اردو شاعری کے متعلق اظہار خیال پر منتہی ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس زبان میں اگرچہ ایک صاحب دل بزرگ حضرت اویس المخاطب بہ محمد کاسہ لیس کے کچھ منظوم ارشادات بھی موجود ہیں اور بعض اشعار علی اختلاف الروایتیں سعدی شیرازی یا سعدی دکنی سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ طبع آزمائی اور تدوین کلام کے لحاظ سے اس میدان میں ولی کو شرف اولیت حاصل ہے۔ ان کے زمانے میں اور اس کے بعد اس سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی اس کی رفتار اور نوعیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"گفتن سخن از ہر دو رو تدوین دیوان مردف بحیر از شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی صورت بستہ با بجملہ در عہد آن مغفور و بعد زمان آن مبرور در دکھنیاں می گفتند آنچہ می گفتند و در حضرت دہلی ہم شاہ مبارک آبرو و غیر آں نیک خو بزبانے کے دانستند بیشتر بے بطریق ایہام می رفتند تا رفتہ رفتہ نوبت بہ نکتہ پیرائے ہنر گستر مرزا جان جاں مظہر رسید۔ وے علیہ الرحمہ ایں زبان را بہ خراط کشید اما سرآمد سخن سنجان فصاحت اما مرزا محمد رفیع سودا و مضامین سخن سازی را یکہ تازمرد خواجہ میر درد و شاعر بے نظیر محمد تقی میر علیہم الرحمۃ من اللہ السمیع البصیر آنچہ گفتند کہ "چہ بگویم نمی تواں گفتن"۔ طرز و انداز سخن از سعیٔ ایشاں صورت

بست و نقش سخن بر روی فصاحت طراز از رنگ زود و انیان در ست
نشست و طریقے کہ بہ زبان ما بہ ظہور رسیدہ و بہ معاملہ موسوم
گردیدہ۔ یا ان کہ بعضے بزبانِ نوال سخن گو یند و در این سرزمین
رخشِ ہمت می پویند، آنچہ ہست ہست"۔ (صفحہ ۱۰ تا ۱۱)

آگے چل کر "بزرگی سخن آرائی و بلند پایگی نکتہ پیرائی" کے زیر عنوان
قاسم نے شاعری کو دیگر فنون سے بلند تر ثابت کرنے کے لئے مختصر
دلائل پیش کئے ہیں۔ ان کے نزدیک ارشادِ ربانی "ان من الشعر لحکمۃ" اس
فن کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ حقیقت بھی کہ کلام رب العلا
کے سوا نطق و بیان کا کوئی بھی شاہکار اس کی قدر و قیمت کو گھٹا نہیں
سکتا، اس کے امتیاز اور برتری پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس
کے تفوق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ، جناب فاطمہ زہراؓ اور شیخ
عبدالقادر جیلانی "جیسے" اساطین ایوانِ دین" اور "عرفائے صاحبِ
یقین" نے اپنے افکار عالیہ سے اس کے دامن پر عرفان و انتخاد کے پھول
ٹانکے ہیں۔

اس کے بعد "احترام اہلِ سخن اور بزرگ داشتِ اصحابِ فن" کا عنوان قائم
کر کے بارگاہِ رسالت سے شعرا کی صلہ یابی اور عرب، ایران اور ہندوستان
کے مختلف سلاطین و امراء کے درباروں میں ان کی قدر و منزلت کے بعض
واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اسی سلسلۂ گفتگو میں اس "تلخ حقیقت" کی
طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

" از ان کہ ایں فن شریف بنا بر کثرت انعام و احسان بزرگان خاصہ
میرزا حسین و میر علی شیر نوائی علیہم الرحمۃ و الغفران بہ دست

"جاہلان افتاد، بہجوم عامیان مرتبۂ این فرقہ را شکست فاحش داد۔ ع ہر چیز کہ بسیار شود، خوار شود ......" (ص ۱٦)

آخر میں اپنے زمانے میں شعر و ادب کی پست معیاری، کساد بازاری اور ارباب کمال کی ناقدری و کس مپرسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"از حال این زمان چہ برطرازم و انتحال و نقال این دوران چہ برنگارم کہ دریں ماتم خامہ سینہ چاک نمودہ جامہ سیاہ می کند و کاغذ جگرپارہ فرمودہ شکن بر پیشانی می افگند۔ ہر سو کہ می نگرم شاعرے بینم و ہر طرف کہ گوش فرامی کنم زمزمۂ شعری شنوم و طرفہ ایست کہ با این ہمہ نا اہلی ہا ہر یک دم از ملک الشعرائی می زند و خود را ہمسر بلکہ برتر از دانایان این فن می شمرد ...... و معہذا قدردانی ہم بدرجہ رسیدہ کہ اگر استاد رودکی ہشتاد ہزار کلیلہ و منہ بروئے کار آرد بشیزے در جائزہ نیابد و خاقانی شروانی اگر ہزاران ہزار قصاید حکیمانہ بہ گوناگوں صنائع در مدح کسے سرانجام دہد، دامے در صلۂ آن بدو نرسد بلکہ مورد تحسین و مرتبع آفریں ہم نگردد۔" (صفحات ۱٦، ۱۷)

اس عبارت پر مقدمے کے اختتام کے بعد اصل کتاب اس انداز سے شروع ہوتی ہے کہ اس کے پہلے ہی صفحہ کا مطالعہ ہمیں مولف کی سلیقہ مندی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔ تذکرے کو قارئین کے لئے سہل الاستفادہ بنانے کی غرض سے قاسم نے اسے جتنے بہتر اور باقاعدہ

طریقے سے مرتب کیا ہے، اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ انھوں نے ایک خاص نظم کے تحت اولاً ان شاعروں کا ذکر کیا ہے، جن کے متعلق وہ اپنی ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں بقدر ضرورت یا حسب خواہش معلومات کے حصول میں کامیاب ہو گئے تھے اس کے برخلاف جن لوگوں کے بارے میں ان کی معلومات نامکمل اور محتاج تفصیل تھیں یا جن کے حالات و کلام تک بعد میں رسائی حاصل ہوئی تھی انکے تراجم تکملے کے طور پر کتاب کے آخر میں شامل کئے گئے ہیں۔ شاعروں کے درمیان سلسلہ وار ترتیب حروف تہجی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے جس میں تخلص کے حرف اول کے ساتھ حرف دوم کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

قاسم کے اس طرز خاص کی باقی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(الف) ہر ردیف کی ابتدا میں اس کے تحت متذکرہ شعرا کی تعداد واضح کر دی گئی ہے۔

(ب) ہم تخلص شعرا کی تعداد بالتفصیل درج کی گئی ہے اور ان کا ذکر کرتے وقت یہ بتا دیا گیا ہے کہ ان میں سے کتنے اصل متن میں شمولیت کے مستحق قرار پائے ہیں اور کتنوں کو تکملے کے تحت جگہ دی گئی ہے۔

(ج) مجموعی طور پر نمونہ کلام میں پیش کئے گئے اشعار کی تعداد اور صنفی نوعیت بیان کر دینا بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔

(د) ضمناً غیر متعلق شعراء کے جس قدر اشعار نقل ہوئے ہیں ان کی کیفیت علیحدہ قلم بند کر دی گئی ہے۔

اس حسن التزام کی وضاحت اور اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ

کرنے کے لئے ردیف الف کی تمہید ملاحظہ ہو۔

"در طے ایں حرف ذکر شصت (۶۰) سخن گو کہ سہ کس از ایشان آرام تخلص می کنند و دو کس آشفتہ و چار عزیز بہ احمد متخلص اند و سہ بہ احسن و دو کس را از ما آن تخلص است و دو را اصغر و دو شخص را افوس تخلص اختیار افتادہ و دو را اکبر و دو بزرگ امیر تخلص گزیدہ اند و سہ امین، اندراج یافتہ و مجموع اشعار شعرائے شصت گانہ کہ در تحت اسامی ہائے شان بالذات و استقلال مندرج گشتہ یک بند مخمس و دو بند ترجیع بند و یازدہ رباعی و پنج صد و ہفتاد و چار شعر متفرقہ سہ مقطعات است و یک مصرع اشرف ندیمی بہ تضمین شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی و یک مطلع میر انشاء اللہ خاں انشا و یک بند مخمس مرزا عظیم بیگ و یک قطعہ دوبیتی شیخ ولی اللہ محب بالعرض و تقریباً اندراج یافتہ" (صفحہ ۱۷)

قاسم کے آداب نگارش کا یہ پہلو بھی بالکل منفرد اور بطور خاص قابل ذکر ہے کہ انھوں نے بعض ممتاز شاعروں کے لئے ان کے تخلص کے ہم قافیہ فقروں کی شکل میں کچھ القاب مقرر کر دئے ہیں جن کی شمولیت کے بغیر وہ ان کا نام لینا سوء ادب خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ فقرے بہ ادنی تغیر شروع سے آخر تک اکثر جگہ دہرائے جاتے رہے ہیں، مثال کے طور پر خان آرزو بیشتر "روشن زبان بدیہہ گو" یا "سخن سنج بدیہہ گو" کے لقب سے یاد کئے گئے ہیں اور خواجہ میر درد کو "مضمار سخن سازی رائحہ تازہ درد، خواجہ میر درد" یا سخن سنج روشن ضمیر حضرت خواجہ میر" کہا گیا ہے اس

قسم کی کچھ اور مثالیں درج ذیل ہیں۔

حاتم :- استاد اکثرے از سخن سنجان عالم شیخ ظہور الدین حاتم

سودا :- سرآمد شعرائے فصاحت آما، مرزا محمد رفیع سودا۔

سوز :- شاعر فصاحت افروز، محمد میر سوز۔

فراق :- دوستدار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔

مظہر :- سخن سنج ہنر گستر مرزا جان جاں مظہر۔

میر :- سخن سنج بے نظیر، محمد تقی میر۔

ہدایت :- استادِ صاحب درایت، ہدایت اللہ خاں ہدایت

ولی :- شاعر شانِ جلی المتخلص بہ ولی۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی عرض کیا جا چکا ہے قاسم نے شعرا کے حالات و کلام کی فراہمی کے مقصد سے بیشتر قدیم اور معاصر تذکرے پیش نظر رکھے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دوسرے تمام ذرائع و وسائل سے بھی حسب موقع مدد لی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی وہ اس حیثیت سے اپنا امتیاز برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں کہ نہ تو انھوں نے دوسروں کے بیانات کو بے چون و چرا قبول کر کے کورانہ تقلید کا ارتکاب کیا ہے اور نہ کسی پیشرو تذکرہ نگار کے مختتم فیصلے یا ذاتی رائے سے مرعوب یا متاثر ہو کر مزید غور و فکر کے دروازے بند کئے ہیں بلکہ بعض جگہ تحقیق اور آزادانہ رائے زنی سے کام لے کر اصل حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہو مثلاً میر محمد باقر حزیں کے ذکر میں سرور کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اشعارے کہ خان رفعت نشان اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر در تذکرۂ خود بنام محمد علی حزیں تخلص نوشتہ اند، از آنِ میر باقر

حزیں است"۔ (جلد اول صفحہ ۲۰)

سعدی دکنی کے بارے میں میرزا سودا کے بیان پر جو ان کے متعلق پھیلی ہوئی عام غلط فہمی کا نتیجہ ہے اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

"منطنۂ بیشتر ے از سخن پیرا خصوص سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا نظر بر اتحاد تخلص آں کہ ایں سعدی ہموں سعدی شیرازی است قدس سرہٗ کہ وارد در بار دکن شدہ و شعر ریختہ از طبع وقاد آں قدوۂ متغزلانِ ریختہ چنانچہ در تذکرۂ خود اشعار ایں سعدی دکنی را عفی اللہ عنہ بہ شیخ شیراز علیہ الرحمۃ والغفران نسبت نمودہ" (صفحہ ۲۹۸ جلد اول)

یقین کے ذکر میں پورے وثوق اور جراءت کے ساتھ ان کے کلام کے بارے میں صاحب نکات الشعراء کے معروف بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

شاعر بے نظیر محمد تقی میر در تذکرۂ خود قلمی نمودہ کہ دیوان وے از آں مرزائے مغفور (مرزا مظہر جانجاں) است افترائے محض و کذب خالص است کہ از مر حد از وے سرزد، الحق غزلہا بدیہہ بحضور سراپا سرور، آگاہ رموز خفی و جلی سید فتح علی خاں حسینی دام ظلہم گفتہ"۔ (صفحہ ۲۵۵ جلد دوئم)

تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع، دلچسپ اور مفید و کارآمد بنانے کی غرض سے قاسم نے شعرا کے تعارف میں حتی الامکان ان کے وطن، مقام پیدائش، حسب و نسب، اخلاق و عادات، مذہبی عقاید، علمی استعداد سلسلہ تلمذ، مشاغل زندگی اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کے متعلق تمام ضروری

معلومات یکجا کر دینے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن ولادت و وفات، اور دوسرے اہم واقعات زندگی کے سلسلے میں سنین کے تعین سے بے نیازی کے باعث یہ کامیابیاں اس سرحد کمال کو نہیں چھو سکی ہیں جہاں تذکرہ نویسی تاریخ ادب کے لئے چراغ راہ اور نشانِ منزل بن جاتی ہے۔ بہر صورت تذکرے کے مختلف اوراق سے اس تعارف نگاری کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کی صحیح کیفیت کا اندازہ ہوگا۔

(الف) خواجہ احسن اللہ خاں بیان کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:-

"وے در اصل از خطۂ دلپذیر کشمیر و شاگرد رشید سخن سنج ہنر گستر مرزا جانِ جاں مظہر علیہ الرحمۃ والغفران و مرید سعید قدوۃ العارفین مولانا محمد فخر الدین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ است در آخر ہا ندرے تحصیل علم صرف و نحو ہم نمودہ و خاکپائے طلبائے جہاں اعنی تا سم ہیچمدان سراپا نقصان بکرار سبق خود بیشتر بلکہ بلاناغہ می فرمود ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیشہ بعمدگی و خوبی ایام بسر کردہ۔ از چندے بہ حیدر آباد در سرکار ناظم آن بلاد ملازم بود۔ مدتے است کہ از احوال غیر مآلش اطلاع نیست" (صفحہ ۱۲۴ جلد اول)

(ب) شاہ حاتم کے حالات ڈیڑھ صفحے کو محیط ہیں جن میں انکی شخصیت اور زندگی کے تقریباً تمام پہلو زیر بحث آگئے ہیں۔ بعض اہم اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"وے از سکنائے شاہجہان آباد ۔۔۔۔۔۔۔ بود

در اوائل حال بہ سپاہ گری ایام بسری برد۔ و در آخرہا بہ ہدایت سعادتِ ازلی در ہنموئی مشیتِ لم یزلی تعلقاتِ دنیوی را خیرباد گفتہ مشتِ خاکِ خود بدامانِ اہلِ دل بربست ...... در آخرہائے روز مدام بہ تکیۂ خانۂ تسلیم کہ بر شاہراہ راج گھاٹ زیر دیوار قلعہ مبارک واقع است، تشریف شریف ارزانی می داشت۔ و بر خلاف آزادان بیمہ می پوشید و بسیار با نظافت و طہارت می زیست و گرد مسکرات نمی گشت و بصوم و صلاۃ و سائر آزادانہ بر کلاہ می بست و چوبک باریک در دو مالی کہ شعار آزادی است با خویش می داشت .... و در دیباچہ دیوان نام چہل و پنج کس از شاگردانِ خود برشتۂ تحریر کشیدہ۔ سرآمدِ شعرائے فصاحت آ میرزا محمد رفیع سودا ہم در آں سلک منسلک است۔ از انصاف گستریش چہ بر طرازم استاد سراپا درایت ہدایت اللہ خاں ہدایت عفی اللہ عنہ می فرمودند کہ بارہا از زبانِ نصفت بیانِ آن استادِ دوران شنیدہ ام کہ ایں مصرعہ می خواند ع رتبۂ شاگردی من نیست استادِ مرا، و می گفت حقا کہ ایں در حق استادی من و شاگردی مرزا است!!

(صفحات ۱۷۹ و ۱۸۰ جلد اول)

میر حسن کے تذکرہ میں اگرچہ مرزا رفیع سودا سے اکتساب فیض کے متعلق قاسم کا بیان درست نہیں اور ان کے تذکرۂ شعرا سے بے خبری بھی باعثِ حیرت ہے تاہم دوسری تفصیلات اختصار کے باوجود تذکرہ نگاری کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کر دیتی ہیں لکھتے ہیں کہ

"میر غلام حسن خلف الصدق میر غلام حسین ضاحک اصلش از ایران و مولدش ہندوستان جنت نشان است در سید واڑہ دہلی کہنہ تولدش واقع شدہ۔ گردش دورِ دوارِ وے را بہ دیارِ مشرق انداختہ در فیض آباد بملازمِ سرکار سردار جنگ خلف رشید نواب سالار جنگ گشتہ۔ شاگرد رشید میر ضیاء الدین ضیا است و از خدمتِ سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا ہم استفادہ نمودہ۔ مثنوی بے نظیر و بدر منیر بے نظیر گفتہ .....
..... بیرون ازیں مثنوی در ہجو بلدۂ لکھنؤ و مدح شہر فیض بہر فیض آباد ہنگامہ در سرگذشت راہ کہ ہمراہِ نیزہ ہائے شاہ مدار قدس سرہٗ راہی آں دیار شدہ بسیار خوب و پاکیزہ گفتہ"

(صفحات ۲۰۲ ، ۲۰۳)

"عیار الشعرا" کے مولف خوب چند ذکا کے حال میں دہلی پر احمد شاہ ابدالی کی یورش کے دوران ان کے خاندان کی تباہی و بربادی اور انتشار و ابتری کے متعلق یہ تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔

"در افراط و تفریطے کہ بہ ہنگامہ افاغنہ ابدالی بحضرت دہلی رو داد، اکثرے از نیاکانش بپاس ناموس عیالِ خود را جوہر نمودہ خود بمعرض ہلاک در آمدند و بعضے از نسوان بہ لحاظ عصمت بچاہِ افتادہ جان بہ جان بخش دادند و برخے از اناث و ذکور پامردی خود جان از مہلکہ جان ستان بسلامت بردہ انجمان و خیزاں از جور عام کہ مسکن ایشاں بود، بشہر لکھنؤ افتادہ بود۔ از اں جہت کہ ایں فتنۂ عام فرد نشست و آتش بلاکہ سر بہ بالا کشیدہ بود پست

گشت، گرد ہے ازاں رخت سفر بربستہ بہ عظیم آباد رحل اقامت انگند و شرذمۂ بہ شاہجہاں آباد صانہا اللہ عن الشر والفساد سکونت ورزیدند" (صفحہ ۲۶۰۔ جلد اول)

سعادت یار خاں رنگین کے حالات بھی کافی تفصیل سے لکھے گئے ہیں جن میں ان کی زندگی اور شعری و نثری کارناموں کے متعلق مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس ترجمے کے بعض اہم حصے یہ ہیں:۔

"وے رومی الاصل است اگرچہ مسقط الراسش خاک پاکِ ہندوستان جنت نشاں واقع شدہ پدرش محکم الدولہ طہماس خان بہادر اعتقاد جنگ ۔۔۔۔۔۔ بہ ترفہ تمام و آسودگی تمام زندگی می کرد و خورش نیز بعزو امتیاز ملازم شاہزادہ ہائے والا قدر و امرازادہ ہائے ثروت ہم سر فراز ماندہ اما از یک چند ترکِ آں نمودہ کردہ گوشہ نشین زاویۂ عزلت است۔۔۔۔

۔۔۔۔ نسبت تلمذ بہ شیخ ظہور الدین حاتم دارد و بعد رحلت آں مرحوم بہ میاں محمد اماں نثار کہ شاگرد رشید شاہ حاتم مغفور است۔ توسل جستہ۔ بہ میر انشاء اللہ خاں انشا ہم صحبت داشتہ چار دیوان مرتب دارد کہ من جملہ آں ہا یکے تمام غزل در غزل ریختہ ہمگی ہزل و یکے بتمامہ بزبانِ زنانِ گفتہ۔ و در دیوانِ ہزلیات قصیدہ در مدح شیطان لعین انشاد نمودہ و بجائے تسمیہ نعوذ باللہ از آں جا قبت فرمودہ و بیرونِ مثنویات چند از دیگرے بر صفحہ روزگار ثبت افتادہ و رسالۂ نثر کہ بہ مجالس رنگین موسوم ساختہ در اکثرے از اہل سخن تا شیخ شیراز علیہ الرحمۃ والغفران

بزعم خود دوران دخل پر بجا کردہ تصنیف نمودہ۔"

(صفحہ ۲۷۸ - جلد اوّل)

قاسم نے حالاتِ زندگی کی فراہمی کے پہلو بہ پہلو سیرت و شخصیت کے تجزیے اور محاسنِ عادات و مکارمِ اخلاق کی تحسین پر بھی کافی زور دیا ہے۔ وہ تہذیب و شائستگی، پاکیزگی و پرہیزگاری، نیک خلقی و نیک مزاجی، حیت و مروت، خوش کلامی و خوش اخلاطی اور خندہ جبینی و زندہ دلی کے مداح اور قدر شناس ہیں۔ چنانچہ جہاں بھی ان میں خوبیاں نظر آتی ہیں انھوں نے دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ ان اوصاف سے عاری و محروم تھے، ان کی حالت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ لیکن اس طرح اچھائی یا برائی کے ساتھ صرف انھیں شاعروں کو یاد کیا گیا ہے جنھیں خلوت و جلوت میں بارہا دیکھنے اور انکے مزاج و طبیعت کو سمجھنے کا موقع ملا ہے یا جن کے حالات تک معتبر و مستند روایات کے ذریعے رسائی حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ بیانات بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں:

(الف) میر محمدی بیدار:-

"ظاہرش بہ لباسِ فقر او درویشان آراستہ و باطنش بہ صلاح و تقوی پیراستہ خوش گو شیریں گفتار پاکیزہ خو، فرشتہ کردار۔" (صفحہ ۱۱۸ جلد اوّل)

(ب) خواجہ حسن دہلوی:-

"بہ حلیۂ علم و حلم آراستہ و بہ زیورِ فضل و کمال پیراستہ، صوفی مشرب، فقیر نہاد، پاکیزہ مذہب خدا یاد، درویش باطن

تونگر ظاہر .... باایں ہمہ شکوہ و تمول کہ دارد بغایت خوش اختلاط و افتادہ افتادہ" (صفحہ ۲۰۵ جلد اول)

(ح) میر اعظم الدولہ سرور :-

" جوانیست خوش طبع، کشادہ پیشانی، نیک اختلاط، پاکیزہ زندگانی، شیریں گفتار، عذوبت بیان، نیکی کردار وافت نشاں محبت دثار مروۃ منش مودت شعار فتوۃ روش، صاحب نفس سلیم، مالک طبع مستقیم، معانی فہم، نکتہ یاب عالی طبع خوش خطاب" (صفحہ ۲۹۴ جلد اول)

(د) مصحفی امروہوی :-

" عزیزے نیک سیرت مسکین نہاد، خوش خو، خوبی نژاد متواضع، باادب، مرتبہ شناس، مہذب، خلیق و شگفتہ پیشانی باتمکین و پاکیزہ زندگانی واقع شدہ" (صفحہ ۱۸۹ جلد دوئم)

(ہ) ہدایت اللہ خاں ہدایت :-

" بزرگے بود درویش دل سنجیدہ اشتغال، سالک راہ، خدا آگاہ مسکین نہاد والا نژاد، سراسر حلم، سربسر حیا، یک سر ہر یک قلم وفا نیک محضر، پاکیزہ سیر، محبت پرور، مروۃ گستر، صاف دل، یک رو صفائی طینت، زخندہ خو، بردل کسے از وے غبارے نہ بہ فخر احدے از و عارے۔ تاہم ہیچمدان سراپا نقصان با وصف صحبت متوفی در عرض چہل سال تخمیناً گاہے ندیدہ کہ از وے کسے رنجیدہ یا بہ دل کسے از دستش آزار رسیدہ"

(صفحہ ۳۱۷ جلد دوئم)

(د) مرزا عظیم بیگ عظیم :-

"بیار صاحب غیرت و عزت .... دوست نواز، دشمن گداز، مروت نہاد فتوت بنیاد، محبت پرور، مودت گستر ظریف مزاج، صاحب ابتہاج یک رو، کشادہ ابرو بود۔"

(صفحہ ۱ جلد دوم)

انشا کے خلاف معرکہ آرائیوں میں میرزا عظیم بیگ اور قاسم کی رفاقت کے پیش نظر ممکن ہے اس تعریف و توصیف کو حق دوستی کی ادائیگی سے تعبیر کیا جائے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ قاسم کو صرف عظیم کی خوبیوں ہی کا تجربہ نہ تھا وہ ان کی خامیوں سے بھی پوری طرح باخبر تھے اور ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی کا احساس بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ باہمی رابطہ تعلق اور محبت و اخلاص کے رشتے انھیں اس حقیقت کے اظہار سے نہیں روک سکتے ہیں کہ :-

"خیال شاعری در کاخ دماغش چنان پیچیدہ بود کہ خود را صائب ہندی می پنداشت و شعر ہیچ متنفسے در میزان طبعش از خود سری ہا وزنے نہ داشت۔" (صفحہ ۲ جلد دوم)

(ز) میر کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور بدمزاجی کے متعلق قاسم نے اپنے تجربات و مشاہدات ان الفاظ میں نظم بند کئے ہیں :-

"از کبر و غرورش چہ برطرازم کہ حدے ندارد و از نخوت و خود سریش چہ بر نگارم کہ سینۂ قلم حقائق رقم نمی نگارد۔ بر شعر کسے گر ہمہ اعجاز باشد و کلام شیخ شیراز باشد، سر ہم نمی جنباند تا بہ تحسین خود چہ رسد زبہ سخن احدے اگرچہ معجز طرازی

بود، گفتۂ اہلِ شیرازی گوش ہم فرانمی آرد۔ امکان چیست
کہ حرفِ آفریں بر زبانش رود۔۔۔۔۔۔۔"

(صفحہ ۲۳ جلد دوئم)

میر صاحب کی خود سری اور متکبر مزاجی کے خلاف اس اظہار ناپسندیگی
کے باوجود قاسم نے انصاف پسندی اور اصول پرستی کے تقاضوں
کے عین مطابق ان کی استادی اور شاعرانہ عظمت کا کھلے دل سے
اعتراف کرتے ہوئے انھیں شعرائے اُردو کی صف میں ایک نمایاں
مقام کا مستحق قرار دیا ہے:

(ح) سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنے دور کے نوجوان شعرا
کی تربیت اور اردو زبان اور شاعری کی تہذیب و ترقی میں جو نمایاں کردار
ادا کیا ہے اس کی بنا پر وہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک قد آور
شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاسم نے ان کی علمیت اور اخلاق کی
تعریف کے ساتھ ساتھ اس پہلو کو بھی بطورِ خاص اجاگر کرنے کی
کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"از جادہ طرازانِ سحر بیان و استادانِ نکتہ دانِ خاکِ
پاک ہندوستان۔۔۔۔۔۔۔۔ واقف فروع و اصول
ماہر منقول و معقول۔۔۔۔۔۔۔ بہ اوصافِ حمیدہ موصوف
بہ اخلاقِ پسندیدہ معروف نکتہ سنج شیریں زبان، ظریف الطبع
عذب البیان بود۔۔۔۔۔۔ نسخہ پرداز ایہام گوئی میاں
آبرو، سر آمد سخن سنجان خوش نوا میرزا محمد رفیع سرداد مملکت
سخن سازی را کہ تا از فرزند خواجہ میر درد و شاعر بے نظیر

محمد تقی میر من جملہ فیض اندوزان آں گیہان خدیو سخن پردازی اند بمثابہ کہ علماء حق را داست برکاتہم عیالِ امام ہمام قبلۂ انام ابوحنیفہ کوفی رضی اللہ عنہ می گویند، اگر شعرائے ہندی زبان را عیالان خان آرزو گویند می سزد" (صفحہ ۲۴ جلد اول)

(ط) ولی کو ایک مدت دراز تک اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا رہا ہے۔ یہ بات اس حد تک آج بھی صحیح ہے کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنی فکر کی بلندی، زبان کے جادو، طرز ادا کے بانکپن اور اسلوب کی لطافت سے "ایک لیچر سی بات" کو ہمارے ادب کا محبوب ترین سرمایہ اور قابلِ فخر شاہکار بنادیا اور ہم عصر شعراء کو اردو میں طبع آزمائی کے لئے بے پناہ امکانات کا شعور عطا کرکے فکر و فن کے تیز دھارے ایک نئے میدان کی طرف موڑ دیئے۔ قاسم کے نزدیک ان کی شخصیت کی عظمت اور انفرادیت کی یہی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

"بہ آئینے کہ از قدوۂ متغزلانِ سخن پرداز شیخ شیراز قدس سرہٗ در بہ غزل از کنم عدم بہ منصۂ ظہور جلوہ گر شد، تدوین دیوان ریختہ مردف و مملو انواعِ سخن و مشحونِ اقسام امور ایں فن از ولے بہ صفحۂ روزگار ثبت افتاد اگرچہ اشعار متفرقہ ریختہ پیش از وے .... از طبع .... دیگر سخن سنجان ہم ریختہ ماندہ بین جملگی انحاء شعراز وے بہ ظہور پیوستہ۔ مختصر کلام حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی ثابت است۔" (صفحہ ۱۹۰)

ان مثالوں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قاسم نے ایک بااصول سیرت نگار کی حیثیت سے اپنی غیر جانبداری اور انصاف

پسندی کو بہر صورت برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہ تو معاصرانہ چشمک یا ذاتی مخاصمت و پرخاش کی بنا پر کسی شاعر کے معایب سیرت و اخلاق کا پردہ فاش کیا ہے نہ تنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی کے مکارم صفات اور کارناموں کے اعتراف میں کوئی کسر چھوڑی ہے اور نہ ذاتی تعلقات اور مراسم کی بنیاد پر بے جا تعریف و تحسین کو اپنا شعار بنایا ہے۔ یہ دیانت داری اور غرض شناسی تذکرے کی تحریر کو ایک وزن عطا کرتی ہے جو ان کی انفرادیت اور امتیاز کا ضامن ہے۔ سیرت نگاری اور شخصیت کی مرقعہ کشی کے برخلاف تنقید کلام کے معاملہ میں تذکرے کا رویہ مایوس کن ہے۔ انھوں نے شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں کے معیار و منہاج اور ان کے سرمایہ افکار کی لسانی و بیانی خصوصیات کے متعلق اظہار خیال پر وہ توجہ صرف نہیں کی ہے جس کی ان جیسے ذی علم اور صاحب نظر ادیب سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے چنانچہ اس تذکرے میں بغیر کسی رائے کے اشعار پیش کر دینے کی روش عام ہے اور اگر کسی جگہ کوئی رائے ظاہر کی بھی گئی ہے تو اس کا انداز بالعموم اس قسم کا ہے۔

(الف) میر کلو شاعر:۔ " مذاق گفتارش بسیار شیریں، طرز اشعارش نہایت دل نشیں "۔ (صفحہ ۲۳۵۔ جلد اول)

(ب) میر محمدی ثروت:۔ " کلامش پختہ و با کیفیت است خیال بندی بہ خیالش خیلے جا داشت "۔ (صفحہ ۳۴ جلد اول)

فتح علی شیدا:۔ " شعرش نہایت پختہ و با کیفیت است "

(صفحہ ۳۵۶۔ جلد اول)

شاہ گھسیٹا عشق:۔ " شعرش با کیفیت و تصوف آلودہ و پرمزہ و

درد آموده است"۔ (صفحہ ۲۸۴۔ جلد اول)

انعام اللہ خاں یقین :۔ "طرزِ نوی بدستش افتاد، انداز جدید را رونق تازه داده۔ ہمیشہ غزل پنج بیتی می گفت، اما بہ طرز نمکین در معنی می سفت"۔ (صفحہ ۳۵۵۔ جلد دوئم)

یہ مجمل و مختصر تنقیدی اشارے بھی "النادر کالمعدوم" کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ شاعروں کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ صفِ اول و دوئم کے بعض نامور اساتذہ اور ممتاز فن کار جن کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس امتیاز کے مستحق قرار پائے ہیں کہ ان کے کلام کی منفرد خصوصیات کو نسبتاً نمایاں اور واضح طور پر بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ شاہ مبارک آبرو کے ذکر میں ان کی شاعری اور اسکے ضمن میں اس زمانے کے بعض مخصوص فنی و لسانی تصورات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

"در طرز گفتار حسب رواج آن وقت بیشتر بہ ایہام گوئی صرف ہمت می نمود۔ وجود الفاظ منکره و عدم مبالات تنگی الفاظ و جواز قافیۂ سین و صاد و امثال آں در کلامش و کذالک در اشعار معاصرانش زیاده بر اں است کہ بہ تحریر در آید۔ اما در شاعری این بزرگان علی تفاوت المراتب ہیچ شک شبہ نیست۔ رواج یافتن امرے در عہدے کہ مرغوب الطبع عہد دیگر نباشد امرے دیگر است"۔ (صفحہ ۲۹۔ جلد اول)

میر اثر کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

"شعر ایشان نہایت با اثر و بدرجۂ اعلاء فصاحت است۔

نسخۂ درست از دیوانِ برادرِ بزرگوار برداشتہ اند۔ بہ آئینے کہ خود شما در ذاتِ ستودہ صفاتِ برادر کریم بودند، شعر ایشان ہم شما در شعراء شاں است۔ دیوانے مختصر در نہایت جودۃ و پاکیزگی و مثنوی خورد کہ در غایت متانت و پختگی یادگار ایں بزرگوار است۔" (صفحہ ۲۴ جلد اول)

میر محمدی بیدار کے کلام میں جو خوبیاں نمایندہ خصوصیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ قاسم نے ان کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"شعرش بسیار باکیفیت و پختگی و بہ نہایت حلاوت و دلبستگی است۔ بندشِ الفاظ و استحوال بندی ان بدرجۂ اعلیٰ دارد۔ و با ایں ہمہ نزاکتِ معنی بوجدانِ نازک خیالان خیلے می سازد!" (صفحہ ۱۰۸ جلد اول)

مرزا عظیم بیگ عظیم دہلوی کے ذکر میں ان کے شاعرانہ کمالات اور کلام کی امتیازی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"شعرش پختگی تمام دارد۔ در خیال بندی و نازک خیالی خیلے ہنر پردازی ہا بروئے کار آورد۔ دریں کار استوار ید طولیٰ داشت و بیشتر بہ معنی بندی ہمت می گماشت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صنائع بدائع بسیار بکار می برد۔ زور طبعش از قصائد ریختہ طبع و تادش روشن می شود۔ قصیدۂ زبے بلے اغراق بہ قصیدہ سرآمد شعرائے فصاحت آثار مرزا محمد رفیع سودا می ماند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شعرش با وصف قلتِ بضاعت عالم دیگر دارد۔ شاعری وے باوجود کم نظری بر کلام اساتذہ قدیمہ از جہان دیگر است" (صفحہ ۱۰ جلد دوم)

اُردو شاعری میں انشا کی انفرادیت کا راز ان کے زورِ طبیعت کی ہمہ گیری میں مضمر ہے۔ قاسم اس وصفِ خاص کو ان الفاظ میں نمایاں کرتے ہیں:

"طرزِ گفتارش بہ شاعرِ فصاحت افروز محمد میر سوز مانا است۔ اس طرز اگرچہ مرغوب الطبع وے افتادہ، اما بہر گونہ سخن طرازی دستے دارد۔ از قصائد و مثنویات وے خاصہ قصیدۂ کہ در تہنیتِ سال گرۂ مرشد زادۂ شوکت پژدہ میرزا سلیمان شکوہ بہادر در ایامِ ملازمیٔ سرکارِ دولت مدار آن والا تبار در بلدۂ لکھنو گفتہ کہ مطلعش این است ......"

صبحدم میں نے جو لی بسترِ گل پر کروٹ
جنبشِ بادِ بہاری سے گئی آنکھ اُچٹ

زورِ طبعش معلوم می شود۔ بنا بر بضاعتے کہ از علوم شریف دارد کلامش صحت نظام است۔" (صفحہ ۸۰ و ۸۱ جلد اول)

میر کی شاعری کے متعلق بھی قاسم نے بڑی صائب رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ غزل گوئی میں ان کے امتیاز کے معترف ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی انھیں سودا سے کمتر درجے کا شاعر سمجھتے ہیں جیسا کہ دونوں اساتذہ کے اس تقابلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے۔

"بزعمِ بعضے آں کہ سرآمد شعرائے فصاحت آثار مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی سخن بہ وے نرسانیدہ اما حق آنست کہ حکم ہر گلے رادِ رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا در یائیست بیکراں و تبحر مہارتیست عظیم الشان۔ در معلوماتِ قواعدِ فنِ تحریر مرزا برتری است و در قوتِ شاعری مرزا بر میر سر و دی۔" (صفحہ ۲۳۰ و ۲۳۱ جلد دوم)

بعض اوقات مشرقی تنقید کی ابتدائی روایات کے عین مطابق قاسم نے اشعار کے لفظی و معنوی اسقام سے بھی بحث کی ہے اور ان معایب کو دور کرنے کے لئے متبادل الفاظ اور مصرعے بھی تجویز کئے ہیں اگرچہ اس قسم کی تنقید و اصلاح کی مثالیں پورے تذکرے میں صرف پانچ چھ مقامات پر ملتی ہیں تاہم ان سے مولف کے ذہنی شعور اور زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے' اس لئے اس سلسلۂ بحث میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میر محب علی حالی، قاسم کے ایک غیر معروف ہمعصر تھے جو ان کے بقول سودا اور میر جیسے اساتذہ کے کلام کو ساقط المعیار سمجھتے تھے۔ ان کے.. اس مطلع پر کہ ؎

عوض میں بوسے کے دے ہے گالی سوال دیگر جواب دیگر
یہ طرز تو نے عجب نکالی سوال دیگر جواب دیگر

قاسم نے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ :۔

"قطع نظر از لغویت لفظ" میں "متبادر از مصرعۂ اول اعطائے بوسہ بہ معشوق و یافتن عاشق عوض آں دشنام از وے است۔ اگرچہ بدلالتِ لفظ "سوال" المعنی فی بطن الشاعر بہ تکلف ظاہر می شوند .. .. بہ گمانِ قاسم ہیچمدان سراپا نقصان اگر ایں چنیں می گفت ہر حال خوب می شد۔

میں چاہوں بوسہ وہ دیں ہیں گالی سوال دیگر جواب دیگر
یہ طرز انھوں نے نئی نکالی سوال دیگر جواب دیگر

(صفحہ ۱۹۵- جلد دوم)

مرزا قاسم علی رخشت کا ایک مطلع ہے ؎

ہمارے سامنے مت ابر بار بار برس ۔۔۔ جو ہم سے ہو سکے، تجھ سے نہ ہو ہزار برس

قاسم نے معمولی سی ترمیم کا مشورہ دیکر اس مطلع کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

"اگر در مصرعہ اولیٰ قافیہ نوبہار می نمود، خوب می بود" (صفحہ ۲۷۵ جلد اول)

میر قمیا دہلوی کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

بار بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا ۔۔۔ آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کھلانے لگا

قاسم اس شعر کے دوسرے مصرعے کی موزونیت سے متفق نہیں ان کا خیال ہے کہ یہ مصرعہ اگر اس طرح کہا جاتا تو بہتر ہوتا ع (ص ۳۶۵ جلد اول)

پہلے ہی کھلنے سے یہ غنچہ تو کھلانے لگا

ولی دکنی کے انتخاب کلام میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

فصاحت کیا کہوں اس خوش دہن کی ۔۔۔ کسی کا واں نہیں ہوتا سخن سبز

اس شعر میں قاسم کی مجوزہ تبدیلی ہمارے نزدیک زیادہ نازک اور لطیف نہیں تاہم الفاظ کے معمولی سے رد و بدل سے جو رعایت پیدا ہو گئی ہے اس عہد کی روایات اور معیار فن کے پیش نظر اس کی لطافت سے انکار ناممکن ہے لکھتے ہیں کہ "اگر بجائے اوس خوش دہن "پستہ دہن می گفت سبزی سخن کا افزود (صفحہ ۳۰ جلد دوم)

المذیازی مباحث کے پہلو بہ پہلو اس تذکرے میں ضمنی طور پر کچھ ایسے اہم اور عجیب موضوعات بھی زیر بحث آئے جن سے تاریخ ادب کے مطالعے میں بعض نئے گوشوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ ولی دکنی کے متعلق صاحب نکات الشعراء کی مشہور رائے اور اسکے رد عمل کے بارے میں قاسم کے بیانات اسی ضمن میں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میر خاں کمترین کے حالات میں یہ جملہ ہماری نظر سے گذرتا ہے کہ

"بنا بر نوشتن میر در تذکرہ خود شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی را کہ

بے شاعریت از شیطان مشہور تر ہجو ہائے رکیکہ بو اجبی

نمود۔"

(صفحہ ۱۴۳ - جلد دوم)

اس کے بعد میر صاحب کے ذکر میں یہی بات اس طرح دہرائی گئی ہے کہ

"در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ۔ در حق شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" و سزائے ایں کردار ناہنجار از کمترین شاعر بد اجبی یافتہ کہ وے ہجو ہائے متعددۂ او کردہ کہ بعضے ازاں بنہایت رکیک و بردہ در افتادہ۔" (صفحہ ۲۳۰ - جلد دوم)

تیسری جگہ ولی کے حال میں باین الفاظ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ :۔

"سخن بہ سخنش ابلیس منشی و شیطنت، بہر حال کمترین کہ خواہش بیا مرزد بیاد بموقع و بجا گفتہ کہ ع
"ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں۔"
(صفحہ ۲۹۷ جلد دوم)

قاسم کے یہ انکشافات ہمارے لئے غور و فکر اور تحقیق و تلاش کا ایک نیا موضوع فراہم کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس اعتبار سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ باتیں میر صاحب کی زندگی میں کہی گئی ہیں اور ان کی یا ان کے کسی ارادت مندکی جانب سے کسی مدافعانہ اور جوابی کارروائی کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

قاسم کا یہ تذکرہ اپنے دور کے ادبی ماحول کے بارے میں بھی بڑی اچھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ شاعری کی عمومیت اور ارباب کمال کی

کس مپرسی کے متعلق ان کے اس تاثر کے باوجود جسے مقدمے پر بحث کے ضمن میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیشتر ذی علم حضرات اس فن کی طرف راغب ہیں اور امرا و رؤسا کا قدر شناس طبقہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کی سرپرستی میں مصروف نظر آتا ہے۔ جا بجا مقررہ اوقات پر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان میں شرکت کرتے ہیں۔ فن کے اصول و آداب کی نگہداشت کے متعلق مباحثوں سے معرکہ آرائی تک نوبت پہنچتی ہے اور اہلِ کمال کو اپنی طبیعتوں کے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے جس کی بدولت رکاکت و ابتذال سے معمور ہجویہ نظموں کے ساتھ ہی کچھ ایسے گراں قدر کارنامے بھی معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں، جنھیں مستقبل میں عظیم ادبی سرمائے کی حیثیت حاصل کرنا ہے۔ اس قسم کی محفلوں میں پیش آئے ہوئے بعض اہم اور دلچسپ واقعات اور لطیفے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

خان آرزو کے مشاعرے میں سودا نے ایک غزل پڑھی جو در اصل قدسی کی غزل کا ترجمہ تھی لیکن سوائے خان آرزو کے کوئی اس حقیقت تک نہ پہنچ سکا یا مصلحتاً کسی نے اس کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اس واقعے کی جو تفصیلات درج کی ہیں ان کا ماخذ مجموعہ نغز کی یہ روایت ہے کہ:-

"روزے در مجلسِ مشاعرہ کہ در خانۂ موصوف (آرزو) انعقاد می یافت، میرزا محمد رفیع سودا غزل حاجی محمد جان قدسی را بطور خود مترجم ساختہ برخواندنِ آں بہ شد و مد تمام ہمت گماشت اتفاقاً احدے از حضارِ مجلس برآں نہ رسید یا از خوف

مترجم کہ بواد ئے سبب بے محابا بہ ہجو ہر کس می پرداخت، سکوت دورزید۔ خان تحسین بلیغ فرمود و در اثناء توصیف بدیہتہ بر زبان اوشں بیان جاری نمود کہ۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے
لکھ رکھیں چاہیئے نلک پہ ملک

مرا بے اختیار برخواستہ بر سینۂ خان چسپید و سخن بہ مزاح و طبیعت کشید۔“ (صفحہ ۲۶ جلد اول)

جراءت کی شاعری کے متعلق میر کا مشہور استہزائیہ جملہ بھی اسی تذکرے کی وساطت سے مولانا آزاد تک پہنچا ہے۔ قاسم نے یہ سرگزشت اس طرح بیان کی ہے کہ

”روزے در مجلس شعراء کہ بخانہ مرزا محمد تقی خاں ترقی انعقاد می یافت، یا بیارے از تلامذۂ خود رسیدہ غزلہا بر خواند و مورد تحسین و آفریں خاص و عام گشت کہ شنیدن شعر مشکل شد تا بہ فہمیدن خود چہ رسد اتفاقاً سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر ہم دراں مجلس حاضر بود۔ قلندر بخش جراءت، جراءت نمودہ خود را پہلوئے میر رسانیدہ داد خواہ اشعار خود شد۔ میر بعد ازاں کہ دو سہ بار مدارا کرد، چوں ابرامش دریں امر از حد درگزشت گفت کہ ہر گاہ ایشاں بدیں جد و کد می پرسند ناچار می گویم و ایں الفاظ ہندی بر زبان نخوۃ توامان وے گزشت کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہنا نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹا کہہ لیا کرو۔!“ (صفحہ ۱۵۶ جلد اول)

نواب امین الدولہ مہر امینڈ ہوا امیر کے حالات میں لکھتے کہ ایک بار مرزا عظیم بیگ عظیم کے جو بڑے آزاد وضع اور بے باک اللسان تھے یہ کہہ کر آپ کے مشاعرے میں شرکت سے انکار کر دیا کہ مجھے خواہ مخواہ کسی امیرزادے کی تعظیم و تکریم بجا لانے اور مسند صدارت کی پائیں نشینی اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب امین الدولہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس پیشکش کے ساتھ عظیم کو دوبارہ شرکت کی دعوت دی آپ ضرور تشریف لائیں ہم بھی آپ کے ساتھ چاندنی پر ہی بیٹھیں گے اسکے بعد سے مسند پر بیٹھنے کی رسم ہمیشہ کے لئے موقوف ہو گئی۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امرا کی محفلوں میں شعرا کی کس قدر ناز برداریاں کی جاتی تھیں۔ اسی مشاعرے کے ذکر کے سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"در ایام متبرکہ صیام کہ برائے سخن سنجان اسلام سفرۂ امیرانہ می کشید و نظر برکرم کریمانہ اش بہ مذاق شعرائے ہندو نژاد شیرینیٔ قسم اعلیٰ می رسید۔ برخوردار کامگار میر عزت اللہ عشق ...... چون دریں ایام خجستہ آغاز فرخندہ انجام بنابر خواندن خیر الکلام و تراویح (در مجلس مشاعرہ) نمی رفت مبالغہ تمام ہنگام افطار یاد فرمودہ گونہ گونہ عنایت در بارہ او مبذول داشتہ فرع نوع اطعمہ و اشربہ و فواکہ خشک و تر بہ دست حق پرست خود لطف می فرمود۔" (صفحہ ۲۔ جلد اول)

انشا کے ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدولہ اپنے مشاعروں میں ثناء اللہ خاں فراقؔ، مرزا عظیم بیگ عظیم اور قاسم کو جن توجہات اور عنایات سے نوازتے رہتے تھے وہ انشاؔ، برکت اللہ

خاں برکت اور مشتاق علی خاں مشتاق کو ان کے مقتضائے طبیعت کی بنا پر شاق گزرتی تھیں۔ خاص طور پر عظیم اور انشا کے درمیان اکثر ٹھنی رہتی اور دونوں ایک دوسرے کی "تہجین و تذلیل" پر کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ۔

"مرزائے مذکور غزلے طرح انداخت و بنابر غرورے کہ در سر داشت لاابالیانہ بہ فکرِ مضمون و معانی افتادہ۔ درحین شناوری بحر رجز غوطہ خوردہ بہ بحر رمل افتاد و بعد انصرام غزل بے آن کہ روبروئے محبان و دوستان بخواند بے تحاشا بہ حضور میر ماشاءاللہ خاں مرحوم کہ دوست و محب مرزائے مغفور بود بر خواند قضا را میر موصوف (انشا) مجلس نشین پدر بزرگوار خود بود، حریفانہ تحسین بلیغ نمودہ مکرر بگوش ہوش شنودہ یاد گرفتہ بہ خواہ یاران انداخت و در عین مجمع شعراء تکلیف تقطیع نمودہ مرزا را ملزم ساخت و در آں وقت بوے رسید آنچہ رسید و شنید آنچہ شنید اگرچہ من بعد ایں ماجرا مخمسے در ہجو بلیغ میر مشار" الیہ در جواب ایں لغزش گفتہ اما مشتے کہ بعد جنگ یاد آید بر کلۂ خوش باید زد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ازاں پس مرزا چناں متنبہ شدہ بود کہ اگر مصرعے موزوں می کرد، بے آں کہ بگوش ایں ہیچمداں نہ رساند بر زبان نمی آورد تا بخواندن بحضور کس چہ رسد (صفحات ۸۲ و ۸۳، جلد اول)

یہ واقعہ اور اس کے بعد پیش آنے والے معرکوں کی مکمل تفصیلات جو تذکرے کے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، مولانا آزاد آب حیات میں نقل

کر چکے ہیں، اس لئے یہاں مزید تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔
مہدی علی خاں عاشق کے مشاعرے کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اس محفل کی سب سے بڑی خصوصیت پابندی اوقات تھی۔ قاسم نے اس سلسلے میں یہ معلومات فراہم کی ہے۔

"قریب دوازدہ سال بلا ناغہ روز جمعہ بہ انعقادِ مجلس شاعرہ پنجگانہ خود پرداخت و بہ ہیچ مانع قوی بل اقوی موقوف نہ ساخت۔ حتیٰ کہ صبح فاتحۂ سیوم فرزند ارجمند خود نمودہ و بعد ظہر مجلس مراختہ منعقد نمود" (صفحہ ۲۶۹ - جلد اول)

نجم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب کے حال میں لکھتے ہیں کہ:۔

"یک چند مجلس مراختہ بہ دولت خانۂ خود منعقد می ساخت و بہ ضیافت مجلسیان خاصہ شعرائے فصاحت بیان بہ انواعِ اطعمہ واقسامِ اشربہ وانحائے حلاوی وصد گونہ رقص می پرداخت" (صفحہ ۲۴ جلد دوئم)

مجموعہ نغز کے مطالعے سے ان مجالس شعر وسخن کے علاوہ دہلی میں بھورے خاں آشفتہ، حمید الرحمٰن انیس، اسد بیگ رفیق، سجاد اکبر آبادی، میر محمدی ثروت، ممتاز الملک ظفریاب خاں صاحب، راجہ فتکر ناتھ صبا اور مصحفی کی قیام گاہوں پر لکھنؤ میں شاہزادہ سلیمان شکوہ اور مرزا رضا قلی آشفتہ کے یہاں اور رام پور میں مولوی قدرت اللہ قدرت کے مکان پر شاعروں کے انعقاد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مجموعہ نغز کے یہ بیانات اردو شاعری کی مقبولیت و محبوبیت کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں۔

اس تذکرے کے اوراق پر ایسے اشارات بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جن سے اس دور کے تاریخی حالات، سیاسی انتشار اور سماجی اضطراب کا پتہ چلتا ہے اور احمد شاہ ابدالی کے حملے اعیانِ سلطنت کے باہمی اختلافات اور اسی قسم کے دوسرے حادثات و واقعات کے نتیجے میں نظام مملکت کی ابتری نے جس طرح ارباب فضل و کمال کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا، سالہا سال کی کوششوں سے پروان چڑھی ہوئی تہذیب جس حوصلہ فرسا ماحول سے دو چار تھی اور لوگوں کی فکری سطح اور اخلاقی معیار جس قدر پست ہو چکے تھے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ عبدالحئی تاباں کے حال میں ایک ثقہ اور معتبر بزرگ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:-

"امردانِ شیریں ادا و سادہ رویانِ ملاحت آما در خانہ دے بہ زر و زیور آراستہ و پیراستہ می شدند و حسب الطلب امرائے ترز لباش در محافہا نشستہ بشب مہمان می رفتند۔ از شومئ ایں چنیں کردارہائے ناہنجار بحضرتِ دہلی رسید، آنچہ رسید۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیآت اعمالنا!!"

(صفحہ ۱۲۲۔ جلد اول)

زشتی اعمال و پستی کردار کی جو تصویر اس تحریر کے آئینے میں ابھر کر سامنے آئی ہے وہ کسی فرد واحد یا چند افراد کے بجائے پورے معاشرے کی نمایندگی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ہزل گو شاعر شہوت کے متعلق یہ بیان عام پست مذاقی اور ذہنی و اخلاقی زوال کا آئینہ دار ہے۔

"دے مرد کہ بود فحاش و ہزل گو، فرساق بکو ہیدہ خو، خود را از دودمانِ شرافت می پنداشت و ہمگی ہمت بر فرساقی و

ہرزہ درائی می گماشت۔ خود را بہ میر بخشی اشتہار دادہ و از پیش گاہ سلطنت بہ آرزوئے تمام مسخرۃ الدولہ قرم ساق خان بہادر سبھکرا جنگ خطاب گرفتہ در ہم پیشگان خویش علم امتیاز بر افراختہ!" (صفحہ ۲۵۴ - جلد اول)

مجموعہ نغز کا یہ امتیاز بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں کہ اس میں دوسرے طویل تذکروں کے مقابلے میں مسلمہ حقایق و واقعات سے انحراف کی مثالیں تقریباً مفقود ہیں اور اشعار کے انتخاب میں بھی بہت کم غلطیاں ہوئی ہیں تذکرے کو ان لغزشوں سے بڑی حد تک پاک رکھنے میں قاسم کے ذوق جستجو، عالمانہ نظر اور ناقدانہ بصیرت کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے بعض دوسروں کے اقوال و بیانات پر اکتفا نہ کرتے ہوئے حتی الوسع معتبر ترین ماخذ تک پہنچنے اور بالعموم ذاتی مشاہدات و معلومات کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں جو تھوڑی سی بہت غلطیاں نظر آتی ہیں وہ یا تو بدیہی طور پر کسی اتفاق یا سہو نظر کا نتیجہ ہیں یا وہ دوسرے ذرائع تصدیق کی عدم موجودگی میں پیشرو تذکرہ نگاری کی روایات پر اعتقاد و انحصار کے باعث رونما ہوئی ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے اس صورت حال کی وضاحت ہوگی۔

(الف) مرزا رفیع سودا کے مشہور شاگرد معین بدایونی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"غلام معین الدین خاں مرحوم .... شاعرے بود از دیرینہ مشتاقان خوش نوا ...... گویند کہ از سکنۂ الہ آباد و بسیار مرد نیک نہاد بود!" (صفحہ ۲۰۱ جلد دوم)

میر حسنؔ، امر اللہ الہ آبادی اور دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے شاعر مذکور، شیخ محمد معین الدین[1]، شیخ معین الدین[2] یا صرف معین الدین[3] کے نام سے یاد کیا ہے۔ بدایوں سے وطنی تعلق کا معاملہ بھی ان لوگوں کے درمیان متفق علیہ ہے۔ ایسی صورت میں قاسمؔ کے یہ بیانات کہ ان کا نام غلام معین الدین اور وطن الہ آباد تھا، خلاف واقعہ قرار پاتے ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ غلطی "عیار الشعراء"[4] اور "عمدۂ منتخبہ"[5] کی تقلید کا نتیجہ ہے ان دونوں تذکروں میں معینؔ کو علی الترتیب غلام معین الدین اور معین الدین خاں باشندۂ الہ آباد لکھا گیا ہے۔

(ب) ردیف نون کے تحت نواؔ تخلص کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ۔

"شیخ محمد ظہور ...... طالب علمے از طلبائے بلدہ لکھنؤ

...... شاگرد محمد بقاء اللہ اکبر آبادی است"

(صفحہ ۲۸۶ جلد دوم)

اس کے بعد تکملے کے ضمن میں اسی تخلص کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"عزیزے است سعادت نشان المسمیٰ بہ ظہور اللہ خاں"

(صفحہ ۴۰۹، جلد دوم)

ان بیانات کے ذریعے قاسم نے "شیخ محمد ظہور نواؔ" اور "ظہور اللہ خاں نواؔ" میں جو فرق قائم کیا ہے وہ درست نہیں۔ یہ دراصل ایک ہی نام کی دو صورتیں ہیں جن میں سے پہلی غلط اور دوسری صحیح ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع دوم صفحہ ۱۶۵

[2] تذکرہ مسرت افزا صفحہ ۲۰۲ [3] طبقات الشعراء نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد

[4] عیار الشعراء مخطوطہ علی گڑھ ۲۲۸ الف [5] عمدۂ منتخبہ صفحہ ۶۸۰

نوا کا وطن بدایوں تھا اور وہ نسبتاً شیخ صدیقی تھے لفظ "خان" شہزادہ جواں بخت کے دربار سے ملے ہوئے خطاب "خوش فکر خاں" کی رعایت سے ان کے نام کا جز بن گیا تھا۔[1] "مجموعہ نغز" میں ان کے حالات بادنیٰ تغیر "عمدۂ منتخبہ" سے نقل کیے گئے ہیں لیکن وہاں یہ غلطی موجود نہیں۔ سرور انھیں "ظہور اللہ خاں طالب علم باشندہ لکھنؤ متوطن بداؤں"[2] قرار دیتے ہیں۔

(ج) تکملے ہی کے ذیل میں محمد روشن جوشش عظیم آبادی کے فوراً بعد ان کے بھائی محمد عابد دل کا ترجمہ بھی اسی تخلص (جوشش) کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے (جلد دویم ص ۲۰۰) یہ غلطی بھی غالباً "عیار الشعرا" یا عمدۂ منتخبہ" کے اتباع پر مبنی ہے۔

(د) تذکرے کے اسی آخری حصے میں جسے تکملے کا نام دیا گیا ہے مجہول الاحوال شاعر شیخ عبدالواسع عزت کے نام سے درج ذیل مطلع منقول ہے ؎

بجز رفاقت تنہائی آسرا نہ رہا
سوائے بیکسی اب کوئی آشنا نہ رہا

جبر، قائم، میر حسن اور امر اللہ الہ آبادی اس مطلع کو سید عبدالولی عزلت سورتی سے منسوب کرتے ہیں البتہ دوسرے تذکرہ نگاروں کے برخلاف میر حسن نے ان کا نام سید عبدالواسع قرار دیا ہے[3] جو یقیناً غلط ہے۔ تذکرہ میر حسن کی اس روایت میں مزید تحریف یعنی تخلص کی تبدیلی بظاہر

---

[1] مختصر سیر ہندوستان صفحہ ۹۳

[2] عمدۂ منتخبہ صفحہ ۹۵؛

[3] تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۱۰۷۔

سہو کتابت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

(ہ) احسن اللہ احسن کا مشہور شعر ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوش خط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

ذکا کی طرح قاسم نے بھی اس شعر کو اولاً احسن سے اور اس کے بعد شرف الدین علی خاں پیام سے منسوب کیا ہے۔ مستند روایات کے پیشِ نظر انتساب دوم درست نہیں۔

(و) ایک مشہور رباعی ہے:۔

میخانے میں کیا پھرے ہے ٹکی مٹکی
نت شیخ و برہمن سے ہے کھٹکی کھٹکی
قاضی سے ڈرے ہے نہ محتسب سے کافر
یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

یہ رباعی بھی قاسم نے ذکا کی پیروی میں کلام انشا کے ذیل میں نقل کی ہے۔ مسرت افزا اور تذکرۂ شعرائے اردو میں اسے میر علی نقی کافر سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ "عیار الشعرا" پر بحث کے سلسلے میں واضح کیا جا چکا ہے در اصل یہ میر عبد الحئی تاباں کی تصنیف ہے:

(ز) میر کی ایک غزل کے دو شعر ہیں۔

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
مجنوں زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے

"عیار الشعرا" کی تقلید میں "مجموعۂ نغز" میں بھی یہ دونوں اشعار بیک وقت میر صاحب اور محتشم علی خاں حشمت کے کلام میں شامل ہیں۔ لیکن یہ غلطی صرف پنجاب یونیورسٹی کے نسخے میں پائی جاتی ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ اس سے بری ہے۔[1]

(ح) مندرجہ ذیل اشعار بھی اس تذکرے میں دو شاعروں کے انتخابات کلام میں مشترک ہیں۔

ہوا ہے عشق سے آکر مقابلہ دل کا
بھڑا پہاڑ سے جاہل بے حوصلہ دل کا

سرشک آہ ہو، جوشِ جنوں ہو، وحشت ہو
عجب شکوہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

کہاں ہے تیشۂ مے، محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

یہ تینوں شعر پہلے شاہ قدرت اللہ قدرت سے اور پھر واقف شاہ واقف سے منسوب کئے گئے ہیں لیکن در اصل ایک تیسرے شاعر مراد علی حیرت مراد آبادی کے نتائج فکر ہیں۔[2] قاسم نے یہاں بھی شاید "عیار الشعرا" ہی کا اتباع کیا ہے۔

(ط) مندرجہ ذیل دو مطلعے بھی اعادے کی ایسی ہی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

آتا ہے ہر سحر اٹھ، تیری برابری کو کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

---

[1] بحوالہ "مجموعۂ نغز" مطبوعہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲ (جلد اول)

[2] "عیار الشعرا" کے ذیل میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔

مرا جس ناز سے تو لے لیا دل خدا جانے ہے اس کو یا مرا دل

مطلع اول خان آرزو اور ان کے شاگرد رائے انند رام مخلص کے کلام میں مشترک ہے۔ مرزا علی لطف کے یہاں اس زمین میں آرزو کے کے نام سے مکمل غزل کی موجودگی پہلے انتساب کی تائید کرتی ہے[1]۔ دوسرا مطلع اصل متن میں سوز کے ایک شاگرد شمس الدین ہوش لکھنوی سے اور بیکے ہیں دوسرے نامعلوم الاسم شاگرد ہوش سے منسوب ہے۔ میر حسن اور سرور کے تذکرے موخر الذکر انتساب کے حق میں فیصلہ صادر کرتے ہیں، اور غالباً یہی صحیح بھی ہے۔ "مجموعۂ نغز" کی دوسری روایت "عمدۂ منتخبہ" سے منقول معلوم ہوتی ہے۔ قاسم کی طرح سرور بھی شاعر مذکور کے متعلق سوز کی شاگردی کے علاوہ دوسری تفصیلات پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ البتہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں "میر نبی جان" کے نام سے ان کا ذکر کرتے ہوئے بقدر ضرورت معلومات فراہم کر دی ہیں[2]۔

"مجموعۂ نغز" چونکہ کئی سو شاعروں کے حالات اور کئی ہزار منتخب اشعار پر مشتمل ہے، اس لئے اس قسم کی معدودے چند غلطیاں اسکی استنادی حیثیت کو متاثر نہیں کرتیں۔ مجموعی طور پر اس تذکرے میں صحتِ بیان کا خاص اہتمام نظر آتا ہے۔ اس وصف کے پہلو بہ پہلو قاسم نے اپنے مشاہدات و تاثرات کے بیان میں جس غیر جانبداری، کتنا زیادہ دلی اور صاف گوئی سے کام لیا ہے اور قانونوں کی پابندی کے باوجود باکموں دم سادگیِ بیان، سلاستِ زبان سے وصع اسلوب نگارش

---

[1] گلشن ہند طبع ثانی، صفحہ ۲۲ و ۲۳

[2] تذکرہ شعرائے اردو، طبع ثانی صفحہ ۱۷۵

کی جو مثال پیش کی ہے وہ ان کی تحریر کے وقار اور قوت کو دوبالا کر کے "مجموعۂ نغز" کو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

گلشنِ بے خار

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اُردو کے منتخب، ممتاز اور بلند پایہ اہلِ قلم میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے زمانے کے تمام بڑے بڑے اساتذہ ان کی دیدہ وری اور اصابت نگر ونظر کے قائل تھے۔ حتیٰ کہ غالب جیسے خود پرست فن کار کو بھی ان کے اظہار پسندیدگی کے بعد اپنی غزلیات شاملِ دیوان کرنے پر ناز تھا۔ "گلشنِ بے خار" انیسویں صدی کی اسی مشہور و معروف شخصیت کا ایک وقیع کارنامہ ہے۔ اس تذکرے میں اُردو شاعری کے ابتدائی زمانے سے تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک کے شعرا کے حالات و اشعار درج کئے گئے ہیں۔ تذکرے کے اسباب تالیف کی وضاحت کرتے ہوئے شیفتہ لکھتے ہیں کہ

"بہ امتثال امریکے از احبائے روحانی کہ... آرزوئے جان وجانِ آرزو ست، دلِ بیشتر از زبان زبان بہ تسلیم کشاد و ایں بار ننگ و عار بر سر گردن من نہاد" (ص ۵)

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ "گلشنِ بے خار" کی ترتیب کا خیال مولف کے کسی ایسے دوست کی فرمائش کا مرہونِ منت تھا جس کا نام ظاہر کرنا کسی خاص سبب کے تحت مناسب نہیں سمجھا گیا۔ زمانہ تالیف کے بارے میں اگرچہ یہ صراحت موجود ہے کہ ابتدائے ایں

کارنامہ در ابتدائے سال ہزار و دو صد و چہل و ہشت (۱۲۴۸ھ) از ہجرت
بودہ و انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ (۱۲۵۰) تاہم بعض داخلی شہادتوں
کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۱۲۵۰/۱۸۳۵ء کے
بعد بھی اس میں جا بجا اضافے کیے جاتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر
سعادت یار خاں رنگین کے حالات میں یہ جملہ بھی شامل ہے کہ :-

"بعد بپایان آمدن ایں تذکرہ عمرش بسر آمد۔ و کان
ذلک فی شہر جمادی الثانی ہزار و دو صد پنجاہ و یک"

(ص ۱۱۵)

یہ تو سنہ اختتام سے چند مہینے بعد ہی کی بات ہے لیکن ناسخ
کا حال اس سے بھی کچھ بعید تر زمانے کی نشان دہی کرتا ہے لکھتے ہیں کہ
"بعد مدتے از ترتیب و تبییض ایں رسالہ پدید آمد کہ دیوان
دیگر از افکار دقادش فراہم آمدہ و ہم در شہر رسیدہ"

(ص ۳۰۹)

مزید تلاش و جستجو سے اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں جن کی
روشنی میں ترتیب تذکرہ کے بعد کی اس مدت مدید کا تعین کیا جا سکے لیکن
اس بحث کو زیادہ طول نہ دیتے ہوئے مختصراً یہ بتا دینا ضروری معلوم
ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں ہوئی اور تقریباً تین سال
کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً حسب ضرورت
اضافے اور تبدیلیاں کی جاتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۲۵۲ھ مطابق
۱۸۳۶ء میں لیتھو گرافک پریس دہلی سے اس کا اولین ایڈیشن شائع
ہوا اور بہ ظاہر ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف مطبوں

سے اس تذکرے کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن چونکہ یہ سبھی اڈیشن الحاق و تصرف اور دوسرے مختلف النوع نقائص سے مملو ہیں۔ اس لئے یہاں ہم نے اپنے مطالعے کے لئے بطور خاص اشاعت اول کو پیش نظر رکھا ہے جس کی صحت میں بظاہر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

گلشن بے خار ایک دوست کی تحریک پر معرض وجود میں آیا۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس کی ترتیب کا مقصد کیا تھا۔ اس سلسلے میں شیفتہ کے بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا اصل مطمحِ نظر صرف اچھے اشعار کا انتخاب ہے نہ کہ عام فنکاروں کی شخصیات اور سرمایۂ افکار کا تعارف۔ لہٰذا اس تذکرے میں صرف وہی شعرا جگہ پا سکے ہیں جن کا کلام کلی یا جزوی طور پر مولف کی پسند کے معیار پر پورا اترا ہے۔ اس ضمن میں تذکرے کی اصل عبارت یہ ہے کہ

"آوردن اشعار دلاویز است، نہ شمار اسامی شعرا، اذاں کہ جامعہ زیب بیتے بہ نظر رسید، عام تر از مجاہیل و معارف و احیاء و اموات، نامش دریں سفینہ چوں ابیاتش درج نہ گردید۔ اما از مشاہیر کم کسے است کہ شعرے لائق نہ داشتہ باشد ناگزیر ایراد ہمہ شاں لازم آمدہ" (ص ۷)

اسی پابندی کی بنا پر شعر و شاعری کے اس دور شباب میں اس بساطِ سخن پر صرف چھ سو چھتر (۶۷۶) شاعروں کو جگہ مل سکی ہے۔ البتہ بعض شاعروں کے کلام کے طویل انتخابات کے باعث ضخامت اسی تعداد کے تناسب سے عام تذکروں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ ہو گئی ہے۔ شیفتہ نے اسی خصوصیت کو گلشن بے خار کا طرۂ امتیاز خیال

کرتے ہوئے فخریہ لکھا ہے کہ۔

"ہر گوہرے کہ مستعد پیش کش جوہریان بازار سخن بہ لنظر در آمد در انسلاک آن ضنت نہ رفت۔" (ص ۷)

اور خوش آب موتیوں کا یہ ہار تیار کرنے کے لئے انھوں نے جو طریق کار اپنایا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ۔

"دو او دین اساتذہ سلف و خلف بدقت و انصاف ملاحظہ و از آن التقاط کردم و دیوان کسے کہ بہ نظر نہ رسید دست بہم نداد انکارش از تذکرہ ہاد سفائن و ہر آنچہ بخاطر بود بدستور بنقطۂ انتخاب موشح و ثبت افتاد۔" (ص ۷)

انتخاب اشعار کے سلسلے میں تذکروں سے استفادے کے متعلق شیفتہ کے اس اشارے کی تفصیل یعنی مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" و "ریاض الفصحا" مرزا علی لطف کے "گلشن ہند" میر اعظم الدولہ سرور کے "عمدۂ منتخبہ" اور شرف الدین مسرور کے "تذکرہ شعرائے اردو" کے نام پورے وثوق کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں۔ ایک جگہ مفتی صدر الدین آزردہ کے تذکرے کا حوالہ بھی موجود ہے ان اردو تذکروں کے علاوہ حسین قلی خاں عاشقی عظیم آبادی کا تذکرہ شعرائے فارسی موسوم بہ "نشتر عشق" بھی ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ان ماخذ سے اقتباس و اکتساب کے وسیع تر امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے اشپرنگر نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "یہ تذکرہ بہت حد تک "مجموعۂ نغز" سے ماخوذ ہے" ناسی نے بھی غالباً اسی قول کی بنیاد پر اپنے ایک لیکچر میں یہ بات دہرائی ہے

۱؎ فہرست کتب خانہ شاہان اودھ ص ۱۸۹

کہ - قاسم کے تذکرے سے .... مولف نے بہ نسبت کسی دوسرے تذکرے کے زیادہ استفادہ کیا ہے[1]"۔ لیکن قاسم کے ذکر میں شیفتہ کی اس صراحت کے بعد کہ "تذکرۂ در حالِ فکرِ ریختہ نگاشتہ است و بملاحظہ نہ رسیدہ[2]"۔ ان بیانات سے اتفاق کی گنجایش باقی نہیں رہتی طرزِ ترتیب اور اندراج اشعار کے متعلق مولف نے اپنے اصول کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"در ایرادِ تراجم شعرا بہ ترتیب حروفِ ہجا حرفِ اول و ثانی از تخلص و در اشعار حرفِ آخر معتبر گشت و دریں تقدیر از سبقت زمان و مرتبت قطع نظر و بہ علت قلت فرصت غیر از اشعارِ غزل از دیگر اصنافِ اعراض رفت"۔ (ص ۷)

ان بیانات کا ماحصل یہ ہے کہ "گلشنِ بے خار" کی تالیف میں شیفتہ کی تمامتر توجہات پسندیدہ اشعار کے انتخاب اور ایک خاص نظم اور سلیقے کے ساتھ ان کی ترتیب پر مرکوز رہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے تذکرہ نگاری کے دوسرے مطالبات اور تقاضوں کو بنیادی طور پر ناقابلِ اعتنا تصور کیا ہے۔ اپنے اس اساسی نقص کے باوجود شعرائے اردو کے تذکروں میں شہرت و اہمیت کا جو منصب بلند اس تذکرے کو حاصل ہے، وہ "عیار الشعرا" "عمدۂ منتخبہ" اور "مجموعۂ نغز" جیسے مبسوط کارناموں کو بھی میسر نہیں۔ پرنسپل عبدالشکور کے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ۔

"یہ تذکرہ اور تذکروں کے مقابلے میں زیادہ اہتمام اور

---

[1] نگارستان ذناکسی کے تمہیدی خطبے مصححِ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص ۱۰
[2] گلشن بے خار طبع اول ص ۲۱۲

ذمہ داری کے جذبے کے ساتھ لکھا گیا ہے"۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔

شیفتہ نے پوری کوشش کی ہے کہ ہر شاعر کے زیادہ سے زیادہ حالات معلوم کر کے درج کیے جائیں"[1]

لیکن یہ اور اسی قسم کی دوسری تمام رائیں کسی غائر تجزیے اور بسیط مطالعے پر مبنی نہیں بلکہ مولف کی سخن شناسی اور دیدہ وری کے بارے میں اگلے مداحین و معاصرین و متاخرین کے تاثرات کی صدائے بازگشت ہیں جن ناقدین نے اس سلسلے میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے "گلشن بے خار" کو دوسرے تمام تذکروں سے ممتاز اور فائق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ یا تو اگلے مضامین و مطالب پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر گئے یا دوسرے ہم زمانہ اور قدیم تذکروں کے مطالعے سے محروم رہے ہیں ورنہ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ رہتے کہ بعض دوسرے تذکرہ نگاروں کی روش کے مطابق شیفتہ نے بھی اکثر و بیشتر تین چار تعریفی جملوں یا دو تین سطروں کے مختصر اور رسمی تعارف کے بعد اشعار نقل کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ یہ عمومی کیفیت مندرجہ ذیل مثالوں سے صاف ظاہر ہے جو مجموعی صورت حال کو سمجھنے کے لئے یقیناً کافی ہوں گی۔

(۱) آرزو:۔ "تخلص سراج الدین علی خاں اکبر آبادی است۔ حالش از فرط شہرت آرزو مند آن نیست کہ راقم متصدی آں شود۔ گاہے بنا بر گفتن بہ فکر ریختہ می پرداخت"۔ (ص ۱۲)

(۲) اکبر:۔ "تخلص اکبر خاں کہیں برادر داعی آثم۔ بہ اکثر صفات حسنہ متصف است۔ از کمتر ایام رغبتے بہ شعر پیدا کردہ۔ از

---

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ اول ص ۔۵۴

(۳) تسکین :۔ حضرت مومن استفادہ می کند (ص ۳۵)

"تخلص میر حسین۔ سلسلۂ نسبش بمیر حیدر خاں قائل۔ زر زرخ سیر می رسد۔ صاحبِ فکر بلند۔ اسلوب گفتارش دلپسند۔ از حضرت مومن بدرستیٔ اشعار پرداختہ۔ از احبابِ راقم است۔" (ص ۵۹)

(۴) حشمت :۔ "تخلص میر محمد علی از پیشینیان است"۔ (ص ۸۶)

(۵) خلق :۔ "تخلص الموسوم بہ میر احسن بن میر حسن صاحب مثنوی سحرالبیان کہ شہرہ بدر منیر است۔ کسب سخن از پدرش کردہ۔" (ص ۹۳)

(۶) ذکا :۔ "تخلص خوب چند کایستھ دہلوی شاگرد شاہ نصیر است روزے با فقیر برخوردہ بود می گفت کہ تذکرہ در ریختہ نوشتہ ام ملاحظہ نہ شد۔" (ص ۱۰۵)

(۷) سوز :۔ "تخلص محمد میر نام لکھنوی۔ در تیر اندازی دستگاہے داشت خط شفیعا و نستعلیق زیبا می نگاشت بخواندنِ اشعار بطرز مطبوع مشہور رجال و کلامش از جادۂ مستقیمہ برکران"

(ص ۱۳۸)

(۸) عشق :۔ "تخلص شاہ رکن الدین معروف بشاہ گھسیٹا از سخن پردازان معروف عظیم آباد است۔ بہ دنیا زندگانی می کرد۔" (ص ۱۷۹)

(۹) فگار :۔ "تخلص میر حسن نبیرۂ میر نصیر الدین فقیر۔ سید لیست دل نگار وطلبش بلند۔ جلد آشنا۔ سخن را بہ مرزا اسداللہ خاں غالب گذرانیدہ۔" (ص ۲۰۵)

(۱۰) یاس :۔ "تخلص خیر الدین ساکن دہلی طبع شگفتہ دارد۔ اکنون بہ فکر شعر نمی پردازد۔ خوشہ چین خرمن فیض خدمت مومن خاں است۔ دریں ایام طبعش بہ کرب طب مصروف است گویا ہمیں سبب ترکِ سخن بودہ" (ص ۱۴۴)

جن شعرا کے متعلق "گلشن بے خار" کی عبارات اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں سے آزردہ، حشمت، ذکا، سوز اور عشق کے بارے میں مصحفی، مرزا علی لطف اور بعض دوسرے پیش رو تذکرہ نگاروں کے یہاں اس سے کہیں زیادہ تفصیلات موجود ہیں۔ لہذا ان کے حالات کے سلسلے میں شیفتہ کی کوتاہ قلمی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح باقی ماندہ شعرا کے بارے میں قرب زمانی و مکانی ذاتی تعلقات اور دوسرے ذرائع و وسائل کی موجودگی میں صرف چند تعارفی جملوں پر اکتفا کرتے ہوئے اشعار نقل کر دینا ان کی سہل انگاری کا ایک بین ثبوت ہے۔ صرف مفتی صدر الدین آزردہ، قلندر بخش جرأت، خواجہ میر درد، شیخ محمد ابراہیم ذوق، سعادت یار خاں رنگین، مرزا رفیع سودا، مرزا غالب، قائم چاند پوری، مصحفی امروہوی، مرزا مظہر جان جاناں، حکیم مومن خاں مومن، میر تقی میر، شیخ امام بخش ناسخ جیسے معدودے چند اساتذہ اس بے اعتنائی کی زد سے محفوظ رہے ہیں۔ لیکن اس تلافی مافات میں بھی مولف کا زیادہ تر زور قلم واقعات زندگی کی شرح و تفصیل کے بجائے دور از کار مداحی پر صرف ہوا ہے ضمناً کہیں کچھ کام کی باتیں آگئی ہیں۔ ان کی نوعیت بھی اسی قسم کی ہے:

(۱) رنگین :۔ "تخلص سعادت یار خاں خلف محکم الدولہ طہماسپ بیگ خاں لختے از فنون سپہگری آگاہ است۔ اکثر بلاد را بہ گام

سیاحت بیہودہ دور ایام جوانی مشتہا ورزیدہ ۔۔۔۔۔۔۔ تلمیذ شاہ حاتم است ۔ چند دیوان با اصناف سخن نظم کردہ و آن را در مجلدے فراہم آوردہ نورتن نام کردہ ۔۔۔۔۔۔ بعد بپایان آمدن ایں تذکرہ عمرش بسر آمد۔ وکان ذلک فی شہر جمادی الثانی سنہ ہزار و دو صد و پنجاہ و یک و ہشتاد سال زندگانی کرد۔'' (ص ۱۱۵)

(۲) سودا :۔ '' اصلش از کابل و مولد و منشائش جہاں آباد است۔ بہ سن شباب بہ لکھنؤ رفت و ہم در انجا وفات یافت ۔ وفاتش را زمان بسیار آمدہ ۔ از مقربان بارگاہ وزیرالممالک نواب آصف الدولہ بہادر بود ۔'' (ص ۱۳۱)

(۳) قائم :۔ '' شیخ محمد قیام الدین از سکنائے چاندپور دارشد تلامذہ مرزا رفیع سودا است بیشتر محل سکونش دارالخلافہ بود ۔۔۔۔۔۔ وفاتش در ۱۲۱۰ھ اتفاق افتاد ۔'' (ص ۲۰۶)

(۴) مصحفی :۔ '' اصلش از قصبۂ امروہہ من مضافات مراد آباد ۔ در عنفوان جوانی بہ جہاں آباد آمدہ طرح اقامت افگندہ ۔ آخرہا بہ لکھنؤ رفتہ و تا نفس آخر ہم در آں جا عمر گزرانید ۔ وفاتش را امروز دہ سال گزشتہ ۔ عمر بسیار یافتہ ۔ ابتدائش انتہائے دورۂ سودا بود با جرأت و انشا شاعرات و مطارحات کردہ است ۔ شش دیوان ریختہ و یک تذکرہ تمام کردہ و دیوانے در فارسی و تذکرہ ہم دارد ۔'' (ص ۲۴۱)

(۵) مظہر :۔ اسم شریفش مرزا جان جاناں ۔ علوی نسب است ۔ بزرگان

ایشان از ارباب مناصب بودہ اند۔ پدر بزرگوار ایشان بہ علتے از عالمگیر بادشاہ آزردہ ترک منصب گفتہ۔ مرزا در اکبرآباد نشو و نما یافتہ۔ عاقبت میانہ جہاں آباد۔ طرح سکونت انداختہ کسب باطن از خدمت سید محمد نور بدائونی نقش بندی مجددی نمودہ ... ... در ماہ محرم ۱۱۹۲ھ بعضے از تعصب کشان بیباک دبید روان سفاک شہیدش کردند و او خونش بہ قاتل بخشید میر قمر الدین منت۔ "عاش حمیداً مات شہیداً" تاریخ وفاتش یافتہ۔" (ص ۲۴۸ : ۲۴۹)

(۶) ناسخ بہ "تماسیہ عہد لکھنؤ گزرانیدہ و بے از کارکنان دولت آن جانا این بودہ مجال سکونت نہ یافتہ بہ الہ آباد شتافتہ و باز بہ کانپور عود نمودہ و اکنون بہ سبب تغیر و تبدیل دورۂ اراکین سابق رجوع بہ مرکز کردہ۔ گویند کہ در ایام فراق لکھنؤ و احباب لکھنؤ اشعار درد آمیز گفتہ و قصۂ نقل و حرکت او دراز است کہ این مختصر گنجائی آن را بر نیاید۔" (ص ۲۰۹)

اس قسم کے مجمل و مختصر سوانحی اشارے اگرچہ کسی شاعر کی زندگی کے مختلف گوشوں کو پوری طرح اجاگر نہیں کر سکتے تاہم ان کے سہارے اس کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں کسی قدر مدد مل جاتی ہے۔ لیکن اگر موازنے اور مقابلے کی نظر سے دیکھا جائے تو ان اساتذہ کے بارے میں تذکرۂ ہندی، طبقات سخن، عیار الشعراء، عمدۂ منتخبہ اور مجموعۂ نغز کی فراہم کردہ معلومات اس سے زیادہ مفصل و معتبر ہیں۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ شیفتہ نے ہر شاعر کے زیادہ سے زیادہ حالات معلوم کر کے درج کرنے کی کوشش کی ہے۔

یکسر خلافِ واقعہ اور حد درجہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے بیشتر شعرا کے ذکر میں ان کے سلسلۂ تلمذ کی نشان دہی کر دی ہے اور بیس اکیس شاعروں کے سنینِ وفات بھی متعین کر دئے ہیں جن کی کچھ مثالیں اوپر گزر چکی ہیں اور کچھ یہ ہیں۔

(۱) میر امانی دہلوی "وفاتش ۱۱۷۷ھ اتفاق افتاد۔" (ص ۳۹)

(۲) محتشم علی خاں حشمت :- "در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و سہ بمفاجات درگذشت۔" (ص ۸۶)

(۳) اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور "بعد ضبط ترجمہ دے پیش ازاں کہ ایں تذکرہ بہ انجام رسد۔ عمرش بہ انجام رسید وکان ذلک فی شہر شوال سنہ خمسین و مائتین بعد الالف من ہجرت خیر الورٰی علیہ الوف التحیۃ والثنا۔" (ص ۱۲۸)

(۴) الٰہی بخش خاں معروف - "در ۱۲۴۲ھ یک ہزار و دو صد و چہل و دو۔ ۔ ۔ ۔ ایں جہاں گذران را گذاشت" (ص ۲۵۰)

(۵) میر قمر الدین منت :- بعمر چہل و نہ سال در کلکتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داعیِ اجل را لبیک گفت وکان ذلک فی سنہ ثمان و مائتین بعد الالف۔" (ص ۲۶۴)

(۶) جواد علی خاں ہادی "در سنہ ۱۲۱۵ھ بگور آرمیدہ۔" (ص ۲۳۶)

لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جن شعرا کے زمانۂ وفات کے بارے میں دوسرے ذرائع سے تصدیق کی جا سکتی ہے ان میں سے بیشتر کے متعلق شیفتہ کے بیانات غلط ہیں مثلاً :-

(الف) غلام علی راسخ کے حال میں لکھتے ہیں کہ در سنہ یک ہزار

دو صد و چہل فوت شد۔" (ص ۱۰۱)

راسخ کا انتقال ۱۲۴۰ھ میں نہیں ہوا بلکہ اس سے دو سال قبل ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۳ء میں ہوا ہے جیسا کہ ان کے شاگرد یاس اکودی کے مندرجہ ذیل بیان سے معلوم ہوتا ہے

"اسحاق تاریخ رحلت شیخ غلام علی راسخ بہ تلاش تجسس کما ینبغی بہ دریافت رسید کہ تاریخ بستم جمادی الاولی ۱۲۳۸ھ روز دوشنبہ بودہ است[1]"

(ب) میر غلام حسین شورش کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "وفاتش بہ سنہ ۱۱۹۰ نوشتہ اند۔" (ص ۱۵۲)

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس سلسلہ میں شیفتہ کا ذریعۂ معلومات کیا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ بیان غلط ہے صحیح سال وفات امرا اللہ الہ آبادی کے بقول ۱۱۹۵ھ/ ۸۱-۱۷۸۰ء ہے جس کو انھوں نے دیگر تفصیلات کے ساتھ ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔

"در عشرۂ اولیٰ ماہِ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و نود و پنجم ہجری میر شورش جہانِ پُرشور را بدرود کرد۔[2]"

علی ابراہیم خلیل کے بیان سے بھی ۱۱۹۵ھ/ ۸۱-۱۷۸۰ء ہی میں انتقال کی تصدیق ہوتی ہے[3]۔

(ج) اشرف علی خاں فغاں کے متعلق لکھتے ہیں کہ

---

[1] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" از پروفیسر اختر اورینوی ص ۲۰۱

[2] تذکرہ مسرت افزا" ص ۱۱۲

[3] در ۱۱۹۵ھ رحلت کردہ" گلزار ابراہیم مخطوطہ رضا لائبریری رام پور۔ ورق ۱۵۷

"در سنہ ۱۱۹۶ھ ازیں خاک دان بہ بہشت جاوداں نقل کرد"

(ص ۱۰۳)

شیفتہ کے اس بیان کے برخلاف بعض تذکرہ نگاروں نے فغاں کا سال وفات ۱۱۸۶ھ/۷۳-۱۷۷۲ء قرار دیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ ان کے سنگِ مزار پر کندہ تاریخ وفات "مرد دلہا رفت"[1] سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(د) میر شمس الدین فقیر کے بارے میں یہ اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ

"در ۱۱۷۰ھ بعد کسبِ سعادتِ زیارت حرمین شریفین زاد اللہ شرفاً و تعظیماً ہنگام بازگشت زورقِ حیاتش طوفانی شد" (ص ۲۰۵)

فقیر کا سنہ ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء میں وفات پانا کسی مستند روایت کی رو سے ثابت نہیں۔ ان کا انتقال زیارتِ عتباتِ عالیات سے واپسی کے دوران ۱۱۸۳ھ/۷۰-۱۷۶۹ء میں ہوا ہے[2]۔

(ہ) مرزا مظہر جانِ جاناں کی نسبت گلشنِ بے خار کا جو اقتباس گزشتہ سطور میں نقل کیا گیا ہے اس کے آخری چند جملے ہیں کہ:-

"در ماہ محرم ۱۱۹۵ھ بعضے از تعصب کیشانِ بے باک بیدردانِ سفاک شہیدش کردند و ادخونش بقاتل بخشید میر قمر الدین منت عاشق حمید گشت شہید ا تاریخ وفاتش یافتہ" (ص ۲۴۹)

شیفتہ کی یہ روایت بھی سابق الذکر روایات کی طرح بعید از صحت ہے اور تذکرہ سرور کی کورانہ تقلید کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔ سرور نے

---

[1] بحوالہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا از ڈاکٹر اختر اورینوی ص ۲۳۰

[2] تفصیلات "گلشنِ ہند" پر بحث کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہیں۔

مرزا صاحب موصوف کے حال میں لکھا ہے کہ:۔

"در عہد نواب ذوالفقار الدولہ از دست چندے بے باکان اکثر سکنۂ شہر کشتہ شدند۔ ایشاں را ہم کسے در ماہ محرم سنہ یک ہزار و یک صد و نود و شہید گردانید[1]"

مرزا صاحب کی شہادت مسلمہ طور پر محرم الحرام ۱۱۹۵ھ/ جنوری ۱۷۸۱ء کا واقعہ ہے[2]۔ شیفتہ کے نقل کردہ مادۂ تاریخ "عاشق حمید گا، مات شہید گا" سے بھی ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے اس تاریخ کو نقل کرتے وقت اس کے اعداد پر توجہ دی ہوتی تو یقیناً وہ اس غلط بیانی کے مرتکب نہ ہوتے۔

ان تاریخی غلطیوں کے علاوہ "گلشنِ بے خار" شاعروں کے نام، تخلص تلمذ اور وطنیت سے متعلق بے شمار لغزشوں اور تحیڈے سے فرق کے ساتھ ایک ہی شاعر کے ذکر کے اعادے کی چند در چند مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان اوراق کی محدود گنجائش کے پیش نظر یہاں ان میں سے بعض کی جانب اشارے کیے جاتے ہیں۔

(الف) لکھنؤ کے ایک شاعر شاہ شرف الدین الہام پہلے ملول تخلص کرتے تھے[3]۔ شیفتہ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ پہلے ردیف الف میں اور پھر ردیف میم کے تحت دو مختلف شاعروں کی حیثیت سے بہ تفصیل ذیل ان کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) "الہام تخلص شیخ شرف الدین المعروف بہ شاہ ملول از لکھنؤ

---

[1] عمدۂ منتخبہ۔ ص ۵۲   [3] "عقد ثریا" از مصحفی اردو ہوی ص ۵۶

[2] "گلشن ہند" از مرزا علی لطف ص ۳۴۰

است۔ مرد وارستہ بودہ۔ و بہ علتِ درویشی بہ اعتبار می زیست
گویند کہ بزمرہ اساتذہ معدود نبود۔ بہ فارسی ہم تکلم می کرد از
اوست۔

ارے بیکسی تیرے قربان ہوں :: بُرے وقت میں ایک تو رہ گئی

نگاہ نہ دشنہ کہ طعنہ کٹار پر مارے
مژہ وہ تیر کہ خنجر کو دھار پر مارے (ص ۳۹)

(۲) "ملول تخلص شاہ شرف الدین از درویشان است۔ از اوست

تری جدائی نے یاں تک ہمیں ملول کیا
کہ زندگی کے عوض مرگ کو قبول کیا (ص ۲۵۴)

(ب) جوشش تخلص کے تحت ایک ہی صفحے پر بہ صورتِ ذیل
دو مختلف الاسم شاعروں کے حالات درج کئے گئے ہیں۔

(۱) "جوشش تخلص محمد عابد۔ اصحاب تذکرہ اور از ابنائے
جسونت ناگر عظیم آبادی نوشتہ اند" (ص ۷۲)

(۲) جوشش تخلص محمد روشن از تازہ خیالانِ محمد آباد است۔
شورش عاشق بے غمش فکرش دلپذیر و دلکش۔ شیوہ گزیدہ
اش گزیدہ۔ طرز پسندیدہ اش پسندیدہ و معہذا در فنِ
عروض بسیار مہارت دلخواہ داشت" (ص ۷۲)

بہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ محمد عابد کا تخلص دِل ہے اور شورش
کا محمد آباد بنارس سے وطنی تعلق نہیں تھا اس اتفاقی اختلاف سے قطع
نظر شیفتہ نے انتخاب کلام کے تحت جو اشعار نقل کئے ہیں انکے مطابق
محمد عابد اور محمد روشن شخص واحد یعنی جوشش ہی کے دو تخلص ہو پائے

(ج) سراج کا ترجمہ ان تفصیلات پر مشتمل ہے:-

"سراج تخلص، سراج الدین علی۔ سراج بزمِ علم و دانش است آوردہ اند کہ روزے در رہگزرے سراج پروانہ شمع روئے از طائفہ ہنود گشت۔ چوں تخالفِ مذہب در میان بود، در تب آں شور بجز من افتادہ بیہودہ می سوخت۔ آخر تاثیرِ عشقِ یک رنگی پسند، وزی سوزر حجے در دلِ مرشدِ پدر آن ماہوش انداخت کہ برائے وصلتِ آں ہر دو سوختۂ آتشِ فراق بدلش راہ ہدایت ساخت۔ وے نظر بفرطِ الاعتقاد اعراض از فرمائش نتوانست کرد و دم شمع را بہ پروانہ داد یعنی دخترش را بہ سراج زدانہ چوں کام پروانہ از وصلِ جاناں غیر از جاں دادن نیست سراج پروانہ وار گردِ آں چراغ محفلِ حسن گردیدہ جان بجان آفریں سپرد۔ او نیز شمع کردار لمحے بر سرِ نعشِ سوختہ خویش گریستہ مرد۔ فرد

تو ہم شب را بسر کے می بری اے شمع کم فرصت
گر نتم سوختی پروانۂ آتش بجانے را

بالجملہ غزلے کہ شعرے از آں ایراد کردہ می شود، از و شہرت تمام دارد: جز ایں چیزے دیگر از مسموع نہ گشتہ۔

جلی دشتِ عشق میں وہ ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی (ص ۱۲۶-۱۲۷)

اس عبارت میں سراج کے معاشقے کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے۔ مبتلا میرٹھی نے "طبقاتِ سخن" میں اور

خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں مبتلا ہی کے واسطے سے اس سلسلے میں کچھ اور تفصیلات بھی بیان کی ہیں جن میں یہ اطلاع بھی شامل ہے کہ:-

"در ضلع پورب مزار آن ہر دو بے قرار بیک جا ہنوز بہ مرقدین عاشق و معشوق مشہور است"[1]

سراج کے مدفن کے متعلق یہ ایک خلاف حقیقت روایت ہی اس پورے واقعے کو محض افسانہ قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ ممکن ہے کہ شیفتہ نے یہ واقعہ مبتلا کے بیٹے شیخ شرف الدین مضمون میرٹھی کے تذکرے سے جوان کے ماخذ میں شامل ہے نقل کیا ہو۔ بہر حال اس کی صحت کا کوئی معتبر ثبوت موجود نہیں۔ اس سے زیادہ گمراہ کن یا مغالطہ انگیز امر یہ ہے کہ شیفتہ مذکورالصدر سراج اور مشہور شاعر سراج اورنگ آبادی کو دو مختلف شخصیتیں قرار دیتے ہیں چنانچہ منقولۂ بالا شعر نقل کرنے کے فوراً بعد موخر الذکر سراج کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

"سراج نامش معلوم نشد۔ از اورنگ آباد است و معاصر آبرو۔ از وست۔

نہیں ہے تاب مجھے تیرے سامنے جاناں
کہاں سراج کہاں آفتاب عالم تاب
نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف ان کے قامت کی
کہ یہ مضمون مجھ کو عالم بالا سے آتے ہیں

(صفحہ ۱۲۰)

---

[1] تذکرہ بے جگر مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن ورق ۱۰۵ الف

یہ تینوں شعر بہ شمول شعر نمبر ۱ (چلی دشت ..... ہری کا رہی) ایک ہی شاعر سراج کی تصنیف ہیں جن کا پورا نام سید شاہ سراج الدین اور مولد و مدفن اورنگ آباد ہے۔[1] ظاہر ہے کہ جس تذکرے میں اس قسم کی غیر محتاط اور بے سر و پا روایتیں اور وہ بھی فراوانی کے ساتھ موجود ہوں، اسے استناد و اعتبار کے درجے پر فائز سمجھنا ایک ایسی غلطی ہے جو گمراہ کن نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔

سوانح حیات اور ان سے متعلقہ امور کے سلسلے میں شیفتہ کے بیانات اور انداز نظر کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہوئے جب ہم ان کے پیش کردہ سیرت و شخصیت کے مرقعوں تک پہنچتے ہیں تو وہاں بھی ڈاکٹر عندلیب شادانی کے بقول یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ "اگر شاعر کا نام اور دوسرے حوالے حذف کر دئے جائیں تو ان عبارتوں کو پڑھ کر کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس کے متعلق ہیں"۔[2] بالخصوص شخصیت کے خط و خال کی بازآفرینی اور تخلیقی صلاحیتوں کی تحسین کے لئے انھوں نے جو پرتکلف اور مرصع انداز بیان اختیار کیا ہے وہ اس فن سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ ان کی تحریروں میں مصور کے حقیقت طراز قلم سے زیادہ انشا پرداز یا شاعر کا نازک بیان تخیل کارفرما نظر آتا ہے وہ تجزیہ کے بجائے حاشیہ آرائی سے کام لیتے ہیں اور رنگینی عبارت و شگفتگی تحریر کی خاطر حقائق کے رشتے خواب و خیال کی دنیا سے ملا کر ایک طلسمی کیفیت پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ یہ طلسم بندیاں

۱؎ تفصیلات کے لئے دیکھئے مقدمہ کلیات سراج از پروفیسر عبدالقادر سروری

۲؎ شیفتہ نقاد کی حیثیت سے "تحقیق کی روشنی میں" صفحہ ۵۲

شخصیت کے تنوع اور ہمہ گیری کے ساتھ پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات اصل مفہوم الفاظ کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً :-

(۱) ذوق :- "آئینۂ طوطیٔ بلاغت است و طوطی شکرستان فصاحت جامۂ سحر بیانی بہ بالائش راست و دامنِ آتش زبانی از یادِ نفسش شعلہ افزا است ۔ رنگینیٔ خیالش جلوہ لالہ و گل بہ نظر می فزاید و شمعِ فکرتش پروانہ وار دل می رباید اگر لفظ "بنشیں" در کلامش آید جانفزا تر از دمِ عیسیٰ است و اگر حرفِ "برو" در سخنش گزرد دلکش تر از خوش آمدنی شاہد زیبا۔ ہر مصرعش تیریست از ترکش کمال ابروان جستہ و ہر بیتش دشنہ ایست دل ہا خراشیدہ و سرہا شکستہ۔" (صفحہ ۱۰۵)

(۲) سودا - "لطفِ طبعش چوں عشوۂ دلدار سراپا ناز از ہر رگ و پے نظمش می بارد - فکرش چمن جنت است کہ گلہائے کس نہ چیدہ ازاں می خیزد و اندیشہ اش چشمۂ خلد است کہ جوئے شیر ازاں می ریزد - ذوقِ کلامش ہم از شراب است امانہ شرابے کہ از رگ تاک بر آید - طائر خیالش بانسر طائر ہم پرواز است و ہمائے فکرش بر ایوان کیوان سایہ گستر و جلوہ انداز۔" (صفحہ ۱۳۱)

(۳) غالب - "طوطیٔ بلند پرواز چمن معانی است و نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی - پیشِ بلندیٔ خیالش اوجِ فلک پستیٔ زمیں است و در جنب نو نشینی غورش سرفرازیٔ تا دون کرسی نشین - فکرش خود بہ ترسگاہ عنقانہ پرداز داشہب طبعش

جز بہ عرصۂ فلک نتازد۔ اگر امروز بہ تلاش متاع نفیس یابی

جز بدکانش درنیابی۔" (صفحہ ۱۸۶)

(۴) مومن۔ "زبانِ جادو۔ طرازش سحر را بمرتبۂ اعجاز رسانیدہ و سخنِ دلپذیرش طول را ہمپایۂ ایجاز گردانیدہ۔ گوہر افشانیٔ طبع نیساں بارش دامنِ کان جواہر در جیب و آستین مفلساں انداختہ دگلریزیٔ اندیشہ بہار نثارش چمن چمن ریاض جنت بچشم نظارگیان جلوہ گر ساختہ۔ در جلبب تفردِ ذاتش ماہتاب کہ بہ یکتائی علم است مانند ستارگان بتعدد مشہور و بہ ضیائے شمع فکرتش ذرات نامحسوس بجلوۂ خورشید اختاں شاہد و منظور۔ در پیش جنبش نیر گیتی آرا انوری کم از سہا و در بارگاہ چنیں خدیو فریدوں فر خاقانی کمینہ چاکر۔ اعشیٰ یکے از وظیفہ خوارانِ خوانِ نعمت اوست و بوفراس یکے از غاشیہ بردارانِ میدانِ مکرمت او دعویٰ گرانِ بلند آہنگ ہمہ دانی و رحضرتش نغمۂ ہیچدانی می سرایند و مدعیان طلیق اللسان بہ جنبگاہش لب می بندند و زبانِ بہ اظہارِ لکنت، می کشانید" (صفحہ ۳۶۸)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جن اساتذہ کے حالات سے یہ اقتباسات ماخوذ ہیں وہ اپنی گراں قدر ادبی خدمات کے باعث زیادہ سے زیادہ تحسین وستائش کے مستحق ہیں لیکن ان کی شخصیات کے نقوش ابھارنے کے لئے اس قسم کی بے سرو پا عبارت آرائی اور غیر مدلل مداحی کی کوئی بھی شخص جو الفاظ اور معانی کے رشتوں اور ان کی نزاکتوں کا شعور

رکھتا ہے، وکالت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرنسپل عبدالشکور بھی جنھوں نے "گلشن بے خار" کو ہر اعتبار سے منفرد اور ممتاز ثابت کرنے میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے، ایک دوسرے موقع پر مومن کے متعلق ایسے ہی چند جملے پیش کرتے ہوئے اس اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں کہ:-

"یہ الفاظ کا انبوہ محض عبارت آرائی ہے جو مومن کے لئے اسی آسانی کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں جیسے غالب اور ذوق کے لئے اس عبارت میں نہ مومن کا ذاتی نقد موجود ہے اور نہ غالب کا۔ جامہ دار کی شیروانی ہے جو چاہے زیب تن کر لے"[1]

مزید براں تحریر کا پرشکوہ اور خطیبانہ انداز صرف فن کے جادو اور شخصیت کی عظمت کے ساتھ مربوط و مخصوص نہیں۔ ہر وہ شخص جس سے شیفتہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ہیں اس کا مستحق قرار پایا ہے۔ چنانچہ دہلی کی ایک مشہور طوائف رحیم متخلص بہ نزاکت کے ذکر میں بھی ان کے قلم کی گوہر افشانی کا یہی عالم نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"شاہیست شیریں و دلبریست نمکیں۔ از شعشعۂ غدارِ تابانش خورشید خجل و از جلوۂ قامت زیبائش شمشاد پا در گل۔ غنچہ از لب خندانش طرز تبسم آموختہ و شمع از عارض درخشانش بہرہ برافروختہ۔ نسیم گیسوئش عطر بیز تر از بادِ بہاریست و شمیم مویش مشک ریز تر از نافِ آہوانِ تتاری۔ خجستہ روئے و خجستہ خوئے و خجستہ نام و خوش ترکیب و خوش حرکات و

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ اول صفحہ ۵۸

خوش خرام۔ تازہ گلِ گلشنِ جوانی است و نورس ثمر باغچۂ زندگانی در گلستاں حسن سرو یست نوخاستہ و باچنیں صفاتِ ظاہر بمحاسنِ باطن آراستہ از حسنِ صورت چگوید کہ معنی صد چند از اں است۔ بصفائے فکر و جودتِ ذہن و درستیٔ فہم وحیدِ عالم و یکتائے زماں۔ طبع لطیفش بمقتضائے فطرت بکسبِ فنونِ کمال مالوف است و بحسبِ سرشت از اوضاعِ ناپسندیدہ نفور و بسجایائے مرضیہ مشغوف۔ از زیرکی و فطانت و شوخی و متانت بکلی بہرہ ور و از آئینِ دردمندی و جیدرندی و وفا بر دو رکا و بلے رحمی بیگانہ باخبر۔" (صفحہ ۳۱۹)

الفاظ کے ان پردوں کی اوٹ سے جس شخصیت کا نقش ابھرتا ہے، اس کا طرۂ امتیاز فن کی زیبائش اور لطافتیں نہیں، حسن و جمال کی رعنائیاں ہیں اس لحاظ سے یہ مرقع ادب کے کسی طالبِ علم کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتا۔ البتہ اس سے اس احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کا ضرور اندازہ ہو جاتا ہے جو مؤلف کے مزاج میں رچا اور بسا ہوا تھا اور حسن کے نمایاں وجود پر اس عبارت کا ایک ایک لفظ شاہد ہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بعض دوسری تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔

مثال کے طور پر میر مہدی داغ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"جوانیست نیکو رو و زیبا شمائل و باوجود دلربائی بہ بیدلی مائل۔ تشبیہ گل بادبہر دو معنی درست است کہ ہم سینہ چاک است و ہم سینہ بدریدن می دہد و مشابہت لالہ باوے بہر دو صورت موافق کہ ہم دلش داغ است و ہم داغ بر دلہا می نہد۔" (صفحہ ۹۵)

مرزا غالب کا ایک مشہور اور زبان زد مقطع ہے

حشتؔ شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید   مرگیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالبؔ نے اس مقطعے میں جن دو شاعروں سے اپنا مرثیہ لکھنے کی توقع وابستہ کی ہے وہ دونوں اتفاقاً مومنؔ کے عزیز شاگرد، غالبؔ کے عقیدت مند اور ایک دوسرے کے بہت قریبی دوست ہیں لیکن دونوں کے ادبی مرتبے میں بڑا فرق ہے۔ ایک اپنے زمانے کا ممتاز فنکار ہے اور دوسرا ایک عام شاعر جس کی شہرت اس کی زندگی کی طرح اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ اس کے باوجود دوست کی نگاہِ التفات اسے عام شعراء کی صف سے نکال کر خواص کے پہلو بہ پہلو جگہ دیتی ہے اور اس کا قلم اس کی تعریف میں اس طرح موتی بکھیرتا ہے۔

"ماہِ منیر اوجِ سخن سنجی و سخن دانی است و مہرِ انور فلکِ مضامین و معانی۔ گلہائے نکرش دستہ بزم گل رخاں را شاید و جواہر نظمش آویزہ گوش یاقوت لباں را باید۔ زہے صولت کلامش کہ از زبانِ حسود ہیچ است بجائے طعنہ نعرۂ احسنت خیزد و خہے شوقِ گفتارش کہ در زہرخند شراب از دہانِ اعدا ریزد۔ عرصۂ نظم پامال کردۂ ہم گناز رخش اوست۔ انصاف ایں است کہ نکوئی فنِ شعر در سخن اوست۔ و قطعِ نظر ازیں باوجود حداثتِ سن و عنفوانِ شباب در اکثر کمالات جاہے بلند و مکانتے ارجمند دارد" (صفحہ ۲۳۰)

تحسین و توصیف کے اس انداز کو دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ شیفتہ کو بہت سے مشاہیر شعرا کی شخصیتوں میں بھی کمالات کی یہ جامعیت اور اوصافِ ظاہری و باطنی کا یہ امتزاج نظر نہیں آیا ہے اور اس ضمن میں وہ ان کے متعلق سرسری طور پر دو ایک جملے سپردِ قلم کرکے آگے بڑھ گئے ہیں مثلاً:-

(الف) آتش :- "روش رندانہ و وضع بے باکانہ دارد"۔ (صفحہ ۹)

(ب) انشا :- "لختے در فنونِ رسمیہ مہارت داشت و در ہر فن کوس لمن الملکی بہ آوازۂ تمام می نواخت"۔ (صفحہ ۴۲)

(ج) حاتم :- "تبتل و توکل شیوہ کردہ در جہاں آباد آزادانہ می زیست اکثر اربابِ فکر از وہ بہرہ ہا یافتہ اند" (صفحہ ۷۷)

(د) بہادر شاہ ظفر :- "بہ اکثر صفاتِ موصوفہ و بہ محامد و مکارم معروف۔ در اکثر خطوط دستگاہ شایستہ دارد۔ با ایں ہمہ بسیار ماہر فن است"۔ (صفحہ ۱۷۳)

(ہ) شمس الدین فقیر :- "در دری زبان دستگاہ معقول دارد ولا سیما در عروض و قافیہ بے نظیر وقت خویش است" (صفحہ ۲۰۵)

(و) نظیر اکبرآبادی :- در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است" (صفحہ ۳۲۳)

(ز) ہدایت اللہ خاں ہدایت :- "طبعش بہ فنونِ نظم قادر از نکات و غوامض آں فی الجملہ ماہر"۔ (صفحہ ۳۳۷)

(ح) انعام اللہ خاں یقین :- "جوانیست نیکو روئے و خوش خوئے... ... در فن نظم مکانتے مطلوب بادست" (صفحہ ۳۴۲)

ناقدین نے گلشن بے خار کے تنقیدی پہلو کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے چنانچہ اردو تنقید کی تاریخ میں شیفتہ ایک عہد نو کے نقیب کی حیثیت سے یاد کئے جاتے رہیں۔ ان کی سخن شناسی اور ناقدانہ بصیرت کی تعریف و توصیف اور ان کے تنقیدی فیصلوں کی دقت اور بلند معیاری کا اعتراف اتنی بار کیا گیا ہے اور ایسے ایسے مشاہیر اہلِ قلم نے کیا ہے کہ آپ یہ باتیں تاریخ ادب کے

مسلمات کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ بعض مشہور مصنفین کے یہ اقوال اسی صورت حال کی جانب اشارہ کرتے ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر رام بابو سکسینہ:۔ "گلشن بے خار۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے"۔[۱]

(۲) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی:۔ "ہر شاعر کے متعلق انھوں (شیفتہ) نے بڑی جچی تلی رائیں لکھی ہیں"۔[۲]

(۳) ڈاکٹر عبادت بریلوی:۔ "شیفتہ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کی خامیوں کو اجاگر کر کے پیش کرنے سے باز نہیں آتے"۔[۳]

(۴) پرنسپل عبدالشکور:۔ "اس تذکرے میں جو متانت اور وزن پایا جاتا ہے وہ اور تذکروں میں مشکل سے ملتا ہے شیفتہ ناقد بھی بہتر ہیں اور شعرا کے بارے میں ان کی رائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ان کے یہاں) تنقید کا پہلو زیادہ جاندار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے۔ ۔ ۔ ۔ مولف کو اپنے فرض کا احساس ہے اور اس نے ذاتی تعلقات سے متاثر ہو کر شاعر کے کلام کی تعریف نہیں کی ہے"۔[۴]

عصر حاضر کے ممتاز دانشوروں کی یہ رائیں ایک ایسے قاری کو جو اپنے محدود

---

[۱] تاریخ ادب اردو، ترجمہ عسکری صفحہ ۲۱۰

[۲] دلی کا دبستان شاعری صفحہ ۲۵۰

[۳] اردو تنقید کا ارتقا صفحہ ۱۰۰

[۴] تنقیدی سرمایہ حصہ اول صفحات ۵۲ و ۵۴

علم یا فارسی زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر "گلشن بے خار" کے براہِ راست مطالعے سے قاصر ہو یہ باور کرا دینے کے لیے یقیناً کافی ہیں کہ شیفتہ نے اپنی تمام تر ناقدانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے بغیر کسی تخصیص ہر شاعر کے کلام کے متعلق ایک قطعی اور فیصلہ کن رائے دے دی ہے اور ان کی یہ رائیں دوسرے "تذکرہ نگاروں کی رایوں سے زیادہ بے لاگ، زیادہ باوقار، زیادہ جچی تلی اور زیادہ صحیح ہیں لیکن ان دعووں میں کس حد تک حقیقت و واقفیت کا عنصر موجود ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جن شاعروں کے کلام کے بارے میں شیفتہ نے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیا ہے، ان کا تناسب شعرا کی مجموعی تعداد کے آٹھویں حصے سے کسی طرح زیادہ نہیں اور یہ تاثرات بھی بالعموم چند بندھے ٹکے لفظوں اور مجمل و مختصر جملوں میں محدود ہیں مثلاً :-

(۱) شاہ مبارک آبرو :- "از زبان آوران نائی طبقہ پیشین است - بصنعتِ ایہام مائل بود۔" (صفحہ ۸)

(۲) رضا قلی آشفتہ :- "شعرش ستہ و صاف و فکرش مطبوع طبع اہلِ انصاف۔" (صفحہ ۱۰)

(۳) احسن اللہ بیان :- "حد بستش شیریں و دلآویز سخنش نمکین و شور انگیز" (صفحہ ۵۳)

(۴) احسن اللہ احسن :- "از معاصرین آبرو و ناجی و بطور شان غزل سراست۔" (صفحہ ۲۹)

(۵) سجاد اکبر آبادی :- "از تلامذۂ آبرو ست و متبع طریقہ او۔" (صفحہ ۱۲۵)

(۶) میر سوز :- کلامش از جادۂ مستقیمہ برکراں" (صفحہ ۱۳۸)

(۷) میر ضیاء الدین ضیا :- "از شعرائے نامی است" (صفحہ ۱۷۱)

(۸) شرف الدین مضمون :- "فکرش منصور بر ایہام است کہ شیوۂ اہل زمانش بودہ" (صفحہ ۲۴۶)

(۹) الٰہی بخش خاں معروف :- "خیالات رنگیں و مضامین دلنشیں دارد" (صفحہ ۲۵۰)

(۱۰) انعام اللہ خاں یقین :- "کلامش پر نمک است ۔ حلاوت دل خواہ دارد" (صفحہ ۲۴۲)

اس نوعیت کے تبصروں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے بقول "نہ کسی قسم کا اجتہاد ہے نہ کسی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار" بلکہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے عام طور پر جو باتیں کہی ہیں انھیں کو الفاظ کے معمولی سے رد و بدل کے بعد "گلشن بے خار" میں بھی نقل کر دیا گیا ہے البتہ صف اوّل و دوم کے چند اساتذہ اور مؤلف کے بعض احباب کے حالات میں کہیں کہیں ایسے جملے مل جاتے ہیں جنھیں صحیح معنی میں تنقید کلام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ اپنی عددی قلت کے باوجود یہ تنقیدیں اس لحاظ سے کافی اہمیت رکھتی ہیں کہ شیفتہ نے معمول کے برخلاف ان کے اندر بڑی حد تک آزادیٔ رائے اور ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاہی سے کام لیا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو نسبتاً بہتر طور پر نبھانے کی کوشش کی ہے ۔ در اصل "گلشن بے خار" کے یہی وہ حصے ہیں جن کی بنا پر اسے اچھے تذکروں کی فہرست میں کوئی جگہ دی جا سکتی ہے درج ذیل اقتباسات اس استثنائی کیفیت کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہیں :-

(۱) خواجہ میر درد :- "از لطافتِ طبع و شستگیِ نظم و رشاقتِ مضمون پیداست
کہ خواجہ را دریں فن نیز مانند کمالاتِ اخروی مکانتے ارجمند و
دستگاہے بلند است۔ فکرش صحیح و نظمش فصیح۔ گفتارش
از رکاکت و اغلاط پاک۔ در جلب گلہائے خیالش گلہائے
چمن ہم ارزِ خس و خاشاک۔ دیوانش از نظر گزشت۔ از اشعارِ
پرگن خالی است و اکثر ابیات با علوِ معانی و سموِ مضامین و نمکش
و حالی"۔ (صفحہ ۹۷)

(۲) شیخ محمد ابراہیم ذوق :- "قوت مشقے کہ او راست دیگرے را دیدہ نہ
شد و ہمہ ز ارطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویان است در کلامش
کمتر۔ بر جمیع اصنافِ سخن قدرتِ تمام دارد"۔ (صفحہ ۱۰۵)

(۳) مرزا رفیع سودا :- "با فنونِ شاعری مناسبتِ تمام دارد۔ بر اصنافِ سخن
قدرتِ تمام۔ و آں کہ بین العوام شہرت پذیر است کہ قصیدہ
اش بہ از غزل است حرفیست مہمل بزعمِ فقیر غزلش بہ از قصیدہ
است و قصیدہ اش بہ از غزل ... ... از اقسامِ شاعری در
مثنوی فکرِ معقول نداشت اما ہجوِ رکیکہ بسیار گفتہ و بآں شیوہ
داشتہ و مضامینِ دلآویز می یافتہ"۔ (صفحہ ۱۲۲)

(۴) مرزا غالب :- "در اوائلِ حال بتقاضائے طبعِ دشوار پسند بہ طرزِ
مرزا عبد القادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینیہا می کرد۔
آخر الامر از آں طریقہ اعراض نمودہ اندازے مطبوع ابداع
نمودہ۔ ... ... در زبانِ فارسی نیز دستگاہے بلند و مایۂ وافر
بہم رسانیدہ۔ پایۂ اش از فحولِ استادان کم نیست۔ غزلش

چوں غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدہ عرفی دلپذیر
مضامین شعری را کما حقہٗ می فہمد و بہ جمیع نکات و لطائف پے می
برد۔ و ایں فضیلتے است کہ مخصوص بعض اہل سخن است" (صفحہ ۱۸۶)

(۵) میر تقی میر: "با فنونِ نظمیہ ربط تمام دارد۔ لاسیما در غزل سرائی و
مثنوی گوئی گوئے سبقت می رباید۔ پست و بلند کہ در کلامش بینی
در رطب و یابس کہ در ابیاتش بنگر نظرت کنی واز نظرش شیفگی کہ گفتہ
اند فرد۔

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست

۔۔۔۔۔ از اقسام شاعری در قصیدہ فکر خوشے نداشتہ۔ چنداں
کہ غزلش بلند مرتبہ تر است ہم چناں قصیدہ اش پست پایہ تر"
(صفحہ ۲۹۱)

ان عبارات میں زیرِ بحث شعرا کی تخلیقات اور فن کے جائزے کا جو انداز اختیار
کیا گیا ہے اس میں تذکرہ نگاری کی بنیادی ضرورت کے بقدر انفرادی غور و فکر
اور آزادانہ رائے زنی کا رجحان کار فرما نظر آتا ہے۔ چوں کہ "گلشنِ بے خار" کی
غیر معمولی شہرت و عظمت کی دیواریں نقد و نظر کی اس متاعِ قلیل کے سہارے پر
کھڑی ہوئی ہیں، اس لئے اس پہلو کو مزید نمایاں کرنے کی خاطر مختلف شعرا کے
تراجم سے اسی قسم کی کچھ اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) انشا: "دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بہ طریقہ
راسخۂ شعراء نگفتہ اما در شوخیِ طبع و جودتِ ذہن او سخنے نیست"
(صفحہ ۴۲)

(۲) میر حسن: "بر اصنافِ سخن فی الجملہ قدرتے داشتہ۔ لاسیما مثنوی نیکو می گفتہ۔ مثنوی "سحر البیان" کہ مشہور بہ بدرِ منیر است، شہرتِ تمام دارد۔ قطع نظر از پالغزہائے شاعری بجا درہ عوام بر گفتہ بلکہ دادِ بلاغت دادہ۔" (صفحہ ۸۲)

(۳) قلندر بخش جرأت: "دیوانِ ضخیمے مشحون بہ انواع سخن ترتیب دادہ۔ چوں از اصول و قوانین ایں فن بہرہ نداشتہ نغمہ ہائے خارج از آہنگ می سرودہ وآوازہ اش کہ چوں طبل دور ترمز رفتہ از آنست کہ پذیرائے خاطر و گوارائے طبع اوباش والواط حرف می زدہ۔ و بہذا البعض ابیاتش بنہایت خوش ادا و دلربا آمدہ۔" (صفحہ ۶۲)

(۴) قائم چاندپوری: "شاعر لیست خوش گفتار بلند پایہ، عوز و غیبت عالی مقدار گراں مایہ۔ و آنچہ بعض ناشناسانِ سخن بہ مکانتِ سودا شمارندش حرف دردِ دیوانگی شان از جنوں است۔ از بہرہ اندوزانِ دانش نیا بد پستیٔ زمین را با فرازِ فلک یکے دانستن و ارباب بصیرت چشم از حق نتواند بست۔ چگونہ ... ذرہ را آفتاب تواں گفتن۔ بہ ہمہ حال قائم در سخن دستگاہے دل پسند دارد گو بپایۂ سودا نباشد۔ احاطہ بر اصناف او را میسر است لاسیما در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ۔" (صفحہ ۲۰۶)

(۵) مصحفی امروہوی: "بتقاضائے شیوۂ بسیار گویاں اکثر کلامش بر کم مایہ و از لطائف خالی است۔ اما گزیدہ اشعار او در نہایت رتبت والا و رتبت عالی است۔" (صفحہ ۲۴۱)

شیفتہ کے ان فیصلوں سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے بلکہ عصر حاضر کے ارباب نظر بھی ان مباحث میں بڑی حد تک ان کے ہم نوا ہیں لیکن اس سلسلے میں کچھ ایسے مقام بھی آئے ہیں جہاں ان کی رائے سے اختلاف ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ آتش کو ناسخ کا ہم رتبہ و ہم پایہ تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خالص شاعری کے نقطۂ نظر سے آتش کا درجہ ناسخ سے بلند تر ہے۔ ناسخ صرف ایک ماہر فن اور مصلح زبان کی حیثیت سے آتش پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آتش کے ذکر میں شیفتہ نے اپنے اس خیال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"مردم آن دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آں جاست قریب ہم انگارند و ہر دو را ہم وزن شمارند و قباحت این تحقیق لا یخفی علی من لہ حظ من الفہم۔" (صفحہ ۹)

فرق مراتب کے متعلق اسی ذاتی رائے کے پیش نظر انھوں نے آتش کا حال تین ساڑھے تین سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے اور ان کے نام سے صرف چوالیس شعر نقل کئے ہیں جب کہ ناسخ کا ترجمہ غیر معمولی طور پر طویل ہے اور ان کی غزلیات کا انتخاب بھی ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ہے۔ آتش کی طرح نظیر اکبرآبادی کے ساتھ بھی شیفتہ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیان جاری است و نظر بہ آں ابیات در اعداد شعراء نشاید ش شمرد۔" (صفحہ ۳۲۳)

شیفتہ کی اس رائے سے کوئی بھی شخص جس نے نظیر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے، اتفاق نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ان کے یہاں مخشیات و لغویات کی فراوانی

کے باوجود ایسے اشعار اور نظموں کا معتدبہ ذخیرہ موجود ہے جو ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کی آئینہ دار ہیں اور جن پر اردو شاعری بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے عوام کی زبان میں عوام کی دلچسپی کے موضوعات اور ان کے دکھ درد کی داستانیں نظم کرکے روایت سے بغاوت کی ہے۔ سوچنے اور شعر کہنے کی یہ سطح یقیناً شیفتہ جیسے ثقہ ادیب کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی تھی۔

شیفتہ کا یہ قول ابتدائی سطور میں نقل کیا جاچکا ہے کہ تذکرے کی ترتیب کا اصل مقصد "اشعار دلارا" کی فراہمی ہے چنانچہ جس شاعر کے کلام میں کوئی قابلِ انتخاب شعر نظر آیا ہے۔ بلا تامل نقل کرلیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر و بیشتر وہ اپنے اس موقف پر کاربند رہے ہیں اور انھوں نے صرف وہی اشعار انتخاب کئے ہیں جن میں کوئی لفظی یا معنوی خوبی موجود ہے۔ تاہم بعض جگہ دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح وہ بھی اپنی تمام تر متانت و ثقاہت اور معیارِ نظر کی انفرادیت کو بالائے طاق رکھ کر مذاقِ عام کی سطح تک اتر آئے ہیں۔ سطور ذیل میں ایسے کچھ اشعار بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں جنھیں ذوقِ سلیم کسی طرح گوارا کرنے پر آمادہ نہیں۔ بہتر تھا کہ انھیں تذکرے کے صفحات پر جگہ نہ دی گئی ہوتی ؎

روز رخسار کے لیتا ہوں مزے خوبوں کے
بہتر اس شغل سے حجام ہنر کیا ہوگا

(عنایت اللہ حجام)

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہو
حورد ل پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہو

(ذوق دہلوی)

بنے گی اس سے صحبت کس طرح کچھ کہہ نہیں سکتے
وہ ہرجائی ہے اور بن شغل ہم بھی رہ نہیں سکتے
(سعادت یار خاں رنگین)

کھڑکی نکال جانب دشمن نہ بام پر
کوٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص و عام پر

یاد دلوائے جو ہم بستری یار در لائے
سو وہ تصویر نہالی ہے بغل کا دشمن

(میر محمد نصیر رنج دہلوی)

نہ ہوئی کوئی شب وصل میسر ورنہ
دیکھتے شوق محبت سے میں کیا کیا کرتا

(سہراب بیگ سہراب دہلوی)

مشکل ہو میری اس کی ہو صحبت برار آہ
میں جلد باز ہوں وہ تغافل شعار ہو

(مرزا سیف علی شگفتہ)

جو ہم بستر ہو ہم سے تو اس کی کیا شکایت ہو
نظر بھر کر ہمیں اک دیکھنا اس کا کفایت ہو
(صابر شاہ صابر دہلوی)

جو ہم بستر کبھو ہم ہوں غلام اس خوبصورت کے
نہ لیں واللہ تا روز قیامت دوسری کروٹ
(راجہ گوپال ناتھ غلام)

اس تند خو سے بوسے میں نے بصد سماجت
جب سو پچاس مانگے جب تین چار ٹھہرے
(نوازش حسین خاں نوازش)

تعجب تو یہ ہے کہ کبھی کبھی اس احساس کے باوجود زیر بحث شاعر کا کلام اوّل سے آخر تک عریانیت و فحاشی اور رکاکت و ابتذال سے مملو ہے شیفتہ نے محض خانہ پری کے لئے یا دوسرے تذکرہ نگاروں کے اتباع میں اس کو سپرد قلم کرنا ضروری سمجھا ہے۔ مثلاً امام علی صاحبقراں بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں کہ:-

"شرم و حجاب از دلش مراحل دور و طیش از آداب و

اخلاق ہجو ۔۔۔۔۔۔ ہمہ اشعارش از انواع ہزل مملوست ۔
اگرچہ مضامین دلپذیر ہم دارد اما حیا مانع تحریر مگر از یک بیت
نتواں گذشت کہ در نہایت مرتبہ عالی رتبہ آمدہ و مبتذل نباید کہ
نوجوانان بیباک و شبانِ ہوسناک را تا نوشتن آں ابیات
موجب شکایت و گلہ گردد اما ناچار بہ تحریر رفتہ آمد۔" (صفحہ ۱۶۷)

اور وہ ایک شعر جس کی اس قدر تعریف کی گئی ہے یہ ہے ؎

مجھ کو شہوت ہوئی تیمم سے
مخفی مقرر کسی چھنال کی خاک

منصور لکھنوی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ :-

" از سوقیانِ لکھنؤ ست ۔ خرافاتش نہ سزائے آں است
کہ دریں اوراق مذکور گردد" (صفحہ ۳۵۴)

اس کے بعد اپنے مطمح نظر کو یکسر فراموش کرتے ہوئے اس تاویل کے
ساتھ کہ " چوں نوشتہ اند، نوشتہ شد" یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہو کیوں مشفق من
بوسہ وہ شے ہو کہ دونوں کو مزا دیتا ہو

گلشنِ بے خار میں عام تذکروں کی بہ نسبت ایسے اشعار کا تناسب بہت
کم ہے۔ یہاں اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ شیفتہ کے تہذیبی بیان
کی تحریک کا نتیجہ ہے ورنہ تذکروں میں اس نقص کی عمومیت کے پیش نظر
اس موضوع پر خامہ فرسائی کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مترادف ہے۔

تذکرے کے جتنے اقتباسات اب تک نقل کئے جا چکے ہیں ان کو
سامنے رکھ کر شیفتہ کے اسلوبِ نگارش کے متعلق بہ آسانی یہ رائے قائم کی
جا سکتی ہے کہ وہ مسجع اور مقفیٰ طرزِ عبارت کے دلدادہ ہیں اور حتی الامکان
قافیوں کی پابندی کرتے ہیں نیز اظہارِ مافی الضمیر میں رنگینی و دلکشی پیدا

کرنے کے لئے جا بجا تشبیہات و استعارات اور صنعتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ طرزِ تحریر جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ انشائیہ نگاری کے لئے تو مناسب ہو سکتا ہے لیکن تذکرہ جیسی صنفِ ادب کے لئے ۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قطعاً موزوں نہیں۔ "گلشنِ بے خار" کی تحریر کا ایک اور نقص جو رنگیں بیانی کے اس مظاہرے سے بھی زیادہ کھٹکتا ہے وہ عربی کی یہ کثرت آمیزش ہے مثلاً مفتی صدر الدین آزردہ کے متعلق تقریباً نصف عبارت عربی میں ہے جس کا سمجھنا ایک عام فارسی داں کے لئے ممکن نہیں۔ اظہار علمیت میں انتہا پسندی کی اس مثال سے قطع نظر جہاں یہ شوق حد اعتدال میں رہا ہے اس کے کچھ نمونے یہ ہیں:۔

(الف) خواجہ میر درد:۔ "تاریخ ادبیہ نسبت: چہارم صفر ندائے یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ بسمع رضا اصغا نمودہ دکان ذالک فی سنتہ تسعہ وتسعین ومایہ بعد الالفِ من ہجرت خیر الانام علیہ الوف الصلوٰۃ والسلام"۔ (صفحہ ۹۷)

(ب) مرزا محمد رفیع سودا:۔ "قدمارا مانند فصائے متاخرین پیرامونِ خاطر وجاگزیں دل نہ ایں بود کہ ہر شعر دلپذیر آید وہر بیت خاطر نشیں دلہذا در کلام ایشاں رقص اجمل واقع شدہ چہ در قصیدہ وچہ در غزل مع انہم اولون والموجودل والاحاطہ بجمیع نثر نہا متعذر" للمتقدمین واللہ دره من قال العلم للمتاخرین"۔ (صفحہ ۳۱)

(ج) حکیم مومن خاں:۔ "شاہِ حکمت پرور حکیم سخن گستر، فرید عصر،

یکتائے دوراں، جامع فنونِ رشتی حکیم محمد خاں مومن الذی
اعطاہ اللہ تعالیٰ استعداداً بھمیع اشتات الکمال وجری
فی ریاض خلبہ من ینابیع الاقدس انھار الانفضال "

(صفحہ ۲۶۷)

حیرت کی بات یہ ہے کہ شیفتہ نے اپنی دانست میں اس طرزِ تحریر کو سادگی
وسلاست کا شاہکار تصور کیا ہے۔ چنانچہ خاتمے کی عبارت میں ریختی زبان
وبیان سے بہ مصلحت احتراز کا عذر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔
"آئین ایں نگار خود از سادگی بستہ ام واز بے تکلفی طراز
جیب ودامال کردہ، نہ ایں از آں بود کہ نغمہ گر ساز ورگ نواند اشتہ
نے اگر خواستے زہرہ بیچرخ آمدے وعطار صغیر بے ہشانہ زدے
اما پیش نہاد تعزّر ہمیں ایں بود کہ ایں رنگ در تذکرہ فارسی ریختہ
شود تا ہر یکے برنگِ دگر جلوہ گر باشد وہم سخن از بلاغت نہ گذردہ
ونیز فرانِ دقت بقصرِ سلاست بود اطناب دقت را مجال کو "

(صفحہ ۳۴۵)

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شیفتہ کے اندر ایک اچھے تذکرہ نگار کی صلاحیتیں
ضرور موجود تھیں لیکن یہ صلاحیتیں بہر حال عصری معیار و میلان کی تابع
رہیں اور روایات کی زنجیریں توڑ کر مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ یہی وجہ
ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ گلشن بے خار میں کوئی ایسی بات پیدا نہ کر پائے جسے
ان کا امتیازی کارنامہ قرار دیا جا سکے۔ ایسی صورت میں محض اس مفروضے کی بنا پر
کہ غالب نے جس شخص کی خوش ذوقی و صاحب نظری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ
ایک اچھا تذکرہ نگار بھی ہوگا، کوئی رائے قائم کر لینا درست نہیں ہو

حاصلِ کلام

گزشتہ ابواب میں مختلف تذکروں کی خوبیوں اور خامیوں کا جس تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد یہ حقیقت کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہتی کہ تذکرے ہمارے سرمایۂ ادب کا ایک گراں قدر حصہ ہیں جسے نظر انداز کر کے نہ تو ہم اردو شاعری کے مطالعے ہی میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے ادبی و تنقیدی شعور کے آغاز و ارتقا کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ شعرائے فارسی کے پہلے تذکرے "لباب الالباب" کے متعلق علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کا خیال ہے کہ اگر یہ تذکرہ دستیاب نہ ہوا ہوتا تو اکثر شعرائے متقدمین گمنامی کے دھندلکوں میں کھو چکے تھے اور آج ان کا نام و نشان تک باقی نہ ہوتا[1] "مجمع الفصحا" مولفہ رضا قلی ہدایت کے مرتب آقائے مظاہر مصفا بھی فارسی تذکروں کے لسانی و بیانی معائب اور تاریخی غلطیوں پر سخت تنقید کے بعد آخر کار اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر ماضی میں تذکرہ نگاری کی طرف اس انہماک کے ساتھ توجہ نہ دی گئی ہوتی تو ہم بیشتر بلکہ تمام تر گزشتہ شاعروں کے احوال و آثار سے بے خبر رہتے[2] یہی رائے بعینہٖ اردو تذکروں پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ ہم نے اکثر اپنے قدیم شاعروں کو انھیں تذکروں کے ذریعہ جانا اور پہچانا ہے۔ یہی نہیں

[1] لباب الالباب مرتبہ سعید نفیسی صفحہ شانزدہم

[2] مجمع الفصحا مرتبہ آقائے مظاہر مصفا۔ مقدمہ مرتب۔

بلکہ ہماری ناقدانہ بصیرت بھی انھیں تذکروں کی فضا میں پروان چڑھی ہے اور انھیں تذکروں سے ہمارے یہاں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کے فن کا آغاز بھی ہوا ہے۔

تذکروں کی قدر و قیمت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہے نہ اسے فن سیرت یا سوانح نگاری کے تحت رکھا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس کا دائرہ کار تنقید کی طرح صرف اچھے بُرے کی پرکھ تک محدود ہے بلکہ در حقیقت یہ ان تمام فنون یا اصناف ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنفِ ادب ہے۔ تذکرہ نگار شاعر کے مختصر حالات زندگی کو قلمبند کرتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا ذکر کرتا ہے اس کی وضع قطع اور عادات و اخلاق کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں بطور نمونہ چند اشعار پیش کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔

تذکرہ نگاروں پر بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ شاعر کی زندگی کے حالات و واقعات بالتفصیل بیان نہیں کرتے یہ ایک امر واقعہ ضرور ہے لیکن بحیثیت اعتراض قابل قبول نہیں کیونکہ اول تو بیشتر تذکرے جس زمانے میں لکھے گئے ہیں اس زمانے کے محدود وسائل معلومات کی بنا پر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے تمام معاصرین ہی کے حالاتِ زندگی کی جستجو میں کامیاب ہو جائے چہ جائیکہ وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات بہم پہنچائے جو اس سے بہت پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تذکرہ نگاروں کے درمیان ایسا کوئی روایتی معاہدہ یا اصولی اتحاد نہیں کہ ایک شخص نے

کسی شاعر کی زندگی کے جن واقعات کا ذکر کیا ہے دوسرے تذکرہ نگار بھی بعینہٖ انھیں واقعات کو بیان کرتے رہیں اور ان پر مزید معلومات کا اضافہ ان کے نزدیک وحی منزل میں تحریف وتصرف کے مترادف قرار پائے۔ بطور مثال اگر گردیزی نے میرؔ کو صرف دو ڈھائی سطر کا مستحق سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تذکروں سے میرؔ کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اس مثال کو صرف تذکرہ گردیزی کے نقائص کے ثبوت ہی میں پیش کر سکتے ہیں، اس کی بنیاد پر تمام تذکروں کو بے مقصد اور لاحاصل قرار نہیں دے سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تذکروں میں اجمال واختصار کی کیفیت عام ہوتے ہوئے بھی مجموعی حیثیت سے سوانحی معلومات کا وافر سرمایہ محفوظ ہے۔ چنانچہ آج بھی شعرائے متقدمین کے حالات زندگی کی فراہمی کے لئے ہماری نگاہ بالآخر انھیں تذکروں پر جاکر ٹھہرتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر تذکرہ نگار واقعات کے بیان میں سنین وتواریخ کا ذکر نہیں کرتے لیکن ایسے تذکروں کی تعداد بھی کم نہیں جو اس نقص سے مبرا ہیں۔ شفیق نے "چمنستانِ شعرا" میں کتنے ہی شاعروں کے انتقال کی تاریخیں نقل کی ہیں "مسرت افزا" "گل عجائب" "گلزار ابراہیم" "گلشن ہند" "تذکرۂ عشقی" "تذکرۂ بے جگر" اور "گلشنِ بے خار" میں بھی جا بجا سنین کے حوالے موجود ہیں۔ "گلشنِ سخن" اور "گلزار ابراہیم" کے مولفین نے یہ اہتمام کیا ہے کہ حتی الامکان ہر شاعر کے ذکر میں اس کے حالات کی تحریر کے زمانے اور اس زمانے میں اس کی جائے بود وباش کی صراحت کر دی جائے۔ "تذکرہ ہندی" اور "ریاض الفصحا" میں شعرا کے سنین

عمر کے بیان پر خاص توجہ دی گئی ہے جس کی مدد سے تھوڑی سی کد و کاوش کے بعد سنینِ ولادت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگر ہمیں ایک تذکرے سے کسی شاعر کے سنہ ولادت، دوسرے سے اس کے سالِ وفات اور اس طرح کچھ اور تذکروں سے دیگر واقعات کے سنین کی دریافت میں مدد ملتی ہے تو گویا ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور صنفی حیثیت سے تذکروں کی افادیت کا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت نہیں ہو سکتا۔

یہاں ہمیں یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سوانح نگاری صرف چند سنین اور تاریخوں کے بیان کر دینا کا نام نہیں۔ کوئی شاعر کہاں پیدا ہوا اس کی تعلیم و تربیت کس ماحول میں ہوئی۔ علومِ درسیہ میں کس حد تک کمال بہم پہنچایا، کن کن لوگوں سے کلام پر اصلاح لی، مروجہ اصنافِ سخن میں طبیعت کا رجحان کس صنف کی طرف رہا، کس قدر سرمایۂ شاعری اپنی یادگار چھوڑا، یہ اور اس قسم کی دوسری بہت سی باتیں بھی اسی دائرے میں آتی ہیں اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تذکرہ نگاروں نے عام طور پر شعرا کے سنینِ ولادت و وفات بیان کیے ہوں یا نہ کیے ہوں اس قسم کی معلومات ضرور بہم پہنچائی ہیں۔ میر، قائم، گردیزی اور ابتدائی زمانے کے کچھ اور تذکرہ نگاروں نے بیشک اس طرف برائے نام توجہ دی ہے لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں کے یہاں یہ نقص بہت کم نظر آتا ہے۔ مسرت افزا، تذکرہ شورش، گلشنِ ہند، مجموعۂ نغز، عیار الشعراء، عمدۂ منتخبہ، تذکرہ ہندی، گلشنِ سخن وغیرہ اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تذکروں سے ہمیں شعرا کی زندگی، ان کے اکتسابات اور کارناموں کے بارے میں

بہت سی مفید اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہمیں اپنے شعرا اور بالخصوص شعرائے متقدمین کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں بیشتر معلومات انھیں تذکروں سے حاصل ہوتی ہے جو بظاہر ناقص اور نامکمل نظر آتے ہیں البتہ ان شاعروں کو جن کے متعلق تمام تذکروں کے مطالعے کے بعد بھی ہمارا علم انتہائی محدود رہتا ہے اس کلیے سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے لیکن اس مستثنیات کو کسی فیصلے کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ وہ شعرا جن کے حالات کو بیسیوں تذکرہ نگاروں میں سے کسی ایک شخص نے بھی شرح و بیان کے لائق نہ سمجھا یقیناً کسی ادبی اہمیت کے حامل نہ ہوں گے اس لئے اگر ان کے متعلق تحقیق و جستجو کے دوران کسی محقق کو تذکروں کی تشنگی اور تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے تو یہ ایسا نقص نہیں جس کی بنا پر پوری صنف کو دفترِ بے معنی قرار دے دیا جائے۔

ہمارے تذکرہ نگاروں کی تاریخی حس زیادہ بیدار نہ تھی پھر بھی تذکروں میں تاریخی عناصر یکسر مفقود نہیں۔ تاریخ نگاری کے لئے جس باقاعدگی، نظم و ضبط اور ربط و تسلسل کی ضرورت ہے وہ اگر تمام تذکروں میں نہیں تو چند تذکروں میں ضرور موجود ہے۔ قائم چاندپوری اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے لئے علیحدہ علیحدہ ادوار قائم کئے ہیں۔ قدرت اللہ شوق نے شعرا کو ان کے کلام کے معیار و مذاق اور فنی و لسانی خصوصیات کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم کیا ہے، یہ درجہ بندی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ چنانچہ ان تذکروں کی مدد سے

ہم اُردو کی لسانی تعمیر و تہذیب اور شاعرانہ روایات کے رد و قبول کی تاریخ
مرتب کر سکتے ہیں۔ بعض تذکرے صرف ایک مخصوص دور سے متعلق ہیں۔
ان کے مطالعے سے اس زمانے کے ادبی ماحول کا ایک مکمل نقشہ سامنے
آجاتا ہے۔ اسی طرح جو تذکرے کسی خاص علاقے سے تعلق رکھتے ہیں انکی
روشنی میں علاقائی حدود میں زبان اور شاعری کی ترقی کا مطالعہ بڑی آسانی
کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی زاویۂ نگاہ سے تذکروں کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس حقیقت کو
بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ تاریخ خواہ سیاسی ہو یا ادبی صرف چند خشک
اور بے روح واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہر گوشہ گرم اذہان
و افکار کے سارے انقلابات اور تہذیب انسانی کی تمام رنگینیوں اور
رعنائیوں سے مل کر اس کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ اس کا دامن قبائے محبوب کی
طرح تنگ نہیں ہوتا۔ وہ ہماری جد و جہد حیات کے ہر لمحے کو جاوداں
بنا کر اپنے سینے میں جذب کر لیتی ہے۔ تاریخ کو اس وسیع مفہوم کو نظر میں
رکھ کر صنفِ تذکرہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے نتائج یقیناً مایوس کن
نہ ہوں گے۔ اس سلسلے میں تذکروں کی جو خصوصیت ہمیں سب سے زیادہ
متاثر کرتی ہے وہ اس لسانی انقلاب کی ترجمانی ہے جو عالمگیر کی وفات کے
بعد سے مغلوں کی سیاسی و تہذیبی نظام کی ابتری کے دوش بدوش ملک
میں اور خاص طور پر اس کے شمالی حصے میں ایک سیل بیکراں کی طرح برابر
آگے بڑھ رہا تھا۔ خاندان تیموریہ کے عروج و اقبال کی بدولت ہندوستان
کی بساطِ علم و سیاست پر فارسی کو جو بالادستی حاصل ہوئی تھی اسے دیکھ کر
کون یہ کہہ سکتا تھا کہ کسی دن اس کی قسمت کا ستارہ بھی غروب ہو سکتا ہے

لیکن چونکہ وہ وہ زبان سلطنت کی پروردہ اور ارباب اقتدار کی مسلط کی ہوئی زبان تھی اور اس کی تعمیم و ترقی میں ملک کے عوام کا خلوص، ان کے خون جگر کی مستی اور دل کی دھڑکنوں کا سوز شامل نہ تھا اس لئے زوال سلطنت کے ساتھ اس پر بھی زوال آیا۔ اہل ہنر اہل کرم کو زمانے کے ہاتھوں اپنے سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم پاکر کمالات کی داد طلبی کے لئے دربار دل کی بجائے عوام کی طرف دیکھنے کے عادی ہوئے اور اپنی زبان میں اپنے دلوں کی ترجمانی کی خواہش نے پر و بال نکالے۔ محمد شاہ کے دوسرے سال جلوس (۲۳-۱۱۳۲ھ) میں ولی کا دیوان دہلی آیا تو دیکھتے دیکھتے اس کے اشعار ہر خرد و بزرگ کی زبان پر جاری ہو گئے[۱] رفتہ رفتہ اردو میں طبع آزمائی کا شوق اس قدر عام ہوا کہ تھوڑے ہی دن کی کشمکش کے بعد فارسی نے اپنی اس نوخیز حریف کے لئے مسند اقتدار خالی کر دی۔ مصحفی فارسی دانی کے تمام دعووں کے باوجود مسابقت اور برتری کے اس مقابلے میں اردو کی فتح مندی کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:-

"ایں فقیر..... اول از تکمیل نظم و نثر زبان فارسی و تحقیق محاورہ و اصلاح آں فراغت حاصل کردہ بمقتضائے رواج زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے اینکہ رواج شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بپایہ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ از بہتر گردیدہ۔"[۲]

دوسری جگہ انھوں نے اسی صورت حال کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"الحال چوں زبان فارسی از بے علمی صاحبان زمانہ روز در

---

[۱] تذکرہ ہندی ص ..   [۲] تذکرہ ہندی ص ۲۴۰

نقاب بر اختفا دارد، طبیعت ہا بیشتر متوجہ ریختہ اند"[1]

یہاں "بے علمی صاحبانِ زمانہ" کی شکایت ہمارے نزدیک اس احساس کمتری کے ایک جلوہ بازپسیں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جس نے صدیوں کی لسانی محکومیت کے زیر سایہ پرورش پائی تھی ورنہ ۱۲۳۶ھ تک جبکہ یہ الفاظ سپرد قلم کئے گئے ہیں ہندوستان کے طول و عرض میں اردو کی بنیادیں اس قدر مستحکم ہو چکی تھیں کہ اس سے وابستگی کسی تاویل و توجیہ کی محتاج نہ رہی تھی خود تذکروں میں شعرا کی تعداد کے اضافے کی عہد بعہد رفتار اردو شاعری کے اس قبولِ عام کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

سیاسی محاذ پر اردو کی فتوحات کا مزید ثبوت ان تذکروں سے ملتا ہے جو اُردو ہی میں لکھے گئے ہیں۔ ان تذکروں میں حیدر بخش حیدری کا "گلشن ہند" سر فہرست ہے۔ یہ تذکرہ دو سو نواسی شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اور ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں نواح مرشد آباد میں مرتب ہوا ہے[2]۔ دوسرا تذکرہ مرزا علی لطف کا "گلشن ہند" ہے جس میں اڑسٹھ شعرا کے حالات و اشعار منقول ہیں۔ یہ تذکرہ کلکتے میں ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں جان گلکرسٹ کی فرمائش کے بموجب گلزار ابراہیم کے بعض حصوں کے ترجمے کی بنیاد پر ولایت سے تازہ وارد انگریزوں کی ذہنی تربیت کے مقصد سے مرتب کیا گیا تھا[3]۔ تاکہ وہ اس کے ذریعہ اُردو زبان اور اس کے شعری ادب سے واقفیت حاصل کریں اور سیاسی و تجارتی معاملات میں ہندوستانی عوام سے ربط و ضبط کے مواقع پر گونگے اور بہرے

---

[1] ریاض الفصحا ص ۲۸۰

[2] گلشن ہند مخطوطہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آکسفورڈ ورق ۲ الف

[3] گلشن ہند۔ طبع اول ص ۳

ثابت نہ ہوں گویا یہ تذکرہ اُردو کے اس عوامی اور جمہوری کردار کی ایک دستاویز ہے جس نے سمندر پار سے آئے ہوئے حکمرانوں...... کو بھی ملک میں اپنے اثر و رسوخ کی استواری کے لئے اس کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا ان دو ہم نام تذکروں کے علاوہ بھی اُردو میں متعدد تذکرے مرتب ہوئے ہیں لیکن یہاں ان کا ذکر چنداں ضروری نہیں۔

اردو زبان اور اس کی شاعری اگرچہ عوام کی تمناؤں اور آرزوؤں کے آغوشِ تربیت میں پل کر جوان ہوئی لیکن اپنے اس دورِ ترقی میں ملک کے زوال آمادہ درباری نظام سے بھی اس نے دل کھول کر اپنی محبوبیت کا خراج وصول کیا۔ تذکروں میں اس کی اس ادائے دلبری کے نقش ان امرا اور اعیان سلطنت کے حالات میں ملتے ہیں جو بحرِ سخن کے غواص بھی تھے اور جواہر معنی کے قدر شناس بھی۔ شاعروں کے اہتمام اور شعرا کی پرورش سے ان کی دلچسپیاں اہلِ شہر کے لئے بڑا سہارا اور ذوقِ شعری کی عمومیت کا ایک اہم سبب تھیں۔ اس لحاظ سے شاعری کی ترقی میں ان کے اشتراکِ عمل کا بڑا حصہ ہے۔ خواہ اس کے نتیجے میں مدحیہ قصاید کا دفتر بے معنی ہی کیوں نہ وجود میں آیا ہو۔ کیونکہ کچھ تخلیقات بدلے ہوئے حالات کے تحت کسی زمانے میں اپنی معنوی اہمیت کھو سکتی ہیں لیکن ان کی لسانی و تاریخی حیثیت پر کوئی فکری و نظریاتی انقلاب اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بہرصورت شاعری اور دربار کے باہمی تعلق اور اس کے نتائج و اثرات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے تذکروں میں کافی سامانِ دلچسپی موجود ہے۔

تذکرہ نگاروں نے عوامی شاعروں کا ذکر بھی بڑی کثرت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ شاعر جو ابتدا میں فراخوں کے نام سے یاد کئے جاتے تھے

فارسی سے مسابقت کی جد و جہد یا لسانی خود مختاری کی تحریک ہی کا ایک حصہ تھے۔ شعرا کی حریفانہ گروہ بندیاں اور ان گروہوں کے باہمی معرکے کلام کی خامیوں پر بر محفل اعتراض اور ان اعتراضات کے خلاف رد و قدح الفاظ کے محلِ استعمال اور ان کی معنوی وسعتوں سے متعلق بحث و تحمیص اور اسی سلسلے میں معانی و بیان کے رموز و نکات کی تشریح ان شاعروں کی خصوصیات تھیں۔ ان ہنگامہ آرائیوں کی بدولت اردو شاعری کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا اور ہمارے ذوق کی تربیت اور فنی پختگی کے راستے بھی ہموار ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے شاعروں کے ذکر میں عمل اور ردِ عمل کی یہ تفصیلات اگرچہ عام طور پر بیان نہیں کی ہیں تاہم بعض تذکروں میں اس سلسلے کے کچھ ایسے واقعات مذکور ہیں جن کے پس منظر میں ہم تہذیب فکر و نظر کی ان جلوہ سامانیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں مثال کے طور پر قدرت اللہ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں اور اعظم الدولہ سرور نے "عمدۂ منتخبہ" میں میر انشاء اللہ خاں انشا اور عظیم بیگ عظیم کی معاصرانہ چشمکوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے یا "گلستانِ سخن" مولفہ قادر بخش صابر میں شاہ نصیر دہلوی اور ان کے حریفوں کی باہمی آویزش کی ایک طویل داستان محفوظ ہے۔

تذکروں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں شعر و سخن کی بارگاہ تک رسائی کے کچھ آداب و ضوابط بھی تھے۔ یہاں جس طرح بزرگوں کی صحبت سے کسبِ فیض اور اساتذہ کی اصلاحوں سے استفادہ کیے بغیر کسی کا چراغ جلنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح نسبی شرافت اور نجابتِ خاندانی بھی منجملۂ لوازمات خیال کی جاتی تھی۔ شاعری شریفوں کا فن یا تفریحی مشغلہ قرار دے دی گئی تھی اور شرفا اپنے اس کاروبارِ شوق میں سفیہوں کی

شرکت گوارا نہ کرتے تھے۔ چنانچہ خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرے میں آگے رے کے بخشی نامی قوال کا ذکر کرتے ہوئے اس روایت سے بغاوت کی نادیل پر کافی زور قلم صرف کیا ہے[۱]۔ گو، بخش ادیب کے متعلق جو قوم کے کہار تھے مصحفی کا یہ بیان بھی ایسی صورت حال کی جانب اشارہ کرتا ہے لکھتے ہیں کہ:-

"در ابتدائے حداثت سن بلوغ ...... بمقتضائے شوق
در مکتب لالہ بینی پرشاد ظریف چندے زانوئے ادب ......
...... تہ کردہ کو رسوادی بہم رسانید چوں موزوں طبع بود
...... مشار الیہ ...... او را پیش فقیر آوردہ تا آنکہ در
چار ریختہ ہندلیش بنوک قلم اصلاح آمد و در مشاعرہ ......
ہمہ سماع پسندیدند و آفریں ہا گفتند بعد یک دو روز محمد عیسیٰ
تنہا تخلص کہ یکے از تلامذہ فقیر بود تقریب در منع اصلاح او بزبان
آوردہ گفت کہ اے قبلہ اگر ہم چنیں ہر کس و ناکس را جناب در
محفل قریب خویش جا خواہند داد، مرتبہ ما مردم کہ عمرے در یں
فن بخدمت شریف استخوان شکستہ ایم کجا خواہد ماند از استماع
ایں سخن من ہم متامل شدہ نصیحت ناصح را کہ حق شاگردی او
کثر بود بذیرا شدم و از و در گذشتم ......"[۲]

تذکرے ان اخلاقی تصورات اور مجلسی آداب کی بھی ترجمانی کرتے ہیں جو کسی زمانے میں مشرقی تہذیب اور تمدنی زندگی کا طرۂ امتیاز تھے۔ کئی تذکرہ نگاروں کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں دو سروں

---

[۱] تذکرہ بے جگر نسخہ لندن ورق ۲۴ الف [۲] ریاض الفصحا ص ۲۷

کی عیب جوئی بدترین عیب تھی۔ حفظ مراتب اور بزرگوں کے لئے جذبۂ
احترام ان کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اساتذہ کی صحبتوں میں
حاضری ارباب ذوق اور نسبتاً کم عمر شعرا کے معمولات میں داخل تھی۔
اپنی علمی اور فنی صلاحیتوں کو ریاضں کی آگ میں تپا کر کندن بنانے والے
عام طور پر قدر و منزلت کے مستحق سمجھے جاتے تھے اور اولیاء اللہ اور
صاحب سجادہ بزرگوں سے عقیدت کا میلان عام تھا۔ میر صاحب جن کی
خود پرستی اور بلے دماغی مشہور عام ہے۔ جب خواجہ میر درد کے سلسلے میں
ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب کا ذکر کرتے ہیں تو ان پر عقیدت کی ایک
خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ احترام کا یہی جذبہ ان کے یہاں
سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا مظہر اور خواجہ میر درد کے حالات میں
بھی کار فرما نظر آتا ہے مصحفی کے بیان کئے ہوئے ایک واقعہ سے پتہ
چلتا ہے کہ بزرگانِ دین کی مجلسوں میں سلاطین و امرا کے لئے بھی آداب
محفل سے تجاوز کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہی نہیں بلکہ فقر کی مستی جلالِ
بادشاہی کو پائے حقارت سے ٹھکرا بھی سکتی تھی۔ مذکورہ واقعہ خواجہ میر
درد سے متعلق ہے اور ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

"روزے حضرت ظلِ سبحانی برائے زیارت ایشان آمدہ
بودند بعد نشستن در مجلس عذر درد بیان آوردہ اند کہ پا دراز
ساختن شاید" الیہ از مشاہدۂ ایں حالت منغص شدہ ایں قاعدہ
را خلافِ معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پا دراز ساختہ"[1]
اہل کمال کی ناز برداری میں بھی لوگ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۹۲

کرتے تھے۔ مصحفی نے استغنائے مزاج کو شعرا کا خاصہ قرار دیا ہے[1]۔ یہ استغنا مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا رہتا تھا، بطور مثال میر صاحب کے یہاں اس نے خود پرستی اور کم آمیزی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تذکرہ نگاروں میں سے جہاں بعض لوگوں نے ان کی اس صفت پر سخت لہجے میں تنقید کی ہے وہیں بعض تذکرہ نگار اسے ان کے کمالِ فن کی ایک علامت قرار دیتے ہوئے جائز اور مناسب بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ان کے بارے میں میر حسن کی یہ رائے ہے کہ "بسیار صاحبِ دماغ است و دماغ اورا می زیبد[2]"

احد علی خاں یکتا کے بیان میں "چنانچہ می باید" کا ٹکڑا بھی اسی تصور کا غماز ہے لکھتے ہیں کہ:

"جناب میر بغرور کمال و استغنائے تصوف کہ مضمر بخاطرش بودہ، اکثر کم التفاتی و بے اعتنائی بحال مردم می نمود بلکہ گاہے گاہے با ما ہم چنانچہ می باید راہ التفات و مبالغت نمی پیمود[3]"

تذکروں سے ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ ہندوستان کی اس نظامِ معاشرت میں جس کی تشکیل ہند ایرانی روایات کی آمیزش سے ہوئی تھی، رندی و شاہد بازی کے ساتھ گناہ کا کوئی تصور وابستہ نہ تھا اور محبوبانِ خوش جمال و طفلانِ پری تمثال سے لوگ علی الاعلان عشق کرتے تھے۔ چنانچہ خواجہ حسن دہلوی کے بارے میں صاحبِ گلشنِ ہند لکھتے ہیں کہ:

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۱۱۱ [2] تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ۱۵۲

[3] دستور الفصاحت ص ۲۵

"بخشی نامی ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے اس پر مرتے ہیں اور اکثر نام اس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں"[1]

میاں عبدالحئی تاباں کے متعلق میر حسن کا بیان ہے کہ :-

"سید زادۂ بود بکمال حسن و وجاہت تمام عالم فریفتۂ حسن او بود بلکہ گرم بازاری ریختہ ازاں شعلہ رو و بالا شدہ اکثر اشخاص ایں فن را وسیلہ ساختہ دخیل صحبت او می شدند"[2]

ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم کے بارے میں بھی یہ تذکرے خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس نظام میں ایک باشعور اور کارآمد شہری بننے کے لیے صرف چند کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہ تھا لوگ علوم درسیہ کے ساتھ علم مجلسی اور فنون سپہ گری میں بھی کمال حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ موسیقی اور خوش نویسی وخطاطی کے فن سے بھی بالعموم بقدر ضرورت واقفیت بہم پہونچائی جاتی تھی۔ تحصیل علم کا یہ ہمہ گیر، ہمہ جہت تصور رزم و بزم اور سیف و قلم کو ایک مرکز پر لے آیا تھا۔ چنانچہ بہت سے شاعر علوم معقول کے رمز آشنا ہی انہیں تلوار کے دھنی اور فنون لطیفہ کے ماہر بھی تھے۔ میر سوز کی نسبت مصحفی نے لکھا ہو کہ

"کمال ہائے ایں بزرگ ماورائے کمال شاعری او وو نہ بیشی بیارند چنانچہ در تیر اندازی و سواری اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا ...... و آداب صحبت ملوک و سلاطین .... نظیر خود ندارد"[3]

خواجہ حسن دہلوی کے متعلق مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ :-

---

[1] گلشن ہند طبع ثانی ص ۱۱۵ [2] تذکرہ شعرائے اردو ص ۳۵

[3] تذکرہ ہندی ص ۱۱۱

"علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر اور استعداد اس علم کی ان تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا جگار کھتے ہیں ...... علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں۔ خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں"

مغل تہذیب اور سلطنت کے دورِ انحطاط کی عام اقتصادی کشمکش اور آئے دن کے سیاسی انتشار نے اردو شاعری کی تاریخ پر کیا اثرات مرتب کئے یہ جاننے کے لئے بھی تذکروں کا مطالعہ از بس ضروری ہے قدیم ہندوستان میں اہل علم اور ارباب ہنر وجہ معاش کے لئے عام طور پر "نوکری خانۂ بادشاہی" کا سہارا لیتے تھے۔ جب سطوتِ شاہی پر زوال آیا تو رفتہ رفتہ یہ معاشی سہارے بھی ٹوٹنا شروع ہو گئے اور اہل کمال تلاش روزگار میں قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر آوارہ و سرگرداں پھرنے لگے۔ بعض لوگوں نے اس کشاکش سے ہار مان کر درویشی و خانہ نشینی اور توکل علی اللہ کو اپنا شعار بنایا اور بعض لوگ نئی پناہ گاہوں کی تلاش میں کامیاب ہو گئے۔ یہی وہ پناگاہیں تھیں جنھوں نے بعد میں ترقی کر کے حیدرآباد، پٹنہ، کلکتہ اور رام پور جیسے اہم ادبی مراکز کی حیثیت حاصل کر لی۔ تذکرہ شورش اور گلزار ابراہیم میں بکثرت ایسے شعرا کا ذکر ہے۔ جنھوں نے نادر شاہ کی سفاکانہ یورش اور احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملوں میں لٹنے پٹنے کے بعد دہلی کو خیرباد کہا اور عظیم آباد اور مرشد آباد کو اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ قائم چاندپوری نے اپنے تذکرے میں احمد شاہ بادشاہ دہلی کے دور (۱۱۶۱ھ - ۱۱۶۷ھ) کے آشفتہ بر احوال ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہوئے اپنے ہی بارے میں لکھا ہے

"از بہ شورتا باین حال تتوسل نوکری باد شاہی بدارالخلافت

ـــــــــــــــــــ

۵ گلشن ہند طبع ثانی ۱۱۵

شاہجہاں آباد گزرانده دلیل و نهار ...... بصحبت سخن سنجان عالی
مقدار بسر برده (اما) درین ایام که رشتهٔ سلک انتظام مرزبوم
بادشاهی بصدمهٔ انقلاب سلطنت از هم گسیخت و هریکے چوں لآلی
آبدار بر خاک مذلت افتاده رو به هر سو نهاده - چاره ناچار بلکه
بے اختیار ارادهٔ سفر برائے اقامت غالب آمد[1]

اردو شاعری کے شانہ بشانہ اردو نثر کے فروغ و ارتقا کے سلسلے میں
بھی بعض مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے خاص خاص شعرا
کے ذکر میں نثر نگاری و انشا پردازی سے ان کے شغف کا بھی ذکر کیا ہے
میر حسن، محمد حسین کلیم کے حال میں ان کی نامعلوم الاسم "کتاب نثر ہندی"
کے دو جملے بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔ مسرت افزا میں تحسین کی نو طرز مرصع
کا ایک طویل اقتباس منقول ہے۔ طبقات سخن اور تذکرۂ بے جگر میں بھی نثر
کے کئی قابل لحاظ نمونے ملتے ہیں۔ ریاض الفصحا سے بہت سے شاعروں
کے پہلو بہ پہلو ایک مجلس مناظرہ کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ مرزا علی لطف کا
تذکرہ گلشن ہند اردو نثر کے اس اسلوب یا دبستان کی بڑی مکمل اور کامیاب
نمایندگی کرتا ہے جسے مغربی اثرات کے تحت فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ
فروغ حاصل ہوا تھا۔

سوانحی اور تاریخی عناصر کے بعد صنف تذکرہ کے اجزائے ترکیبی میں
تیسرا اہم مقام تنقید شعر کا ہے لیکن تذکروں کی تنقیدی حیثیت کا جائزہ لیتے
وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں نے شاعری کے حسن و
قبح کی پرکھ کو کبھی مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ ان کے حدود کار میں نقد و نظر

[1] مخزن نکات ص ۲۲

کے اس عمل کی صرف اتنی ہی اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ شاعر کے فنکارانہ مقام کا تعین ہو جائے۔ وہ کلام کے بارے میں اپنے تاثرات کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں اس کے محاسن و معائب کا تجزیہ نہیں کرتے کیونکہ تجزیے کے لئے جس تفصیل اور تشریح کی ضرورت ہے۔ صنف تذکرہ کا روایتی اجمال و اختصار اس کی اجازت نہیں دیتا۔ صنف کے بنیادی تقاضوں کے عین مطابق تذکرہ نویس اشاروں میں بات کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ اشارے بڑے بلیغ اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ البتہ ان کی بلاغت و معنویت کی گرہ کشائی کے لئے علم معانی اور بدیع و بیان کی اصطلاحات اور دوسرے فنی رموز و علائم کی دلالتوں سے آگاہی اشد ضروری ہے مثال کے طور پر جب تذکرہ نویس کسی شاعر کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا کلام فصاحت و بلاغت سے خالی نہیں تو اس سے ان کی یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر اپنی زبان کے خزانۂ الفاظ اور اظہار و ابلاغ کے تمام وسائل پر پوری قدرت رکھتا ہے جو بحیثیت فنکار اس کے کمال کی دلیل ہے کیونکہ اظہار و بیان کے وسائل پر کامل دسترس ترسیل خیال کی مکمل صلاحیت اور الفاظ کی معنوی نزاکتوں سے پوری واقفیت کے بغیر فصاحت و بلاغت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔

عربی و فارسی کی تنقیدی روایات اور نقد و نظر کے معیاروں سے عدم واقفیت یا بے اعتنائی بھی تذکروں کے سرمایہ تنقید کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں تذکرہ نویسی کا آغاز فارسی کے زیر اثر ہوا۔ اور فارسی تذکرہ نویس براہِ راست عربی تذکرہ نگاروں سے متاثر ہیں چنانچہ اُردو تذکروں میں بھی کلام کے متعلق اظہار رائے کے پس پشت

انھیں اصولوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے، جو عربی و فارسی تذکروں کی تنقید کی بنیاد ہیں۔ عرب شاعر اور نقاد شاعری میں طرزِ بیان کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی شاعر کے شیوۂ گفتار کی ندرت ہی اسے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ شعر کی بنیادی خوبیاں ان کی نظر میں یہ ہیں کہ تکلف اور آورد سے پاک اور نادر تشبیہات و استعارات سے مرصع ہونا چاہیئے۔ اس کی زبان سادہ اور بندش چست ہو اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کر دئے جائیں۔ بالفاظ دیگر شعر کی اچھائی یا بُرائی کا انحصار اس کے خارجی حسن اور آرائش پر ہے معانی اور موضوع کی متانت اور تازگی پر نہیں۔ فن کا یہی تصور تھا جس پر عربی تذکروں میں تنقید کی بنیاد استوار ہوئی اور یہی تصور فارسی تذکروں کے واسطے سے اردو تذکرہ نگاروں کے ورثے میں آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر توجہات پیرایۂ بیان کی لطافت، فصاحت و بلاغت کے آداب کی نگاہ داری، زبان کی سادگی، محاورات کی صحت اور وزن و قافیہ کے مسلمہ اصولوں کی پابندی کے جائزے تک محدود رکھیں۔ یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے اردو تنقید کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ آج ہمارے ناقدین کی بصیرت اگرچہ انھیں اس مقام سے بہت آگے لے آئی ہے لیکن ادب کی کسی بھی دوسری صنف کی طرح اردو تنقید کا موجودہ معیار بھی ایک مسلسل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور ارتقا کے آداب و قوانین ہرگز اس پر مجبور نہیں کرتے کہ ماضی سے تمام رشتے منقطع کر لئے جائیں اس لئے ہمیں اپنے سفر کی اس منزلِ اول کو جس کے نقوش تذکروں کی تنقید میں ملتے ہیں، محض گرد ِرہ کارواں سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیئے۔

ان توضیحات کے ساتھ ہی اس قسم کے خیالات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں کے پیشِ نظر تنقید کے کوئی واضح اصول اور معیار نہ تھے۔ انھوں نے عام طور پر اپنے زمانہ کے مروجہ تنقیدی اصولوں اور معیاروں کا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن شعرا کے کلام کے متعلق فیصلہ کرتے وقت ان سے بے نیازی یقیناً نہیں برتی ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے بیانات میں اس قسم کے مسائل اور موضوعات پر بھی گفتگو کی ہے جن کی روشنی میں ہم ان کے تنقیدی نظریات اور اصولوں کی ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہاں صرف میر اور مصحفی کو بطور مثال پیش کریں گے۔ میر صاحب شاعر کے لئے سلیقہ مندی کو جو زبان کے رموز و نکات اور اظہار و بیان کی نزاکتوں سے پوری طرح واقفیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، ایک لازمی امر قرار دیتے ہیں۔ فارسی کی مانوس اور شگفتہ تراکیب اور صنائع و بدائع کا بے تکلف استعمال سادگی بیان، چستی بندش اور فصاحت و بلاغت کے تقاضوں کی پاسداری ان کے نزدیک اچھی شاعری کے لوازمات ہیں۔ الفاظِ تازہ کی تلاش کے ساتھ ساتھ مضامین و معانی کی ندرت کو بھی انھوں نے کافی اہمیت دی ہے۔ روزمرہ اور محاورات کی صحت کا خیال رکھنا بھی ان کی نظر میں بے حد ضروری ہے۔ شاعر کو ان کے بقول عوام کی زبان اور روزمرہ کی تقلید سے بھی احتراز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے اصل مخاطب خواص ہوتے ہیں وہ برگِ گل کی طرح پاکیزہ و رنگین زبان کے رسیا ہیں لیکن شاعری کو صرف گل و بلبل کی داستان تک محدود رکھنے کے قائل نہیں گویا شاعری کی عظمت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسے واردات عشق کے ساتھ

کیفیاتِ زندگی کا بھی ترجمان ہونا چاہیئے[1]

مصحفی شاعر کے لئے "موزونیٔ طبع" کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اچھی شاعری محض کوشش سے وجود میں نہیں آتی اس کے لئے طبعی مناسبت اور فطری رجحان ناگزیر ہے۔ یہ فطری ذوق "فیض صحبت بزرگان" اور اساتذہ کے یمنِ تربیت سے جلا پاتا ہے۔ استاد کے خامۂ اصلاح کی شائستگی شاعر کے اندر کلام کے محاسن و معائب کی تمیز اور زبان اور محاورے کی صحت کا شعور پیدا کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ لوگ جن کا کلام اساتذہ کے نوکِ قلم کی اصلاح سے محروم رہتا ہے فن کی نزاکتوں اور تحقیق محاورہ و اصطلاح سے نابلد رہتے ہیں اور عام حالات میں شاعری کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ شعر کو ان کے نزدیک فصاحتِ بیان، بلاغتِ کلام، بندش کی چستی۔ الفاظ کی شیرینی اور زبان اور محاورے کی صحت سے متصف ہونا چاہیئے۔ شاعری ان کی نظر میں صرف خیال آرائی سے عبارت نہیں۔ اسی لئے وہ اصولی طور پر اس رنگِ سخن کو جسے ناسخ اور ان کے بعض تلامذہ نے پروان چڑھایا ناپسند کرتے ہیں اور اس گروہ سے متعلق شعرا کے اشعار خیالی کو زیادہ قابل قدر نہیں سمجھتے[2]

ان حقائق کی روشنی میں تذکروں پر یہ اعتراض وارد کرنا کہ دنیائے تنقید میں ان کی کوئی اہمیت نہیں یا جہاں تک تنقید کا واسطہ ہے ان کا ہونا

---

[1] مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے نکات الشعراء سے متعلق اس مقالے کے گزشتہ اوراق اور "اردو تنقید کی تاریخ" از پروفیسر مسیح الزماں ص ۸۱ تا ۹۵

[2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا مضمون "مصحفی ۔ نقاد شاعر" مشمولہ "اردو زبان اور ادب" ص ۹۶ تا ۱۰۸

نہ ہونا برابر ہے یا پھر یہ کہہ کر ان کی اہمیت کو گھٹانا کہ ان میں جس قسم کی تنقید ملتی ہے وہ محض سطحی ہے کیونکہ اس کا تعلق زبان محاورہ اور عروض سے ہے نیز یہ کہ تذکرہ نویس تنقید کی ماہیت اس کے مقصد اور اس کے صحیح اسلوب سے واقفیت نہ رکھتے تھے[1] امور واقعہ کی غلط تعبیر اور ارتقا کے عمل کی تدریجیت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بقول یہ صحیح ہے کہ تذکرہ نویسوں نے تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد سے تذکروں میں بحث نہیں کی ہے۔ (کیونکہ) یہ ان کا میدان ہی نہیں تھا لیکن انھوں نے کلام پر جو رائیں دی ہیں ان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ وہ تنقید کے مفہوم سے واقف تھے اور اس کا شعور بھی رکھتے تھے (ان کے یہاں) تنقید ہے لیکن اجمال کے ساتھ معیار ہیں لیکن وہ آج کل کے معیاروں سے مختلف ہیں۔ اس لئے تذکروں میں) صرف تنقیدی روایات اور تنقیدی شعور کو تلاش کرنا چاہیئے تنقید کے مکمل اور بہترین نمونوں کو ڈھونڈھنا بے سود ہے۔[2]

مختصر یہ کہ تذکرے بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمارے ادبی ورثے کے محافظ فنی شعور کے نقیب علمی ذوق کے آئینہ دار مجلسی زندگی کے عکاس اور معاشرتی آداب کے ترجمان ہیں۔ ان کے اوراق اپنے سینوں میں اس گراں قدر امانت کے نقوش چھپائے ہوئے ہیں جس نے پہلی بار اہل ہند کے سامنے ایران کی لسانی محکومیت سے آزادی کا تصور پیش کیا۔ عوام کے جذبۂ اظہار کو ایک مہذب اور شائستہ زبان عطا کی۔ ملک کے مختلف

---

[1] یہ اعتراضات پروفیسر کلیم الدین احمد نے وارد کئے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "اُردو تنقید پر ایک نظر" ص ۲۸ و ۲۹

[2] اُردو تنقید کا ارتقا ص ۱۱۶، ۱۱۷

طبقوں کے درمیان ذہنی و فکری ہم آہنگی کے ایک نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک ہمہ گیر و ہمہ رنگ، لالہ کار و سدا بہار تہذیب کو جنم دیا۔ اس امانت کے تحفظ اور بقا یعنی اردو کی توسیع و ترقی کے لئے کی گئی کوششوں کی روداد جب بھی قلم بند کی جائے گی تذکروں سے دامن بچا کر گزر جانا ممکن نہ ہوگا۔

فہرست مآخذ

(الف) مخطوطات :-

بہارِ بے خزاں	از احمد حسین سحر لکھنوی	کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
تاریخ لطیف	از مہدی علیخاں ممتاز رامپوری	رضا لائبریری رام پور
تذکرہ آزردہ	از مفتی صدر الدین آزردہ	عکس مخطوطہ کنگس کالج کیمبرج مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو علیگڈھ
تذکرہ بے جگر	از خیراتی لال بے جگر	عکس مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن مملوکہ جناب مالک رام۔ دہلی۔
تذکرہ ریختہ گویاں	از فتح علی گردیزی	کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن)
تذکرہ شعرائے اردو	از میر حسن	کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ
تذکرۂ شورش	از میر غلام حسین شورش	کتب خانہ خانقاہ رشیدیہ جونپور
تذکرۂ شورش	از میر غلام حسین شورش	عکس مخطوطہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ مملوکہ یونیورسٹی لائبریری پٹنہ۔
تذکرۂ عشقی	از وجیہ الدین عشقی	عکس مخطوطہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ مملوکہ یونیورسٹی لائبریری پٹنہ
تذکرہ ہندی	از غلام ہمدانی مصحفی	کتبخانہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
تذکرۂ ہندی	از غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری پٹنہ
خوش معرکہ زیبا	از سعادت خاں ناصر لکھنوی	علیگڈھ مسلم یونیورسٹی لائبریری علیگڈھ
خوش معرکہ زیبا	" "	لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری، لکھنؤ

دیوانِ مصحفی (جلد ششم)	از غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری پٹنہ
دیوانِ ممنون	از میر نظام الدین ممنون	مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال
ریاض الفصحاء	از غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش لائبریری پٹنہ
ریاض حسنی	از فتوت اورنگ آبادی	کتبخانہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد
شعر العرب	از سید اعجاز احمد معجز	مسودۂ مصنف مملوکہ سید تہذیب احمد صاحب نقوی سہسوان
صحائف شرائف	از محمد عسکری بلگرامی	کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد
طبقات الشعراء	از مولوی قدرت اللہ شوق	کتبخانہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد
طبقات الشعراء	از مولوی قدرت اللہ شوق	کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد
طبقات الشعراء	از مولوی قدرت اللہ شوق	نقلی مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڑھ مملوکہ راقم
طبقات سخن	از غلام محی الدین مبتلا میرٹھی	ایکریزنل مخطوطہ برلن مملوکہ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔
طبقات سخن	از غلام محی الدین مبتلا میرٹھی	کتب خانہ فیض عام ڈگری کالج شاہجہانپور
طبقات شعرائے ہند	از مولوی کریم الدین	رضا لائبریری رامپور
عیار الشعراء	از خوب چند ذکا	کتبخانہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
عیار الشعراء	از خوب چند ذکا	عکس مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو علیگڈھ
فہرست اردو مخطوطات	مرتبہ جناب نصیر الدین ہاشمی	سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد
کشکول متفرقات		مسلم یونیورسٹی لائبریری علیگڈھ

گلِ رعنا	از شفیق اورنگ آبادی	کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد
گلزارِ ابراہیم	از علی ابراہیم خاں خلیل	رضا لائبریری رام پور
گلزارِ ابراہیم	از علی ابراہیم خاں خلیل	خدا بخش لائبریری پٹنہ
گلشنِ بے خار	از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	مملوکہ جناب کوثر چاند پوری بھوپال
گلشنِ بے خار	از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال
گلشنِ سخن	از میرزا کاظم مبتلا لکھنوی	رضا لائبریری رام پور
گلشنِ سخن	از میرزا کاظم مبتلا لکھنوی	مملوکہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی
گلشنِ ہند	از حیدر بخش حیدری	نقل مخطوطہ برٹش میوزیم مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو علیگڈھ
گلشنِ ہند	از حیدر بخش حیدری	نقل مخطوطہ اڈنبرا یونیورسٹی اسکاٹ لینڈ مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو علیگڈھ
مجمع الانتخاب	از شاہ کمال مانکپوری	کتبخانہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ
مجمع النفائس	از سراج الدین علیخاں آرزو	رضا لائبریری رامپور
مخزن نکات	از قائم چاند پوری	نقل مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو علیگڈھ
مراۃ الخیال	از شیر خاں لودی	رضا لائبریری رام پور
مسرت افزا	از امر اللہ الہ آبادی	خدا بخش لائبریری پٹنہ
نشترِ عشق	از حسین قلی خاں عاشقی	رضا لائبریری رام پور
نفائس المآثر	از علاء الدولہ قزوینی	" " "
نکات الشعراء	از میر تقی میر	" " " "
نکات الشعراء	از میر تقی میر	

(ب) مطبوعات :-

آب حیات — از شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد — مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور ۱۸۸۰ء

آب حیات کا تنقیدی مطالعہ — از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی — کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۴ء (طبع ثانی)

آثار الشعرائے ہنود — از دیبی پرشاد بشاش — مطبوعہ مطبع رضوی دہلی ۱۸۸۵ء

اخبار الصنادید (مکمل) — از نجم الغنی رامپوری — ۱۹۱۸ء

ادب العرب — از پروفیسر زبید احمد — شائع کردہ نور بکڈپو۔ بریلی ۱۹۳۶ء

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ — از ڈاکٹر سید عبداللہ — شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۴۲ء

اردو تذکروں میں نکات الشعرا کی اہمیت — از ایم کے کاظمی — شائع کردہ: انش محل لکھنؤ ۱۹۶۶ء

اردو تنقید پر ایک نظر — از پروفیسر کلیم الدین احمد — شائع کردہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء

اردو تنقید کا ارتقا — از ڈاکٹر عبادت بریلوی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۱ء

اردو تنقید کی تاریخ (جلد اول) — از پروفیسر مسیح الزماں رضوی — مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۵۴ء

اردو زبان اور ادب — از ڈاکٹر مسعود حسین خاں — شائع کردہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ

اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر — از ڈاکٹر محمد حسن — مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۴ء

اردو شہ پارے (جلد اول) — از ڈاکٹر محی الدین قادری زور — شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد (۱۹۲۹ء)

اردو کی ادبی تاریخ — از پروفیسر عبدالقادر سروری — مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۵۸ء

اردو مثنوی شمالی ہند میں — از ڈاکٹر گیان چند جین — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۹ء

اردو نثر کا آغاز اور ارتقا — از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ — مطبوعہ ریاست پریس حیدرآباد (طبع اوّل)

اردوئے قدیم — از شمس اللہ قادری — مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء

اقبال نامہ جہانگیری — از مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی ترجمہ محمد زکریا مائل — مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۲۸ء

امرائے ہنود — از منشی سید احمد مارہروی — مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۹۱۰ء

باقیات — از ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی — شائع کردہ دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۵ء

بنگال کا اردو ادب — از پروفیسر جاوید نہال — شائع کردہ اردو رائٹرس گلڈ کلکتہ غالباً ۱۹۶۹ء

بہادر شاہ ظفر — از امیر احمد علوی — شائع کردہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء

بہار سخن — از برق سیتاپوری — مطبوعہ سیتاپور ۱۹۳۲ء

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا — از ڈاکٹر اختر اورینوی — مطبوعہ نیشنل لیتھو پریس پٹنہ (۱۹۵۷ء)

بھارت کا اتہاس (ہندی) — از ڈاکٹر ایشوری پرشاد — مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۵۶ء

تاریخ ادب اردو — از ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری — مطبوعہ راجہ رام کمار پریس لکھنؤ ۱۹۵۲ء

تاریخ ادبیات ایران (ہر دو جلد) — از جلال الدین ہمائی — مطبوعہ تہران ۱۹۶۱ء

تاریخ ادبیات ایران (ہر دو جلد) — از ڈاکٹر سلیم جباری — مطبوعہ تہران ۱۳۳۴ شمسی

تاریخ ادبیات در ایران (جلد اول و دوم) — از ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا — شائع کردہ کتاب فروشی ابن سینا تہران مطبوعہ ۱۹۶۰ء

تاریخ ادبیات عربی — از ابو الفضل ایم اے — مطبوعہ حیدرآباد دکن

تاریخ اردو (مکمل) — از نجم الغنی خاں رامپوری — مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء

تاریخ تذکرہ ہائے فارسی (جلد اول) — از احمد گلچین معانی — شائع کردہ دانش گاہ تہران ۱۳۴۸ شمسی

تاریخ فرشتہ اردو ترجمہ — از حکیم محمد قاسم فرشتہ — مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۳۳ء

تاریخ ہندوستان (مکمل) — از مولوی ذکاء اللہ دہلوی — مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۱۹ء

تاریخ ہند۔ عہد برطانیہ (اردو ترجمہ) — از جے سی مارشمن — مطبوعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۲۳ء

تجزیے اور روایت — از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی — شائع کردہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۹ء

تحفۃ الشعراء — از افضل بیگ خاں قاقشال — شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۶۱ء

تحقیق کی روشنی میں — از ڈاکٹر عندلیب شادانی — مطبوعہ مطبع عالیہ لاہور ۱۹۶۳ء

تحقیقی مطالعے — از پروفیسر عطا کاکوی — شائع کردہ عظیم الشان بکڈپو پٹنہ ۱۹۶۵ء

تذکرۃ الاولیا — از شیخ فرید الدین عطار مرتبہ پروفیسر نکلسن — مطبوعہ مکتبہ بریل لیڈن ۱۹۰۵ء

تذکرۃ الشعراء — از دولت شاہ سمرقندی مرتبہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن — مطبوعہ مطبع بریل لیڈن ۱۹۰۱ء

تذکرہ ابن طوفان — مرتبہ قاضی عبدالودود — شائع کردہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ ۱۹ء

تذکرہ اہل دہلی — مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو کراچی

تذکرہ حسینی — از میر حسین دوست سنبھلی — مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۲ء

تذکرہ ریختہ گویاں — از میر فتح علی گردیزی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۳ء

تذکرہ شعرائے اردو — از میر حسن — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد (طبع اول)

تذکرہ شعرائے اردو — از میر حسن — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد (طبع ثانی)

تذکرہ طاہر نصیر آبادی — مطبوعہ چاپ خانہ ارمغان طہران ۱۳۷۰ شمسی

تذکرۂ کاملان رام پور — از احمد علی شوق — مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء

تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان — از ڈاکٹر سید علی رضا نقوی — شائع کردہ موسسہ مطبوعاتی علمی تہران ۱۹۶۴ء

تذکرۂ ہندی — از غلام ہمدانی مصحفی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۳ء

تقویم ہجری و عیسوی — مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۹ء

تلامذہ غالب — از مالک رام — شائع کردہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۸ء

تنقیدی سرمایہ (حصہ اول) — از عبدالشکور — مطبوعہ مشن پریس الہ آباد ۱۹۴۱ء

توزک جہانگیری (اردو ترجمہ) — از نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ — شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء

تین تذکرے — مرتبہ نثار احمد فاروقی — مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۸ء

جوامع الحکایات و لوامع الروایات — از محمد عوفی، ترجمہ اختر شیرانی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء

چمنستان شعرا — از لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

خزانۂ عامرہ — از علامہ آزاد بلگرامی — مطبعۂ نول کشور پریس کانپور ۱۸۷۱ء

خطبات گارساں دتاسی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد

خمخانہ جاوید (جلد دوم، سوئم، چہارم، پنجم) — از لالہ سری رام

خواجہ میر درد تذکرہ و تفکر — از نذیر احمد — مکتبہ شاہراہ دہلی ۱۹۶۴ء

داستان تاریخ اردو — از حامد حسین قادری — شائع کردہ لکشمی نرائن اگروال اینڈ سنز آگرہ ۱۹۴۱ء

دستور الفصاحت — از احمد علی خاں یکتا لکھنوی، مرتبہ عرشی رامپوری — مطبوعہ ہندوستان پریس رامپور ۱۹۴۳ء

دکن میں اردو	از نصیر الدین ہاشمی	شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد ۱۹۳۶ء
دکنی ادب کی تاریخ	از ڈاکٹر محی الدین قادری زور	شائع کردہ اردو اکیڈیمی سندھ کراچی ۱۹۶۰ء
دلی کا دبستان شاعری	از ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان ۱۹۴۹ء
دو تذکرے (دو جلد)	مرتبہ کلیم الدین احمد	مطبوعہ نیشنل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۲ء
دیوان تاباں	از عبدالحی تاباں مرتبہ مولوی عبدالحق	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۵ء
دیوانِ جوشش	از جوشش عظیم آبادی مرتبہ قاضی عبدالودود	شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۱ء
دیوان جہاں	از رائے بینی نرائن	مطبوعہ نیشنل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء
دیوان ذوق	از شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد دہلوی	مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور (۱۹۲۲ء)
دیوان غالب	از مرزا اسداللہ خاں غالب مرتبہ عرشی رامپوری	شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۱ء
دیوان فغاں	از اشرف علی فغاں مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن	شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۰ء
دیوان قائم	از قائم چاندپوری مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام	شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

دیوانِ یقین	از انعام اللہ خاں یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ	شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد ۱۹۳۰ء
ذکرِ غالب	از مالک رام	شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۶۴ء
ذوق - سوانح اور انتقاد	از ڈاکٹر تنویر علوی	شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
راحت الصدور	از محمد بن علی بن سلیمان الراوندی مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال	شائع کردہ موسسہ مطبوعاتی امیر کبیر تہران ۱۳۳۳ شمسی
ریاض الفصحا	از غلام ہمدانی مصحفی	شائع کردہ انجمن ترقی (ہند) اورنگ آباد ۱۹۳۴ء
سبک شناسی (جلد سوم)	از ملک الشعراء مرزا محمد تقی بہار	مطبوعہ تہران ۱۹۵۹ء
سحر البیان (مثنوی)	از میر حسن	شائع کردہ مشورہ بکڈپو دہلی ۱۹۶۴ء
سخن شعراء	از عبد الغفور نساخ	مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء
سراپا سخن	از سید محسن علی محسن	" " " ۱۸۹۰ء
سروِ آزاد	از علامہ آزاد بلگرامی	مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور
سفرنامہ مصر و روم و شام	از علامہ شبلی نعمانی	مطبوعہ رحمانی پریس دہلی
سفینہ خوش گو	از بندرابن داس خوش گو متھرادی	شائع کردہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ ۱۹۵۹ء
سفینہ ہندی	از بھگوان داس ہندی	شائع کردہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ ۱۹۵۸ء
سوانحاتِ سلاطین اودھ	از سید کمال الدین حیدر عرف سید محمد میر	مطبوعہ نولکشور پریس کانپور ۱۹۰۷ء
سودا	از شیخ چاند	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک — از مولانا عبید اللہ سندھی — شائع کردہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۴۵ء

شعرائے اردو کے تذکرے — از ڈاکٹر سید عبداللہ — شائع کردہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء

شمیم سخن (حصہ اول) — از عبدالحئی صفا بدایونی — مطبوعہ مطبع امداد ہند مراد آباد ۱۸۸۴ء

طبقات الشعراء (عربی) — از ابن سلام — مطبوعہ مطبع بریل لیڈن ۱۹۱۳ء

طبقات شعرائے ہند — از مولوی کریم الدین — مطبوعہ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ء

عربی ادب — از علی احمد نعت — شائع کردہ اردو اکیڈمی بہاولپور ۱۹۶۲ء

عقد ثریا — از غلام ہمدانی مصحفی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۴ء

علمی نقوش — از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ

علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول — مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور — شائع کردہ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۲ء

عمدۂ منتخبہ — از اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — شائع کردہ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ۱۹۶۱ء

عیارستان — از قاضی عبدالودود — شائع کردہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۹۵۷ء

غالب — از غلام رسول مہر — شائع کردہ شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور (طبع ثانی)

غیاث اللغات — از غیاث الدین رامپوری — مطبوعہ نول کشور پریس کانپور ۱۸۴۰ء

فائز دہلوی اور دیوان فائز — مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی — شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۵ء

فرہنگ آنندراج جلد اول — از منشی محمد بادشاہ — مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۹ء

فرہنگ نامہ پارسی (جلد اول) — از علامہ سعید نفیسی — شائع کردہ وزارت فرہنگ تہران ۱۳۱۹ شمسی

الفہرست — از ابن الندیم — مطبوعہ لائپزگ ۱۸۷۱ء

فہرست — کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد — مطبوعہ حیدرآباد ۳۳-۱۳۳۲ھ

قاموس المشاہیر — از نظامی بدایونی — مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۶ء

قرآن شریف مع ترجمہ — شبیر احمد عثمانی

قرآن شریف مع ترجمہ — شاہ رفیع الدین صاحب

کتاب الاغانی جلد نمبر (۲۱) — از ابی الفرج الاصفہانی — مطبوعہ مطبعۃ التقدم مصر ۱۳۲۳ھ

کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون جلد چہارم — از حاجی خلیفہ — مطبوعہ لندن ۱۸۳۷ء

کلام انشاء — از انشاء اللہ خاں انشا — شائع کردہ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۵۲ء

کلمات الشعراء — از محمد افضل سرخوش مرتبہ علامہ محوی صدیقی لکھنوی — شائع کردہ مدراس یونیورسٹی مدراس ۱۹۵۱ء

کلیات انشا — از انشاء اللہ خاں انشا — مطبع اردو اخبار دہلی ۱۸۵۵ء

کلیات سراج — از سراج اورنگ آبادی — مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری — شائع کردہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدرآباد

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ — مرتبہ ڈاکٹر زور — شائع کردہ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء

کلیاتِ سودا	از مرزا محمد رفیع سودا	مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۲ء
گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے	مصححہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۰ء
گلِ رعنا	از لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدرآباد دکن
گلِ رعنا	از عبدالحی	شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۳۴۳ھ
گلزارِ ابراہیم و گلشنِ ہند	مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور	مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڈھ ۱۹۳۴ء
گلستانِ بے خزاں	از قطب الدین باطن اکبرآبادی	مطبوعہ نولکشور پریس ۱۲۶۱ھ
گلستانِ سخن	از قادر بخش صابر	" " " ۱۸۸۲ء
گلشنِ بے خار	از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	مطبوعہ سید الاخبار پریس دہلی ۱۸۳۷ء
گلشنِ بے خار	از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء
گلشنِ سخن	از مرزا کاظم مبتلا لکھنوی مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ ۱۹۶۵ء
گلشنِ گفتار	از خواجہ حمید اورنگ آبادی مرتبہ پروفیسر سید محمد	مطبوعہ خورشید پریس حیدرآباد ۱۹۳۰ء
گلشنِ ہند	از مرزا علی لطف	مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۰۶ء
گلِ عجائب	از اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۶ء
گلکرسٹ اور اس کا عہد	از عتیق صدیقی	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علیگڈھ ۱۹۶۰ء

لباب الالباب (جلد اول)	از محمد عوفی مرتبہ پروفیسر ایڈورڈ براؤن و محمد بن عبدالوہاب قزوینی	مطبوعہ مطبع بریل لیڈن ۱۹۰۶ء
لباب الالباب (جلد دوم)	" " " "	" " " ۱۹۰۳ء
لباب الالباب (ہر دو جلد)	از محمد عوفی مرتبہ پروفیسر سعید نفیسی	شائع کردہ کتب خانہ ابن سینا تہران ۱۹۵۷ء
مادھوجی سندھیا (اردو ترجمہ)	از ایچ جی کین	مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد ۱۹۲۳ء
مباحث	از ڈاکٹر سید عبداللہ	شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء
مثنویات راسخ	از ڈاکٹر ممتاز احمد	مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۷ء
مجمع الفصحا	از رضا قلی ہدایت مرتبہ آقائے مظاہر مصفا	شائع کردہ موسسہ مطبوعاتی امیر کبیر تہران ۱۳۳۶ شمسی
مجموعہ نغز	از حکیم قدرت اللہ قاسم مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی	شائع کردہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء
محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن	از مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری	مطبوعہ مطبع رحمانی حیدر آباد ۱۹۲۹ء
مختصر سیر ہندوستان	از حکیم وحید اللہ بدایونی	مطبوعہ دبدبہ حیدری آگرہ ۱۳۰۳ھ
مخزن نکات	از قائم چاند پوری	شائع کردہ انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن ۱۹۲۹ء
مرآۃ السلاطین		
ترجمہ سیر المتاخرین	از درگا پرشاد	

مرزا محمد رفیع سودا	از ڈاکٹر خلیق انجم	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۶ء
مطلع العلوم مجمع الفنون (اُردو ترجمہ)	از منشی زین العابدین مراد آبادی	
منتخب اللباب جلد سوم	از خافی خاں	شائع کردہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال
المنجد فی الادب والعلوم	از لوئس معلوف	مطبع بیروت، طبع جدید
مومن	از کلب علی خاں فائق رامپوری	شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء
میخانہ	از عزتی قزوینی مرتبہ احمد گلچین معانی	مطبوعہ تہران ۱۳۸۱ھ
میر تقی میر، حیات اور شاعری	از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ہند علیگڑھ
میر کی آپ بیتی	از نثار احمد فاروقی	شائع کردہ مکتبۂ برہان دہلی۔ ۱۹۵۷ء
نادرات شاہی	از شاہ عالم آفتاب مرتبہ عرشی رامپوری	مطبوعہ ہندوستان پریس رام پور ۱۹۴۴ء
نقوش و افکار	از مجنوں گورکھپوری	شائع کردہ ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء
نکات الشعراء	از میر تقی میر مرتبہ حبیب الرحمن خاں شیروانی	مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۶ء
نکات الشعرا	از میر تقی میر مرتبہ مولوی عبدالحق	شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد ۱۹۳۵ء
نکات الشعراء	از میر تقی میر، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی	شائع کردہ ادارہ تصنیف ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۹۷۲ء

وفیات الاعیان (جلد اوّل)	از ابی العباس احمد بن خلکان	مطبوعہ: الطباعۃ المجریہ ۱۲۷۵ھ
وفیات الاعیان (جلد ثانی)	از ابی العباس احمد بن خلکان	مطبوعہ مطبعۃ المیمنہ مصر ۱۲۱۰ھ
وقائع عالم شاہی	از پریم کشور فراقی	مطبوعہ ہندوستان پریس رام پور ۱۹۴۹ء
یادگار شعراء	مرتبہ طفیل احمد	شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد
یادگار غالب	از شمس العلماء مولانا حالی	مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد ۱۹۵۸ء
یتیمۃ الدہر مکمل	از ثعالبی	مطبوعہ مطبع السعادۃ قاہرہ ۱۹۵۶ء

رسائل و جرائد:-

اردو سہ ماہی	کراچی	جنوری ۱۹۵۰ء، اکتوبر ۱۹۵۹ء، جولائی ۱۹۶۶ء، جولائی ۱۹۶۷ء
اردو ادب (سہ ماہی)	علی گڑھ	مارچ ۱۹۵۵ء، جون ۱۹۵۵ء
اردو نامہ (سہ ماہی)	کراچی	شمارہ نمبر ۱۶ بابتہ اپریل تا جون ۱۹۶۴ء
انتخاب ماہ نو	کراچی	۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۲ء
اورینٹل کالج میگزین	لاہور	بابتہ نومبر ۱۹۲۵ء، فروری ۱۹۲۷ء، فروری ۱۹۳۳ء، اگست ۱۹۴۳ء
پگڈنڈی (ماہنامہ)	امرتسر	سالنامہ ۱۹۵۹ء

رسالہ	مقام	شمارے
دلی کالج میگزین میر نمبر		۱۹۶۲ء
قومی زبان (پندرہ روزہ)	کراچی	شمارہ یکم و ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ء
معاصر (سہ ماہی)	پٹنہ	مکمل فائل ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۵ء
نقوش	لاہور	شمارہ اکتوبر ۱۹۵۸ء
نگار (ماہنامہ)	لکھنؤ	شمارہ جون ۱۹۵۶ء
نگار (ماہنامہ)	کراچی	شمارہ ستمبر ۱۹۶۳ء۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر ۔ و مصحفی نمبر
نئے ادب (سہ ماہی)	بمبئی	شمارہ اپریل ۱۹۵۶ء، اکتوبر ۱۹۶۸ء
نیا دور (ماہنامہ)	لکھنؤ	شمارہ جولائی ۱۹۶۲ء
ہماری زبان ہفت روزہ	علی گڑھ	۱۵ جنوری تا ۱۵ اپریل ۱۹۶۰ء، یکم نومبر ۱۹۶۰ء تا ۸ اپریل ۱۹۶۶ء
ہندستانی (سہ ماہی)	الہ آباد	شمارہ اکتوبر ۱۹۳۳ء